Kashif Azad@OneUrdu.com
زیرو پوائنٹ 3
جاوید چوہدری
Kashif Azad@OneUrdu.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم



# زیرو پوائنٹ 3

# زیرو پوائنٹ 3



جاوید چوہدری

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | .......... | زیرو پوائنٹ 3 |
| مصنف | .......... | جاوید چودھری |
| ناشر | .......... | گلفراز احمد<br>علم و عرفان پبلشرز، لاہور |
| پروف ریڈنگ | .......... | محمد صابر نواز |
| مطبع | .......... | زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور |
| سن اشاعت | .......... | 20-اکتوبر 2007ء |
| قیمت | .......... | 350/- روپے |





## مشتاق بک کارنر

الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 7230350

## سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7223584 موبائل: 0300-4125230

روبینہ

اپنی بیوی کے نام

# ترتیب

# کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے

## (میری داستان' تھوڑی تھوڑی)

میری عمر اس وقت تین سال تھی' میرے والدین گاؤں سے تازہ تازہ کھاریاں آئے تھے' کھاریاں میں نئی نئی چھاؤنی بنی تھی' شہر میں سوئی گیس نہیں تھی چنانچہ میرے والد نے کوئلے کا کام شروع کر دیا' وہ صوبہ سرحد' پنجاب اور بلوچستان سے کوئلہ منگواتے تھے اور یہ کوئلہ چھاؤنی کو سپلائی کر دیتے تھے' اس کاروبار سے انہوں نے لاکھوں روپے کمائے' ہم لوگ کھاریاں میں گھیانہ روڈ پر رہتے تھے' یہ دو کمرے کا ایک درمیانے درجے کا مکان تھا جس کا صحن بہت بڑا تھا اور مکان میں ایک چھوٹا سا کنواں بھی تھا اس دور کی دو یادیں ابھی تک میرے ذہن سے چپکی ہوئی ہیں' مجھے ان دونوں واقعات کی تمام جزئیات آج تک یاد ہیں' یہ سردیوں کا زمانہ تھا' ہم ایک صبح اٹھے تو ہمارے دروازے کے سامنے کوئی فقیر لیٹا تھا' اس نے بدبو دار رضائی اوڑھ رکھی تھی' میرے والد کو بڑا غصہ آیا اور وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا' میری والدہ نرم دل خاتون ہیں' وہ نماز اور روزے کی انتہائی پابند ہیں' انہوں نے فوری طور پر مداخلت کی اور فقیر کی "جان بخشی" کرا دی' وہ فقیر بعد ازاں مستقل طور پر ہمارے گھر کے سامنے اقامت پذیر ہو گیا' ہمارے گھر کے آگے ایک بڑھئی کی دکان تھی' وہ بڑھئی رات کو دکان بند کرتا تھا تو فقیر دکان کے تھڑے پر ڈیرہ ڈال لیتا تھا اور صبح کے وقت تھڑے سے اتر کر ذرا دور چٹائی بچھاتا تھا اور رضائی اوڑھ کر وہاں بیٹھ جاتا تھا' فقیر کے کھانے پینے اور چائے کا بندوبست میری ماں نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور انہوں نے مجھے فقیر کا "ویٹر" بنا دیا تھا' میری ماں دن میں تین مرتبہ ٹرے میں سالن' روٹیاں اور پانی کا پیالہ رکھتی اور میں بڑی مشکل سے یہ ٹرے اٹھا کر فقیر کے پاس پہنچتا' فقیر مجھے جوں ہی گھر کی دہلیز سے باہر نکلتے دیکھتا تو وہ ٹرے تھام لیتا اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا' مجھے اس کی چٹائی' اس کے کپڑوں اور اس کی رضائی سے شدید بدبو آتی تھی لیکن پتہ نہیں کیوں میں اس کے باوجود اس کے پاس بیٹھ جاتا تھا' میری ماں نے اس کا نام بابا جی رکھ دیا تھا لہٰذا میں آنے والی سطروں میں اسے بابا جی ہی لکھوں گا' بابا جی میرے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو بھی کرتے تھے' وہ مجھے اکثر کہا کرتے تھے' تم پڑھنا' اچھے بچے بننا اور بڑے ہو کر کتابیں لکھنا اور میں تمہاری

کتابیں پڑھوں گا وغیرہ وغیرہ' میں برتن اٹھا کر واپس جانے لگتا تو وہ اپنے سرہانے کے نیچے سے اخبار کا کوئی نہ کوئی مسلہ کچلا صفحہ نکالتے' دونوں ہاتھوں سے اسے سیدھا کرتے اور کہتے تم مجھے اخبار پڑھ کر سناؤ' میں اس وقت تک اخبار نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اخبار تھما دیتے تھے اور میں اخبار کا یہ صفحہ ساتھ لے آتا تھا اور سارا سارا دن اسے دیکھتا رہتا تھا۔

ایک دن بارش کا موسم تھا' شہر میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بارش کے باعث بڑھئی دکان کھولنے نہیں آیا تھا چنانچہ اس دن بابا جی کو تھڑے سے نہیں اترنا پڑا تھا' میری ماں نے مجھے بڑی مشکل سے اٹھایا اور میں شدید سردی اور دھند میں ناشتہ لے کر بابا جی کے پاس حاضر ہو گیا' بابا جی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اور سڑک پر بارش کے گرتے قطروں کو دیکھ رہے تھے' وہ اس منظر میں بری طرح محو تھے' میں نے ان کے سامنے ٹرے رکھا تو وہ چونک پڑے اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے' میں ڈر گیا' بابا جی چند لمحے تک مجھے دیکھتے رہے اور اس کے بعد مسکرا کر بولے "چلو ادھر بیٹھ جاؤ" میں ان کی چٹائی پر بیٹھ گیا' باہر شدید سردی اور دھند تھی' میں سردی سے کانپ رہا تھا' بابا جی نے پوچھا "سردی لگ رہی ہے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' بابا جی مسکرائے' میرا ہاتھ پکڑا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے' ذرا دیر بعد مجھے محسوس ہوا ان کے ہاتھ سے حدت نکل رہی ہے اور بڑی تیزی سے میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے' چند لمحے بعد میرے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے' انہوں نے مسکرا کر پوچھا "اب بھی سردی لگ رہی ہے" میں نے انکار میں سر ہلا دیا' وہ مسکرائے اور دوبارہ بولے "سردی اور گرمی انسان کے اندر ہوتی ہے' اگر انسان اپنے باطنی ریگولیٹر تک پہنچ جائے تو وہ بڑی آسانی سے اپنا درجہ حرارت کم اور زیادہ کر سکتا ہے" مجھے اس وقت ان کی بات سمجھ نہ آئی' میرے لئے درجہ حرارت' ریگولیٹر اور باطنی جیسے الفاظ اجنبی تھے لیکن میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا' انہوں نے اپنے سرہانے کے نیچے سے چاق کا ایک چھوٹا سے ٹکڑا نکالا اور میرے سامنے فرش پر ایک دائرہ کھینچ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولے "تم سڑک کے ایک سرے سے دوسرے تک دیکھو" میں نے باہر سڑک کی طرف دیکھا' سڑک پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی' آسمان سے پانی برس رہا تھا' پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل اختیار کرتا تیزی سے آگے بہتا چلا جاتا تھا' میں نے جہاں تک نظر جاتی تھی سڑک دیکھ لی' وہ بولے "اب تم آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں بند رکھنا" میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں بند کر لیں' وہ نیچی آواز میں کسی اجنبی زبان کے الفاظ دہرانے لگے' وہ پڑھتے پڑھتے خاموش ہوئے اور سخت آواز میں بولے "آنکھیں کھولو" میں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں' انہوں نے انگلی کے اشارے سے دائرے کی طرف دیکھنے کا حکم دیا' میں نے دائرے کی طرف نظر گھمائی تو میں حیران رہ گیا' دائرے میں فلم چل رہی تھی' یہ ایک کچی سڑک تھی جس پر تانگے چل رہے تھے اور اس سڑک کے دونوں اطراف کچے مکان تھے' مکانوں کے درمیان میں کھیت تھے اور کھیتوں میں لوگ بیلوں سے ہل چلا رہے تھے' میں نے مکانوں کے درمیان میں تیلی کا ایک کوہلو بھی دیکھا' بوڑھا تیلی لکڑی

کے تخت پر بیٹھا تھا' اس کے سامنے ایک کولہو تھا اور ایک کمزور لاغر سا بیل کولہو کھینچ رہا تھا' کولہو کے پرنالے سے سرسوں کے تیل کی باریک سی دھار نکل رہی تھی' کچی سڑک کے ایک سرے پر ٹھیلے والے کھڑے تھے' ٹھیلوں پر قلفیاں' برف کے گولے اور بتاشے بک رہے تھے اور بچے جیب سے سکے نکال نکال کر یہ چیزیں خرید رہے تھے' میں نے گھبرا کر باباجی کی طرف دیکھا' باباجی دائرے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے' میں نے دوبارہ دائرے کی طرف دیکھا تو وہاں منظر بدل چکا تھا' اب دائرے میں ایک پکی سڑک تھی' سڑک پر موٹر گاڑیاں' بسیں اور رکشے چل رہے تھے' سڑک کے دونوں طرف اونچی اونچی عمارتیں اور خوبصورت دکانیں تھیں اور ان دکانوں سے لوگ خریداری کر رہے تھے' مجھے سڑک پر ایک سکول بھی دکھائی دیا' سکول کے سامنے بچوں کا رش لگا تھا' میں نے گھبرا کر منظر سے آنکھیں پھیریں اور باباجی کی طرف دیکھنے لگا' انہوں نے پڑھنا بند کیا اور مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگے' دائرے سے تصویریں غائب ہو چکی تھیں' وہ ہنسے اور بولے "یہ اس سڑک کا ماضی اور مستقبل تھا جس پر تم اس وقت بیٹھے ہو' پہلا منظر اس سڑک کا تیس برس پرانا ماضی تھا اور دوسری بار تم نے آج سے تیس برس بعد کی سڑک دیکھی' تم آج سے تیس برس بعد جب اس جگہ سے گزرو گے تو یہ سڑک ایسی ہو گی" میں باباجی کی بات سن کر پریشان ہو گیا' اس کے بعد وہ آگے جھکے اور انہوں نے اپنی انگلی میرے سر اور گردن کے درمیان میں موجود جوڑ پر رکھ دی اور مسکرا کر بولے "اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ایک کیمرہ لگا رکھا ہے' اگر کسی انسان کا یہ کیمرہ چل پڑے تو وہ ماضی' حال اور مستقبل کی ساری تصویریں دیکھ لیتا ہے" انہوں نے اپنی انگلی دبائی اور بولے "یہ وقت کی جگہ ہے' تم سے پہلے کیا تھا اور تمہارے بعد کیا ہو گا یہ ساری باتیں' یہ سارے منظر اس جگہ محفوظ ہیں' انسان کی آنکھ اگر اس جگہ کے اندر چلی جائے تو وہ اپنا ماضی' حال اور مستقبل دیکھ لیتا ہے اور اگر یہ آنکھ تیز ہو تو وہ دوسروں کا وقت بھی ٹٹول لیتا ہے"۔ میں خاموش بیٹھا رہا' وہ دوبارہ بولے "میں تم پر وقت کا دروازہ کھول رہا ہوں' اگر تم اچھے بچے ثابت ہوئے تو تم اپنی اور دوسروں کی تصویریں دیکھ سکو گے اور اگر بڑے ہو کر بدمعاش بن گئے تو تم دنیا میں بڑی خرابی پھیلاؤ گے' میری دعا ہے تم اچھے بچے بنو" اس کے بعد باباجی نے میری گردن کے اس مقام پر اپنا انگوٹھا رکھا اور دبانا شروع کر دیا' مجھے درد کا ہلکا ہلکا اثر محسوس ہونے لگا' پھر اچانک میری ریڑھ کی ہڈی میں بجلی کا ایک کوندا سا لہرایا اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا' مجھے جب ہوش آیا تو میں گھر میں پڑا تھا' میرے اوپر رضائی تھی اور سارے گھر والے میرے ارد گرد بیٹھے تھے' میرا پورا جسم بخار سے جل رہا تھا جبکہ میری ماں ذرا پرے میرے منہ میں عرق گلاب ٹپکا رہی تھی' میں نے سب سے پہلے دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ میرے کانوں میں آوازیں آنے لگیں' ان تمام آوازوں پر میرے والد کی آواز حاوی تھی' وہ غصے سے باباجی کو گالیاں دے رہے تھے' چند دن بعد میری ماں نے مجھے بتایا باباجی نے اس دن دروازہ بجایا اور مجھے میری والدہ کو پکڑا کر بولے تھے "بچے کا سر چکرا گیا ہے آپ اس پر کمبل ڈال دیں" میری ماں نے مجھے بے ہوش دیکھ کر رونا شروع کر دیا تھا' میرے والد نے انہیں روتا دیکھا' پھر مجھے دیکھا تو وہ باہر تھڑے کی

طرف لپکے لیکن بابا جی تھڑے سے غائب تھے میرے والد رات تک تھڑے کے چکر لگاتے رہے مگر بابا جی واپس نہ آئے میں دو دن بخار میں جھلسنے کے بعد باہر نکلا تو بابا جی ابھی تک غائب تھے تھڑے کے ایک کونے میں ان کی چٹائی' ان کی بدبودار رضائی اور لوٹا پڑا تھا' یہ ساری چیزیں کئی ہفتوں تک وہاں پڑی رہیں لیکن بابا جی واپس نہ آئے یہاں تک کہ ایک دن بڑھئی نے یہ ساری چیزیں اٹھا کر گندے نالے میں پھینک دیں' میں نے زندگی میں دوبارہ بابا جی نہ دیکھے مگر ان کی پراسرار باتیں آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہیں' مجھے آج تک بابا جی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے اور میں چونک کر آگے پیچھے دیکھنے لگتا ہوں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آتے۔

میں عملی طور پر ایک پریکٹیکل اور سائنسی ذہن کا شخص ہوں' میں نے کبھی زندگی کو دو جمع دو اور نیوٹن کے تیسرے قانون سے باہر نکل کر نہیں دیکھا' میں مادے پر بھی مکمل یقین رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے اس پریکٹیکل لائف کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے اور یہ زندگی ہر وقت ہمارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلتی رہتی ہے' مجھے بچپن سے ماضی' حال اور مستقبل کے جھماکے ہوتے رہتے ہیں' میں کبھی دیواروں پر تصویریں سی چلتی دیکھتا ہوں اور یہ تصویریں بعد ازاں سچ ثابت ہو جاتی ہیں۔ مجھے لوگوں کی فطرت اور نفسیات جاننے میں بھی سیکنڈ لگتے ہیں اور میرے دوست مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں تم منہ سے بری بات نہ نکالا کرو' وہ ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ میری اکثر بری باتیں اور بری سوچیں سچ ثابت ہو جاتی ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ قبل اپنے ایک درویش دوست سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا ''ہم لوگ اس خوبی کو وجدان کہتے ہیں' یہ بعض لوگوں میں پیدائشی ہوتی ہے اور بعض کو ریاضت سے ملتی ہے' تم میں یہ قدرتی ہے'' میں نے ان سے بابا جی کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکرا کر بولے ''وہ کشفی درویش تھا' قدرت جن لوگوں کو وجدان کی نعمت سے نوازتی ہے ان کے دماغ اور ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ میں ایک پھوڑا سا ہوتا ہے' اگر پانچ سال کی عمر سے پہلے یہ پھوڑا اپھٹ جائے تو اس بچے کا دماغ ترقی کرنے لگتا ہے بصورت دیگر وہ بچہ مجذوب بن جاتا ہے۔ وہ کشفی درویش اس پھوڑے سے واقف تھا چنانچہ اس نے تمہاری گردن دبا کر وہ پھوڑا اپھاڑ دیا' اس کی بس اتنی سی ڈیوٹی تھی' وہ آیا' اس نے اپنی ڈیوٹی کی اور چلا گیا' اگر وہ ایسا نہ کرتا تو تم آج دماغی امراض کے کسی ہسپتال میں ہوتے یا پھر مجذوب بن کر سڑکوں پر ننگ دھڑنگ پھر رہے ہوتے'' میرے یہ دوست ٹھیک ٹھاک قسم کے متقی اور پرہیز گار شخص ہیں' میں ان کی باتوں کو بڑی سنجیدگی سے لیتا ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی اس بات پر یقین نہیں آتا اور میں بچپن کے اس واقعے کو نظر کا دھوکہ اور اپنے ''کشف'' کو الوژن سمجھتا ہوں' ہم اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور اس صدی کا سائنسی دماغ ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا کرتا' دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے (باقی آئندہ)

جاوید چودھری
ہاؤس نمبر 490' سٹریٹ نمبر 17
شہزاد ٹاؤن' اسلام آباد

# برکت

خان عبدالصمد خان صاحب سے میرا رابطہ اچانک شروع ہوا اور اچانک ختم ہو گیا' آج سے چار پانچ برس پہلے کسی صاحب نے مجھے فیصل آباد سے فون کیا' ان کا کہنا تھا "ہمارے بابا جی آپ کے بہت بڑے فین ہیں' ہم انہیں آپ کا کالم پڑھ کر سناتے ہیں تو وہ بڑی دیر تک سر ہلاتے رہتے ہیں" میں نے ان سے پوچھا "آپ کے بابا جی کون ہیں" انہوں نے بڑی عقیدت سے جواب دیا "فیصل آباد جھنگ روڈ پر صوفی برکت صاحب کا ڈیرہ ہے خان صاحب ان کے ڈیرے پر ہوتے ہیں' ان کی عمر نوے سال سے زائد ہے' وہ مشرقی پنجاب کے کسی زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے' بچپن میں روحانیت کی طرف مائل ہو گئے اور گھر بار چھوڑ کر اللہ کی راہ پر نکل آئے' طبیعت میں مجذوبیت ہے لیکن جب نارمل ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت گفتگو کرتے ہیں" مجھے ان کی گفتگو میں ذرا سی دلچسپی محسوس ہوئی لیکن میں بابا جی سے زیادہ متاثر نہ ہو سکا' چند دنوں بعد ان کا دوبارہ فون آ گیا' اس بار انہوں نے فرمایا "ہم نے آپ کی کتاب خرید لی ہے جس دن آپ کا کالم نہیں آتا ہم اس دن آپ کی کتاب میں سے کوئی کالم نکال کر بابا جی کو سنا دیتے ہیں' وہ آپ کے لئے بہت دعائیں کرتے ہیں" میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بھول گیا' چند دن بعد ان کا ایک اور فون آیا اور انہوں نے چھوٹتے ہی فرمایا "لیجئے بابا جی سے بات کیجئے" یوں میں نے پہلی بار خان عبدالصمد خان صاحب کی آواز سنی' خان صاحب کی آواز میں عاجزی اور نرمی تھی' وہ مجھے بیٹا کہہ کر

مخاطب ہوئے اور میری تحریر کی تعریف کرنے لگے' گفتگو کے دوران کہیں کہیں ان کا لہجہ تبدیل ہو جاتا' اس میں جلال آ جاتا اور بات بے ربط ہو جاتی' میں خاموشی اور ادب سے ان کی بات سنتا رہا' پھر اچانک فون بند ہو گیا' ہفتے بعد ان کا ایک اور فون آ گیا' اس فون میں وہ بار بار ایک فقرہ دہراتے رہے ''مہلت کم ہے' مہلت کم ہے'' اس دن ان کی گفتگو میں ربط تقریباً مفقود تھا' میں بڑے غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن سچی بات ہے ان کی کوئی بات میرے پلے نہ پڑی' وہ میری کشمکش بھانپ گئے لہٰذا انہوں نے فون اپنے ''ترجمان'' کو پکڑا دیا' وہ صاحب بڑی عاجزی سے بولے ''بابا جی فرما رہے ہیں' ان کے پاس مہلت کم ہے لہٰذا آپ انہیں آ کر مل جائیں'' میں نے سوچنے کیلئے چند دن مانگے اور فون بند کر دیا' مجھے اس سلسلے کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی' مجھے مجذوبیت اور پراسراریت دونوں ناپسند ہیں' میرا خیال ہے آج کے انسان کو فکر چاہیے' اسے تعویز اور پھونکیں نہیں چاہئیں چنانچہ جو شخص بول نہیں سکتا' جو گفتگو سے انسپائر نہیں کرتا میں اس کے قریب نہیں پھٹکتا' یہی معاملہ پراسراریت کا ہے' جو شخص مجھے اپنا نام' کام اور پتہ نہ بتائے' جو خط کے آخر میں آپ کا ایک قاری یا مہربانی فرما کر میرا نام خفیہ رکھا جائے لکھ دے مجھے اس پر طیش آ جاتا ہے' مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے میری بے عزتی یا توہین کر دی ہو' مجھے خان صاحب بھی ایک پراسرار اور مجذوب قسم کی شخصیت لگے لہٰذا میں نے معذرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان دنوں سرگودھا میں میرے عزیزوں کے ہاں کسی کی فوتگی ہو گئی' مجھے وہاں جانا پڑ گیا' وہاں لوگوں کے ساتھ گپ شپ کے دوران ایک صاحب ملے' یہ صاحب فیصل آباد سے آئے تھے اور ان کا گاؤں صوفی برکت کے مزار کے قریب تھا' میں نے خان صاحب کا ذکر کیا تو وہ صاحب ان کے عقیدت مند نکلے' انہوں نے بتایا' خان صاحب ایک محیر العقول شخص ہیں' وہ سارا سارا دن سورج کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے ہیں' ان کی آنکھ کی پتلی میں اللہ لکھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش رد نہیں کرتا وغیرہ' سچی بات ہے ان صاحب نے خان صاحب کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میرے دل میں خان صاحب سے ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا لہٰذا میں اگلے دن ان کے ساتھ فیصل آباد چلا گیا' وہ مجھے صوفی برکت کے مزار کے پیچھے لے گئے' مزار کے پیچھے کھیت تھے اور کھیتوں کے عین درمیان ایک کچا کوٹھا بنا تھا' ہم کوٹھے کی طرف چل پڑے' کوٹھے کے صحن میں کھجور کی صف پر ایک ضعیف بزرگ بیٹھے تھے اور ان کے گرد چند نوجوان ادب سے بیٹھے تھے' میں قریب پہنچا تو بزرگ نے نوجوانوں کو اشارہ کیا' نوجوانوں نے بابا جی کو سہارا دیا' وہ بڑی مشکل اور تکلیف سے سیدھے

کھڑے ہوئے' میں آگے بڑھا' انہوں نے دونوں بازو پھیلائے اور میرے ساتھ بغل گیر ہو گئے' ان کے لمس میں ایک ٹھنڈ اور خوشبو تھی' انہوں نے مجھے پکڑ کر ساتھ بٹھا لیا اور میرے ساتھ گفتگو کرنے لگے' ان کی باتوں میں ربط نہیں تھا اور انہیں سمجھنے کیلئے بڑی یکسوئی درکار تھی' وہ بار بار کہہ رہے تھے ''جنگ ہو گی' سب منافق مر جائیں گے' نئے لوگ آئیں گے' وہ کوٹ پتلون میں نماز پڑھائیں گے اور اللہ کے دین کو بچائیں گے'' وہ کہہ رہے تھے ''اللہ کافر کو برداشت کر لیتا ہے لیکن منافق کو نہیں'' وہ کہہ رہے تھے ''یہ لوگ قرآن کو آدھا کر دیں گے' یہ اپنے مطلب کی آیتیں پڑھیں گے اور باقی کو چھپا دیں گے' یہ پتلون پہن کر حج کریں گے اور رمضان میں شراب پئیں گے' یہ نمازوں پر پابندی لگائیں گے اور داڑھیوں کا مذاق اڑائیں گے' یہ عورتوں کو باہر نکالیں گے اور مردوں کو گھروں میں بٹھا دیں گے' یہ دشمنوں کو کھلا چھوڑ دیں گے اور دوستوں کو پکڑ لیں گے اور یہ عریانی اور بے ایمانی کو قانون بنا دیں گے'' اس کے بعد وہ عربی' فارسی اور سنسکرت کے ملے جلے شعر پڑھتے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے' وہ رومال سے آنکھیں پونچھتے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ''تم مجھے اچھے لگتے ہو' تم منافق نہیں ہو'' اس کے بعد وہ آسمان کی طرف دیکھتے اور لہک لہک کر بولتے ''میرے مالک میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا' میرے صاحب میں اسے اچھا سمجھتا ہوں تو اسے اچھا کر دے' میرے رسولؐ کے اللہ اسے اچھا بنا دے'' وہ بولتے جاتے' روتے جاتے اور رو رو کر ہنستے جاتے اور میں بیوقوفوں کی طرح انہیں دیکھتا جاتا' وہ میرا بازو چھوڑتے اور اس کے بعد دوبارہ بے ربط گفتگو شروع کر دیتے۔

میں خان صاحب کے ساتھ شام تک رہا' اس دوران انہوں نے میرا سر پکڑ کر اپنے سر کے ساتھ ٹکرایا' مجھے ان کے سر میں ہلکا سا کرنٹ محسوس ہوا اور میں چند لمحوں کیلئے مدہوش سا ہو گیا لیکن میں نے اسے ماحول کا اثر سمجھا اور فراموش کر دیا' انہوں نے اپنی انگلی سے میرے ماتھے پر کلمہ لکھا اور ایک خربوزہ کاٹ کر میرے سامنے رکھ دیا' مجھے بھوک لگی تھی' میں سارا کھا گیا' میں رخصت ہونے لگا تو میں نے ان سے سوال کیا ''یہ صوفیاء کرام کیا ہوتے ہیں'' وہ مسکرائے ''صوفیاء کرام اللہ تعالیٰ کے ہرکارے ہوتے ہیں' یہ اس کے کلرک' سپاہی اور چپڑاسی ہوتے ہیں'' میں نے پوچھا ''یہ کرتے کیا ہیں؟'' وہ مسکرائے ''جو کام تمہاری دنیا کے چپڑاسی' سپاہی اور کلرک کرتے ہیں' یہ پرمٹ' سمن اور شوکاز جاری کرتے ہیں' یہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے انعام' ایوارڈ اور تمغے لوگوں تک پہنچاتے ہیں'' میں نے پوچھا ''آپ کون ہیں'' وہ مسکرائے ''میں اللہ کا چپڑاسی ہوں'' میں نے

پوچھا ''آپ کی کیا ڈیوٹی ہے'' مسکرا کر بولے ''میں لوگوں میں برکت تقسیم کرتا ہوں'' میں نے ان کا ہاتھ تھام کر پوچھا ''آپ نے مجھے کیوں بلایا'' انہوں نے قہقہہ لگایا ''تمہاری عرضی منظور ہو گئی تھی' تم نے برکت مانگی تھی مجھے حکم ہوا اسے برکت دے دیں' میں نے دے دی'' میں نے عرض کیا ''یہ برکت کیا ہوتی ہے'' وہ مسکرا کر بولے یہ جاگ ہوتی ہے' یہ وہ ایک تولہ دہی ہوتی ہے جو دودھ کے پورے مٹکے کو دہی بنا دیتی ہے'' میں نے پوچھا ''مجھے کیسے پتہ چلے گا مجھے برکت مل چکی ہے'' انہوں نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جما کر بولے ''تم جہاں جاؤ گے' وہاں رونق لگ جائے گی اور تم جہاں سے اٹھ کر آ جاؤ گے وہ جگہ اجاڑ ہو جائے گی' لوگوں کے دل تمہاری طرف کھنچے چلے جائیں گے' لوگوں کو تمہارے پاس بیٹھ کر خوشی اور سکون ملے گا' تم سے دوستی کرنے والے لوگ فائدے میں رہیں گے اور نقصان پہنچانے والے خود نقصان اٹھائیں گے'' میں نے پوچھا ''یہ برکت کب تک میرے ساتھ رہے گی'' انہوں نے مجھے سینے سے لگایا اور تھپکی دے کر بولے ''جب تک تمہاری سوچ مثبت رہے گی' جب تک تو جھکا رہے گا اور جب تک تو تکبر سے بچا رہے گا''



میں نے خان صاحب کو سلام کیا اور واپس آ گیا' یہ میری خان عبدالصمد خان کے ساتھ پہلی اور آخری ملاقات تھی' وہ مجھے میرا حصہ دے کر اگلے ماہ رخصت ہو گئے۔

# 84 حکمرانوں کے اختیارات

میں نے ایک دن خواجہ صاحب سے پوچھا ''عام آدمی اور صوفی میں کیا فرق ہوتا ہے'' وہ نرم آواز میں بولے ''صوفی پریشان ہوتا ہے اور نہ ہی حیران'' میں نے ان سے پوچھا ''آپ زندگی میں کبھی حیران اور پریشان ہوئے'' وہ مسکرائے ''میں اس فیلڈ میں آنے کے بعد صرف ایک بار پریشان ہوا تھا'' میں انہیں اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ وہ بولے ''جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو پسند آجاتا ہے اور اسے صوفیاء کی صف میں شامل کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو اسے کوئی نشانی دی جاتی ہے، یہ نشانی صوفی کے حسب، اس کے درجے اور اس کے مقام کا تعین کرتی ہے' کسی کو آئینہ ملتا ہے، کسی کو خرقہ نصیب ہوتا ہے، کسی کو دستار مل جاتی ہے اور کسی کے سر پر تاج رکھ دیا جاتا ہے، یہ نشانیاں عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں، انہیں صرف دوسرا صوفی دیکھ سکتا ہے، صوفی ہزاروں، لاکھوں لوگوں میں دوسرے صوفی کو انہی نشانیوں سے پہچانتے ہیں' میں ایک بار لندن گیا' میں سنٹرل لندن میں پھر رہا تھا' اچانک ایک ڈسکو کلب کا دروازہ کھلا اور ایک شخص جھومتا اور جھولتا ہوا باہر نکلا اور لڑکھڑا کر فٹ پاتھ پر گر گیا' میں نے اسے دیکھا، اس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں ہنس پڑے، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں کلاس فیلو تھے، وہ بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا شاگرد تھا اور میں بھی، اسے شیخ نے اپنا رومال دے رکھا تھا' تم غور کرو وہ گورا تھا، لادین تھا، جواری اور شرابی تھا لیکن اس کے باوجود میرا بھائی اور کلاس فیلو تھا، ہم دونوں نے ایک دوسرے

کی طرف ہاتھ ہلائے اور چپ چاپ اپنے اپنے راستے پر چل پڑے۔ تو میں عرض کر رہا تھا یہ وہ نشانیاں ہوتی ہیں جن سے ایک صوفی دوسرے صوفی کو پہچانتا ہے اور ہم لوگ ان نشانیوں کی وجہ سے دوسروں کے کاموں اور علاقوں میں مداخلت نہیں کرتے"

وہ رکے اور دوبارہ بولے "ہمیں جب منتخب کیا جاتا ہے تو ہمارے پاس کچھ امانتیں رکھ دی جاتی ہیں، یہ امانتیں ولایت کی نشانیاں ہوتی ہیں اور ہم اس وقت تک دنیا سے رخصت نہیں ہوتے جب تک ہم یہ امانتیں حق داروں کو سونپ نہ دیں۔ میرے پاس بزرگوں نے ایک خرقہ خلافت رکھوایا تھا، یہ وہی خرقہ تھا جو نور الدین زنگی کو عنایت ہوا تھا اور کبھی محمود غزنوی کو ہندوستان بھجوایا گیا تھا۔ یہ ولایت کی بڑی امانتوں میں سے ایک امانت تھی، میں اسے روز حسرت سے دیکھتا تھا اور سوچتا تھا وہ کون خوش نصیب ہوگا جسے یہ نشانی نصیب ہوگی اور میں ساتھ ہی یہ دعا کیا کرتا تھا کاش وہ خوش نصیب میں ہوں"۔ خواجہ صاحب نے حسرت سے آہ بھری اور دوبارہ گویا ہوئے "ایک دن مجھے تہجد کی نماز کے بعد اونگھ آ گئی اور میں جائے نماز پر ہی لیٹ گیا، مجھے نیند میں اٹھائیس تیس برس کا ایک نوجوان دکھایا گیا، اس کا پتہ سمجھایا گیا اور یہ خرقہ اسے پہنچانے کا حکم دیا گیا۔ وہ نوجوان ہوا۔



کینٹ میں رہتا تھا، میں نے امانت کی پوٹلی اٹھائی اور واہ کی بس میں سوار ہو گیا، وہ پوش علاقے میں رہتا تھا، میں مختلف لوگوں سے ایڈریس پوچھتا ہوا اس کے گھر پہنچ گیا، میرے سامنے ایک بہت بڑی کوٹھی تھی، میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا، ایک بوڑھی خاتون گیٹ پر آئی، میں نے اس سے زاہد صاحب کا پوچھا تو اس نے شدید نفرت سے میری طرف دیکھا اور پھنکار کر بولی، اب تم آ گئے ہو، تم لوگ داڑھی رکھ کر بھی ایسے کام کرتے ہو، مجھے اس خاتون کا لہجہ اور باتیں عجیب لگیں، میں نے بڑی لجاجت سے درخواست کی میرے پاس زاہد صاحب کی ایک امانت ہے میں انہیں یہ سونپے بغیر واپس نہیں جا سکتا۔ مہربانی فرما کر ان سے میری صرف ایک منٹ ملاقات کرا دیں بوڑھی خاتون کا بلڈ پریشر یک دم بڑھ گیا اور وہ اونچی آواز میں دہائی دینے لگی وہ بد بخت ہوش میں ہوگا تو کسی سے ملے گا ناں اور اس کے بعد وہ بوڑھی خاتون آسمان کی طرف دیکھ کر زاہد صاحب کو بد دعائیں دینے لگی، وہ بار بار کہتی تھی اس اولاد سے تو میں بانجھ ہی اچھی تھی وہ یہ بھی کہتی تھی یا اللہ تو اسے اٹھا لے یا پھر مجھے اٹھا لے کیونکہ اس زندگی سے تو دوزخ میں سڑنا اچھا ہے مجھے اس ساری صورتحال کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں گیٹ کی دہلیز پر کھڑا تھا اور بوڑھی خاتون میرا راستہ روک کر بد دعائیں دے رہی تھی مجھے محسوس ہوا میں غلط پتے پر آ گیا ہوں کیونکہ تصوف کے اصولوں کے مطابق کوئی ایسا

شخص ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا جو اپنے والدین کا گستاخ ہو اور زاہد صاحب کی ماں دہلیز پر کھڑی ہو کر انہیں بددعائیں دے رہی تھی' بہر حال قصہ مختصر یہ سلسلہ بڑی دیر تک چلتا رہا جب بڑھیا کو یقین ہو گیا میں زاہد صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا تو وہ مجھے پیچھے سرونٹ کوارٹر میں لے آئی"۔

خواجہ صاحب دم لینے کیلئے رکے' میں بے تابی سے ان کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا' وہ گویا ہوئے" اندر کا منظر انتہائی پریشان کن تھا' پورے کمرے میں شراب کی خالی بوتلیں بکھری تھیں اور ان بوتلوں کے درمیان ایک خستہ حال نوجوان آڑھا ترچھا پڑا تھا' نوجوان نیم برہنہ تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی' اس نے کئی دنوں سے غسل بھی نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے جسم سے شراب اور پسینے کی ملی جلی بو آ رہی تھی' بوڑھی خاتون مجھے وہاں چھوڑ کر چلی گئی' میں نے نوجوان کو ہلایا' تھپکیاں دیں اور اس کے پاؤں پر گدگدی کی تو اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور گھبرا کر بیٹھ گیا' وہ وحشی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا' میں نے اس کے پاؤں چھوئے اور پوٹلی اس کی گود میں رکھ دی' وہ بڑی دیر تک پوٹلی کو دیکھتا رہا' اس کی آنکھوں میں سیلاب تھا' جس میں بہہ رہا تھا' اس نے پوٹلی کو بوسہ دیا اور مجھے اشارے سے جانے کا حکم دیا' میں اٹھا لیکن پھر دوبارہ بیٹھ گیا' اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور تھکی آواز میں بولا" تم معلوم کر کے کیا کرو گے" میں نے عرض کیا" حضور میں اپنے سوال کی سزا سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہیں پا رہا" وہ اٹھا' اس نے کارنس سے ایک تصویر اٹھائی اور اس پر انگلی رکھ کر بولا" اس کی وجہ سے" میں تصویر پر جھک گیا تصویر میں ایک بزرگ وہیل چیئر پر بیٹھے تھے اور وہیل چیئر کے پیچھے دروازے پر ملنے والی بوڑھی خاتون اور زاہد صاحب کھڑے تھے زاہد صاحب نے بتایا' یہ میرے والدین' میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں' میرے والد بہت رئیس انسان تھے لیکن مجھے دولت نے بگاڑ دیا تھا' میں شراب کی لت میں پڑ گیا تھا' میری صحبت خراب تھی' میں اور میرے دوست ساری ساری رات شراب پیتے تھے' میری خرابی کی وجہ سے والد کو دکھ پہنچا' انہیں فالج ہوا اور وہ وہیل چیئر تک محدود ہو گئے' جس کے بعد میں ہر اتوار کی صبح اپنے والد کو اپنے ہاتھوں سے نہلاتا تھا۔ یہ میرا معمول بن گیا تھا' ایک دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کاغان چلا گیا' ہم لوگوں نے رات خوب شراب پی' نشے کے دوران مجھے اچانک یاد آیا کل اتوار ہے اور صبح میرے والد میرا انتظار کرتے رہیں گے' میں فوراً اٹھا' میں نے گاڑی نکالی اور واپسی کا اعلان کر دیا' میرے دوستوں نے مجھے بہت سمجھایا' انہوں نے مجھے بتایا رات بہت اندھیری ہے اور تم نشے میں دھت ہو تم ڈرائیونگ نہیں کر سکو

گے لیکن میں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا' میں سارا راستہ اپنے سر پر برف رکھتا اور لیموں چوستا رہا لیکن میں صبح واپس واد پہنچ گیا۔ میرے والد ویل چیئر پر بیٹھ کر میرا انتظار کر رہے تھے' میں نے فوراً ٹب میں نیم گرم پانی ڈالا' پانی میں نمک اور لیموں ملایا اور انہیں پانی میں لٹا کر فوم سے ان کا مساج کرنے لگا' میرے والد اس دوران مجھے غور سے دیکھتے رہے' میری آنکھیں نیند' نشے اور تھکاوٹ سے بوجھل تھیں' مجھے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن میں اپنے والد کو غسل دیتا رہا' میں نے غسل کے بعد انہیں تولئے سے خشک کیا' ان کے جسم پر پاؤڈر چھڑکا' انہیں صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور ان کی ویل چیئر کے ساتھ ٹیک لگا کر سو گیا' یہ میری زندگی کی قیمتی ترین نیند تھی اس نیند میں مجھے ایک بزرگ دکھائی دیئے' انہوں نے اپنا خرقہ اتارا' مجھے پہنایا اور آپ کی شکل دکھا کر رخصت ہو گئے''۔

خواجہ صاحب رکے اور ذرا دیر رک کر بولے ''میں نے زاہد صاحب سے پوچھا' آپ کے والد کہاں ہیں' زاہد صاحب نے جواب دیا' وہ اپنے رب کے پاس لوٹ گئے ہیں' میں نے ان سے پوچھا اب آپ کیا کریں گے' انہوں نے پوٹلی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے میں اس پوٹلی کے بعد کیا کر سکتا ہوں' میرے راستے طے ہو چکے ہیں' مجھے شرابیوں کو راہ راست پر لانے کی ڈیوٹی سونپی گئی ہے' میں اس شہر سے نکلوں گا اور شہر شہر گاؤں گاؤں اپنے جیسے لوگوں کی اصلاح کروں گا'' خواجہ صاحب رکے اور دوبارہ بولے ''میں نے زاہد صاحب سے دعا کی درخواست کی اور اٹھ کر واپس آ گیا'' خواجہ صاحب خاموش ہو گئے' میں نے ان سے پوچھا ''زاہد صاحب کے پاس کتنے اختیارات ہیں'' خواجہ صاحب نے ذرا دیر سوچا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے ''اتنے جتنے 84 ملکوں کے حکمرانوں کے پاس ہیں''۔ میں نے حیرت سے عرض کیا ''صرف ایک غسل کے بدلے اتنے اختیارات'' خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا ''جب اللہ دیتا ہے تو وہ سارے خزانوں کے دروازے کھول دیتا ہے'' میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر واپس آ گیا۔

# تین ہزار ایک سو چوبیس

وہ جمعے کے دن غائب ہو جاتے تھے' صبح سویرے اٹھتے تھے' وہ گاڑی میں عجیب و غریب قسم کی چیزیں رکھتے تھے اور گھر سے رخصت ہو جاتے تھے اور جب شام کو واپس لوٹتے تھے تو ان کے ہاتھوں پر تارکول' سیمنٹ اور گارے کے داغ ہوتے تھے لیکن ان کے چہرے پر گہرا اطمینان ہوتا تھا' میں ان سے ہر بار اس پراسرار سرگرمی کے بارے میں پوچھتا تھا مگر وہ مسکرا کر ٹال دیتے تھے' ایک جمعرات وہ میرے پاس آئے اور مسکرا کر بولے اگر تم کل فارغ ہو تو میرے ساتھ چلو میں تمہیں اپنی مصروفیت میں شامل کرنا چاہتا ہوں' میں فوراً تیار ہو گیا' اگلی صبح میری زندگی کا انتہائی دلچسپ اور پراسرار دن تھا' گیلانی صاحب نے سٹور سے ایک ہتھوڑی' ایک کھرپہ' ایلومونیم کی ایک پرات' بیجوں کا ایک ڈبہ' مین ہولز کے دو ڈھکن' چند چھننیاں' چند کنڈیاں اور چند کیل نکالے ڈگی میں رکھے اور مجھے ساتھ بٹھا لیا' ہم اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئے' راستے میں گیلانی صاحب خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے' ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی پراسراریت تھی' گیلانی صاحب راولپنڈی میں میرے پہلے میزبان تھے' میں 1992ء میں اسلام آباد منتقل ہوا اور میرے پاس اسلام آباد میں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا' میں مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا گیلانی صاحب کے پاس پہنچ گیا' گیلانی صاحب واپڈا میں ملازم تھے اور سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی کے ایک چھوٹے سے مکان میں مجرد زندگی گزار رہے تھے' میں دو ماہ تک ان کے پاس

مہمان رہا۔

میں اس دن کی طرف واپس آتا ہوں' گیلانی صاحب سیدھے دامن کوہ پہنچے' انہوں نے گاڑی سے ایک چٹخنی' پیچ' ایک پیچ کس اور ہتھوڑی نکالی اور مجھے لے کر دامن کوہ کے ریستوران میں داخل ہو گئے' وہ سیدھے ٹوائلٹ میں پہنچے' میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا' ٹوائلٹ کے دروازے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی' انہوں نے پرانی چٹخنی اتاری اور اس کی جگہ نئی لگا دی' مسکرائے اور مجھے حکم دیا' چلو' میں چل پڑا' انہوں نے راستے میں ایک جگہ گاڑی روکی' ڈگی سے پرات نکالی' پرات میں کلو بھر سیمنٹ ڈالا' سیمنٹ میں پانی ملایا' سٹین لیس سٹیل کے بڑے چمچوں سے سیمنٹ مکس کیا اور پہاڑ کی طرف چل پڑے' پہاڑ کی دیوار کا ایک پتھر کمزور تھا' انہوں نے پتھر نکالا' اس کے ساتھ سیمنٹ لگایا اور وہ پتھر دوبارہ اس جگہ جڑ دیا' انہوں نے فارغ ہونے کے بعد باقی سیمنٹ دوسرے پتھروں پر لگا دیا' انہوں نے ذرا سے فاصلے سے پہاڑ کو غور سے دیکھا اور اطمینان سے سر ہلا دیا' ہم آگے چل پڑے' وہ چڑیا گھر کے قریب رکے' انہوں نے ڈگی سے بیجوں کا ڈبہ' کھرپہ اور پانی کا کین نکالا اور سڑک کے کنارے بیٹھ گئے' وہاں پہاڑ اور پتھروں کی دیوار کے درمیان ایک قدرتی کیاری بنی تھی' انہوں نے کھرپے سے کیاری کی مٹی نرم کی' وہاں بیج چھڑکے اور ان پر پانی کی پھوار ڈال کر واپس آ گئے' ہم آگے چل پڑے' وہ جی تھری کی ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوئے' یہ مکانوں کی پچھلی گلی تھی اور اس میں مکینوں نے جگہ جگہ کچرے کی ٹوکریاں الٹی ہوئی تھیں' پوری گلی میں جھاڑ جھنکار اور کائی جمی تھی' گیلانی صاحب کے ہاتھ میں مین ہول کا ایک ڈھکن تھا' وہ گلی کے درمیان پہنچے' وہاں ایک مین ہول کا ڈھکن غائب تھا' گیلانی صاحب نے مین ہول پر ڈھکن لگا دیا' وہ کورڈ مارکیٹ کے قریب رکے' انہوں نے گاڑی سے بجلی کا ایک سوئچ نکالا اور بلال مسجد کے استنجا خانوں میں داخل ہو گئے' استنجا خانے کا ایک سوئچ ٹوٹا ہوا تھا' گیلانی صاحب نے وہ سوئچ تبدیل کر دیا' وہ بازار روڈ کے سکول میں داخل ہوئے' ان کے ہاتھ میں لوہے کا ایک دستہ تھا' سکول کے برآمدے میں گھنٹی لگی تھی' گھنٹی کے ساتھ دستہ پڑا تھا' انہوں نے پرانا دستہ اٹھایا اور اس کی جگہ نیا رکھ دیا' ہم دونوں آگے چل پڑے' راستے میں انہوں نے درخت کی ایک بڑی سی شاخ توڑی اور ایک گلی میں داخل ہو گئے' گلی کے عین درمیان میں ایک بڑا سا گڑھا تھا' جس کی وجہ سے گاڑیوں کو خاصی زحمت اٹھانا پڑ رہی تھی' گیلانی صاحب نے یہ شاخ گڑھے میں رکھ دی' ہم آگے بڑھتے گئے' وہ شام تک مختلف جگہوں پر اس قسم کی کارروائیاں کرتے رہے' میں خاموشی سے

ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا' مغرب کی اذان کے وقت انہوں نے کمر پر ہاتھ رکھا' آسمان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

میں گاڑی میں بیٹھ کر بار بار پہلو بدل رہا تھا' گیلانی صاحب میری بے چینی سے لطف لے رہے تھے' ہم چاندنی چوک سے سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف مڑنے لگے تو وہ بولے "میں خضریہ فرقے کا پیروکار ہوں اور یہ سب میری ڈیوٹی' میری عبادت کا حصہ ہے" میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولے اس فرقے کے بانی حضرت خضرؑ ہیں' ہم لوگ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے قائل ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں نیکی بیج کی طرح ہوتی ہے' آپ آدھے تولے کا بیج بوتے ہیں' اسے پانی دیتے ہیں' اس بیج میں سے ایک کونپل نکلتی ہے اور یہ کونپل آگے چل کر سینکڑوں ٹن کے درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے' دنیا کا کوئی انسان زمین میں پچیس تیس فٹ کا درخت نہیں لگا سکتا لیکن دنیا کا ہر انسان با آسانی سینکڑوں ہزاروں درختوں کے بیج بو سکتا ہے اور ہم لوگ نیکیوں کے بیج بوتے ہیں' ہم لوگ خاموش رہتے ہیں' ہم اپنے فرقے کا اعلان نہیں کرتے' ہم اس کی نشر و اشاعت نہیں کرتے' ہم بس چپ چاپ بیج بوتے ہیں اور اپنے حصے کا کام ختم کر کے رخصت ہو جاتے ہیں' ہم لوگ ہر مذہب' ہر فرقے اور ہر قوم میں موجود ہیں' ہم لوگ یہودیوں میں بھی ہیں' عیسائیوں میں بھی' مسلمانوں میں بھی' بودھوں میں بھی اور شاید ہندوؤں میں بھی ہیں' ہم روس میں بھی ہیں' امریکہ میں بھی' یورپ میں بھی اور پاکستان میں بھی' ہمارا ایک پورا ریکٹ ہے' ہم پوری زندگی خود کو کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے' ہم لوگ مجرد زندگی گزارتے ہیں اور زندگی میں چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے تین ہزار ایک سو چھ بیج بو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔" وہ رکے اور دوبارہ بولے "تم مجھ سے آج کے دن کی کارگزاری پوچھنا چاہتے ہو' میں تمہیں بتاتا ہوں' دامن کوہ کے اس ٹوائلٹ کی چٹخنی کئی دنوں سے خراب تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو پریشانی ہوتی تھی' میں نے یہ چٹخنی لگا کر سینکڑوں لوگوں کی پریشانی دور کر دی۔ پہاڑ کا وہ پتھر گر جاتا تو اگلی بارشوں میں وہاں لینڈ سلائیڈنگ ہو جاتی' میں نے لینڈ سلائیڈنگ کا راستہ روک دیا' میں نے سڑک کے اس موڑ پر پھولوں کے بیج لگا دیئے ہیں دو ماہ بعد جو شخص اس جگہ سے گزرے گا وہ پھول دیکھ کر خوش ہو گا' اس گلی کے مین ہول کا ڈھکن غائب تھا۔ وہاں سے پھر اچھلنے والے بچے گزرتے تھے اور ان کی جان کو خطرہ رہتا تھا' بلال مسجد کے ٹوٹے ہوئے سوئچ سے نمازیوں کو کرنٹ لگتا تھا اور سڑک کے گڑھے میں شاخ رکھنے سے ڈرائیوروں کو خطرے کی نشاندہی ہو جاتی تھی' میں جیسے کو ایسے کاموں کیلئے

نکلتا ہوں" وہ رکے اور مسکرا کر بولے "اب تم پوچھو گے میں نے یہ ساری باتیں تمہیں کیوں بتائیں" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، وہ مسکرائے "ہم میں سے ہر شخص رخصت ہونے سے پہلے یہ راز اپنے کسی قریبی شخص کو بتاتا ہے، یہ پانچ ہزار سال سے ہماری روایت ہے، میں رخصت ہو رہا ہوں لہٰذا اپنی امانت تمہیں سونپ رہا ہوں" ہمارا گھر آ گیا، گیلانی صاحب اترے، انہوں نے تالہ کھولا اور گھر میں داخل ہو گئے، میں پسینے میں شرابور تھا، انہوں نے لائٹ جلائی اور بولے "لیکن تم یہ نہ سمجھنا ہم تمہیں اپنے فرقے میں داخل کر رہے ہیں، ہم لوگ دنیا دار لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کرتے۔ میں بس تمہیں راز دار بنا رہا ہوں، تم کل اپنا بوریا بستر اٹھانا اور یہ گھر چھوڑ دینا، ہمارا ساتھ بس یہیں تک تھا" وہ تولیہ لے کر غسل خانے میں چلے گئے، میں نے دوسرے دن گیلانی صاحب کا گھر چھوڑ دیا اس کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملے لیکن میں جب بھی کوئی مین ہول دیکھتا ہوں، کوئی ٹوٹی ہوئی چھتنی دیکھتا ہوں یا مجھے کسی سڑک کے گڑھے میں درخت کی کوئی شاخ نظر آتی ہے تو مجھے بے اختیار گیلانی صاحب یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا یہ لوگ واقعی ہمارے اردگرد موجود ہیں، کیا حضرت خضرؑ کی جماعت حقیقتاً ہمارے اردگرد چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے بیج بو رہی ہے یہاں پہنچ کر میں ہمیشہ گومگو کی صورتحال کا شکار ہو جاتا ہوں۔



O......O......O

# بڑی سرکار

''درمیان میں پانچ دن آ گئے یہ پانچ دن کہاں سے آئے تھے اور ان کے آنے کی وجہ کیا تھی مجھے آخر تک سمجھ نہیں آئی'' وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور مسکرا کر دوبارہ گویا ہوئے ''میں ملک سے باہر تھا' میری خواہش تھی میں ریٹائرمنٹ کے بعد باقی زندگی فرانس کے کسی گاؤں میں گزار دوں' میں نے سوئس فرانس سرحد پر چھوٹا سا مکان بھی خرید لیا تھا لیکن پھر وزیراعظم صاحب فرانس آ گئے' وہ میرے گھر تشریف لائے اور مجھے پاکستان آنے کی ترغیب دینے لگے' میں نے عرض کیا میں ملک کے حالات سے دلبرداشتہ ہو چکا ہوں لہٰذا میں نے اپنی خواہش سے اپنے لئے یہ گوشہ منتخب کیا ہے' میں اس خرابے میں واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہوں' وزیراعظم صاحب میرے پرانے دوست تھے' انہوں نے اصرار شروع کر دیا' میں ان کے اصرار کے سامنے بے بس ہو گیا' وزیراعظم صاحب میرے گھر سے اٹھنے لگے تو میں نے ان سے اپنی مرضی کا محکمہ مانگ لیا' میرا کہنا تھا میں اس محکمے میں زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہوں' وزیراعظم نے فوراً ہاں کر دی' ہم نے تاریخ طے کی اور وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

میں نے چند ماہ میں اپنی نوکری سے استعفیٰ دیا' سامان پیک کیا اور پاکستان آ گیا' میں نے وزیراعظم صاحب سے ملاقات کی' وزیراعظم نے میری پوسٹنگ کا حکم دے دیا' دو دن بعد مجھے تقرر نامہ مل گیا' میں نے تقرر نامہ کھولا تو میں حیران رہ گیا' میری تقرری ایک غیر متعلقہ محکمے کے

دورہ ۔ از سٹیشن پر کر دی گئی تھی' مجھے ایک ایسے محکمے کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا گیا تھا جس کی میں الف ب تک سے واقف نہیں تھا' میں نے فوراً پرنسپل سیکرٹری سے رابطہ کیا' وہ پریشان ہو گئے' انہوں نے تحقیق کی تو پتہ چلا اس دن وزیراعظم نے دو افسروں کے تقرر کا حکم دیا تھا اور غلطی سے دوسرے افسر کا خط میرے نام سے جاری ہو گیا' خط جاری کرنے والا جوائنٹ سیکرٹری انتہائی پریشان تھا' اس نے مجھ سے درخواست کی آپ مہربانی فرما کر وزیراعظم صاحب کو اس غلطی کی اطلاع نہ دیں' ہم سب کی نوکری اور کیریئر برباد ہو جائے گا' میں نے اس کا حل پوچھا' اس نے ایک عجیب حل تجویز کیا' اس نے کہا'' سر آپ اس محکمے کو جوائن کر لیں' ہم پانچ دن میں آپ کو دوسرے محکمے میں ٹرانسفر کر دیں گے' میں نے احتجاج کیا لیکن وہ گریہ زاری اور منتوں پر اتر آیا چنانچہ میں اسے پریشان دیکھ کر نرم پڑ گیا' میں نے سوچا صرف پانچ دن کی تو بات ہے' میں یہ پانچ دن جیسے تیسے گزار لوں' میں نے ہاں کر دی' دوسرے دن میں نے جوائننگ دے دی'' وہ رکے سانس لیا اور مسکرا کر بولے'' میں نے پانچ دن پورے کئے' چھٹے اور ساتویں دن چھٹی تھی' آٹھویں دن مجھے نیا تقرر نامہ مل گیا' میں نے پانچ دن والے محکمے کو خیر باد کہا اور نئے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا' میں اسلام آباد پہنچ گیا' یہ 12 اکتوبر کا دن تھا' میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا کہ شام کو اطلاع آئی' فوج نے ایک بار پھر اقتدار سنبھال لیا ہے' میں حیران رہ گیا' دوسرا اور تیسرا دن اسی حیرانی میں گزر گیا' چوتھے دن میں اپنے نئے دفتر گیا تو پتہ چلا وزیراعظم کے تمام پرانے احکامات منسوخ ہو چکے ہیں لہٰذا میں اب محکمے کا چارج نہیں لے سکتا' میرے مقدر کا فیصلہ اب نئی انتظامیہ کرے گی' میں نے کندھے اچکائے' کراچی واپس آیا' اپنا سامان بک کرایا اور فرانس آ گیا' میرا دو ہفتے کا ایڈونچر ختم ہو گیا'' وہ خاموش ہو گئے۔

میں ان کی انتہائی بور اور غیر ضروری حد تک طویل داستان سن کر تھک چکا تھا' میرے چہرے پر بیزاری کے آثار نمایاں تھے اور سوچ رہا تھا اس کہانی میں مقدر کا عنصر کہاں پوشیدہ ہے' ایسی ہزاروں کہانیاں ہمارے دائیں بائیں بکھری پڑی ہیں' وہ میری کیفیت بھانپ گئے' انہوں نے کافی کے مگ پر ہاتھ پھیرا اور ذرا سی شوخ آواز میں بولے'' اب سوال پیدا ہوتا ہے قدرت نے مجھے پاکستان کیوں بھجوایا تھا'' میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا' وہ ہنسے'' قدرت نے مجھے صرف ایک ڈرائیور کے لئے پاکستان بھجوایا تھا'' میں نے چونک کر سر اٹھایا' وہ شوخ آواز میں بولے'' میں نے جب اس غیر متعلقہ اور ناپسندیدہ محکمے کا چارج لیا تھا تو اس سہ پہر محکمے کا ایک بوڑھا اور بیمار ڈرائیور میرے پاس آیا' اس نے مجھ سے پوچھا' صاحب آپ دوسرے ملک سے آئے ہیں' میں

نے اسے گھور کر جواب دیا" ہاں فرانس سے" ڈرائیور نے کانپتے ہوئے عرض کیا" جناب آپ کو یہاں صرف میرے لئے بھجوایا گیا ہے" میں نے اس سے وجہ پوچھی' وہ بولا" جناب پانچ دن بعد میری بیٹی کی شادی ہے اور میرے گھر میں پانی کے ایک گھڑے کے سوا کچھ نہیں' میں نے پچھلے صاحب کو امداد کی درخواست دی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا' میں نے بڑی سرکار سے اس کی شکایت کر دی لہٰذا وہ یہاں سے ٹرانسفر ہو گیا جس کے بعد میں نے بڑی سرکار سے درخواست کی' آپ کسی باہر کے بندے کو میری مدد کے لئے بھجوائیں' اس ملک کے افسروں کے دل بہت تنگ ہیں' بڑی سرکار نے مجھ سے وعدہ کیا' وہ سکینہ کی بارات سے پہلے کسی نرم دل افسر کو یہاں بھجوا دیں گے" میں نے اس سے پوچھا" تمہاری بڑی سرکار کون ہے" اس نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا اور گلوگیر آواز میں بولا" وہ ہم سب کی بڑی سرکار ہیں" وہ مجھے ایک دلچسپ کردار لگا لہٰذا میں نے اس سے کہا" تم ثابت کرو مجھے یہاں صرف تمہارے لیے بھجوایا گیا ہے" وہ مسکرایا اور عاجزانہ آواز میں بولا" آپ مجھے صرف ایک سوال کا جواب دے دیں میں ثابت کر دوں گا" میں نے کہا" پوچھیں" وہ بولا" کیا آپ یہاں اپنی مرضی سے آئے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلا دیا' وہ بولا" جناب آپ کا انکار میرے دعوے کا ثبوت ہے" میں نے تھوڑی دیر سوچا تو وہ ڈرائیور مجھے ذرا ذرا سا ٹھیک لگا، میں نے اپنے پی اے کو بلایا اور اسی وقت اس ڈرائیور کو محکمے کے فنڈ سے تین لاکھ روپے دینے کا حکم دے دیا، میں نے بینک فون کر کے منیجر سے فوری ادائیگی کی درخواست بھی کی، اس کے بعد میں نے سٹاف کو حکم دیا بارات کے استقبال کیلئے لان میں خوبصورت شامیانہ لگا یا جائے اور بارات کو کھانا محکمے کی طرف سے دیا جائے، میں نے انہیں حکم دیا ہم سب بارات کا استقبال کریں گے اور پورا محکمہ مل کر ڈرائیور کی بیٹی کو رخصت کرے گا۔ میرے احکامات پر عملدرآمد شروع ہو گیا، ڈرائیور کو جہیز کے لیے رقم مل گئی، ہم لوگوں نے دفتر کے لان میں شامیانے لگوائے، لان میں چراغاں کیا۔ بارات کیلئے کھانا پکوایا، سب نے مل کر بارات کا استقبال کیا، پورے محکمے نے دولہے دلہن کو سلامیاں دیں اور دعاؤں اور پیار کے ساتھ بچی کو رخصت کر دیا۔ اگلی صبح وہاں میرا آخری دن تھا، میں دفتر آیا تو پتہ چلا فجر کی نماز کے دوران ڈرائیور کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ سجدے کے عالم میں فوت ہو گیا۔ میں نے اس کا جنازہ پڑھا اور کراچی واپس آ گیا۔ کراچی سے میں اسلام آباد گیا اور اسلام آباد سے پانچ دن بعد میری واپسی کا عمل شروع ہو گیا یوں میری ڈیوٹی ختم ہو گئی، وہ خاموش ہو گئے۔

میں انہیں حیرت سے دیکھنے لگا، وہ بولے "مجھے صرف اس ڈرائیور کے لیے پاکستان بھجوایا گیا تھا، میری جاب صرف پانچ دن تک محدود تھی لہٰذا جوں ہی میرا کام ختم ہوا" میں واپس فرانس آ گیا" وہ رکے اور دوبارہ بولے "ہم سب بڑی سرکار کے مہرے ہیں، ہمیں بڑی سرکار کبھی کسی ڈرائیور، کبھی کسی مالی، کبھی کسی چوکیدار، کبھی کسی چپڑاسی اور کبھی کسی خانسامے کیلئے دائیں بائیں اور آگے پیچھے کرتی رہتی ہے اور ہم نا جانتے ہوئے نا چاہتے ہوئے اپنے حصے کی خدمت سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ جب ہمارا کام ختم ہو جاتا ہے تو ہمیں بڑی سرکار ریٹائر کر دیتی ہے اور ہم واپس اپنے گھر لوٹ جاتے ہیں" وہ خاموش ہو گئے، میں نے ان سے آہستہ سے پوچھا "وہ ڈرائیور کہاں کا رہنے والا تھا" وہ مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر بولے "وہ سکھر کا رہنے والا تھا" میں نے ان سے عرض کیا "وہ ایک صاحب دسترس شخص تھا، ہمیں اس کی قبر پر حاضری دینی چاہیئے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا "جس شخص کو بڑی سرکار عرضی ڈالنے کی اجازت دے دے، جس کی مدد کے لیے اللہ آپ جیسے لوگوں کو فرانس سے بھجوا دے وہ شخص کوئی عام انسان نہیں ہو سکتا، وہ یقیناً بڑی سرکار کے نظام کا کوئی بڑا پرزہ تھا"۔ انہوں نے ذرا دیر سوچا اور ہاں میں سر ہلا دیا، وہ گزشتہ روز دوبارہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے ڈرائیور کی قبر کے بارے میں پوچھا، وہ بڑی دیر تک افسردہ انداز سے میری طرف دیکھتے رہے اور آہستہ آواز میں بولے "وہ قبر قبروں کے ہجوم میں گم ہو چکی ہے، میں قبرستان میں مسلسل دو دن قبر تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے نہیں ملی" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پورے یقین سے عرض کیا "وقت نے ثابت کر دیا وہ واقعی کوئی بڑا شخص تھا"۔

# مصلحت

ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا' انہوں نے آنسو روکنے کیلئے تیز تیز پلکیں ہلائیں اور پھر بولے' مجھے قدرت [illegible] ان کی جان بھی [illegible] آرام سے لے لیتی' وہ ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح چند لمحوں میں فوت ہو جاتیں' اللہ تعالیٰ کو انہیں یوں چار برس تک ہسپتالوں میں دھکے کھلانے کی کیا ضرورت تھی' مجھے ان کی تکلیف نہیں بھولتی' میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے دماغ میں ان کی چیخیں گونجنے لگتی ہیں' میں تڑپ کر اٹھ جاتا ہوں اور اس کے بعد مجھے ساری رات نیند نہیں آتی'' انہوں نے رومال سے آنکھیں صاف کیں' ٹھنڈا سانس بھرا اور خاموش ہو گئے۔

وہ پاکستان کے سب سے بڑے صنعت کار ہیں' ان کی فیکٹریوں میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں' ان کے کتنے بینک اکاؤنٹس ہیں اور ان اکاؤنٹس میں روزانہ کتنی رقم جمع ہوتی ہے' وہ نہیں جانتے' وہ پچھلے 20 برس سے پاکستان کی 20 امیر ترین شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس حقیقتاً دنیا کی ہر نعمت ہے' انہوں نے زندگی میں خوشی' کامیابی اور آسائش کو بڑے قریب سے دیکھا۔ وہ ایک ایسے شخص ہیں جن پر لوگ رشک کرتے ہیں' لوگ ان جیسا کامیاب شخص بننا چاہتے ہیں لیکن پھر ان کی زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا' ان کی بیگم کو کینسر ہو گیا' ان کے پاس بے تحاشا دولت تھی لہٰذا ان کا خیال تھا ان کی دولت کے سامنے یہ مرض بہت چھوٹا ہے' وہ دنیا کے

بہترین ہسپتالوں اور ماہر ترین ڈاکٹروں سے بیگم کا علاج کرائیں گے اور بیگم صحت مند ہو کر گھر آ جائیں گی۔ انہوں نے دنیا کے ایک سرے سے علاج شروع کیا اور دوسرے کونے تک چلے گئے' وہ بیگم کو لے کر دنیا کے تمام بڑے ڈاکٹروں کے پاس گئے' انہوں نے بیگم کے سرہانے قیمتی ترین ادویات کا ڈھیر لگا دیا' انہوں نے کوئی پیر فقیر' کوئی حکیم' کوئی بابا نہ چھوڑا لیکن بیگم کی تکلیف میں اضافہ ہوتا چلا گیا' وہ چار سال تک ہسپتالوں میں دھکے کھاتے رہے مگر بیگم کے درد میں کمی نہ آئی۔ یہاں تک کہ بیگم صاحبہ کو مارفین کے ٹیکے لگنے شروع ہو گئے۔ پچھلے سال بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا' میں تعزیت کیلئے ان کے پاس حاضر ہوا' وہ بڑی دیر تک بیگم صاحبہ کا ذکر کرتے رہے' وہ کہتے تھے ''مجھے ان کے انتقال کا دکھ نہیں' دنیا کے ہر شخص نے فوت ہو جانا ہے' مجھے صرف ان کی تکلیف کا دکھ ہے' ان کا آخری وقت بہت کرب' بہت تکلیف میں گزرا تھا' میں جب بھی ان دنوں کو یاد کرتا ہوں تو میں اندر سے زخمی ہو جاتا ہوں' میں اپنے دوستوں سے ذکر کرتا ہوں تو سب اسے اللہ کی رضا' اسے قدرت کی مصلحت کہتے ہیں لیکن میرا دل نہیں مانتا' میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں ایک شخص کو چار سال تک مسلسل تکلیف دینے میں اللہ کی [illegible] میں اللہ کی [illegible] ہو سکتی ہے' میں اپنی بیگم کو جانتا ہوں' وہ بے انتہا پرہیز گار' متقی' مخلص اور سخی خاتون تھیں' وہ ہر سال کروڑوں روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کرتی تھیں' انہوں نے سینکڑوں غریب بچوں کو تعلیم دلائی اور ہزاروں بچیوں کی شادیاں کرائیں اور وہ چیرٹی ہسپتال چلاتی تھیں' ایسی خاتون کو اتنی اذیت دینا یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

میں ان کا سوال سمجھ گیا' میں نے ان سے عرض کیا ''سر شاید آپ کو معلوم نہیں دنیا کے تمام طاقتور' صاحب اقتدار' صنعت کار اور سرمایہ کار لوگ اور ان کے اہل خانہ کسی نئی' حیران کن اور شدید بیماری کا شکار ہوتے ہیں' یہ لوگ عموماً کسی ایسے مرض کے ہاتھوں فوت ہوتے ہیں جو میڈیکل سائنس کے لئے نیا ہوتا ہے یا پھر اس مرض کی یہ نوعیت انوکھی ہوتی ہے' آپ کیونکہ پاکستان کے امراء میں شمار ہوتے ہیں لہٰذا آپ کی بیگم صاحبہ بھی قدرت کے اس قانون کا شکار ہو گئیں'' مجھے ان کے چہرے پر حیرت کے آثار دکھائی دیئے' مجھے محسوس ہوا وہ میری بات پر یقین کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں' میں نے عرض کیا ''سر آپ دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں' آپ کو وہ لوگ اپنی محبوب ہستیوں کو ہسپتالوں میں اٹھائے اٹھائے پھرتے نظر آئیں گے'' انہوں نے پہلو بدلا اور ٹھنڈے لہجے میں بولے ''لیکن کیوں' میں قدرت کی یہ مصلحت جاننا چاہتا

ہوا' میں نے مسکرا کر عرض کیا'' سر اس میں قدرت کی تین مصلحتیں ہوتی ہیں اول بڑے لوگوں کی تکلیف بنیادی طور پر صدقہ جاریہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی حیران کن بیماری کا شکار ہوتے ہیں تو دنیا بھر کے سائنس دان' ڈاکٹر اس بیماری پر ریسرچ شروع کر دیتے ہیں۔ ماہرین اس بیماری کا علاج تلاش کرتے ہیں' اس کی دوا بناتے ہیں اور یہ دوا' یہ علاج اور یہ تحقیق آگے چل کر عام انسان کو فائدہ پہنچاتی ہے' آپ ڈسپرین سے انسولین تک دنیا کی تمام ادویات کی ہسٹری دیکھ لیں ان تمام ادویات کا محرک آپ جیسے بڑے لوگ تھے' یہ ادویات بنیادی طور پر امراء کے لئے ایجاد ہوئی تھیں لیکن پھر ان کا فیض عام انسان کو پہنچا' دوم بڑے لوگوں کی تکلیفوں سے دنیا میں بے شمار نئے ہسپتال بنے تھے۔ آپ دنیا کے تمام بڑے ہسپتالوں کی تاریخ نکال کر دیکھ لیں' یہ تمام ہسپتال آپ جیسے لوگوں نے اپنے اپنے پیاروں کی یاد میں بنوائے تھے۔ اگر آپ جیسے لوگوں کے پیارے کسی مہلک بیماری کا شکار نہ ہوتے' آپ لوگ انہیں اٹھا کر طبیبوں اور ہسپتالوں میں نہ پھرتے تو یہ ہسپتال' یہ لیبارٹریاں اور یہ کینسر سنٹر نہ بنتے اور آج ان اداروں سے عام لوگ فائدہ نہ اٹھا رہے ہوتے۔'' وہ خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے' میں نے عرض کیا'' مثلاً اگر آپ عمران خان کو دیکھئے اگر عمران خان کی والدہ کو کینسر نہ ہوتا تو شاید عمران خان کو اس مرض کا پتہ نہ چلتا' انہیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ پاکستان میں کوئی کینسر ہسپتال نہیں' یہ عمران خان کی والدہ کی بیماری کا صدقہ جاریہ ہے کہ آج پاکستان میں نہ صرف شوکت خانم میموریل ہسپتال ہے بلکہ اس میں ہر مہینے سینکڑوں ہزاروں غریبوں کا علاج ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کو دیکھئے' ایپل کمپنی کا مالک اینڈریو گرو'' پراسٹیٹ کینسر'' کا مریض ہے' اس نے اس مرض کے علاج کے لئے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ وقف کر رکھا ہے' اس وقت دنیا کی 11 بڑی لیبارٹریاں اینڈریو گرو کیلئے علاج دریافت کر رہی ہیں' ذرا سوچئے جب یہ علاج دریافت ہوگا تو کتنے عام لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے' اسی طرح دنیا کا امیر ترین شخص بل گیٹس بھی ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہے' وہ دودھ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' بل گیٹس ہر وقت دودھ پیتا رہتا ہے' اس کی میز' اس کی گاڑی' اس کے بریف کیس حتیٰ کہ اس کی جیب تک میں دودھ کا پیکٹ ہوتا ہے۔ سائنس دان اس عجیب و غریب بیماری کے بارے میں تحقیق کر رہے ہیں' اس تحقیق کے تمام تر اخراجات بل گیٹس برداشت کر رہا ہے' اسی طرح بل گیٹس کا ایک قریبی دوست ایڈز کا شکار ہو گیا' بل گیٹس نے اس کا علاج کرایا لیکن وہ فوت ہو گیا' اس وقت بل گیٹس کو اس مرض کی شدت کا اندازہ ہوا لہٰذا دنیا میں اس وقت ایڈز

کے بارے میں جتنی ریسرچ ہو رہی ہے اس کے تمام اخراجات بل گیٹس ادا کر رہا ہے' دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص شہزادہ ولید بن طلال تنگی کے مرض کا شکار ہے' اس کی آنکھوں کی پتلیاں حرکت نہیں کرتیں' وہ صرف سیدھا دیکھ سکتا ہے' اس وقت اس مرض پر تحقیق ہو رہی ہے اور اس تحقیق کے اخراجات بھی شہزادہ طلال برداشت کر رہا ہے' آپ ذرا سوچئے جب اس مرض کا علاج دریافت ہو گا تو اس سے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کتنے لوگوں کی زندگیاں تبدیل ہو جائیں گی۔"

وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا "سر بیگم صاحبہ کی اس بیماری میں اللہ کی ایک تیسری مصلحت بھی پوشیدہ تھی' آپ نے اس مصلحت پر غور نہیں کیا ہو گا' آپ ذرا یاد کیجئے جب آپ بیگم صاحبہ کو لے کر کسی ڈاکٹر' کسی ہسپتال میں جاتے تھے تو وہاں آپ اور بیگم صاحبہ کو کتنے ضرورت مند لوگ ملتے تھے' یہ وہ لوگ تھے جن کے پیارے ہسپتالوں میں داخل تھے لیکن ان کے پاس دواؤں اور خون کے لئے پیسے نہیں تھے' ان دنوں آپ کا دل نرم تھا چنانچہ مجھے یقین ہے آپ نے بے شمار ضرورت مندوں کی مدد کی ہو گی" میں خاموش ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے فرمایا "ہاں میں جانتا ہوں" میں نے عرض کیا "سر اگر بیگم صاحبہ اپنے بیڈ روم میں فوت ہو جاتیں تو آپ ان ہسپتالوں کا چکر نہ لگاتے' آپ ان ضرورت مندوں سے نہ ملتے' آپ ان کی امداد نہ کرتے اور یوں ان لوگوں کے عزیزوں کو صحت نہ ملتی لہٰذا سر قدرت بیگم صاحبہ کی تکلیف کے ذریعے آپ کو ان لوگوں تک پہنچانا چاہتی تھی' آپ ان لوگوں تک پہنچے' آپ نے چند کروڑ روپے خرچ کئے اور آپ کے یہ چند کروڑ روپے بے شمار لوگوں کو زندگی دے گئے اور یوں بیگم صاحبہ کی تکلیف سے بے شمار لوگوں کو شفا ملی' آپ ان لوگوں کو یاد کیجئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے" میں خاموش ہو گیا۔

انہوں نے سر اٹھایا اور مسکرا کر بولے "واقعی میں نے ان پہلوؤں پر کبھی غور نہیں کیا تھا' جب آپ گفتگو کر رہے تھے تو میں سوچ رہا تھا مجھے دو کام کرنے چاہئیں' مجھے بیگم صاحبہ کے نام سے کینسر کا ایک ایسا ہسپتال بنانا چاہیے جس میں غریبوں کا مفت علاج ہو اور مجھے ایک ایسا میڈیکل کالج بھی بنانا چاہیے جس میں ڈاکٹروں کو کینسر کی سپیشلائزیشن کرائی جائے' یہ سپیشلائزیشن بھی فری ہو بس ڈاکٹروں سے یہ وعدہ لیا جائے وہ زندگی بھر غریبوں کا مفت علاج کریں گے" ان کے الفاظ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی' میں نے ان سے عرض کیا "سر یہ تھی اللہ تعالیٰ کی وہ مصلحت جس تک لے جانے کیلئے قدرت کو آپ پر چار سال محنت کرنا پڑی۔"

# خوشحالی کا دیوتا

72 سالہ رضیہ تین راتوں سے دروازے پر بیٹھی تھی' اس کے ہاتھ میں موتیے اور گلاب کے ہار تھے' وہ دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھی لیکن جوڑوں میں درد کی وجہ سے اٹھتے ہوئے دیر ہو جاتی تھی اور وہ لوگوں سے لپٹتے اور ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہو جاتے تھے' رضیہ دوبارہ بیٹھ جاتی تھی' تیسرے دن چوکیدار کو رحم آ گیا اور اس نے رضیہ کو دہلیز پر کھڑا کر دیا' رضیہ دروازے کے فریم کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی' اندر حرکت ہوئی' دروازہ کھلا اور وہ مسکراتا ہوا چہرہ باہر آ گیا' رضیہ آگے بڑھی' وہ رضیہ کے سامنے جھکا اور رضیہ نے اس کے گلے میں موتیے کے مرجھائے ہوئے ہار ڈال دیئے' ٹھیک اس لمحے رضیہ کی آنکھوں سے دو آنسو نکلے' آنسو اس کی جھریوں سے الجھتے' ٹکراتے ہوئے ٹھوڑی پر پہنچے اور ٹھٹک کر رک گئے' آنسوؤں میں صبح کا سورج لرز رہا تھا' جب ٹھوڑی ہلتی تھی تو آنسوؤں کے سورج بھی آہستہ آہستہ ڈولتے تھے' اس نے بوڑھی ٹھوڑی پر نظریں جما دیں' آنسو ٹوٹنے کیلئے نیچے جھکے' لکیر بنے اور انہوں نے ٹھوڑی کا ساتھ چھوڑ دیا' غریبوں کے دیوتا نے فوراً اپنی ہتھیلی آگے کر دی' پانی کے دو شفاف قطرے عین اس جگہ آ گرے جہاں سے اس کے مقدر کی لکیر شروع ہوتی تھی' اس نے ہتھیلی تہہ کی' مٹھی بنائی' مسکرایا اور دہلیز سے نیچے اتر گیا' اسے 30 سال کی محنت کا معاوضہ مل گیا۔

ڈاکٹر یونس 1974 تک چٹاگانگ کے ایک مڈل کلاس سونار کا بیٹا تھا اور اس کی واحد

پہچان اس کی پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی' وہ امریکہ میں پڑھتا تھا' اسے وہاں اطلاع ملی اس کا ملک مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بن گیا ہے' وہ فوراً چٹا گانگ واپس آیا اور اس نے یونیورسٹی میں نوکری کر لی' وہ طالب علموں کو اکنامکس پڑھاتا تھا' چٹا گانگ یونیورسٹی کے اردگرد دیہات تھے' ان دیہات میں ان دنوں صرف تین چیزیں تھیں قحط' غربت اور قرض' وہ روز شام کی سیر پر نکلتا تھا' دیہات میں جاتا تھا اور معیشت کو اصل حالت میں دیکھتا تھا' اس کو محسوس ہوتا تھا کتابوں میں لکھی غربت اور گلیوں میں تحریر مفلسی میں زمین آسمان کا فرق ہے' ایک دن اس نے پروفیسر سے کارکن بننے کا فیصلہ کیا' وہ یونیورسٹی سے نکلا اور ''جوبرا'' گاؤں چلا گیا' گاؤں میں ایک 42 سالہ بیوہ تھی' وہ کھڈی پر رومال بناتی تھی' شام کو شہر سے ایک بیوپاری آتا تھا' یہ رومال لیتا تھا اور اس کی جھولی میں دو مٹھی چاول ڈال دیتا تھا' رضیہ کا خاندان ان چاولوں پر چوبیس گھنٹے گزار دیتا تھا' ڈاکٹر یونس اس کے پاس بیٹھ گیا' پتہ چلا گاؤں کے تمام لوگ سارا دن موڑھے بناتے' رومال کاتتے اور کپڑے سیتے ہیں اور شام کو بیوپاری ان کی جھولی میں دو دو مٹھی چاول ڈال کر سارا سامان شہر لے جاتے ہیں' اس گلی میں 42 گھر تھے' وہ دروازے دروازے گیا' اس نے سب کی کہانیاں سنیں تو اسے معلوم ہوا اگر کوئی شخص ان لوگوں کو صرف 27 ڈالر دے دے تو نہ صرف یہ 42 گھرانے قرض سے آزاد ہو سکتے ہیں بلکہ یہ لوگ اپنے پاؤں پر بھی کھڑے ہو سکتے ہیں' ڈاکٹر نے اپنے اثاثے کا اندازہ لگایا' اس کے پاس 30 ڈالر تھے' اس نے تین ڈالر اپنے پاس رکھے اور باقی 27 ڈالر ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے' یہ 27 ڈالر آگے چل کر گرامین بینک بن گئے' ڈاکٹر یونس نے اپنے طالب علموں کو ساتھ ملایا اور ان لوگوں نے معیشت کے ایک نئے فارمولے کی بنیاد رکھ دی' اس فارمولے کی بنیاد اعتماد تھا' ڈاکٹر یونس کا خیال تھا عورت خاندان میں سب سے زیادہ ذمہ دار فرد ہوتی ہے' ایک گھریلو عورت دنیا کے ہزار معیشت دانوں سے زیادہ سمجھدار' ذمہ دار اور ایماندار ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے آج تک دنیا کے کسی فنانشل انسٹی ٹیوٹ نے عورت کے اس ٹیلنٹ کو نہیں آزمایا' ڈاکٹر یونس کا کہنا تھا قرض کے معاملے میں مرد غیر ذمہ دار ہوتے ہیں اس لئے دنیا میں 98 فیصد مرد ڈیفالٹ کرتے ہیں جبکہ عورتوں کی شرح محض دو فیصد ہے' ڈاکٹر یونس کا خیال تھا اگر ہم عورتوں پر اعتماد کریں تو وہ بنگلہ دیش کا مقدر بدل سکتی ہیں' ڈاکٹر یونس کا ایک دوست بنگلہ دیش کے نیشنل بینک میں ملازم تھا' ڈاکٹر نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اپنی ذاتی ضمانت پر جوبرا گاؤں کی تمام عورتوں کو قرضہ لے دیا' قرض کی کل رقم تین سو ڈالر تھی' ان تین سو ڈالروں سے پورے گاؤں کی حالت بدل دی' لوگوں

نے بینک کو تمام قسطیں بھی وقت پر ادا کر دیں۔ ڈاکٹر یونس کا دوسرا تجربہ بھی کامیاب ہو گیا۔ اس دوسرے تجربے نے آنے والے دنوں میں دنیا کے دس کروڑ انتہائی غریبوں کی حالت بدل دی۔

گرامین بینک کا ماڈل بہت دلچسپ تھا' یہ بینک غریب گھرانوں کو ضمانت کے بغیر چھوٹے قرضے دیتا تھا' یہ قرضے بلا سود ہوتے تھے اور قرض دار انہیں چھوٹی چھوٹی قسطوں میں واپس کرتے تھے' گرامین 1976ء دسمبر میں شروع ہوا اور اس نے 1979ء میں حکومت کی توجہ حاصل کر لی' حکومت نے ڈاکٹر یونس اور گرامین بینک کی سپورٹ شروع کر دی' حکومت نے 1983ء میں اسے باقاعدہ بینک کی شکل دے دی' ڈاکٹر یونس نے اسے دیہات میں پھیلانا شروع کر دیا۔ اکتوبر 2006ء تک اس کی دو ہزار دو سو 26 شاخیں کھل چکی تھیں' گرامین نے 30 سال میں 71 ہزار 3 سو 71 دیہات کو غربت کے چنگل سے آزاد کرایا۔ عالمی بینک کے مطابق اس بینک سے اب تک 65 لاکھ بنگالی قرض لے چکے ہیں' بینک کے اثاثے 7 ارب ڈالر ہیں جبکہ بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے 45 ممالک میں گرامین طرز پر بینک شروع ہو چکے ہیں۔ بینک کی برکات بنگلہ دیش کے دو کروڑ بائیس لاکھ لوگوں تک پہنچ چکی ہیں جبکہ پوری دنیا کے 10 کروڑ لوگ اس ماڈل سے فائدہ اٹھا چکے ہیں' اس بینک کے قرض خواہوں میں 96 فیصد عورتیں ہیں جبکہ اس کی ریکوری 98 فیصد ہے' گرامین صرف بینک نہیں بلکہ ایک سماجی ادارہ بھی ہے' اس سے قرضہ لینے والے تمام خاندانوں کے بچے سکول جاتے ہیں' گھر کے تمام افراد تین وقت کھانا کھاتے ہیں' تمام گھروں میں ٹوائلٹ ہیں' تمام گھروں کی چھتیں پکی ہیں' تمام لوگ صاف پانی پیتے ہیں' بینک سے قرضہ لینے والوں کیلئے الیکشن میں ووٹ دینا اور خاندانی منصوبہ بندی لازم ہے اور ان سب کو ہیلتھ انشورنس کی سہولت بھی حاصل ہے جبکہ ان تمام سہولتوں کے ساتھ یہ لوگ ہر ہفتے 8 ڈالر کی قسط بھی ادا کرتے ہیں۔ گرامین بینک اب تک بنگلہ دیش کے 45 ہزار بھکاریوں کو بھی مفید شہری بنا چکا ہے' بینک بھکاریوں کو سو ٹکے (ڈیڑھ ڈالر) قرض دیتا ہے' بھکاری اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور بینک کو ہر ہفتے دو ٹکے واپس کرتے ہیں' گرامین بینک نے گرامین فون اور گرامین ٹیلی کام کے نام سے موبائل اور وائرلیس فون کی کمپنیاں بھی بنائیں' ان کمپنیوں نے ایک لاکھ 39 ہزار خواتین کو دیہات میں پی سی اوز لگا کر دیئے اور اس کے نتیجے میں بنگلہ دیش کے 85 ہزار دیہات عالمی رابطوں کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ گرامین بینک اب بنگالی محنت کشوں کو مچھلی کے تالاب بنا کر دے رہا ہے۔ یہ تالاب آنے والے دنوں میں بنگلہ دیش کو مچھلی کا سب سے بڑا ایکسپورٹر بنا دیں گے۔



Kashif Azad@OneUrdu.com

ڈاکٹر یونس کو 13 اکتوبر 2006ء کو نوبل پرائز دیا گیا' ڈاکٹر یونس حقیقتاً اس اعزاز کا مستحق تھا۔ ڈاکٹر یونس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا اگر ایک شخص ٹھان لے تو وہ صرف 27 ڈالر سے غربت کو جڑوں سے ہلا سکتا ہے اور وہ 46 ملکوں کے دس کروڑ لوگوں کا مقدر بدل سکتا ہے۔

آج بنگلہ دیش کے 65 لاکھ گھرانوں اور 2 کروڑ 22 لاکھ لوگوں کی آنکھوں میں تشکر کے وہ آنسو ہیں جو کبھی ڈاکٹر یونس کی آرزو تھے۔ آج لاکھوں بنگالی عورتوں کی آنکھوں سے تشکر کے کروڑوں آنسو نکل رہے ہیں۔ یہ آنسو چہروں کی جھریوں سے الجھ الجھ کر ٹھوڑیوں تک پہنچ رہے ہیں اور ان ٹھوڑیوں پر آنے والے دنوں کے سینکڑوں ہزاروں سورج چمک رہے ہیں' یہ سورج آج اعلان کر رہے ہیں اگر خلیج بنگال میں 1971ء طلوع نہ ہوتا تو آج بنگلہ دیش ہوتا' ڈاکٹر یونس ہوتا' گرامین بینک ہوتا اور نہ ہی بنگلہ دیش کے دو کروڑ 22 لاکھ لوگ خوشحالی کے دروازے تک پہنچ پاتے' آج ڈاکٹر یونس کا نوبل پرائز چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے جب تک ڈاکٹر یونس پاکستان کا شہری تھا' اس وقت تک وہ محض ایک لیکچرار تھا لیکن جب وہ بنگلہ دیش کا شہری بنا تو اس نے اپنی قوم کے قدموں میں نوبل پرائز ڈال دیا' وہ دنیا کا [illegible] بن گیا تو ہمیں آج کے دن وہ بدقسمتی تلاش کریں جو ہمارے ڈاکٹر یونسوں کو لیکچرار سے اوپر نہیں اٹھنے دیتی' جس نے ہمارے ہاتھ' ہمارے پاؤں باندھ رکھے ہیں' جو ہمیں پاکستان میں گرامین جیسے ادارے نہیں بنانے دے رہی اور جو پاکستان میں خوشحالی کا کوئی دیوتا پیدا نہیں ہونے دے رہی' جو ہمیں آگے نہیں بڑھنے دے رہی' اس بدقسمتی کا نام کیا ہے؟ میں اس سوال کا جواب اب آپ پر چھوڑتا ہوں۔

# بڑا انسان

استاد نے اسے گھور کر دیکھا اور شدید غصے میں بولا "بل تم میری بات کان کھول کر سن لو' تم زندگی میں زیادہ سے زیادہ [illegible] بن سکتے ہو" پوری کلاس نے قہقہہ لگایا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گیا' یہ ہارورڈ یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا' وہ اس یونیورسٹی میں ریاضی کا طالب علم تھا' اسے کلاس روم کا ماحول' کلاس فیلوز کی گفتگو' اساتذہ کا پڑھانے کا طریقہ اور یونیورسٹی کی نئی پرانی روایات بور لگتی تھیں' وہ کئی کئی دن کیمپس سے غائب رہتا تھا' اس کا زیادہ تر وقت سیاٹل جھیل کے کنارے پال ایلن کے ساتھ گزرتا تھا' پال بھی اس کی طرح لمبی منصوبہ بندی کا ماہر تھا' وہ دونوں گھنٹوں کسی ایسی دنیا کے بارے میں سوچتے رہتے تھے جو ابھی تحقیق کے مراحل میں داخل نہیں ہوئی تھی' وہ دونوں دن میں خواب دیکھتے تھے' ان خوابوں کے دوران ایک دن ہارورڈ یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا تھا' وہ یہ خط لے کر ایلن کے پاس گیا اور اسے خط دکھا کر بولا "آؤ پال ہم اس دنیا کی بنیاد رکھیں جو آج تک صرف ہمارے ذہن میں تھی" پال ایلن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ 28 اکتوبر 1955ء کو واشنگٹن ریاست کے شہر سیاٹل میں پیدا ہوا' اس کے والد وکیل تھے' سارا گھرانہ پڑھا لکھا اور معزز تھا لیکن بل پڑھائی میں ذرا پیچھے تھا' اس میں یکسوئی نہیں تھی' اس کی سوچیں منتشر ہو جاتی تھیں اور اس کے والدین اس کی وجہ سے پریشان رہتے تھے' اس

کے والد کی خواہش تھی وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے اعزاز کے ساتھ ڈگری لے لیکن یونیورسٹی نے اس کا نام خارج کر دیا' اس کے والد کو شدید صدمہ پہنچا لیکن بل مطمئن تھا' اس کا خیال تھا ہارورڈ یونیورسٹی کسی نہ کسی دن اپنے اس نالائق طالب علم پر فخر کرے گی۔ آنے والے دنوں میں اس کی یہ بات سچ ثابت ہوئی اور ہارورڈ یونیورسٹی کے گیٹ پر اس کے نام کی تختی لگ گئی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ہم ابھی 1975ء میں ہیں' 1975ء میں اس نے اپنے دوست پال ایلن کے ساتھ مل کر دنیا کی پہلی سافٹ ویئر کمپنی بنائی' اس کمپنی کا نام ''مائیکروسافٹ'' رکھا گیا' لوگ اس کے آئیڈیاز اور کمپنی کے نام دونوں پر ہنستے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری' وہ کام کرتا چلا گیا یہاں تک کہ 1979ء تک کمپنی نے پر پرزے نکال لئے اور وہ ٹھیک ٹھاک امیر ہو گیا لیکن ابھی وہ اس کامیابی سے دور تھا جو بچپن سے اس کے ذہن پر دستک دیتی آ رہی تھی' 1980ء میں سٹیو بالمر نے کمپنی جوائن کی اور اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے مائیکروسافٹ واشنگٹن ریاست کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی' اس کے پاس روزانہ اتنے چیک آتے تھے کہ بینک نے اس کے دفتر میں اپنی شاخ کھول لی' آنے والے دنوں میں دنیا کے 51 بڑے بینکوں نے مائیکروسافٹ میں اپنی شاخیں کھولیں اور بینک اکاؤنٹس کے حصول کیلئے مائیکروسافٹ کو باقاعدہ ترغیبات دیئے گئے' 1990ء تک مائیکروسافٹ دنیا کی سب سے مشہور کمپنی تھی اور وہ دنیا کا نامور ترین شخص تھا' وہ اس قدر مشہور ہوا کہ بل کلنٹن نے 1998ء میں اعلان کیا ''وی آر دی نیشن آف بل گیٹس'' یہ ہارورڈ یونیورسٹی کے اس نالائق طالب علم کا پہلا اعزاز تھا۔



جی ہاں اس شخص کا نام بل گیٹس ہے اور یہ پچھلے بارہ سال سے دنیا کا امیر ترین شخص ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا واحد شخص ہے جو 38 برس کی عمر میں دنیا کا امیر ترین شخص بنا اور اس نے مسلسل 12 سال تک یہ اعزاز برقرار رکھا' مائیکروسافٹ میں اس وقت 63 ہزار 5 سو 64 لوگ ملازم ہیں' اس کا کاروبار 102 ممالک تک پھیلا ہے جبکہ یہ کمپنی اب تک دنیا کے ایک لاکھ 28 ہزار لوگوں کو ارب پتی بنا چکی ہے' مائیکروسافٹ کے ملازمین اوسطاً 89 ہزار 6 سو ڈالر سالانہ تنخواہ لیتے ہیں' مائیکروسافٹ کے پانچ ڈائریکٹر ہیں اور بل گیٹس کے پاس سب سے زیادہ شیئرز ہیں' وہ 97 کروڑ 74 لاکھ' 99 ہزار 3 سو 36 شیئرز کا مالک ہے' امریکی سٹاک ایکسچینج میں مائیکروسافٹ کے شیئرز کی قیمت اس وقت 23 ڈالر ہے' پچھلے 15 برسوں میں میڈیا نے بل گیٹس کو پوری دنیا میں سب سے زیادہ کوریج دی' وہ دنیا کی بااثر ترین شخصیات میں شمار ہوتا ہے' لوگ اس کے ساتھ ہاتھ

ملانا اور اس کے ساتھ تصویر کھنچوانا اعزاز سمجھتے ہیں جبکہ اسے دنیا کے 35 ممالک میں سربراہ مملکت کا پروٹوکول حاصل ہے۔

بل گیٹس 15 جون 2006ء تک محض دنیا کا امیر ترین شخص تھا لیکن اس کے ایک اعلان نے اسے دنیا کا سب سے بڑا انسان بنا دیا' بل گیٹس نے 15 جون کو اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو مائیکروسافٹ چھوڑ دے گا اور وہ اپنی باقی زندگی فلاح عامہ کے کاموں کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا وہ یکم جولائی 2008ء سے اپنا سارا وقت فاؤنڈیشن کو دے گا' اس اعلان کے بعد وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص بن گیا' اس سے پہلے دنیا میں عورتوں کیلئے تخت اور تاج چھوڑنے والے بے شمار لوگ تھے' دنیا میں مہاتما بدھ جیسے لوگ بھی تھے جنہوں نے سکون کیلئے اقتدار تیاگ دیا تھا لیکن یہ پہلا شخص ہے جس نے عام لوگوں کیلئے دنیا کی سب سے بڑی کمپنی چھوڑنے کا اعلان کیا' جس نے لوگوں کے دکھ درد کیلئے بادشاہت چھوڑ دی' بل گیٹس نے اپنی بیوی میلینڈا کے ساتھ مل کر جنوری 2000ء میں فلاح عامہ کی ایک فاؤنڈیشن بنائی تھی' اس کا نام "بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن" رکھا گیا' اس وقت یہ دنیا کا ویلفیئر کا سب سے بڑا ادارہ ہے اور فاؤنڈیشن کے اکاؤنٹس میں 29 بلین ڈالر ہیں یہ کتنی بڑی رقم ہے اس کا اندازہ آپ پاکستان کے بجٹ سے لگا لیجئے پاکستان کا ٹوٹل بجٹ 12 بلین ڈالر ہوتا ہے' بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن پوری دنیا میں صحت' تعلیم' لائبریریوں اور کمپیوٹر کی تربیت کے لئے کام کرتی ہے' یہ فاؤنڈیشن ہر سال غریب ممالک کے ذہین طالب علموں کو ایک ارب ڈالر کے وظائف دیتی ہے' یہ غیر امریکی لائبریریوں کو ایک ملین ڈالر کا ایوارڈ دیتی ہے' فاؤنڈیشن ہر سال تیسری دنیا کے سو ذہین طالب علموں کو اپنے خرچ پر کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم دلاتی ہے' فاؤنڈیشن ڈیوک یونیورسٹی کی ہر کلاس کے دس ذہین طالب علموں کو وظیفے دیتی ہے' بل گیٹس نے پندرہ ملین ڈالر سے کمپیوٹر ہسٹری میوزیم بنایا' اس نے چاول کی نئی قسم دریافت کرائی' وہ ہر سال دنیا کے کروڑوں بچوں کو پولیو ویکسین پلاتا ہے اور اس کی فاؤنڈیشن ایڈز کا علاج دریافت کر رہی ہے اور بل گیٹس کی یہ فاؤنڈیشن پانچ سال سے پوری دنیا میں کام کر رہی ہے' بل گیٹس نے اعلان کیا وہ جولائی 2008ء کو مائیکروسافٹ سے فاؤنڈیشن کے دفتر شفٹ ہو جائے گا اور اپنی باقی زندگی لوگوں کی صحت اور تعلیم کے لئے وقف کر دے گا' اس کا کہنا ہے وہ اپنے بچوں کو صرف ایک ایک ملین ڈالر دے گا اور اپنی باقی ساری دولت دنیا کے ضرورت مندوں کے حوالے کر دے گا' اس کا کہنا ہے یہ دولت ضرورت مندوں کی امانت

ہے اور وہ یہ امانت ان لوگوں کو لوٹا کر واپس جائے گا۔

میں نے جب اس کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا بل گیٹس کل تک دنیا کا سب سے امیر شخص تھا لیکن آج سے وہ دنیا کا سب سے بڑا انسان ہے' وہ مائیکروسافٹ کی وجہ سے 12 سال تک دنیا کا امیر ترین شخص رہا لیکن اب شاید وہ ''بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن'' کی وجہ سے قیامت تک دنیا کا سب سے بڑا انسان رہے گا اور میں نے سوچا دنیا کے دس دولت مند ترین لوگوں میں تین مسلمان بھی شامل ہیں لیکن لوگوں کی خدمت کرنے کی سعادت اللہ تعالیٰ نے بل گیٹس کو عطا فرمائی' میں نے سوچا دنیا کا پانچواں امیر ترین شخص ایک عرب مسلمان شہزادہ ولید بن طلال ہے' اس کی دولت جوا خانوں میں خرچ ہو رہی ہے جبکہ بل گیٹس اپنی دولت ایڈز کے علاج پر خرچ کر رہا ہے' وہ مسلمان بچوں کو تعلیم دے رہا ہے اور وہ دنیا میں کمپیوٹر عام کر رہا ہے' میں نے سوچا بل گیٹس جیسے لوگ ہیں جنہیں حقیقتاً رول ماڈل کہا جا سکتا ہے' میں نے سوچا' پوری اسلامی دنیا رئیس لوگوں سے بھری پڑی ہے' اسلامی دنیا میں ایسے ایسے لوگ ہیں جو ہیروں کی کئی کئی کانوں کے مالک ہیں' جن کی زمینوں سے سونا نکلتا ہے اور جو تیل کے درجنوں کنوؤں کے مالک ہیں لیکن انہیں کسی ضرورت مند کو دس روپے دینے کی توفیق نہیں ہوتی جبکہ بل گیٹس اپنی ساری دولت لوگوں کیلئے چھوڑ جائے گا' میں نے سوچا 62 اسلامی ممالک کی اس دنیا میں ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہیں لیکن ان ڈیڑھ ارب لوگوں میں ایک بھی بل گیٹس نہیں' ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو پچاس سال کی عمر میں اپنی کمپنی کا دروازہ کھولے اور اپنا سارا مال' اپنی ساری زندگی اللہ کے بندوں کے لئے وقف کر دے جو لوگوں میں دوا اور کتاب بانٹے' جو لوگوں کے زخم دھوئے' جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور جو لوگوں کے آنسو پونچھے' میں ہمیشہ اپنے آپ سے پوچھتا تھا عالم اسلام پر یورپ اور امریکہ کیوں غالب ہیں؟ مجھے محسوس ہوتا تھا (نعوذ باللہ) یہ اللہ تعالیٰ کی ناانصافی ہے لیکن مجھے آج معلوم ہوا امریکہ اور یورپ بل گیٹس جیسے لوگوں کی وجہ سے ہم پر غالب ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے پاس بڑے انسان ہیں جبکہ ہم لوگ تاجروں' بیوپاریوں اور صنعت کاروں کی غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا ان کے پاس انسان ہیں جبکہ ہم لوگ آدمیوں کی چاکری میں سانس لے رہے ہیں۔
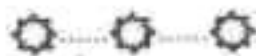
# ہماری کہانی

میدان میں بہت گرمی تھی' بچے فٹ بال کو ٹھوکر مارتے' پیٹ پر ہاتھ رکھتے اور آسمان کی طرف دیکھتے' وہ بار بار ماتھے سے پسینہ بھی پونچھتے تھے وہ میدان کے ایک سرے پر کھڑا ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا' سکے ٹٹولے اور میدان سے باہر آ گیا' باہر اس کے دادا کی دکان تھی' اس نے 25 سینٹ دادا کے سامنے رکھے' کوکا کولا کی چھ بوتلیں خریدیں' بھاگتا ہوا میدان میں آیا اور یہ چھ بوتلیں بچوں میں فروخت کر دیں' اسے اس سودے میں پانچ سینٹ بچ گئے' اس نے پانچ سینٹ کا سکہ ہوا میں اچھالا' کیچ کیا اور ''ناٹ بیڈ'' کا نعرہ لگایا' یہ اس کا پہلا کاروبار تھا اور اس کی عمر اس وقت محض چھ سال تھی۔

لوگ اسے ''پیدائشی سرمایہ کار'' کہتے ہیں' اسے اللہ تعالیٰ نے ایک ڈالر کو ملین میں بدلنے کا ہنر دے رکھا ہے' وہ ہوا کو سونگھ کر سرمائے اور منافع کا رخ پہچان جاتا ہے' وہ سٹاک ایکسچینج کا شہنشاہ کہلاتا ہے' وہ دنیا کا واحد شخص ہے جس نے بغیر ہاتھ ہلائے اربوں کمائے جس نے دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی پیدا کئے لیکن یہ ہماری کہانی نہیں' ہماری کہانی دوسری ہے' وہ 30 اگست 1930ء کو ریاست اوہاما میں پیدا ہوا' اس کا والد سٹاک ایکسچینج کا بروکر تھا' وہ درمیان کا بچہ تھا' اس کی ایک بہن بڑی اور ایک چھوٹی تھی' اس کے والدین اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے لیکن اس کا رجحان کاروبار کی طرف تھا' اس نے گیارہ سال کی عمر میں ''سٹی سروسز'' کے تین شیئرز

خریدے اس وقت ایک شیئر کی قیمت 38 ڈالر تھی' اس کی بہن ڈوری اس کاروبار میں اس کی پارٹنر تھی بدقسمتی سے شیئرز کی قیمت کم ہو کر 27 ڈالر رہ گئی' وہ گھبرا گیا' چند دن بعد شیئرز کی قیمت بڑھ کر 40 ڈالر ہوئی تو اس نے فوراً شیئرز بیچ دیئے' اسے چھ ڈالر منافع ہوا لیکن چند روز بعد ان شیئرز کی قیمت بڑھتے بڑھتے 200 ڈالر ہو گئی' اس وقت اس نے سرمایہ کاری کا سب سے بڑا اصول سیکھا اس نے سیکھا جس شخص میں صبر نہیں ہوتا وہ کبھی سرمایہ کار نہیں بن سکتا' اس کے بعد باقی زندگی اس نے صبر کو اپنا سب سے بڑا ہتھیار بنا لیا' اس کا دوسرا اصول بھاؤ تاؤ اور خریداری تھا' اس کا کہنا تھا آپ کے منافع کا فیصلہ آپ کی خریداری کرتی ہے' اگر آپ نے چیز سستی خریدی ہے تو آپ زیادہ منافع حاصل کریں گے' وہ کہتا تھا دکاندار چیز کو بیچنے میں جتنی محنت کرتے ہیں اگر وہ اس سے آدھی محنت خریداری کے دوران کر لیں تو وہ کئی گنا منافع کمائیں اور اس کا تیسرا اصول ساکھ تھا' اس کا کہنا تھا جب تک لوگ آپ پر بائبل جتنا اعتبار نہیں کرتے آپ سرمایہ کار نہیں بن سکتے' شاید یہی وجہ ہے لوگ بینک آف امریکہ پر اتنا اعتماد نہیں کرتے جتنا اعتبار وہ اس پر کرتے ہیں لیکن یہ ہماری کہانی نہیں' ہماری کہانی دوسری ہے۔

اس نے چودہ سال کی عمر میں اخبار کی ہاکری شروع کی' وہ لوگوں کے گھروں میں اخبار پھینکا کرتا تھا' اس کے اسے 175 ڈالر ماہانہ ملتے تھے' اس نے ہاکری کے ذریعے 1200 ڈالر جمع کئے اور 40 ایکڑ کے ایک فارم پر لگا دیئے' دو سال بعد وہ اس فارم کا مالک تھا' 17 سال کی عمر میں اس نے ''پن بال'' مشین لگائی' اس مشین سے اس نے پانچ ہزار ڈالر کمائے' 22 سال کی عمر میں اس نے اپنی پہلی انویسٹمنٹ کمپنی بنائی' اس نے اپنے خاندان اور دوستوں کو سرمایہ کاری کی دعوت دی' سب نے مل کر ایک لاکھ پانچ ہزار ڈالر جمع کئے' اس نے یہ رقم سٹاک مارکیٹ میں لگا دی' دو سال بعد یہ رقم کروڑوں ڈالر تک پہنچ گئی' اس کے بعد اس کی ترقی کو پر لگ گئے' آج 2006ء میں وہ دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ کار ہے' آج اس کے پاس امریکہ کی سب سے بڑی ٹیکسٹائل مینو فیکچرنگ برک شائر ہیتھوے' والٹ ڈزنی اور امریکن ایکسپریس کے میجر شیئرز ہیں' آج جب بھی امریکہ کی کوئی بڑی کمپنی ڈیفالٹ کرنے لگتی ہے تو کمپنی کے مالکان اس کے پاؤں پکڑ لیتے ہیں' وہ کمپنی کے چند شیئرز خرید لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کمپنی اپنے قدموں پر کھڑی ہو جاتی ہے' لوگ اپنی تمام جمع پونجی اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتے ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں وہ جس ڈالر کو چھو دیتا ہے وہ ملین ڈالر بن جاتا ہے لیکن یہ ہماری کہانی نہیں' ہماری کہانی دوسری ہے۔

وہ دنیا کا دوسرا امیر ترین شخص ہے اور اس کا نام وارن بفٹ ہے' وہ 44 بلین ڈالر کا

مالک ہے لیکن وہ عام زندگی میں بہت سادہ اور درویش صفت انسان ہے' وہ آج بھی اس مکان میں رہتا ہے جو اس نے 30 برس پہلے 31 ہزار 5 سو ڈالر میں خرید ا تھا' وہ آج بھی پرانی کار چلاتا ہے جو اس نے 25 برس پہلے خریدی تھی اور وہ آج بھی اپنے دن کا آغاز کوکا کولا کے کارٹن اٹھا کر کرتا ہے لیکن یہ بھی ہماری کہانی نہیں' ہماری کہانی دوسری ہے' اس وارن بفٹ نے 26 جون 2006ء کو اپنی دولت کا 87 فیصد حصہ بل گیٹس کی فلاح و بہبود کی فاؤنڈیشن کو دینے کا اعلان کر دیا' اس کے اعلان کے مطابق اس کی کمپنی ہر سال بل اینڈ میلینڈا گیٹس فاؤنڈیشن کو ڈیڑھ بلین ڈالر دیا کرے گی' بل گیٹس یہ رقم پوری دنیا میں صحت اور تعلیم پر خرچ کرے گا' وارن بفٹ کا یہ عطیہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ 37 بلین ڈالر کی حد تک نہیں پہنچ جاتا' وارن بفٹ نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہا ''میں نے بل گیٹس کی فاؤنڈیشن کو اس لئے منتخب کیا کہ یہ امریکہ کا واحد ادارہ ہے جو اپنے فنڈز کا 70 فیصد حصہ امریکہ سے باہر دوسرے ممالک میں خرچ کرتا ہے'' اس کا کہنا تھا ''اگلے ماہ سے بل گیٹس کو میری طرف سے امداد کا پہلا چیک مل جائے گا اور میری کوشش ہوگی میں مرنے سے پہلے اپنا حصہ بل گیٹس کے حوالے کر جاؤں'' اس کا کہنا تھا ''میں چھ برس کی عمر سے یہ کاروبار کر رہا ہوں مجھے دولت سے پہلے [illegible] آج 79 سال ہو چکے ہیں' میں نے آج سے 30 برس پہلے جس شخص سے سو ڈالر لئے تھے وہ شخص آج سو بلین ڈالر کا مالک بن چکا ہے' لوگ مجھے جادوگر سمجھتے ہیں' ان کا خیال ہے میں کاغذ کے ٹکڑوں کو سونے میں ڈھال دیتا ہوں' میں جس کمپنی کی دہلیز پر قدم رکھ دیتا ہوں وہ کمپنی ڈیفالٹ سے نکل کر عروج کو چھونے لگتی ہے' میں جس کارپوریشن کا ایک شیئر خرید لیتا ہوں لوگ اس کے کروڑوں شیئرز خرید لیتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں وارن بفٹ بینک آف امریکہ سے زیادہ اعتباری اور زیادہ با اعتماد ہے لیکن میں آج یہ اعلان کرتا ہوں' میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سرمایہ کاری کا آغاز 26 جون 2006ء سے کر رہا ہوں' میں آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا کاروبار شروع کر رہا ہوں'' لیکن یہ بھی ہماری کہانی نہیں' ہماری کہانی دوسری ہے۔

ہماری کہانی اسلامی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور اسلامی دنیا پر ہی آ کر ختم ہو جاتی ہے' پوری اسلامی دنیا تاجروں' سرمایہ کاروں اور دولت مندوں سے بھری پڑی ہے لیکن دنیا کی خدمت کا اعزاز پہلے بل گیٹس نے حاصل کیا اور اس کے صرف دو ہفتے بعد وارن بفٹ اس اعزاز میں شریک ہو گیا جبکہ برونائی تک ہمارے امراء اپنی حرم سراؤں میں اپنی چالیس چالیس لونڈیوں کے ساتھ آرام فرما رہے ہیں' وہ اونٹوں پر داؤ لگا رہے ہیں اور وہ شرابیں پی رہے ہیں' یہ ہے ہماری کہانی۔

# مہاتیر کے ساتھ ایک ملاقات

کھانے کی اس میز پر ہم آٹھ لوگ بیٹھے تھے' ہمارے بالکل سامنے مہاتیر محمد تھے' مہاتیر [illegible] نے کوالالمپور کا واقعہ سنایا' انہوں نے بتایا' وہ پچھلے دنوں ملائشیا کے دورے پر تھیں' وہاں انہوں نے ایک ہندو ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا "تم انڈین ہو" اس نے غصے سے ان کی طرف دیکھا اور تلملا کر بولے "نو آئی ایم ملائشین" مہاتیر محمد مسکرائے اور دھیمی آواز میں بولے "یہ طرز فکر ہماری ترقی اور استحکام کا نتیجہ ہے' جب کوئی ملک ترقی کرتا ہے' جب کوئی ملک دنیا میں عزت اور آبرو پاتا ہے تو اس کے باشندے اپنے ملک پر فخر کرتے ہیں' اس کے برعکس جب کوئی ملک غریب ہوتا ہے' اس کی معیشت ادھار یا بھیک پر چلتی ہے تو اس کے باشندے اپنے ملک کا تعارف کراتے ہوئے شرمندہ ہوتے ہیں' آپ زائریا روانڈا کے کسی باشندے سے پوچھیں' وہ کبھی روانڈین یا زائرین ہونے پر فخر نہیں کرے گا' وہ آئی ایم افریقین کہہ کر اپنا تعارف کرائے گا۔ ہم نے دنیا میں ملائشیا کی عزت اور آبرو میں اضافہ کیا لہٰذا آج ملائشیا کے بودھ خود کو آئی ایم فرام تبت نہیں کہتے' انڈین انڈین اور سنگاپورین سنگاپورین نہیں کہتے حتیٰ کہ ملائشیا میں آباد پاکستانی تک خود کو پاکستانی ملائشین کہتے ہیں"

ہم میں سے ایک صاحب نے پوچھا "آپ نے یہ قومی تفاخر کیسے حاصل کیا" مہاتیر محمد اپنے مخصوص انداز سے مسکرائے "ہماری ترقی کے بے شمار اصول ہیں لیکن ان میں تین کو بنیادی

حیثیت حاصل ہے‘ ہم نے تاریخ کے مطالعے سے اندازہ لگایا‘ دنیا میں تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں لہٰذا ہم نے اپنے کل بجٹ کا 25 فیصد حصہ تعلیم پر خرچ کرنا شروع کر دیا‘‘ وہ ذرا سے رکے اور مسکرا کر بولے ’’ہم لوگ دفاع پر اپنے بجٹ کا صرف چھ سے آٹھ فیصد خرچ کرتے ہیں‘ دوسرا ہم نے قومی ترقی کیلئے مذہب کا سہارا لیا‘ ہم نے تحقیق کی مسلمانوں کی وہ کون سی عادتیں ہیں جو ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہیں‘ ہمیں محسوس ہوا فرقہ پرستی اور نسلی اختلافات عالم اسلام کو اٹھنے نہیں دے رہے‘ ہم نے ملائشیا میں فرقہ بازی اور نسلی اختلافات پر پابندی لگا دی‘ آج ملائشیا میں کوئی مسلمان کسی بودھ سے یہ نہیں کہتا اسلام بودھ سے بہتر مذہب ہے یا میں ملائی ہوں اور تم ایک کمتر ہندو ہو یا میں شیعہ ہوں اور تم سنی‘ وہاں اس قسم کے فقرے یا رائے قانوناً جرم ہے‘ ہم لوگوں نے مسجد کو مثبت رجحانات کی ترویج کیلئے استعمال کیا‘ ہماری مساجد میں علمائے کرام معاشرتی بہبود اور اجتماعی کوشش کی تلقین کرتے ہیں‘ وہاں کسی منبر‘ کسی سپیکر سے اختلافی بات نشر نہیں ہوتی اور تیسری بات ہم نے دیکھا کسی ملک کے شہریوں کے دل میں اپنے ملک کی محبت‘ اپنے ملک پر فخر وہاں کا حکمران طبقہ پیدا کرتا ہے اگر ہمارے بچے امریکہ میں تعلیم حاصل کریں گے تو ملائشیا کے لوگ ملائشیا کے تعلیمی اداروں پر اعتماد نہیں کریں گے‘ اگر میں اپنا سرمایہ برطانیہ کی کمپنیوں میں لگاؤں گا یا میں اپنی رقم سوئس بینکوں میں جمع کراؤں گا تو ہمارے سرمایہ کار‘ ہمارے عام لوگ ملائشیا کے بینکوں‘ ملائشیا کی کمپنیوں پر اعتماد نہیں کریں گے لہٰذا ہماری پوری حکومت‘ پوری بیوروکریسی کے بچے ملائشیا کے سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہم میں سے کسی نے فارن اکاؤنٹ نہیں کھلوایا‘ میں اس ضمن میں ایک مثال پیش کرتا ہوں‘ 1989ء میں مجھے دل کا دورہ پڑا‘ میرے سٹاف نے مجھے امریکہ سے آپریشن کرانے کا مشورہ دیا لیکن میں نے انکار کر دیا اور اپنی وزارت صحت کو تحریری حکم دیا‘ میرا آپریشن ملائشیا کے ہسپتال میں ہوگا اور ملائشیا کے لوکل ڈاکٹر کریں گے‘ اس حکم کا یہ نتیجہ نکلا 1989ء سے پہلے ہر سال ایک سے دو ملین ملائشین علاج کیلئے ملک سے باہر جاتے تھے لیکن اس کے بعد ہر سال چھ ملین لوگ علاج کیلئے ملائشیا آنے لگے‘‘

ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا ’’جب کوئی لیڈر اپنے ملک کو ترقی دیتا ہے تو لوگ اسے ناگزیر کہنا شروع کر دیتے ہیں‘ وہ یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں‘ سر اگر آپ نہ رہے تو یہ سارا سسٹم ختم ہو جائے گا‘ کیا آپ کو لوگوں نے یہ نہیں کہا تھا‘ اگر کہا تھا تو آپ نے اقتدار کیوں چھوڑ دیا‘‘ مہاتیر نے قہقہہ لگایا اور نرم آواز میں بولے ’’مجھے بھی لوگوں نے کہا تھا لیکن میں تاریخ کا

طالب علم ہوں'میں نے تاریخ میں پڑھا'وہ تمام حکمران جو خود کو کسی ملک کیلئے ناگزیر سمجھتے تھے'وہ رخصت ہوئے تو ان کے بعد بھی وہ ملک قائم رہے'دنیا ان کے بغیر بھی چلتی رہی'وقت ان کے بغیر بھی آگے بڑھتا رہا'دوسرا میں نے محسوس کیا'دنیا کے تمام لیڈر ایک وقت میں بہت پاپولر ہوتے ہیں'لوگ ان کی پرستش کرتے ہیں لیکن جب وہ لمبے عرصے تک اقتدار میں رہتے ہیں تو لوگ ان سے اکتا جاتے ہیں'عوام کو ان کی ذات میں کیڑے نظر آنے لگتے ہیں'میں نے دیکھا دنیا کے تمام پاپولر لیڈر جب اقتدار سے رخصت ہوئے تو وہ ان پاپولر ہو چکے تھے'تیسرا میں نے محسوس کیا اگر میں آج فوت ہو جاؤں تو کوئی نہ کوئی شخص میری جگہ لے گا لہٰذا پھر کیوں ناں میں زندگی ہی میں اپنی جگہ کسی دوسرے کو پیش کر دوں اور ساتھی بن کر اس کی مدد کروں''ہم میں سے ایک صاحب نے پوچھا''آپ کی زندگی کا کوئی ون لائن فلسفہ''مہاتیر نے ہنس کر جواب دیا''وہ جمہوریت جو تعلیم کے بغیر ہو وہ ملک کو نقصان پہنچاتی ہے''ہم نے عرض کیا''ہم سمجھ نہیں سکے''مہاتیر نے اٹھتے اٹھتے جواب دیا''صرف تعلیم یافتہ لوگ ہی اچھے لیڈر منتخب کر سکتے ہیں''میں نے ان سے عرض کیا''آپ پاکستان اور ملائشیا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں''انہوں نے تھوڑی دیر سوچا اور نہایت جذباتی لہجے میں بولے''ہم اپنے جی ڈی پی کا 25 فیصد تعلیم پر خرچ کرتے ہیں اور چھ فیصد دفاع پر جبکہ آپ لوگ تعلیم پر دو فیصد خرچ کر رہے ہیں اور دفاع پر 48 فیصد''میں نے مزید عرض کرنے کیلئے منہ کھولا لیکن وہ ہنس کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

(نوٹ: مہاتیر محمد کے ساتھ اس نشست کا اہتمام انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے کیا تھا۔)

✿......✿......✿

# لوہار کا بیٹا

اس کا والد ایک لوہار تھا' گارسر میں اس کی چھوٹی سی بھٹی تھی جس میں وہ کسانوں کے چھوٹے چھوٹے آلات بناتا تھا' محمود اس کا چوتھا بیٹا تھا' 1957ء میں کسی نے اسے بتایا تہران میں لوہاروں کی بہت مانگ ہے' لوہار نے بھٹی بجھائی' اپنے چار بچوں اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تہران آ گیا' تہران شہر میں اللہ نے اسے مزید تین بچے عنایت کئے' یہ ہجرت اس کیلئے سود مند رہی' اس نے تہران کی ایک کچی بستی میں لوہا کوٹنے کا کام شروع کیا' یہ کام چل نکلا اور وہ لوہار سے تاجر بن گیا۔

محمود احمدی اس کے چوتھے بیٹے میں تین خوبیاں تھیں' وہ پڑھائی میں دلچسپی لیتا تھا' وہ ایک فعال اور عملی بچہ تھا' وہ دوسروں کو کام کا حکم دینے کی بجائے خود کام شروع کر دیتا تھا اور تیسرا وہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کا قائل تھا' وہ چھوٹی عمر میں کہا کرتا تھا ''جس برائی کو آپ قوت سے نہیں روک سکتے' وہ برائی آپ کے احتجاج سے نہیں رکے گی'' محمود کے والد نے اسے سکول میں داخل کرا دیا' محمود ایک اچھا طالب علم ثابت ہوا' وہ پڑھتا چلا گیا' اس نے سکول سے تعلیم حاصل کی' وہ کالج میں گیا اور وہاں سے یونیورسٹی' اس نے سول انجینئرنگ میں داخلہ لیا' اس نے ایم ایس سی کی اور اس کے بعد ٹریفک اینڈ ٹرانسپورٹ پلاننگ میں پی ایچ ڈی کر لی' یہ مضمون بھی اس کی ذات کی طرح انوکھا تھا' اس کے ممتحن نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا تھا ''ٹرانسپورٹ

اور ٹریفک اکیسویں صدی کا سب سے بڑا مسئلہ ہوگا' پی ایچ ڈی کے بعد اس نے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا' وہ ڈاکٹر محمود احمدی نژاد ہو گیا' ڈاکٹر محمود احمدی کے والد اسے سرکاری افسر بنانا چاہتے تھے لیکن اس کے رجحانات میں توازن نہیں تھا' وہ ایک طرف تعلیم و تدریس کے جنون میں مبتلا تھا اور دوسری طرف عملی جہاد کا شیدائی تھا' 1980ء میں جب ایران عراق جنگ شروع ہوئی تو وہ سپاہ پاسداران انقلاب میں شامل ہو گیا' وہ ایران کی مغربی سرحد پر لڑنے لگا' اس دور میں اس نے ریکارڈ کامیابیاں حاصل کیں' اس جنگ کے بعد اس نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر کرد لیڈر عبدالرحمن کو ویانا میں گولی مار دی' اس قتل کی ساری منصوبہ بندی محمود احمدی نے کی تھی' اس نے شاتم رسول سلیمان رشدی کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن وہ بچ نکلا۔

محمود احمدی نژاد ان تمام کامیابیوں کے باوجود 2003ء تک گوشہ گمنامی میں رہا' قومی سطح پر لوگ اس کے نام سے واقف نہیں تھے لیکن پھر 2003ء کا مئی آ گیا اور وہ اچانک تہران شہر کا میئر بن گیا' میئر بننے کے بعد اس نے اخباری نمائندوں کو جو انٹرویو دیا' وہ اس کے ویژن اس کے فلسفے کا آئینہ دار تھا' اس نے کہا ''میں لوہار کا بیٹا ہوں' میرے پاس لوگوں کو دینے کیلئے خدمت کے سوا کچھ نہیں' میرا کل اثاثہ خدمت ہے اور تہران کے لوگ مجھے کبھی یہ خزانہ لٹاتے ہوئے بخیل نہیں پائیں گے'' وہ لوہار کا پہلا بیٹا تھا جسے کسی دارالحکومت کی نظامت ملی تھی' اس دور میں تہران میں امریکی فاسٹ فوڈ کے نئے نئے ریستوران کھلے تھے' یہ ریستوران ایران کی نئی حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے مظہر تھے' محمود احمدی نژاد نے ان ریستورانوں پر پابندی لگا دی' اس کا کہنا تھا ''اگر مغرب کے دل میں ہماری تہذیب کیلئے جگہ نہیں تو ہم بھی ان کے کلچر سے انکار کرتے ہیں'' اس نے تہران کے تمام ثقافتی مراکز کو اسلامی قوانین کا پابند بنا دیا' اس نے میونسپل کارپوریشن کی آدھی لفٹیں خواتین کیلئے مختص کر دیں' اس نے کارپوریشن کے تمام ملازمین کو داڑھی رکھنے اور کھلی آستین کی قمیض پہننے کا پابند بنا دیا' اس نے وقت کی پابندی کو شعار بنایا اور سارے عملے کو حکم دیا وہ اس وقت تک گھر نہیں جائیں گے جب تک وہ اس دن کا کام ختم نہ کر لیں' اس کا کہنا تھا ''جو شکایت آج درج ہوئی ہے اس کی تلافی بھی آج ہی ہونی چاہیے'' اس نے تہران کی ساری ٹریفک کو نظم و ضبط کا پابند بنا دیا' ایک سال میں تہران دنیا کا واحد شہر بن گیا جس میں پارکنگ اور ٹریفک کے قوانین پر سو فیصد عملدرآمد ہوتا تھا' اس نے تہران کی ساری شکستہ سڑکیں دوبارہ

بنوانے کا اعلان کیا' شاہراہ سازی کے اس عمل میں بھی اس نے ایک انوکھا اصول وضع کیا' اس نے اعلان کیا' ہم غریب بستیوں سے سڑکیں بنانا شروع کریں گے اور آہستہ آہستہ بڑی شاہراؤں کی طرف آئیں گے' محمود احمدی نژاد تہران کا پہلا میئر تھا جس نے تہران کے مضافات کی ساری سڑکیں وسیع اور پختہ کر دیں' جس نے تمام سڑکوں پر لائٹس لگا دیں' اس نے نوبیاہتا جوڑوں کیلئے قرضوں کا پروگرام شروع کیا' وہ کہتا تھا ''جو شخص شادی کرے' وہ دوسرے دن کارپوریشن سے قرضہ لے اور نئی اور آزاد زندگی شروع کر دے'' اس کی ذاتی زندگی کروفر اور تکبر سے پاک تھی' اس نے میئر کی سرکاری رہائش گاہ استعمال کرنے سے انکار کر دیا' اس نے سرکاری گاڑی اور پٹرول بھی مسترد کر دیا' وہ تہران سے 20 میل باہر ایک پسماندہ بستی کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا' وہ گھر سے ٹفن لے کر دفتر آتا تھا' یہ اس کا لنچ ہوتا تھا' وہ تہران کے میئر کی حیثیت سے کابینہ کے اجلاس میں شرکت کرتا تھا' کابینہ میں اس کے خیالات ''باغیانہ'' ہوتے تھے' وہ کہتا تھا ''ہمارے وزراء لوگوں کے اصل مسائل سے واقف نہیں ہیں' ہمیں بیرونی دنیا کے بجائے اندرونی دنیا پر توجہ دینی چاہیے'' اس کے خیالات کے باعث کابینہ کے اجلاس میں اس کی شرکت پر پابندی لگا دی گئی' 2005ء میں دنیا کے 65 بہترین میئروں کی فہرست بنی' محمود احمدی نژاد کا نام اس فہرست میں شامل تھا' یہ فہرست دنیا کے 550 میئروں کی پرفارمنس دیکھ کر بنائی گئی تھی اور اس میں ایشیا کے صرف 9 میئر شامل تھے' محمود احمد نژاد ایران کا پہلا میئر تھا جس نے یہ اعزاز حاصل کیا۔



محمود احمدی نژاد 2005ء کے الیکشن میں صدارتی امیدوار بن گیا' اس نے الیکشن مہم کے بغیر الیکشن لڑنے کا اعلان کیا' اس کے مقابلے میں علی اکبر ہاشمی رفسنجانی نے الیکشن مہم پر 5 ملین ڈالر خرچ کئے' محمود احمدی نژاد اپنی الیکشن مہم کے دوران صرف ایک نعرہ لگاتا رہا ''میں لوہار کا بیٹا تھا' میں میئر شپ کے دوران بھی لوہار کا بیٹا رہا اور میں صدر بن کر بھی لوہار ہی کا بیٹا رہوں گا'' وہ کہتا تھا ''میں تمہیں امریکہ کی غلامی سے نجات دلاؤں گا'' مغربی میڈیا کا کہنا تھا ''نژاد گیارہ ستمبر کے بعد دنیا کا واحد صدارتی امیدوار تھا جو اپنی تقریروں میں امریکی تعلقات کو للکارتا تھا'' لوہار کا یہ بیٹا 25 جون 2005ء کو ایران کا صدر منتخب ہو گیا' اس نے ایران کی تاریخ میں سب سے زیادہ ووٹ لئے' اس کی کامیابی پر امریکہ کے ایک ٹیلی ویژن نے تبصرہ کیا ''یہ 1979ء کے بعد ایران میں امریکہ کی دوسری شکست ہے'' جب نتائج کا اعلان ہوا تو میرے ایک دوست نے تبصرہ کیا ''نژاد نے امریکی نفرت کو کیش کرا لیا'' میں نے اسے ٹوک دیا ''یہ امریکی ثقافت کی شکست نہیں' یہ نژاد کی

خدمت، سادگی اور اخلاص کی فتح ہے“ اس نے میری طرف دیکھا‘ میں نے عرض کیا ”نزاد کی یہ فتح ثابت کرتی ہے‘ عوام ہمیشہ ایسے لوگوں کو اپنا حکمران دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے مسائل سمجھتے ہوں‘ جو حلئے سے ان جیسے ہوں اور جو ان کے درمیان رہتے ہوں“ میرے دوست نے پوچھا ”لیکن ہمارے ملک میں ایسا کیوں نہیں ہوتا“ میں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ”اس لئے کہ پاکستان میں اقتدار سونے کی کان ہے اور اس کان کے منہ پر لوہار کی بجائے سونار کے بیٹے بیٹھے ہیں“

# آمر ہمیشہ پنوشے کی موت مرتے ہیں

والدہ نے اس کا نام آگستو رکھا تھا لیکن دنیا میں وہ جنرل پنوشے کے نام سے مشہور ہوا' وہ جنوبی امریکہ کے ملک چلی کا رہنے والا تھا' چلی دنیا کا سب سے پتلا اور لمبا ملک ہے' امریکی اسے "تسمہ" کہتے ہیں' اس کے والد کسٹم انسپکٹر تھے' گھر میں غربت تھی لیکن والدہ اپنے سلیقے سے گھر چلا لیتی تھی' وہ انجینئر بننا چاہتا تھا لیکن والدہ کی خواہش تھی وہ فوج میں افسر بنے' اس نے والدہ کی خواہش مان لی' پنوشے نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور وہ آگے بڑھتا چلا گیا' 1970ء کے الیکشن ہوئے اور ان الیکشنوں میں عوام نے سوشلسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر سلواڈور آلندے کو صدر منتخب کر لیا' آلندے ایک کیمونسٹ شاعر تھا' اس نے ملک کی تمام صنعتیں' کانیں' بینک اور مواصلاتی کمپنیاں سرکاری تحویل میں لے لیں' یہ اقدامات امریکہ کے لئے تشویشناک تھے' امریکہ کو خدشہ تھا کہیں چلی بھی کیوبا کی طرح کیمونسٹ ملک نہ بن جائے چنانچہ امریکہ نے صدر آلندے اور کیمونسٹوں کو ہٹانے کا فیصلہ کیا' امریکہ نے حزب اختلاف' اخبارات' سیاستدانوں' تاجروں اور ٹریڈ یونین رہنماؤں پر کروڑوں ڈالر کی "سرمایہ کاری" کی جس کے آخر میں امریکہ کو فوج میں ایسے افسر کی ضرورت پڑی جو چلی کی حکومت پر قبضہ کرے اور پھر برسوں امریکی مفادات کی کاشت کاری کرے' جنرل پنوشے میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں' جنرل پنوشے صدر آلندے کے دور میں کور کمانڈر تھا' صدر آلندے کو ایک ایسا جرنیل درکار تھا جس کا خاندانی پس منظر زیادہ

مضبوط نہ ہو اور جس میں وفاداری اور خلوص موجود ہو' وہ جنرل پنوشے کی شکل اور عجز و انکسار سے دھوکہ کھا گیا چنانچہ اس نے اسے مسلح افواج کا کمانڈر انچیف بنا دیا' امریکی حکومت جنرل پنوشے کی تاڑ میں تھی' امریکہ نے جنرل پر سرمایہ کاری کی اور جنرل پنوشے نے 11 ستمبر 1973ء کو صدر آلندے کا تختہ الٹ دیا جس کے بعد صدر آلندے نے صدارتی محل میں خودکشی کر لی' یوں اس شام جنرل آگستو پنوشے یوگارے چلی کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار بن گیا۔

جنرل پنوشے میں چار خصوصیات تھیں' وہ طاقت استعمال کرنا جانتا تھا' وہ سمارٹ اور چالاک تھا' وہ شطرنج کی طرح لوگوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور وہ سازش کرنے میں ماہر تھا' اس نے اقتدار میں آتے ہی تمام کمیونسٹوں کو گرفتار کر لیا' اس نے 28 ہزار لوگوں کو ٹارچر کیا جن میں سے تین ہزار سیاستدان قتل ہو گئے' وہ مخالفین کو گرفتار کرتا اور اگلے دن ان کی نعشیں دریا میں تیرتی ہوئی ملتیں یا جنگل میں کسی درخت سے لٹک رہی ہوتیں' وہ سو سو نعشوں کو ایک گڑھے میں دفن کر دیتا تھا' وہ ایک تابوت میں تین تین مردے بھی ڈال دیتا تھا' اس نے تین برسوں میں چلی سے کمیونسٹ ختم کر دیئے' وہ آئین اور قانون توڑنے اور نیا بنانے پر یقین رکھتا تھا' اس کا کہنا تھا وردی اس کی اصل قوت ہے اور جب تک وہ مسلح افواج کا کمانڈر انچیف ہے اسے کسی طاقت کا کوئی خوف نہیں' وہ کہتا تھا ''چلی میں صرف وہی پتا ہل سکتا ہے جسے میں ہلنے کی اجازت دوں گا'' اس نے 1974ء میں ریفرنڈم کرایا اور 75 فیصد عوام نے اس کے حق میں ''ووٹ'' دے دیا' اس نے مارچ 1981ء میں اپنی مرضی کا آئین بنایا اور خود کو آٹھ برس کیلئے باوردی صدر منتخب کرا لیا' وہ یونیفارم کے بغیر کسی سیاستدان سے ملاقات نہیں کرتا تھا' اس نے 1982ء میں جمہوریت نافذ کرنے کا اعلان کیا لیکن وہ 1982ء آتے ہی اپنے وعدے سے مکر گیا' وہ خود کو عوام میں انتہائی پاپولر تصور کرتا تھا' 1988ء میں اس نے عوام کو تھوڑی سی آزادی دی اور اس کے بدلے میں ریفرنڈم کرا دیا' اس کا خیال تھا عوام اسے مزید دس برسوں کیلئے صدر منتخب کر لیں گے لیکن وہ ہار گیا' ملک میں صدارتی الیکشن ہوا اور عوام نے اپوزیشن لیڈر اور کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی کے پیٹریشیو ایلون ایزوکار کو صدر منتخب کر لیا جس کے بعد اسے صدارتی عہدہ چھوڑنا پڑا لیکن اس نے یونیفارم اتارنے سے انکار کر دیا' اس نے خود کو دس سال کے لئے بطور کمانڈر انچیف توسیع دے دی' اس نے خود کو تاحیات سینیٹر بھی بنا لیا۔

جنرل پنوشے چلی کو روشن خیال اور اعتدال پسند بنانا چاہتا تھا ''سب سے پہلے چلی''

اس کا فلسفہ حیات تھا لہٰذا وہ امریکہ کا ہر جائز ناجائز حکم فوراً مان لیتا تھا' اس نے امریکی شہریوں کو چلی میں خصوصی حقوق دے رکھے تھے' امریکہ نے چلی میں ایف بی آئی اور سی آئی اے کے باقاعدہ دفتر بنا رکھے تھے اور یہ لوگ ان دفتروں کے ذریعے پورے جنوبی امریکہ کو مانیٹر کرتے تھے' اس نے کیمونسٹوں کے ساتھ ساتھ تمام مذہب پسند عناصر بھی چلی سے فارغ کر دیئے' کسی نے ایک بار اس سے پوچھا تھا "تم ایک تابوت میں دو' دو تین تین مردوں کو کیوں دفن کرتے ہو" اس نے ہنس کر جواب دیا "میں قبرستانوں کی جگہ بچاتا ہوں" اس نے عدالتوں پر بھی قبضہ کر رکھا تھا' وہ نافرمان ججوں کو عہدے سے ہٹا دیتا تھا یا پھر انہیں "روڈ ایکسیڈنٹ" میں مروا دیتا تھا' اسے سیاستدان اچھے نہیں لگتے تھے' وہ انہیں ملکی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا چنانچہ اس کے دور میں زیادہ تر سیاستدانوں نے جلاوطنی اختیار کی یا پھر اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی' اسے کرنسی نوٹ بدلنے کا بھی شوق تھا اس نے اپنے دور میں چلی کے تمام نوٹ تبدیل کر دیئے' اسے شراب پینے اور پلانے کا بھی شوق تھا لہٰذا اس نے اپنے دور میں چلی میں بے تحاشا شراب خانے اور ڈسکو کلب بنائے' وہ خوش لباس تھا' اس کے سوٹ اٹلی سے سل کر آتے تھے اور نیو یارک میں ڈرائی کلین ہوتے تھے' اسے رقص دیکھنے کا بھی شوق تھا چنانچہ اس کے دور میں دنیا بھر کی اداکارائیں سان تیاگو آتی تھیں اور اس سے خوب داد پاتی تھیں' وہ سکیورٹی کے بخار میں بھی مبتلا تھا لہٰذا وہ جب صدارتی محل سے نکلتا تھا تو سان تیاگو کی ساری سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں اور اس کے آگے پیچھے' دائیں بائیں' بیسیوں بلٹ پروف گاڑیاں چلتی تھیں' اس کے بیڈ روم کے باہر توپیں اور میزائل نصب ہوتے تھے لیکن پھر اس کی زندگی میں ایک دن طلوع ہوا اور وہ سان تیاگو کی گلیوں میں رسوا ہو کر رہ گیا' اس کی اپنی بنائی ہوئی عدالتوں نے اس کے خلاف انکوائریاں شروع کرا دیں' اس کا اپنا بنایا ہوا قانون اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گیا' وہ دن دس مارچ 1998ء تھا' اس دن جنرل پنوشے نے یونیفارم اتاری' ریٹائرمنٹ لی اور زندگی آرام اور سکون کے ساتھ گزارنے کا اعلان کر دیا لیکن اگلے ہی دن اس کا احتساب شروع ہو گیا' وہ علاج کیلئے لندن گیا اور برطانوی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا' برطانوی حکومت نے 2000ء میں اسے سان تیاگو بھیجا تو عدالت نے اسے طلب کر لیا' اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی' تین ہزار لوگوں کے قتل اور وسیع کرپشن کا الزام تھا' 2004ء میں اس کا دو کروڑ 70 لاکھ ڈالروں کا ایک اکاؤنٹ بھی پکڑا گیا' وہ شدید ڈپریشن اور پریشانی کا شکار ہو گیا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی لوگ اس سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ اس نے

ایک دن اپنے خادم خاص سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا ''سر آپ خود کہا کرتے تھے یونیفارم آپ کی اصل طاقت ہے آج آپ اس طاقت سے محروم ہو چکے ہیں'' اس نے سر جھکا لیا۔ جنرل پنوشے کو تین دسمبر 2006ء کو ہارٹ اٹیک ہوا، اس کی انجیو پلاسٹی ہوئی لیکن وہ دس دسمبر کو دم توڑ گیا، دس دسمبر انسانی حقوق کا عالمی دن تھا' اس دن پنوشے کی موت قدرت کا اس سے انتقام تھا، اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی ''میری نعش کو جلا دیا جائے۔ مجھے خطرہ ہے لوگ میری قبر کی بے حرمتی کریں گے'' اس کا خدشہ درست تھا پنوشے کی موت پر ہزاروں لوگ گھروں سے نکلے اور انہوں نے سان تیاگو میں رقص شروع کر دیا تھا۔ وہ آتش بازی بھی کر رہے تھے، پولیس کو ان لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج اور آنسو گیس استعمال کرنا پڑی۔

جنرل پنوشے کی موت ایک اور آمر کا انجام تھی، اس موت نے ثابت کر دیا۔ زمین کا ہر آمر دنیا سے رسوا ہو کر رخصت ہوتا ہے، وہ اپنی آنکھوں سے اقتدار اور طاقت کو اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھتا ہے اور پھر ہائے ہائے اور اوئے اوئے کے نعروں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور دنیا میں شاید ہی کوئی آمر گزرا ہو جسے قبر اور مٹی نصیب ہوئی ہو اور جسے مرنے کے بعد بھی لوگوں نے یاد رکھا ہو۔ پنوشے کی موت نے ثابت کر دیا لیڈر اور آمر میں صرف انجام کا فرق ہوتا ہے، لیڈر دنیا سے ہمیشہ عزت کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد لوگ ان کی قبر پر دیا جلاتے ہیں جبکہ آمر ہمیشہ پنوشے کی موت مرتے ہیں اور لوگ ان کی قبر کی طرف پشت کر کے کھڑے ہوتے ہیں' لوگ مرنے کے بعد بھی ان سے نفرت کرتے ہیں لہٰذا میں صدر جنرل پرویز مشرف سے درخواست کرتا ہوں وہ اپنی میز پر جنرل پنوشے کی تصویر لگا لیں اور اٹھتے بیٹھتے اس پر ایک نظر ضرور ڈال لیا کریں اور اللہ سے دعا کیا کریں اللہ تعالیٰ انہیں صدر پنوشے کے انجام سے بچائے۔

# یونیفارم

وہ دنیا کا ایسا حکمران بننا چاہتا تھا جو مرنے کے بعد بھی یونیفارم میں رہے' اسے ریٹائر کے لفظ سے نفرت تھی' جب اس کا اقتدار سوا تیز سے پر تھا تو اس نے دو کام کئے' اس نے خود کو فیلڈ مارشل ڈکلیئر کر دیا اور دوسرا اس نے وصیت کی جب اس کا انتقال ہو تو اسے یونیفارم میں پورے فوجی اعزازات کے ساتھ دفن کیا جائے اور اس کے بعد اسے فیلڈ مارشل صدام حسین کے نام سے لکھا اور پکارا جائے۔



وہ 16 جولائی 1979ء کو عراق کا صدر بنا' اس وقت وہ عراقی فوج میں میجر جنرل تھا' وہ 24 برس تک مسلسل عراق کا حکمران رہا' اس کی ذات ایک ایسا گھنٹہ گھر تھی جس کے گرد اختیار واقتدار طواف کرتے تھے' وہ کہتا تھا میرا جوتا میرا آئین اور میرا قانون ہے' عراق میں چھ بڑے عہدے تھے' صدر' وزیراعظم' افواج کا سپریم کمانڈر' وزیر دفاع' چیئرمین انقلابی کمانڈ کونسل (آرسی سی) اور بعث پارٹی کا سیکرٹری جنرل' یہ سارے عہدے صدام حسین کے پاس تھے' وہ عراق کا مضبوط ترین شخص تھا لیکن وہ وردی کو اپنی اصل طاقت کہتا تھا' اس کا کہنا تھا اگر انتظامی اور سیاسی طاقت کو وردی کی قوت مل جائے تو وہ ناقابل تسخیر اقتدار بن جاتی ہے' وہ یونیفارم اتارنے کیلئے تیار نہیں تھا' اس کا کہنا تھا جس جرنیل کو یونیفارم کے ساتھ اقتدار ملے اسے زندگی میں اقتدار اور یونیفارم میں سے کوئی چیز ترک نہیں کرنی چاہیے' اس کا کہنا تھا یونیفارم اس کرہ ارض پر اللہ تعالیٰ کی

سب سے بڑی نعمت ہے اور جو لوگ اس نعمت کا کفران کرتے ہیں وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں' اس کی بات درست تھی' یونیفارم نے اسے وہ طاقت بخشی تھی جو اس سے پہلے عراق کے کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوئی تھی' اس نے یونیفارم کی طاقت سے پورا آئین بدل دیا تھا۔ اس نے عراق کا سارا قانون تبدیل کر دیا تھا' اس یونیفارم کی مہربانی سے اس کا ہر حکم قانون اور ہر خواہش آئین کا درجہ رکھتی تھی' وہ اگر کہہ دیتا کل سے عراق کے تمام شہریوں کی صبح نو بجے سے شروع ہو گی تو اگلے دن یہ حکم قانون کا درجہ اختیار کر جاتا تھا' پورا ملک صبح نو بجے آنکھ کھولتا تھا' وہ دو قسم کی فوجوں کا سربراہ تھا' ایک ملک کی فوج جس کی تعداد پانچ لاکھ تھی جس کے پاس طیارے' توپیں اور میزائل تھے اور دوسری اس کی ذاتی فوج' یہ فوج صدام حسین اور اس کے نظام کی ذاتی محافظ تھی' اس فوج کے پاس بیک وقت فوج' پولیس اور عدلیہ کے اختیارات تھے' یہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتی تھی' اسے سزا سنا سکتی تھی اور کسی سے اجازت لئے بغیر اس سزا پر عملدرآمد کر سکتی تھی' پورے عراق میں صدام کے ہزاروں لاکھوں مجسمے تھے اور ہر مجسمے میں اس نے فیلڈ مارشل کی وردی پہن رکھی تھی' عراق میں کہا جاتا تھا آپ اپنے گھر کی کھڑکی کھولیں' آپ اپنے گھر کے دروازے سے باہر نکلیں' آپ بازار میں آتے جاتے ہوئے دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھیں آپ کی نظر سب سے پہلے صدام حسین کی تصویر یا مجسمے پر پڑے گی۔ کہا جاتا تھا آپ بغداد میں رہ کر صدام حسین کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتے' کہا جاتا تھا بغداد کا ہر بچہ آنکھ کھولنے کے بعد سب سے پہلے صدام حسین کا شاندار اور بارعب چہرہ دیکھتا تھا اور یہ چہرہ دیکھتے دیکھتے جوان ہوتا تھا' صدام حسین اور اس کی یونیفارم عراق کی فضاؤں' عراق کی ہواؤں میں رچی بسی تھی' وہ روز وردی پہن کر دفتر جاتا تھا' واپسی پر وہ سوٹ پہنتا تھا لیکن اس کی یونیفارم اس کی میزائل پروف گاڑی میں اس کے ساتھ سفر کرتی تھی' وہ اس یونیفارم کو اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا' صدام حسین کے ماتحت اس کی اس نفسیاتی کمزوری سے واقف تھے چنانچہ اس کے دھوبی یونیفارم دھونے سے پہلے یونیفارم کو سیلوٹ کرتے تھے' استری کرنے والے استری پھیرنے سے پہلے یونیفارم کو سیلوٹ کرتے تھے اور اس یونیفارم کو آگے پیچھے لے جانے والے اسے اٹھانے سے پہلے سیلوٹ کرتے تھے' اس کا حکم تھا کرنل سے کم رینک کا کوئی افسر اس کی یونیفارم کو ہاتھ نہ لگائے' اس نے یونیفارم کا تقدس برقرار رکھنے کیلئے اپنے دھوبیوں' استری کرنے والے ملازموں اور یونیفارم کی ''ٹیک کیئر'' کرنے والے خادموں کو اعزازی کرنل کا عہدہ دے رکھا تھا۔

صدام حسین اور اس کی یونیفارم کامیابی سے چل رہی تھی لیکن پھر 2003ء آ گیا' امریکہ نے اتحادیوں کی فوجیں جمع کیں اور عراق پر حملہ کر دیا' صدام حسین اور اس کی یونیفارم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن جلد ہی دونوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا' صدام حسین روپوش ہو گیا اور بغداد فتح ہو گیا' سقوط بغداد کے بعد امریکی فوج کی تھرڈ انفنٹری ڈویژن کا ایک سپاہی ایئرپورٹ کی تلاشی لے رہا تھا تو اسے وہاں ایک شاپنگ بیگ ملا' اس بیگ میں ایک یونیفارم تھی' اس نے یونیفارم سیدھی کی تو وہ حیران رہ گیا' یہ صدام حسین کی وردی تھی' یونیفارم کے سینے پر صدام حسین کے تمام فوجی اعزازات اور تمغے سجے تھے' سپاہی نے یہ یونیفارم چھپا لی' 2003ء کے آخر میں یہ سپاہی واپس امریکہ آیا تو اس نے یہ یونیفارم امریکہ کے مشہور نیلام گھر ''ما نین انٹرنیشنل آکشن ہاؤس'' کے حوالے کر دی' ما نین کا شمار امریکہ کے چند بڑے نیلام گھروں میں ہوتا ہے' یہ نیلام گھر پچھلے 30 برس سے کام کر رہا ہے اور اسے فوجی اعزازات اور عسکری باقیات فروخت کرنے کا خصوصی تجربہ ہے' اس نیلام گھر نے نومبر 2005ء کو یہ یونیفارم آکشن پر رکھ دی' نیلام گھر نے اس یونیفارم کی ابتدائی قیمت 5 ہزار ڈالر طے کی تھی' کمپنی نے اس ضمن میں ایک ویب سائیٹ بنائی اور اس ویب سائیٹ کے ذریعے دنیا بھر میں موجود شائقین کو بولی کی دعوت دی' کمپنی کا خیال تھا عراق کے سب سے طویل حکمران اور سب سے بڑے عہدیدار کی یونیفارم کئی لاکھ ڈالروں میں فروخت ہو گی' کمپنی کا کہنا تھا وہ یونیفارم کی آکشن سے حاصل ہونے والی رقم کا ایک حصہ کسی خیراتی ادارے کو دے گی لیکن کمپنی کو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب گاہکوں نے صدام حسین کی یونیفارم خریدنے میں کوئی سرگرمی نہ دکھائی' یہ کمپنی اس سے قبل ہٹلر کی یونیفارم بھی بیچ چکی تھی اور اسے اس سودے میں کروڑوں ڈالر ملے تھے لیکن اس مرتبہ انہیں کاروبار میں گھاٹا پڑتا دکھائی دیا' صدام حسین کی یونیفارم کی بولی نومبر 2005ء میں پانچ ہزار چالیس ڈالر سے شروع ہوئی اور فروری 2006ء میں سولہ ہزار ڈالر پر آ کر رک گئی' آکشن ہاؤس نے بولی آگے لے جانے کی کوشش کی لیکن چھ ارب لوگوں کی اس دنیا میں انہیں سوا سولہ ہزار ڈالر دینے والا کوئی شخص نہیں ملا لہٰذا کمپنی کو مجبوراً یہ یونیفارم 16 ہزار ڈالر میں بیچنا پڑی۔

اگر ہم اس یونیفارم کی مالیت کا اندازہ لگائیں تو میرا خیال ہے صدام حسین کے فوجی اعزازات پر سولہ ہزار ڈالر سے زیادہ کی پالش لگی ہو گی' سولہ ہزار ڈالر تو اس یونیفارم کا دھوبی لے لیا کرتا تھا' میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یونیفارم کی اس ناقدری پر دلی دکھ ہوا' آپ مکافات عمل

دیکھئے جس صدام حسین کو پوری دنیا جانتی ہے اس صدام حسین کی یونیفارم کے بارے میں کوئی نہیں جانتا وہ اس وقت کس کے پاس ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے' میں نے سوچا ایک طرف یہ یونیفارم ہے اور دوسری طرف اس یونیفارم کا مالک ہے جو کپڑوں کے دوسرے جوڑے کو ترستا ترستا مر گیا' جسے سلیپروں کے نئے جوڑے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ میں ماہنین انٹرنیشنل کی ویب سائٹ دنیا کے تمام باوردی حکمرانوں کی ٹیبل پر لگوا دوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں "سر اخلاق اور اخلاص دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی ہے اور جو حکمران اس طاقت سے مالا مال ہوتا ہے اس کا نام ہزاروں وردیوں سے زیادہ دیرپا اور مضبوط ہوتا ہے" میں ان سے عرض کروں "سر یونیفارم چھ میٹر کپڑے' سوفٹ دھاگے اور آدھا میٹر بکرم کا نام نہیں' یہ اخلاق' سچائی اور ایمان کا نام ہوتا ہے اور جس شخص کے پاس یہ تینوں چیزیں ہوتی ہیں سر ان کے رومال بھی یونیفارم سے تگڑے ہوتے ہیں' سر ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور ان کی سوچ کا ہر مد و جزر آئین ہوتا ہے اور سر ہمارا کام' ہمارا اخلاص اور ہماری کوششیں ہمیں بڑا بناتی ہیں ہمارے کپڑے' ہمارے جوتے اور ہماری بلٹ پروف گاڑیاں نہیں' سر حضرت عمرؓ سے لے کر ماؤزے تنگ تک کسی کے تن پر یونیفارم نہیں تھی لیکن آج وقت ان کی چوکھٹ کو سیلوٹ کر رہا ہے کیوں؟ کیونکہ سر یہ لوگ اپنے ایمان کو اپنی طاقت سمجھتے تھے' یہ لوگ یونیفارم کی بجائے عوام کو اپنی قوت سمجھتے تھے اور سر یہ حقیقت ہے عوام وہ طاقت ہوتے ہیں جو لیڈروں کو اپنے دل' اپنے دماغ میں زندہ رکھتے ہیں' جو انہیں صدیوں تک پھیلی محبت اور عقیدت دیتے ہیں"

# ''ہمیشہ عاجز اور دستیاب رہو''

مرنے سے چند لمحے پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی' اس نے جیول کی طرف ہاتھ بڑھا دیا' جیول نے ہاتھ تھام لیا' ساتھ اس کی بہو کھڑی تھی' اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھا' بہو نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا' بک والڈ کی آنکھوں میں ممنونیت کا احساس ابھرا' اس نے آنکھیں بند کیں' ایک لمبا اور مطمئن سانس لیا اور اپنی روح خالق کائنات کے حوالے کر دی' اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے لگے' جیول اور جیول کی بیوی نے اس کے ہاتھ سیدھے کیے اور اس پر گردن تک چادر دے دی' جس کے بعد ایک عہد ختم ہو گیا' ساٹھ برس تک کروڑوں دلوں پر حکمرانی کرنے والا آرٹ بک والڈ فوت ہو گیا۔

آرٹ بک والڈ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا' اس کا کالم بیک وقت 1600 اخبارات میں شائع ہوتا تھا' آرٹ بک والڈ کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی' وہ 1925ء میں نیو یارک میں پیدا ہوا' دو مرتبہ ہائی سکول میں داخلہ لیا لیکن پڑھ نہ سکا' نیوی میں بھرتی ہوا' تین سال نوکری کی' سارجنٹ بنا اور استعفیٰ دے کر واپس آ گیا' یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلیفورنیا میں داخلہ لیا' تین سال یونیورسٹی میں پڑھا لیکن ناکام ہو گیا' 1948ء میں 250 ڈالر کا بندوبست کیا اور پیرس آ گیا' پیرس میں ''ورائٹی میگزین'' سے وابستہ ہو گیا' پیرس کی شبانہ زندگی پر ہلکا پھلکا کالم لکھا' لوگوں نے پسند کیا اور آرٹ بک والڈ کالم نگار بن گیا' 1952ء میں نیو یارک ہیرالڈ ٹریبون

نے کالم کو ''سینڈیکیٹ'' کر دیا۔ آرٹ بک والڈ کا کالم امریکہ کے 30 اخبارات میں شائع ہونے لگا' 1962ء میں وہ واپس امریکہ آ گیا' 1970ء میں اس کا کالم انٹرنیشنل سطح پر سینڈیکیٹ ہوا اور دنیا کے چھ سو اخبارات میں شائع ہونے لگا' وہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار تھا' اس نے 36 ماہرین کی ٹیم بنا رکھی تھی' یہ سب لوگ مل کر اس کا کالم پلان کرتے تھے' زبان کے ماہرین زبان کی باریکیاں ٹھیک کرتے تھے' قانونی ماہرین کالم کی قانونی پیچیدگیوں کا جائزہ لیتے تھے اور انسانی نفسیات کے ماہر کالم کی نفسیاتی جہتوں کا تجزیہ کرتے تھے' آرٹ بک والڈ کا کالم ایک مختصر سی مزاحیہ تحریر ہوتی تھی لیکن اس کے اثرات کئی مہینوں تک جاری رہتے تھے' اس کے فقرے اور خیالات عام لکھاریوں سے مختلف تھے مثلاً اس نے ایک کالم لکھا تھا ''ہم عجیب لوگ ہیں' ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارا گزرا ہوا کل ہمارے آج سے بہتر تھا' میں ان تمام لوگوں سے مختلف ہوں' میں آج کی خوبیاں جاننے کیلئے دس سال انتظار نہیں کر سکتا لہٰذا میں اپنے آج کو گزرا ہوا کل سمجھتا ہوں اور ہمیشہ آج سے لطف اندوز ہوتا ہوں' میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے آپ 2004ء کو 1994ء سمجھیں اور اسے خوب انجوائے کریں'' اس نے کسی جگہ ڈاکٹروں کا ذکر کیا' اس نے لکھا ''میری بیوی ایک بار ٹھوکر لگنے کے باعث گر گئی' اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی' ڈاکٹر نے کہا یہ نوے کے زاویے پر گری' اگر یہ 45 کے زاویے پر گرتی تو اس کی کلائی بچ سکتی تھی' اس دن سے میں نے گرنے کا یہ نسخہ پلے باندھ لیا ہے لہٰذا میں اپنے دوستوں کو ہمیشہ یہ مشورہ دیتا ہوں' اگر تم گرنے کا منصوبہ بناؤ تو تم مہربانی فرما کر 45 کے زاویے پر گرو تا کہ تمہاری کلائی بچ جائے''

میں آرٹ بک والڈ سے بہت متاثر تھا' میں 2001ء میں امریکہ گیا تو میں نے اسے فون کیا' اس کی سیکرٹری سے بات ہوئی' اس نے مجھے شام پانچ بجے کا وقت دے دیا' آرٹ بک والڈ ایک خوبصورت گھر میں شاہانہ زندگی گزار رہا تھا' اس کی سیکرٹری مجھے اس کی سٹڈی میں لے گئی' بک والڈ کتابوں کے ریکس کے درمیان بیٹھا تھا' اس کے پیچھے شیشے کی دیوار تھی اور دیوار کی دوسری طرف نصف درجن لوگ کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے' میں نے شیشے سے جھانکا تو بک والڈ نے قہقہہ لگا کر کہا ''مائی سٹاف'' میں شرمندہ ہو گیا' اس نے ہاتھ رگڑے اور شرارتی لہجے میں بولا ''سو مسٹر شودری تم زیرو پوائنٹ کے ٹائٹل سے کالم لکھتے ہو' تمہارے ہفتے میں تین کالم آتے ہیں' تمہارے کالموں کا سٹائل ڈرامائی ہے اور لوگ تمہیں پسند کرتے ہیں'' میں نے حیران ہو کر اس

کی طرف دیکھا' اس نے میز پر پڑی فائل کھولی' اس میں سے میرے چند کالم نکالے اور میرے سامنے رکھ دیئے' ایک کاغذ خود اٹھایا اور میرا پروفائل پڑھنا شروع کر دیا' وہ پڑھتا رہا' پڑھتا رہا جب کاغذ ختم ہوا تو مزاحیہ انداز میں بولا ''میں نے یہ ساری معلومات انٹرنیٹ سے نکالی ہیں' مجھے جب پتہ چلا میرا ایک پاکستانی دوست آ رہا ہے تو میں نے فوراً یہ معلومات جمع کر لیں تا کہ جب تم آؤ تو میں پاکستان اور تمہارے بارے میں سوال پوچھ کر تمہارا وقت ضائع نہ کروں' ہم اس ملاقات میں زیادہ بہتر گفتگو کر سکیں لہٰذا ٹیل می سم تھنگ اباؤٹ مشرف'' مجھے اس کا سٹائل بڑا اچھا لگا' وہ حقیقتاً ایک دلچسپ انسان تھا' اس نے مجھے بتایا وہ روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتا ہے' کالم لکھتا ہے' شام کو ٹینس کھیلتا ہے' اسے شطرنج جمع کرنے اور کھیلنے کا شوق ہے' اس کے پاس سینکڑوں قسم کی شطرنجیں تھیں' وہ ریس ٹریکس پر جاگنگ کرتا تھا اور مزاحیہ فلمیں دیکھتا تھا' اس نے مجھے بتایا اسے صدر بش اور اسامہ بن لادن اچھے لگتے ہیں' وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے ان دونوں نے کس طرح پوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے' ہم ایک گھنٹہ گفتگو کرتے رہے' چھ بجے میرا وقت ختم ہو گیا' اس کی سیکرٹری اندر آئی' میں نے جانے کیلئے اجازت چاہی' وہ اٹھا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا ''اگر تمہیں جلدی نہیں تو تم مزید آدھا گھنٹہ میرے پاس بیٹھ سکتے ہو'' میں بیٹھ گیا' اس نے سیکرٹری کو اشارہ کیا' وہ باہر گئی اور چند منٹ بعد ایک فائل لے کر اندر آ گئی ''مسٹر بک والڈ یہ ویتنام کا ایک طالب علم ہے' اس نے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب یہ جینز ٹیکنالوجی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے' اسے سکالر شپ چاہئے'' بک والڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا' سیکرٹری نے دوسرا پیپر پڑھنا شروع کر دیا ''یہ ساؤتھ افریقہ کی بچی ہے' کینسر کی مریضہ ہے' پچیس ہزار ڈالر میں اس کا علاج ہو سکتا ہے'' اس نے اس پر بھی اثبات میں گردن ہلا دی' سیکرٹری نے دونوں کاغذ اٹھائے اور باہر چلی گئی' بک والڈ نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ رگڑ کر بولا ''یہ میری عبادت تھی'' میں نے اس عجیب وغریب عبادت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا ''انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے' جسم' ذہن اور روح' ہم جسم کو تندرست رکھنے کیلئے ورزش کرتے ہیں اور ذہن کو چست و چالاک رکھنے کیلئے مطالعہ لیکن ہم اپنی روح کو ہمیشہ بھلا دیتے ہیں' ہم اسے زندہ اور چست و چالاک رکھنے کیلئے کچھ نہیں کرتے جبکہ ہمارے جسم اور ہمارے ذہن کی تمام جڑیں ہماری روح میں پیوست ہوتی ہیں' میں ایک غیر مذہبی انسان ہوں لیکن میں ورزش کو جسمانی عبادت' مطالعے کو ذہنی عبادت اور فلاح عامہ کو روحانی عبادت سمجھتا ہوں' میں ساڑھے چار سو اخبارات سے حاصل ہونے والی

آمدنی ذاتی زندگی پر خرچ کرتا ہوں جبکہ ڈیڑھ سو اخبارات سے آنے والے چیک اپنے چیرٹی اکاؤنٹ میں ڈال دیتا ہوں' میں روز شام چھ بجے سے ساڑھے چھ بجے تک چیرٹی کا کام کرتا ہوں' میں طالب علموں کو وظیفے دیتا ہوں' مریضوں کے علاج کا بندوبست کرتا ہوں' ہوم لیس لوگوں کی مدد کرتا ہوں اور میں سیلاب اور زلزلوں کے شکار لوگوں کی خدمت کرتا ہوں' میں اسے اپنی عبادت سمجھتا ہوں' میری یہ پریئر میرے دماغ' میرے جسم کو بھی صحت مند رکھتی ہے اور میری روح کو بھی'' میں نے اسے سیلوٹ کیا اور واپس آ گیا۔

آرٹ بک والڈ کی موت اس کی زندگی سے زیادہ دلچسپ تھی' فروری 2006ء میں اس کے دونوں گردے فیل ہو گئے اور وہ ہفتے میں تین دن ڈایا لیسس کرانے لگا' وہ ڈایا لیسس سے بور ہو گیا لہٰذا اس نے مرنے کا فیصلہ کیا' امریکہ میں دو قسم کے طبی مراکز ہوتے ہیں' پہلی قسم کے مرکز کو ہاسپٹل کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ہوسپس کہلاتی ہے' ہوسپس میں علاج سے مایوس مریض داخل ہوتے ہیں' ہوسپس میں داخل مریضوں کا علاج نہیں کیا جاتا' ڈاکٹر مریض کو ایک شاندار کمرے میں لٹا دیتے ہیں اور اس پر خواہشوں کے دروازے کھول دیتے ہیں وہ جو چاہتا ہے کھاتا ہے' جس سے چاہتا ہے ملتا ہے' کوئی شخص اسے منع نہیں کرتا یوں مریض ساری خواہشیں پوری کر کے فوت ہو جاتا ہے' آرٹ بک والڈ نے فروری 2006ء میں ڈایا لیسس بند کرایا اور ہوسپس چلا گیا' اس کے اس اقدام نے اس کی شہرت میں اضافہ کر دیا' امریکہ کے تقریباً تمام اخبارات' رسائل اور ٹیلی ویژن چینلز نے اسے خصوصی جگہ دی' ڈاکٹروں کا خیال تھا وہ دو تین ہفتوں میں انتقال کر جائے گا لیکن قدرت کا کمال دیکھئے وہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس کے گردوں نے بھی اچانک کام کرنا شروع کر دیا' وہ تین ماہ بعد ہوسپس سے نکلا اور معمول کے مطابق کالم لکھنے لگا' امریکہ کے ڈاکٹر اس معجزے پر حیران تھے لیکن میرا خیال تھا آرٹ بک والڈ کو اس کی ''عبادت'' نے زندہ رکھا تھا' وہ ان غریبوں' ناداروں اور مریضوں کی وجہ سے زندہ رہا جن کی خدمت کو وہ عبادت سمجھتا تھا' یہ آرٹ بک والڈ 18 جنوری 2007ء کو فوت ہو گیا' اس کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا جیول اور اس کی بہو اس کے پاس تھے' جیول بک والڈ نے میڈیا کو بتایا' میرے والد نے مرنے سے پہلے اپنے چاہنے والوں کو پیغام دیا ''ہمیشہ عاجز اور دستیاب رہو'' میں نے آرٹ بک والڈ کا یہ پیغام پڑھا تو میں بے اختیار ہنس پڑا' یہ فقرہ میرے بابے نے آرٹ بک والڈ کو دیا تھا' میں نے 2001ء میں آرٹ بک والڈ کو بتایا تھا ہمارے ایک سپر جیول سکالر ہیں' بابا جی' آپ اور بابا جی کے خیالات

بہت ملتے ہیں' وہ کہا کرتے ہیں" اللہ کی عبادت انسانوں کی خدمت سے شروع ہوتی ہے" آرٹ بک والڈ نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ رگڑ کر بولا" بابا جی اور کیا کہتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "وہ کہتے ہیں صوفی کی دو نشانیاں ہوتی ہیں' وہ زمین کی طرح عاجز اور ہوا کی طرح دستیاب ہوتا ہے" آرٹ بک والڈ یہ سن کر خاموش ہوا اور تھوڑی دیر سوچ کر بولا" ہاں انسان کو ہمیشہ عاجز اور دستیاب ہونا چاہیے"

# گڈ بائی مائی فرینڈز

آرٹ بک والڈ نے 2006ء کے وسط میں آخری کالم تحریر کیا تھا' اس کالم کا عنوان "گڈ بائی مائی فرینڈز" تھا۔ اس نے وصیت کی تھی یہ کالم اس کے انتقال کے بعد شائع کیا جائے۔



وہ اس کالم کے بعد بھی کالم تحریر کرتا رہا اور یہ کالم معمول کے مطابق اخبارات میں شائع ہوتے رہے لیکن اس کا آخری کالم اس کے جانے کا انتظار کرتا رہا یہ کالم اس کے انتقال کے بعد 19 جنوری 2007ء کو دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوا' آرٹ بک والڈ کے کالموں میں ہمیشہ طنز کی کاٹ اور مزاح کے رنگ رہے ہیں' اس نے اپنی 82 سالہ زندگی اور 60 سالہ صحافت میں کبھی سنجیدہ کالم نہیں لکھا' اس نے اپنی یہ روایت آخری کالم میں بھی نبھائی۔ آرٹ بک والڈ کے آخری کالم کے تجزیے سے پہلے میری خواہش ہے آپ ایک نظر اس کالم پر ضرور ڈال لیں' میں اس کے بعد آرٹ بک والڈ کے فن پر گفتگو کروں گا' آرٹ بک والڈ لکھتا ہے۔ "میرے دوستوں نے مجھے یہ آخری کالم لکھنے کا حکم دیا' ان کا کہنا تھا مجھے اس کالم کے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہئے لہٰذا میں آج ان کا یہ حکم بجالاتا ہوں' دوستو انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ اپنی زندگی کا حساب کرتا ہے' جب وہ زندگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا تجزیہ کرتا ہے' میں بھی جب اس لمحے اپنی زندگی کا حساب کر رہا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ٹینس میری زندگی کا اہم پہلو تھا' مجھے اس وقت اپنی زندگی کے تمام میچ اور وہ تمام کھلاڑی یاد آ رہے ہیں جنہیں میں نے اپنی خاص "لاب"

کے ذریعے شکست دی تھی' مجھے اپنی "لاب" پر یقین تھا لہٰذا میں سمجھتا تھا میں نہ صرف دنیا کے تمام کھلاڑیوں سے اچھی ٹینس کھیل سکتا ہوں بلکہ میں ٹینس کا ایک عظیم کھلاڑی بھی ہوں' میرا دوست کے۔ گراہم میرے اس خیال سے متفق نہیں تھا' وہ ہمیشہ میرے ساتھ کھیلا' میں نے اسے ہمیشہ شکست دی لیکن اس نے کبھی مجھے عظیم کھلاڑی تسلیم نہیں کیا۔ میں آج یہ سمجھتا ہوں گراہم ٹھیک تھا اور میں غلط' میں گراہم سے معافی مانگ چکا ہوں اور وہ مجھے معاف بھی کر چکا ہے۔

میں اس کالم میں وہ تمام باتیں لکھنا چاہتا ہوں جو میں زندگی بھر نہیں لکھ سکا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے میں اب بھی ایسا نہیں کر پاؤں گا' تاہم میرے لئے آپ تمام لوگوں کا ساتھ دنیا کی عظیم ترین مسرت تھا' میرے لئے یہ کافی تھا میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ نے مجھے عمر بھر اپنی زندگی کا حصہ بنائے رکھا۔ میں آج اعتراف کرتا ہوں آپ میں سے ہر شخص نے میری زندگی پر اثر چھوڑا میرے ہر قاری نے میری زندگی میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ میں اب اپنے آپ کو سمیٹ رہا ہوں' میں رخصتی کیلئے سامان باندھ رہا ہوں' مجھے اطمینان ہے میں نے جس طرح اپنی شرائط پر زندگی بسر کی تھی میں اسی طرح موت بھی اپنی مرضی کی منتخب کر رہا ہوں' پچھلے سال جب میرے دونوں گردے فیل ہوئے تھے تو میرے تمام دوستوں اور عزیزوں کا خیال تھا' مجھے اس بیماری کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے مجھے بار بار ڈایالسیس کی اذیت سے گزرنا چاہئے لیکن میں نے ہسپتال کی بجائے ہوسپس کا انتخاب کیا' میں نے اپنے لیے بیمار زندگی کی بجائے صحت مند موت پسند کی' میرے تمام دوستوں کو میرے اس فیصلے سے اختلاف تھا لیکن میں سمجھتا ہوں انسان کو دنیا سے رخصتی کی آزادی ہونی چاہئے' انسان کو اپنے لئے بہتر موت کے انتخاب کی اجازت ہونی چاہئے' میں نے اپنے لئے آرام دہ موت کا انتخاب کیا' میں نے آخری دن ہوسپس میں گزارنے کا اعلان کیا' میرے خاندان اور میرے ڈاکٹر دوست مائیک نیومین نے میری حمایت کی' مجھے معلوم ہے ڈاکٹر مائیک نیومین اور میرے خاندان کیلئے میرے اس فیصلے کی حمایت کتنی مشکل تھی لیکن یہ لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے لہٰذا انہوں نے میری آخری خواہش کا احترام کیا' میں آج ہوسپس میں بیٹھ کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں' میں اعتراف کرتا ہوں' ہوسپس میں آنا میرا ذاتی فیصلہ تھا کیونکہ مجھے ہوسپس کی موت سب سے بے ضرر اور آرام دہ محسوس ہوتی ہے لہٰذا میں ہوسپس میں رہ کر زندگی سے رخصت ہوتا ہوا اچھا محسوس کروں گا۔

زندگی کی ان آخری ساعتوں میں میرا دماغ نہ جانے کیوں کھانے پینے کی چیزوں کی

طرف مائل ہے۔ مجھے رہ رہ کر چاکلیٹ کی وہ ساری ٹافیاں یاد آ رہی ہیں جو میں زندگی میں نہیں کھا سکا' میں پچھلے چند ماہ سے جب بھی "چیز کیک فیکٹری" کے پاس سے گزرتا ہوں تو میں بے اختیار پرافٹ رول اور بنانا سپلٹ خرید لیتا ہوں' میرے لئے اب ان نعمتوں سے محروم رہنا ممکن نہیں' میں جانتا ہوں زندگی کی آخری ساعتوں میں کھانے پینے کے بارے میں سوچنا اور بنانا سپلٹ' پرافٹ رول اور چاکلیٹ ٹافیاں کھانا نہایت احمقانہ فعل ہے' یہ چیزیں طبی نکتہ نظر سے درست نہیں ہیں لیکن میں آخری وقت خود کو سزا دینا چاہتا ہوں' میں اپنے جسم کو بتانا چاہتا ہوں میں نے زندگی کے اچھے لمحوں میں خود کو ایسی شاندار اور مزیدار چیزوں سے محروم رکھ کر اپنے ساتھ زیادتی کی تھی۔ میں اپنے آپ کو بتانا چاہتا ہوں زندگی کے سفر میں مزیدار چیزوں سے محروم رہنا اپنے ساتھ ظلم ہوتا ہے۔

دوستو! زندگی کی ان آخری ساعتوں میں مجھے ایک گیت کا مصرعہ بار بار یاد آ رہا ہے" What's it all About,alfie" "ایلفی' یہ سب کیا ہے" میں نہیں جانتا میں نے زندگی میں جو کچھ کیا اس کی کیا اہمیت ہے' دنیا کے تخلیقی مواد میں میرے کالموں کی کیا حیثیت ہوگی لیکن اس کے باوجود مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے میں نے زندگی میں جو تخلیق کیا وہ کم از کم تین سال تک ضرور محفوظ رہے گا' لوگ مجھے کم از کم تین سال ضرور یاد رکھیں گے' آپ نے زندگی میں یہ فقرہ بار ہا سنا ہوگا" اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی بڑے مقصد کیلئے زمین پر بھیجا تھا" میں یہ سمجھتا ہوں ہمارا یہ خیال ہماری انا کی تسکین کا بہانہ ہے۔ ہم اور ہمارا کام سب کچھ فضول ہے لیکن اس کے باوجود مجھے نہ جانے کیوں یہ محسوس ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی خاص کام کیلئے دنیا میں بھجوایا تھا' مجھے معلوم ہے میرا یہ آخری کالم بھی خوراک کے کسی ڈبے پر لپیٹ دیا جائے گا یا لوگ اسے "THANKS GIVING DAY" کے موقع پر ایک دوسرے کو سنائیں گے اور اس کے بعد مجھے اور میرے کالم دونوں کو فراموش کر دیں گے لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتا ہوں میں کسی خاص کام کیلئے دنیا میں آیا تھا۔

میں آج جب آپ سے رخصت ہو رہا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں آپ سے What's it all about alfie کہوں اور آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے رخصت ہو جاؤں"۔

یہ بظاہر ایک سطحی اور عامیانہ سا کالم لگتا ہے' آپ کو اس میں سوائے آرٹ بک والڈ کے آخری کالم کے کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ کالموں کی تاریخ کی انتہائی

شاندار اور ناقابل فراموش تحریر ہے۔ یہ پیاز کے چھلکے کی طرح تہہ در تہہ کھلنے والا کالم ہے آپ اس کالم کا پس منظر ملاحظہ کیجئے یہ کالم ایک ایسے کالم نگار نے تحریر کیا ہے جو نہ صرف موت کے دروازے پر بیٹھا تھا بلکہ وہ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے موت کی چاپ سن رہا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اس کالم میں اپنی روایت اور اپنے آرٹ کو مجروح نہیں ہونے دیا' آرٹ بک والڈ نے پوری زندگی طنزیہ کالم لکھا تھا اس کالم میں بھی طنز کے تمام رنگ موجود ہیں' آرٹ بک والڈ نے ہمیشہ مختصر کالم لکھا تھا یہ کالم بھی اس کے دیگر کالموں کی طرح مختصر ہے' وہ زندگی بھر مایوسی سے دور رہا' اس کا یہ کالم بھی مایوسی سے پاک ہے اور اس کے تمام کالم اچانک ختم ہو جاتے تھے اس کا یہ کالم بھی کسی منطقی نتیجے پر پہنچے بغیر اچانک ختم ہو گیا لہٰذا آرٹ بک والڈ کی یہ آخری تحریر دنیا کے دوسرے لکھاریوں کی آخری تحریروں سے یکسر مختلف ہے' دنیا کے تمام مزاح نگار آخری تحریروں میں سنجیدہ ہو گئے تھے اور دنیا کے تمام مختصر نویس آخری وقت میں طوالت کا شکار ہو گئے تھے لیکن آرٹ بک والڈ شاید دنیا کا واحد لکھاری تھا جس کی پہلی اور آخری تحریر میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جس کے قلم نے آخری وقت تک طوالت اور سنجیدگی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا اور جس نے اپنے آخری کالم کو وصیت نہیں بننے دیا۔



ویل ڈن بک والڈ گو آرو ی ہیٹ۔

# شہباز شریف کی کہانی

میں دو مارچ 2007ء کو لندن پہنچا تھا اور تین مارچ کو میری میاں شہباز شریف سے پہلی ملاقات ہوئی تھی‘ میں 1999ء تک نواز شریف خاندان کا مخالف رہا تھا‘ اس مخالفت کی وجوہات میں بعض صحافیوں سے لے کر لاہور کے دو بٹ اور خواجے بھی شامل تھے جنہوں نے نواز شریف کو گھیر رکھا تھا اور جن کے بارے میں میرا خیال تھا یہ انسانی شکل میں فصلی بٹیرے ہیں‘ جس دن فصل کٹے گی یہ اسی دن دوسرے کھیت میں جا بیٹھیں گے‘ 12 اکتوبر کے بعد یہی ہوا‘ نواز شریف کے سارے بٹیرے اڑ گئے اور انہوں نے دوسرے کھیت اجاڑنے شروع کر دیئے‘ نواز شریف کے پروردہ صحافی ان کے خلاف لکھنے لگے‘ نواز شریف کے قریبی ساتھی ان کی پارٹی کو نگل گئے اور نواز شریف کے ذاتی دوست اسٹیبلشمنٹ کے مخبر بن گئے اور ان کے پاس صرف چودھری نثار‘ سعد رفیق‘ جاوید ہاشمی‘ تہمینہ دولتانہ اور احسن اقبال رہ گئے جبکہ صحافیوں میں صرف عطاء الحق قاسمی نے کیریکٹر کا مظاہرہ کیا‘ وہ آج تک نواز شریف کے لئے اکیلے لڑ رہے ہیں۔ 2000ء کے بعد میں نے نواز شریف خاندان کا مطالعہ شروع کیا تو 2006ء تک میرے دل میں ان کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا‘ اس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک وجہ نواز شریف تھے‘ مجھے اس عرصے میں نواز شریف بے گناہ دکھائی دینے لگے تھے‘ مجھے محسوس ہوا نواز شریف سے صرف ایک غلطی ہوئی تھی‘ انہیں جلا وطنی قبول نہیں کرنی چاہیے تھی‘ انہیں وقار کے ساتھ جیل کاٹنا چاہیے تھی‘ دوسری وجہ میاں

شہباز شریف تھے' 1999ء کے بعد میں پنجاب کے جس بیورو کریٹ سے ملا' میری جس سیاستدان' بزنس مین اور دانشور سے ملاقات ہوئی اس نے میاں شہباز شریف کے اخلاص' انتظامی صلاحیتوں اور ایمانداری کی تعریف کی' میاں شہباز شریف نے اڑھائی برسوں میں پنجاب میں حکمرانی کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا تھا جس نے آنے والے دنوں میں تاریخی حیثیت اختیار کر لی' آج یہ عالم ہے جنرل خالد مقبول ہوں یا چودھری پرویز الٰہی پنجاب کے تمام حکمران نفسیاتی طور پر میاں شہباز شریف کا مقابلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں' یہاں مجھے جنرل ریٹائرڈ محمد صفدر حسین کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے' جنرل محمد صفدر 1999ء کے بعد پنجاب کے گورنر بنے تھے' انہوں نے ایک بار مشہور بیورو کریٹ ناصر کھوسہ سے کہا تھا "میں پنجاب کے جس اچھے منصوبے کو ہاتھ لگاتا ہوں معلوم ہوتا ہے وہ شہباز شریف نے شروع کیا تھا' یار یہ شہباز شریف انسان تھا یا جن" میں پچھلے سات برس سے شہباز شریف کے ساتھ کام کرنے والے بیورو کریٹس سے ملتا آ رہا ہوں' ان میں ڈاکٹر توقیر شاہ' ڈاکٹر امجد ثاقب اور شہباز شریف کے سیکرٹری جاوید محمود بھی شامل ہیں' میں اس دوران میاں صاحب کے ساتھ تھوڑے عرصے کیلئے کام کرنے والے افسروں سے بھی ملا اور ان سے شہباز شریف کے بارے میں پوچھا ان برسوں میں ایک شخص کے سوا کسی نے شہباز شریف کے خلاف بات نہیں کی' شہباز شریف کے بڑے سے بڑے مخالف نے بھی ان کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کی' یہاں تک کہ فوجی اسٹیبلشمنٹ میں بھی شہباز شریف کے لئے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہ وہ ساری باتیں اور پس منظر تھا جس کی وجہ سے میں نے لندن پہنچتے ہی میاں شہباز شریف کو فون کیا اور دوسرے دن ہماری ملاقات طے ہو گئی۔

ہم پارک لین کے ایک ریستوران میں بیٹھ گئے' میاں شہباز شریف صحت مند اور فریش لگ رہے تھے' شہباز شریف نے اپنے خاندانی پس منظر سے بات شروع کی' ان کا کہنا تھا" ہمارے دادا صرف پانچ ایکڑ زمین کے مالک تھے' میرے والد نے 1930ء میں اپنے خاندان کی عنان سنبھالی تھی' ہم نے پوری دنیا میں کسی شخص کو اپنے والد سے زیادہ محنتی' مخلص' اچھا ایڈمنسٹریٹر اور سادہ نہیں دیکھا' انہوں نے 1930ء میں لوہا پگھلانے کی پہلی بھٹی لگائی اور اس کے بعد وہ زندگی بھر کام کرتے رہے' ہم نے انہیں کبھی آرام کرتے ہوئے یا فارغ بیٹھے نہیں دیکھا' جدہ کی سٹیل مل ان کا آخری پراجیکٹ تھا' وہ اس وقت شدید علیل تھے لیکن وہ اس کے باوجود ویل چیئر پر سائیٹ پر جاتے تھے اور اپنی نگرانی میں سٹیل مل کا کام کرواتے تھے' وہ ذاتی زندگی میں انتہائی سادہ تھے' ان

کے پاس صرف دو سوٹ ہوتے تھے لیکن وہ انہیں ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے تھے' انہوں نے پوری زندگی چھوٹی گاڑی استعمال کی اور وہ وقت کے انتہائی پابند تھے' ہم تین بھائیوں نے اپنے بزرگوں کے برعکس خوشحالی میں آنکھ کھولی تھی' ہم لوگ تانگے پر سکول جاتے تھے' ہم پورے سکول میں واحد بچے تھے جن کے پاس ذاتی تانگہ ہوتا تھا' میں جوانی میں شہزادوں کی طرح زندگی گزارتا تھا' میں نے باہر سے انتہائی مہنگی اور خوبصورت گاڑی منگوائی تھی' پورے ملک میں اس جیسی دوسری گاڑی نہیں تھی' میں فیکٹری جاتا تھا اور فیکٹری میں اس طرح کام کرتا تھا جس طرح بزنس مین اور مل اونر کیا کرتے ہیں لیکن پھر ایک واقعہ پیش آیا اور میری زندگی کا رخ بدل گیا'' وہ رکے اور انہوں نے قہوے کی پیالی منہ سے لگائی' وہ ذرا دیر بعد بولے'' میں نے 1985ء میں نواز شریف کی الیکشن مہم شروع کی' میں لاہور کی تنگ و تاریک گلیوں میں جاتا تھا اور لوگوں کو نواز شریف کی تصویر دکھا کر ووٹ مانگتا تھا' نواز شریف یہ الیکشن جیت گئے اور اس کے بعد وزارت میں مصروف ہو گئے' اس دوران حلقے کے لوگوں نے میرے پاس آنا شروع کر دیا' حلقے کے لوگوں کا کہنا تھا ہم نے آپ کے کہنے پر نواز شریف کو ووٹ دیئے تھے' وہ ہمیں ملتے نہیں ہیں لہٰذا اب ہمارا مسئلہ آپ حل کریں' میں شروع میں حلقے کے لوگوں کو ہفتے میں دو گھنٹے دیتا تھا' پھر دو دن میں دو دو گھنٹے دینے لگا اور اس کے بعد سارا دن اور پھر میں نے اپنے دو دن حلقے کے لوگوں کیلئے وقف کر دیئے' ہم پچھلی تین نسلوں سے رمضان میں ضرورت مندوں میں آٹا' گھی اور دالیں تقسیم کرتے آ رہے ہیں' اس سال میں نے حلقے کے لوگوں کو ٹارگٹ کیا اور میں اور خواجہ ریاض حق داروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے' ایک شام ہم نسبت روڈ کی ایک گلی میں داخل ہوئے اور ایک گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے' یہ ایک کمرے کا انتہائی خستہ حال مکان تھا، اندر ایک بوڑھی مائی دال صاف کر رہی تھی، چارپائی پر ایک نوجوان لڑکی لیٹی تھی، لڑکی کو ٹی بی تھی اور فرش پر اس لڑکی کا تھوکا ہوا خون پڑا تھا' دوسری بچی اس کمرے کے ایک کونے میں اپنے ہی بول و براز میں لتھڑی پڑی تھی، کمرے کے اندر اندھیرا اور بو تھی، مجھے مائی نے بتایا وہ لوگ اس کمرے میں رہتے ہیں، کھانا بھی اسی میں پکاتے ہیں، نہاتے بھی اسی میں ہیں اور اسی کمرے کے ایک کونے کو واش روم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں، ان لوگوں کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں باہر آیا اور مجھے اپنے کپڑوں، اپنے جوتوں اور اپنے لائف سٹائل سے نفرت ہونے لگی، میں اپنے آپ کو ان لوگوں کا مجرم سمجھنے لگا، میں نے اس دن اپنی گاڑی واپس کی، اپنے سارے سوٹ، سارے جوتے لوگوں میں تقسیم کیے اور اپنے آپ کو

لوگوں کیلئے وقف کر دیا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے کبھی بڑی گاڑی استعمال نہیں کی، میں نے ہمیشہ چھوٹی گاڑی میں سفر کیا اور صرف ضرورت کے دو جوڑے کپڑے بنائے، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا میں جب تک ان جیسے لوگوں کو ایک پر وقار زندگی نہیں دوں گا میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں اپنے ملک کو تبدیل کئے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا' میں اللہ تعالیٰ سے روز دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ مجھے ہمت اور موقع دے اور میں ان لوگوں کیلئے وہ سب کچھ کروں گا جس کیلئے یہ لوگ ترس رہے ہیں''۔

میں نے پوچھا ''آپ نے چیف منسٹر کی حیثیت سے پہلے دن کیا کیا'' وہ مسکرائے'' میں سب سے پہلے اپنے والد کے پاس گیا اور میرے والد نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی دلچسپ نصیحت کی، انہوں نے فرمایا'' اگر تم کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تم پنجاب کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اتفاق گروپ کے ساتھ کرتے تھے'' میں نے پوچھا'' وہ کیسے؟'' وہ بولے'' یاد کرو تم اتفاق فاؤنڈری کیلئے راتوں کو جاگتے تھے' تم نے اس کمپنی کیلئے پوری دنیا سے بہترین مشینری خریدی تھی' تم نے اس کیلئے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی حاصل کی تھی، تم نے فیکٹری کے لیے بہترین ورکرز کا بندوبست کیا تھا' تم نے اپنی زندگی کا سب سے اہم اور بہترین وقت فیکٹری کو دیا تھا اور تم سال کے آخر میں یہ دیکھا کرتے تھے تم نے اس سال کیا کھویا اور کیا پایا لہٰذا آج اتفاق کا شمار پاکستان کے بڑے گروپوں میں ہوتا ہے' میری نصیحت ہے اگر تم اس محنت' لگن اور اخلاص کے ساتھ پنجاب کیلئے کام کرو گے تو تم یہاں بھی وہی نتائج حاصل کرو گے، تم پاکستان کی تاریخ کے سب سے اچھے چیف منسٹر ثابت ہو گے''

# شہباز شریف سے دوسری ملاقات

میاں شہباز شریف کے ساتھ میری دوسری ملاقات سات مارچ کو ایجویر روڈ کے ایک پاکستانی ریستوران میں ہوئی' میاں صاحب نے مجھے ڈنر کی دعوت دی تھی اس دعوت کے دوران وہ ساڑھے تین گھنٹے بولتے رہے تھے اور میں بڑے غور سے ان کی بات سنتا رہا تھا' مجھے ان کے لہجے میں سچائی اور خلوص دکھائی دے رہا تھا' ان کا کہنا تھا ''ہمارا چار نکاتی ایجنڈا تھا' اخلاص' میرٹ' بھرپور مانیٹرنگ اور عام شہری کو فائدہ پہنچانا' ہم نے پورے پاکستان سے چن چن کر ایماندار' ذہین اور مخلص افسروں کو اہم عہدوں پر تعینات کیا' ان افسروں کی مانیٹرنگ کیلئے ایک فول پروف سسٹم بنایا اور پھر ایسی پالیسیاں بنانا شروع کیں جن سے عام شہریوں کو فائدہ ہو سکتا تھا' میرا ایمان ہے بھوتے اور کرپشن کا آغاز ہمیشہ بالائی سطح سے ہوتا ہے اگر چیف منسٹر کرپٹ ہوگا تو وہ صوبے سے کبھی کرپشن ختم نہیں کر سکے گا' میں نے سب سے پہلے خود کو مخلص' وقت کا پابند' میرٹ پر کاربند اور غیر جانبدار ثابت کیا' آپ یقین کیجئے سارا سرکاری نظام ٹھیک ہو گیا' میرے اڑھائی برسوں میں میرے بچے چیف منسٹر ہاؤس نہیں آئے' ایک بار حمزہ کو ایمرجنسی میں وہاں آنا پڑا تھا لیکن میں نے اسے اسی وقت باہر نکال دیا اس کے بعد اس نے کبھی وہاں قدم نہیں رکھا' میری گاڑی ہمیشہ سگنل پر رکتی تھی' میں نے کبھی دو سے زائد گاڑیاں استعمال نہیں کیں' میرے خاندان کے کسی فرد نے ان اڑھائی برسوں میں کوئی سرکاری گاڑی نہیں لی' ہمارے دور میں پورے پنجاب میں کوئی نئی گاڑی

نہیں خریدی گئی' مانیٹرنگ کا یہ عالم تھا میرے بیٹے سلیمان نے میٹرک کا امتحان دینا تھا ہم نے ان دنوں بوٹی مافیا کے خلاف آپریشن شروع کر رکھا تھا' میں نے لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کی وہ تلاشی کا سلسلہ میرے بیٹے سے شروع کرے' سلیمان کی تلاشی ہوئی جس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ ناراض ہو گیا لیکن میں نے پرواہ نہ کی' میٹرک میں سلیمان کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی' میں نے اسے ڈانٹا تو اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ابو میں نقل کے بغیر پاس ہوا ہوں' ہم میرٹ میں اتنے سخت تھے کہ وزیراعظم نواز شریف کی بہو میڈیکل کالج کی سٹوڈنٹ تھی میرے اوپر اس کی مائیگریشن کیلئے دباؤ آیا لیکن میں نے انکار کر دیا میرے پورے دور میں اس کی مائیگریشن نہیں ہوئی' ہم نے لاہور اور راولپنڈی کی پبلک ٹرانسپورٹ کیلئے ٹینڈر مانگے' دونوں شہروں کے ٹینڈر ہمارے سیاسی مخالفین نے جیتے' لاہور کا ٹھیکہ نیو خان کو ملا اور راولپنڈی کیلئے جنرل حمید گل کی بیٹی عظمیٰ گل نے کوالیفائی کیا' ہماری پارٹی نے اعتراض کیا لیکن میں نے میرٹ کے اصول کو مجروح نہ ہونے دیا' ہم نے لاہور شہر سے تجاوزات ختم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو سب سے پہلے اپنی پارٹی اور اپنے خاندان کی تجاوزات صاف کیں' جیل روڈ پر میرے ایک قریبی رشتہ دار کا پٹرول پمپ تھا' میں نے اپنی نگرانی میں یہ پمپ گرایا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار سفارش کے بغیر نوجوانوں کو پولیس میں نوکری ملی تھی' مجھے معلوم ہوا عبدالستار لالیکا مرحوم نے اپنے عزیز کے ذریعے ایک امیدوار کو قد کی حد میں رعایت دلائی تھی' میں نے نہ صرف بھرتی ہونے والے نوجوان کو فارغ کر دیا بلکہ لالیکا صاحب کے اس عزیز کو بھی صوبہ بدر کر دیا' عبدالستار لالیکا اس وجہ سے آخری وقت تک میرے ساتھ ناراض رہے' جب بیوروکریسی نے دیکھا میرے قول اور فعل میں کوئی تضاد نہیں تو اس نے بھی اپنا قبلہ درست کر لیا چنانچہ ہم نے اڑھائی سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو کسی دور میں نہیں ہو سکا' میری کامیابی کی دوسری وجہ فالو اپ تھا' میں رات کو اٹھ کر کسی سائیٹ پر چلا جاتا تھا اور کام کی کوالٹی اور رفتار کا خود جائزہ لیتا تھا' شروع شروع میں افسروں نے اسے میرا وقتی ابال سمجھا لیکن جب یہ سلسلہ تواتر کے ساتھ جاری رہا تو وہ بھی سنجیدہ ہو گئے' میں فجر کی نماز کے بعد کام شروع کرتا تھا اور رات دو بجے تک دفتر میں رہتا تھا' میں سمجھتا تھا میرے پاس وقت بہت کم ہے اور میں نے اس وقت میں وہ سب کچھ کرنا ہے جو پہلے نہیں ہو سکا"

میں نے پوچھا "آپ نے پنجاب کا سیاسی کلچر بدلنے کی کوشش بھی کی" وہ ذرا دیر رکے اور آہستہ آہستہ بولے "ہم نے سیاست سے چاپلوسی اور خوشامد ختم کرنے کی کوشش کی تھی' ہم

رمضان کے دوران آٹا سستا کر دیتے تھے' ایک رمضان میں ہم نے آٹا سات روپے سے پانچ روپے کلو کر دیا' میں دورے پر تھا' میں واپس آیا تو میں نے اپنے دفتر کے راستے میں کامل علی آغا اور لاہور کے میئر حسان کی طرف سے ایک خیر مقدمی بینر دیکھا' اس بینر پر لکھا تھا ہم آٹا سستا کرنے پر وزیراعلیٰ پنجاب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں' میں نے گاڑی رکوائی' نیچے اترا اور اپنی نگرانی میں یہ بینر اتروا دیا اور لاہور کے ڈپٹی کمشنر کو حکم دیا اگر آئندہ شہر میں اس قسم کا کوئی بینر لگا تو تم لوگوں کی خیر نہیں' میں جب تک چیف منسٹر رہا لاہور میں کسی کو دوبارہ ایسا بینر لگانے کی جرأت نہ ہوئی' میں نے اڑھائی سال میں کسی ایم این اے یا ایم پی اے کا کوئی غلط کام کیا اور نہ ہی ہونے دیا' میں پارٹی کے کسی لیڈر کو چند منٹوں سے زیادہ اپنے پاس نہیں بیٹھنے دیتا تھا' ہم نے بیٹھک اور گپ شپ کا کلچر ختم کر دیا تھا' ہم صرف اور صرف کام پر توجہ دیتے تھے' ہم نے سرکاری خزانے کا غیر سرکاری استعمال بھی بند کر دیا' میں نے اڑھائی برسوں میں اپنے تمام اخراجات اپنی جیب سے کئے تھے' میں نے اڑھائی سال میں چیف منسٹر ہاؤس کا قالین تک نہیں بدلنے دیا تھا'' وہ خاموش ہو گئے' میں نے عرض کیا ''فوج کو پہلی بار سیاست میں گھسیٹنے کی غلطی بھی آپ ہی نے کی تھی'' وہ ہاور رہے اور ہاں میں سر ہلا کر بولے ''یہ درست ہے' ہم نے گھوسٹ سکولوں کے لئے فوج کو استعمال کیا تھا اور اس کے بعد فوج کے لئے راستہ کھل گیا تھا' میں نے گھوسٹ سکولوں کا ٹاسک شروع میں پنجاب کے وزیر تعلیم چودھری اقبال کو دیا تھا' چودھری صاحب ہمارے پرانے ساتھی اور بھلے انسان تھے' وہ ہمیں چھوڑ گئے لیکن میں آج بھی ان کا احترام کرتا ہوں' چودھری صاحب نے دو ماہ تک کوشش کی لیکن ناکام ہو گئے اس کے بعد میں نے جنرل جہانگیر کرامت سے مدد مانگی' جنرل جہانگیر کرامت انتہائی شاندار اور سلجھے ہوئے انسان تھے' انہوں نے میرے اصرار پر یہ ذمہ داری اٹھائی' میں امن کے زمانے میں فوج کے سول استعمال کا حامی ہوں' امریکا کا سارا روڈ نیٹ ورک فوج نے بنایا تھا چنانچہ اس تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے گھوسٹ سکولوں کے بعد سڑکوں کی تعمیر اور واپڈا کا کام بھی فوج کو دے دیا لیکن یہ ہماری غلطی تھی اور اس کا ہم نے بعد ازاں نقصان اٹھایا'' میں نے پوچھا ''آپ پنجاب کو نئی شناخت دینا چاہتے تھے'' وہ مسکرائے ''ہاں' میں پنجاب کو پسماندگی' جہالت اور بیماری سے آزاد کرنا چاہتا تھا' 12 اکتوبر 1999ء کو جب ہماری حکومت ختم ہوئی تو اس وقت کراچی پورٹ پر ہماری بسوں کی پہلی کھیپ اتری تھی' یہ بسیں ہم نے لاہور میں چلانی تھیں اور ہمارا منصوبہ تھا پہلی بس میں چیف منسٹر' کابینہ کے ارکان' آئی جی اور چیف سیکرٹری سفر کریں اور اس

کے بعد روز کوئی نہ کوئی وزیر کسی بس کے ذریعے دفتر جائے گا اس سے لاہور کی ٹرانسپورٹ کا سارا نقشہ بدل جاتا' ٹرانسپورٹ کا یہ سسٹم ہم نے پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں بھی شروع کرنا تھا' میں نے ایک ایسے پنجاب کا خواب دیکھا تھا جس میں امن و امان ہوتا' انصاف ہوتا' میرٹ ہوتا' تعلیم اور صحت ہوتی اور جس میں خوشحالی ہوتی' ہم نے اڑھائی برسوں میں ان سب چیزوں کی بنیاد رکھ دی تھی' اگر مجھے مزید اڑھائی سال مل جاتے تو آج پنجاب ایسا پنجاب نہ ہوتا''

وہ رکے' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' انہوں نے ٹشو سے آنکھیں صاف کیں اور روندی ہوئی آواز میں بولے ''میں جب تک ایک رئیس زادہ' ایک بزنس مین اور دنیا دار قسم کا صنعت کار تھا اس وقت تک سسٹم نے مجھے قبول کیے رکھا لیکن جس دن میں بدل گیا جس دن میں نے اپنی ساری صلاحیتیں عام شہری کے لئے وقف کر دیں اس دن اس سسٹم نے مجھے اٹھا کر سمندر پار پھینک دیا'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''لیکن آپ لکھ لیں' میں واپس آؤں گا اور ملک کو ایک آئیڈیل شکل دینے کے سارے خواب پورے کروں گا' اللہ نے چاہا تو میں اپنا رول ادا کیے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا یہ میرا فیصلہ بھی ہے اور ایمان بھی''

# ایک صدر وہ بھی تھا

سردار محمد چودھری مرحوم پنجاب کے سابق آئی جی تھے' پنجاب کے موجودہ آئی جی چودھری احمد نسیم اور چودھری صاحب مرحوم میں دو باتیں قدر مشترک ہیں' دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہے اور دونوں انتہائی سیلف میڈ' انتہائی پروفیشنل اور نیک نام افسر ہیں' میرا دونوں کے ساتھ بڑا قریبی تعلق رہا' چودھری سردار کے ساتھ میری سٹوڈنٹ لائف میں ملاقاتیں شروع ہوئیں اور یہ ملاقاتیں ان کے انتقال تک جاری رہیں جبکہ چودھری احمد نسیم کے ساتھ پہلی ملاقات 1996ء میں ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے' سردار محمد چودھری نے ریٹائرمنٹ کے بعد تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کر دیا تھا' انہوں نے چند برسوں میں پانچ چھ انتہائی معیاری کتابیں لکھیں' یہ کتابیں جہاں ادبی لحاظ سے شاندار ہیں وہاں یہ پاکستان کی تاریخ بھی ہیں' میں پچھلے چند دنوں سے چودھری صاحب کی سوانح عمری پڑھ رہا ہوں' یہ ایک چشم کشا کتاب ہے' اس کتاب کے ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ درج ہے جو پڑھنے والے کو اندر سے ہلا دیتا ہے' میں جب اس کتاب کے مشرقی پاکستان کے باب پر پہنچا تو چودھری صاحب کے انکشافات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے افسردگی میں کتاب بند کر دی۔

چودھری صاحب 1971ء میں سپیشل برانچ کے ایس پی تھے' صدر یحییٰ خان اور ایوان صدر کی سکیورٹی ان کی ذمہ داری تھی' وہ صدر کے مسلح محافظوں کے انچارج بھی تھے لہٰذا انہیں صدر

اور ایوان صدر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا' انہوں نے اپنی آپ بیتی کے صفحہ 127 پر لکھا "پولیس کے سپاہی ان دنوں ایوان صدر کو کنجر خانہ' جی ایچ کیو کو ڈنگر خانہ اور اپنی پولیس لائنوں کو لنگر خانہ کہتے تھے" چودھری صاحب کا فرمانا تھا "صدر پرلے درجے کا شرابی اور عورتوں کا رسیا تھا' اس کا سکیورٹی انچارج کرنل ہم جنس پرست تھا' ایوان صدر میں دلال اور طوائفیں تھیں اور ان میں سے بعض کو انتہائی اہم مرتبہ حاصل تھا' ان میں اقلیم اختر رانی' مسز کے این حسین اور لیلیٰ مظفر سرفہرست تھیں' یہ خواتین سارا دن تمباکو نوشی' شراب نوشی اور ناچنے کودنے میں مصروف رہتی تھیں" پاکستان ٹوٹنے کے بعد چودھری سردار کو اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے خلاف تفتیش کا موقع ملا' انہوں نے 23 روز تک اس سے پوچھ گچھ کی' اس تفتیش کے دوران بڑے ہوش ربا انکشافات ہوئے مثلاً چودھری سردار نے اپنی آپ بیتی کے صفحہ 128 پر تحریر کیا "مجھے جنرل رانی نے بتایا میجر جنرل خداداد لاہور کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے' جنرل رانی اور میجر جنرل خداداد نے دولت جمع کرنے کا منصوبہ بنایا' ان دنوں رفیق سہگل' سہگل گروپ آف انڈسٹریز کے سربراہ تھے' ان دونوں نے اسے ایک سودے کی پیشکش کی' اگلے دن سہگل نے رانی سے فلیٹیز ہوٹل میں ملاقات کی' اسے 10 لاکھ روپے اور ایک نئی ٹیوٹا کار پیش کی' سہگل کے روانہ ہوتے ہی جنرل خداداد کمرے میں داخل ہوا' اس نے کار رانی کو دے دی اور رقم خود لے کر چمپت ہو گیا' جنرل رانی نے چودھری سردار کو بتایا رفیق سہگل بہت خوبصورت تھا اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی مگر سہگل نے اسے مثبت جواب نہ دیا' اس انکار کی اس بے چارے کو بڑی دلچسپ سزا بھگتنا پڑی' ایک دن گورنر ہاؤس پشاور میں پارٹی تھی وہاں جنرل رانی نے یحییٰ خان سے شکایت کی "آغا جی رفیق سہگل میرے نال محبت نہیں کردا" یحییٰ خان نے گورنر ہاؤس کے نگران کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "جب ملکہ الزبتھ یہاں آئی تھی تو وہ کس کمرے میں سوئی تھی" نگران نے کمرے کی نشاندہی کر دی' جنرل یحییٰ نے رفیق سہگل کو حکم دیا "آج رات تم مارشل لاء حکم کے تحت اسی کمرے میں سوؤ گے" رفیق اس حکم کی تعمیل سے انکار کی جرات نہ کر سکا' اس کے بعد یحییٰ خان رانی سے مخاطب ہوئے "موٹی تم اس کے پیچھے جاؤ۔ خدا حافظ" رانی رفیق کے پیچھے روانہ ہو گئی' دونوں کے داخل ہوتے ہی کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا" (صفحہ 129) رانی نے پوچھ گچھ کے دوران ایک اور واقعہ بھی سنایا' اس نے بتایا شاہ ایران پاکستان کے دورے پر آئے ہوئے تھے' انہوں نے کراچی سے واپس روانہ ہونا تھا' جنرل یحییٰ نے انہیں الوداع کہنا تھا' شاہ کے جانے کا وقت ہو گیا لیکن جنرل یحییٰ ابھی تک خواب

گاہ سے نہیں نکلے تھے‘ شام لیٹ ہونا شروع ہو گئے مگر کسی کو صدر کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی جرات نہیں تھی‘ اس کڑے وقت میں جنرل رانی کام آئی‘ صدر کے ملٹری سیکرٹری جنرل اسحاق نے رانی سے درخواست کی‘ تم اندر جاؤ اور صدر کو باہر لاؤ‘ وہ اندر گئی‘ اس روز ملک کی ایک مشہور ترین گلوکارہ صدر کی خواب گاہ میں تھی‘ اندر کا منظر اس قدر کراہت انگیز تھا کہ رانی تک کی طبیعت خراب ہو گئی‘ اس نے بڑی مشکل سے صدر کو باہر آنے کے قابل بنایا۔

چودھری صاحب کا کہنا تھا‘ رانی نے جرنیلوں‘ سیاستدانوں اور سینئر افسروں کے ساتھ میل ملاپ کے نتیجہ میں بے پناہ دولت اکٹھی کر لی تھی۔ جنرل یحیٰی خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد گجرات کے ایک مشہور سیاستدان نے اسے چھ ہزار روپے ماہوار الاؤنس دینا شروع کر دیا تھا۔ چودھری صاحب نے انکشاف کیا جب جنرل رانی کے بیانات کی روشنی میں جنرل یحیٰی سے جواب مانگا گیا تو انہوں نے جواب دیا ”میں اس خاندان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب میرے والد آغا سعادت علی کی بطور ایس پی گجرات میں پوسٹنگ ہوئی تھی‘ یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے‘ رانی میری بہن کی طرح ہے“ چودھری صاحب نے انکشاف کیا جنرل یحیٰی ہر رات اپنی پسندیدہ عورتوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے کر راولپنڈی اور اسلام آباد کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کے لئے نکل جاتا تھا۔ ان سڑکوں پر سکیورٹی کے افراد پہلے سے متعین کر دیئے جاتے تھے۔ بعض اوقات صدر اپنی کار میں‘ جس کی چھت نہیں تھی‘ سیدھا کھڑا ہو جاتا اور محافظ دستے کے سامنے اپنی داشتہ کے ساتھ چھیڑ خانیاں کرنے لگتا۔ مسلح محافظوں کو ایک مسلم ریاست کے سربراہ کی ایسی حرکتوں پر زبردست غصہ آتا تھا‘ میں نے سکیورٹی کے اس مسئلہ کا ذکر اپنے باس ڈی آئی جی قاضی محمد اعظم سے کیا تو وہ صدر کے خلاف باتیں کرنے پر ناراض ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا ”صدر کو سنگین قسم کے مسائل کا سامنا ہے انہیں اس کے بعد آرام اور تفریح کی ضرورت ہوتی ہے۔“ چودھری صاحب نے تحریر کیا‘ یحیٰی خان کے پاس عیش و عشرت کے لئے بہت سی داشتائیں اور کئی ٹھکانے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض تھا۔ ایک شام وہ مسز کے این حسین کے گھر گیا‘ یہ خاتون عرف عام میں ”بلیک بیوٹی“ کے نام سے مشہور تھی۔ اس کے شوہر مشرقی پاکستان پولیس اکیڈمی میں ہمارے پرنسپل رہ چکے تھے اور ان دنوں سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ کے آئی جی تھے۔ صدر نے تین دن اور تین راتیں وہاں گزاریں اور اس دوران کوئی بھی ان سے ملاقات نہ کر سکا۔ چوتھے روز وہ مسز حسین کو سٹیٹ گیسٹ ہاؤس لے گیا جہاں اسے اندرونی آرائش کرنے والی کے طور پر مستقل ملازم رکھ لیا

گیا اور اس کے شوہر کو سوئٹزرلینڈ میں سفیر بنا دیا گیا۔ یحییٰ خان کے مستعفی ہونے پر مسز حسین سٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے اسلام آباد منتقل ہو گئی اور اپنے بہنوئی کمال حسین کے ساتھ رہنے لگی' کمال حسین وزارت خارجہ میں افسر تھا۔ یحییٰ خان کی معطلی کے بعد میں اس خاتون کو ائیرپورٹ چھوڑنے گیا۔ راستے میں' میں نے اس سے پوچھ لیا فلاں موقع پر یحییٰ خان مسلسل تین دن اور تین راتیں تمہارے پاس کیوں ٹھہرا تھا؟ اس نے جواب دیا وہ صدر کو بنگالی میوزک سکھا رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر میرا پیمانہ لبریز ہو گیا' میں نے کتاب بند کی اور سوچا کیا 1971ء اور 2006ء میں صرف سن کا فرق نہیں' کیا ہم آج بھی یحییٰ خان کے دور سے نہیں گزر رہے' میرے پاس اپنے اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں تھا۔

# عبرت ناک انجام

سردار محمد چودھری نے اپنی کتاب میں یحییٰ خان کے خلاف ہونے والے ٹرائیل پر بھی روشنی ڈالی' چودھری صاحب کا کہنا تھا' جنرل یحییٰ خان دنیا کے دیگر آمروں کی طرح اپنی ''پاپولیرٹی'' کے خبط میں مبتلا تھا' اس کا خیال تھا ''عوام اسے بے انتہا پسند کرتے ہیں'' وہ اقتدار سے فراغت کے بعد اس غلط فہمی کا شکار تھا' لوگ اس کی محبت میں سڑکوں پر آ جائیں گے اور موجودہ حکمران اسے ایک بار پھر تخت پر بٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے' اس کا خیال تھا اس کا دور پاکستان کی تاریخ کا سنہرہ ترین دور تھا اور تاریخ کبھی اس کے کارنامے نہیں بھلا پائے گی' چودھری صاحب نے یحییٰ خان کی اس غلط فہمی کے بارے میں بڑا عبرت ناک واقعہ بیان کیا۔

''یحییٰ خان کو کمیشن کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے لانے اور لے جانے کے لئے مجھے دو کاریں اور ایک ہیلی کاپٹر دیا گیا تھا۔ ہم اسے صبح سویرے ہی بنگلہ (کھاریاں) سے بذریعہ ہیلی کاپٹر پنڈی لاتے تھے اور شام کو واپس لے جاتے تھے۔ آخری دن اس نے ہیلی کاپٹر میں سفر کرنے سے انکار کر دیا اور وہ بذریعہ سڑک جانے پر اصرار کرنے لگا۔ مجھے نہ تو ایسا کرنے کا اختیار تھا اور نہ ہی میں اس کے لئے تیار تھا کیونکہ ایسا کرنے میں سکیورٹی کا زبردست خطرہ تھا لیکن وہ سہالہ ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور اس نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے ہیلی کاپٹر میں جبراً سوار کرانے سے گریز کیا اور اسے سمجھانے لگا کہ قابل اعتماد ٹرانسپورٹ' سکیورٹی اور حفاظتی

دستہ وغیرہ فوری طور پر دستیاب نہیں ہیں لہٰذا ہیلی کاپٹر پر ہی چلے جائیں مگر اس نے ایک ضد بحثی اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ شور سن کر چیف جسٹس اور کمیشن کے دیگر ارکان باہر آ گئے۔ چیف جسٹس نے یحییٰ خان کے ساتھ طویل بحث کے بعد مجھے حکم دیا اسے سڑک کے راستے کھاریاں لے جاؤ۔ میں عدالت کا حکم بجالانے پر مجبور تھا' میں اسے کار میں لے کر نکل کھڑا ہوا' یحییٰ خان راستے میں کہنے لگا۔ ''مجھے راولپنڈی لے چلو''۔ میں نے پوچھا'' کیوں؟'' اس نے جواب دیا'' میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں''۔ اس کا لہجہ قطعی تھا'' یہ ناممکن ہے'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''کیوں؟'' اس نے بڑے تند لہجے میں سوال کیا۔ یحییٰ خان کا ردعمل ایسے شخص کا تھا جس نے زندگی میں کبھی حرف انکار نہ سنا ہو۔ ''اس لئے کہ لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا تو وہ آپ کی تکا بوٹی کر دیں گے''۔ ''لوگ میرے خلاف کیوں ہوں گے؟'' اس نے پوچھا'' مشرقی پاکستان میں شکست اور سقوط ڈھاکہ کے باعث وہ بہت برہم ہیں''۔ میں نے وضاحت سے بتایا۔ ''اس افسوسناک واقعہ کے ذمہ دار سیاستدان تھے' میں نہیں''۔ اب اس کے لہجہ میں احتجاج کا عنصر نمایاں تھا۔ ''عوام ایسی باریکیوں کو نہیں سمجھتے' وہ عام طور پر بے خبر ہوتے ہیں''۔ میں نے دوبارہ نرمی سے جواب دیا۔ ''کیا میں زیر حراست ہوں؟'' وہ جارحانہ انداز میں بولا۔ ''نہیں آپ میری حفاظتی تحویل میں ہیں'' اس نے انکار میں سر ہلایا'' مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں' میں راولپنڈی جانا چاہتا ہوں''۔ وہ اپنی بات پر ڈٹ گیا۔ ''سر میں آپ کو لوگوں کے غیظ و غضب سے بچانا چاہتا ہوں''۔ میں نے قدرے سختی سے کہا۔ ''کیا میں اچھوت ہوں''۔ یحییٰ خان نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔ اس کے بعد اس نے پنجابی میں واہی تباہی بکنا شروع کر دی اور بولا'' کیا میں نے کسی کی گدھی کو چھیڑا ہے''

چودھری صاحب تحریر کرتے ہیں' یہ خرافات سن کر مجھے بے حد غصہ آیا' تاہم میں نے ضبط سے کام لیا اور خاموشی اختیار کر لی کیونکہ میرے ساتھ ایک ایسا شخص بیٹھا تھا جو پاکستان کا صدر اور پاک فوج کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ وہ ملک کی تباہی کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا لیکن اسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ واضح فوجی شکست کے باوجود وہ سیاستدانوں کو موردالزام ٹھہرا رہا تھا۔ مجھے اس وقت اس کی حکومت کے وہ تمام منصوبے یاد آ گئے جن میں اس نے سیاستدان کو لمبا راستہ فراہم کرنے کا پروگرام بنایا تھا تاکہ وہ نئے آئین کی تیاری کی جان جوکھم مشق میں الجھ کر خود کو ہلاک کر لیں بعد ازاں اس نے اس کام کو یکسر ناممکن بنانے کیلئے'' ایک شخص'

ایک ووٹ'' کا حربہ بھی استعمال کیا تھا اور اس نے ون یونٹ کو بھی توڑ دیا تھا۔ مجھے یوسف چانڈیو کے ساتھ اس کی وہ گفتگو بھی یاد آ گئی جس میں اس نے بھٹو کو مجیب کے خلاف صف آرا کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ یحییٰ خان مجھے سچ مچ شیطان لگنے لگا۔ میں انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا جب ہمارے سامنے سے گزرنے والی ٹرین کے شور نے مجھے چونکا دیا اور پتہ چلا ہم سہالہ کے ریلوے پھاٹک پر رک گئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس ویران جگہ میں بھی یحییٰ خان کو پہچان لیا' اس کے بعد میں نے دیکھا ہماری کار کو پتھر مارے جا رہے ہیں۔ یحییٰ خان کی خوش قسمتی سے پھاٹک جلد ہی کھل گیا اور ہم نے بھگوڑوں کی طرح رفتار تیز کر دی۔ یحییٰ خان کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بری طرح کانپنے لگا جیسے اس کا دم نکل رہا ہو۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں خاصی دیر تک اس کی اس حالت سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس موقع پر میں نے اس سے کہا ''سر راولپنڈی چلیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلا دیا ''نہیں' ہمیں بنی بنگلہ جانا چاہئے' تم ایک سرکاری ملازم ہو اور میں تمہارے لئے مشکلات پیدا نہیں کرنا چاہتا'' وہ مجھ پر احسان جتانے کی کوشش کر رہا تھا' اس چیز نے میرے دل میں اس کے خلاف مزید نفرت پیدا کر دی لہٰذا میں نے بدتمیزی سے جواب دیا ''میں نہ صرف تمہیں راولپنڈی لے جاؤں گا بلکہ اپنی گاڑی راجہ بازار کے بیچ سے گزاروں گا'' میری بات سن کر وہ اب تھر تھر کانپنے لگا' اس نام نہاد ''غدر سپاہی'' کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ شخص جو پوری دنیا بلکہ بڑی طاقتوں کے خلاف بھی انتہائی غلیظ زبان استعمال کرتا تھا۔ وہ صرف چند پتھروں سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ وہ آخر میں میری منتیں کرنے لگا۔ ''مجھے بنی بنگلہ لے چلو'' ظاہر ہے میں اسے کسی صورت راولپنڈی نہیں لے جا سکتا تھا۔ بنی ریسٹ ہاؤس پہنچنے پر اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ایبٹ آباد منتقل کر دیا جائے۔ ''کیوں؟'' میں نے اس سے پوچھا ''براہ کرم کسی سے کہیں' میں اس جگہ کو بالکل پسند نہیں کرتا' یہاں گیدڑوں کی بھرمار ہے جو رات کو بہت زیادہ شور مچاتے ہیں۔'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا' میں نے جواب دیا ''سر آپ کو بہت اچھے ساتھی میسر ہیں'' وہ میرے ریمارکس پر چیں بجبیں تو ہوا لیکن اس نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ جب میں راولپنڈی واپس پہنچا تو میں انتہائی غصے اور پریشانی کی حالت میں تھا' میں اس کا مکروہ چہرہ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا' میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا' میں اس کی حفاظت کیلئے آئندہ اپنے کسی ماتحت کو بھیج دیا کروں گا' میں ایسا ہی کرتا رہا' جب اس سے بھی تنگ آ گیا تو میں نے آخر کار اس کی خواہش انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر تک پہنچا دی''

میں نے چودھری سردار صاحب مرحوم کی کتاب میں یہ سارے واقعات پڑھے تو میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں نے سوچا اگر آمروں کی زندگی سے عبرت ناک انجام نکال دیا جائے تو دنیا میں ان سے زیادہ آئیڈیل حالات کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھتا' یحییٰ خان ایک شاندار حکمران تھا اگر اس کی زندگی میں 1971ء نہ آتا تو شاید وہ اب تک ملک پر حکمران ہوتا اور ملک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہوتا اور ہمارے سیاستدان اسے اب تک دس بار یونیفارم میں صدر منتخب کرا چکے ہوتے' میں نے سوچا ہم کیسے شاندار لوگ ہیں' ہم تاریخ تک سے سبق نہیں سیکھتے' ہم دیوار پر لکھی تحریریں تک نہیں پڑھتے۔

☼......☼......☼
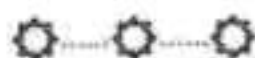
# انسان آخر انسان ہے

ڈاکٹر الا بشیر عراق کے مشہور فزیشن اور سرجن تھے' وہ بغداد یونیورسٹی کے پلاسٹک سرجری اور ری کنسٹریکٹر سرجری کے شعبے کے سربراہ بھی رہے تھے۔ انہوں نے 20 برس تک صدام حسین اور ان کے خاندان کے ذاتی معالج کی حیثیت سے کام کیا۔ ان 20 برسوں میں انہیں صدام فیملی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سقوط بغداد کے بعد انہوں نے صدام کے بارے میں ایک چشم کشا کتاب لکھی' اس کتاب میں انہوں نے صدام حسین کی ذاتی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر بشیر نے انکشاف کیا صدام حسین اپنی مونچھوں کے بارے میں بہت حساس تھے' وہ ان کا خصوصی خیال رکھتے تھے' وہ اپنی مونچھیں رنگتے تھے لیکن ان کی پوری کوشش ہوتی تھی لوگ ان کی مونچھوں کے رنگ کو قدرتی سمجھیں' ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین ایک بار اپنے بیٹے اودے حسین سے ناراض ہو گئے۔ انہوں نے اودے کی ساری کاریں جمع کرائیں' خود کرسی پر بیٹھے اور ان کاروں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا' خادمین نے کاروں آگ لگا دی اور یوں کروڑوں ڈالر کی کاریں جل کر راکھ ہو گئیں۔ جتنی دیر کاریں جلتی رہیں صدام حسین اطمینان سے سگار پیتے رہے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین کا بیٹا اودے حسین نفسیاتی مریض تھا' وہ خواتین کو سگریٹ سے داغتا تھا' ان کے جسم کو چاقو سے چھید ڈالتا تھا اور اس کے بعد ان خواتین کا علاج ڈاکٹر کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ صدام حسین وہمی اور

ضعیف الاعتقاد بھی تھے' اگر انہیں راستے میں کالی بلی نظر آ جاتی تھی تو وہ اپنے کانوائے کا رستہ بدل دیتے تھے' وہ پلاسٹک کے سیاہ شاپنگ بیگوں سے بھی خائف تھے۔ اگر انہیں راستے میں سیاہ بیگ نظر آ جاتے تھے تو بھی وہ راستہ بدل لیتے تھے۔ ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین اور ان کا خاندان خوبصورت نظر آنے کے خبط میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر کو ایک بار صدام حسین کی دوسری بیگم سمیرہ شاہ بندر کی ''فیس لفٹنگ'' کا حکم ملا' یہ ایک خفیہ آپریشن تھا' صدام حسین اور ان کی بیگم اس آپریشن کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی لہٰذا جتنے دن یہ کام ہوتا رہا ڈاکٹر اتنے دن منظر سے غائب رہا۔ صدام حسین کی ایک نواسی اپنی ناک کو ستواں بنانے کے شوق میں مبتلا تھی' وہ روز بیس پچیس لڑکیوں کے ساتھ کلینک آ جاتی اور ڈاکٹر سے پوچھتی ان میں سے کس کی ناک اچھی ہے۔ ڈاکٹر جس کی طرف اشارہ کر دیتا وہ کہتی میری ناک ایسی بنا دیں' ڈاکٹر کا کہنا تھا وہ لڑکیوں کی قطار میں ایسے بیٹھتی تھی جیسے وہ مقابلہ حسن میں شرکت کیلئے آئی ہو۔ صدام حسین عوام میں اپنے امیج کے بارے میں بھی بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ 1991ء میں وہ حادثے کا شکار ہو گئے' ان کے چہرے پر چوٹیں آئیں جس کے بعد ڈاکٹر ان کے چہرے پر پٹیاں لگانے لگا تو صدام حسین نے منع کر دیا' ان کا خیال تھا وہ اس حالت میں کمزور اور لاغر نظر آئیں گے اور وہ اگلے دن ٹیلی ویژن پر بھی نہیں آ سکیں گے' اس حادثے میں ان کی چھوٹی انگلی پر چوٹ لگ گئی' وہ کئی دنوں تک اس چوٹ کے بارے میں متفکر اور پریشان رہے اور ڈاکٹر نے انکشاف کیا صدام حسین نے پورے ملک میں اپنے پوسٹر' اپنے پورٹریٹ' اپنی پینٹنگز اور اپنے مجسمے لگوا رکھے تھے' عراق کی کرنسی تک پر صدام حسین کی تصویر تھی' آپ جس سرکاری سکول' کالج' ائرپورٹ پر جاتے تھے' جس سڑک' جس شاپنگ سنٹر اور جس بازار میں آتے تھے آپ کو ہر طرف صدام حسین کی تصویر' مجسمے اور پورٹریٹس نظر آتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا عراق کا کوئی شہری صدام کی نظروں سے اوجھل نہیں۔

میں نے جب صدام حسین کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کے بارے میں یہ ساری باتیں پڑھیں تو میرے ذہن میں صدام حسین کی ایک ایسی تصویر بنی جس میں وہ نازک مزاج' سیلف سینٹرڈ اور شاہانہ عادات کے مالک ایک آزاد منش انسان تھے۔ اس کے بعد میں نے صدام حسین کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے کو ہن کوہلن کی تحریریں پڑھیں' کو ہن کوہلن صدام حسین کا سرکاری سوانح نگار تھا۔ وہ بڑا عرصہ صدام حسین کے قریب رہا تھا' اس سال جون میں لندن کے ایک اخبار نے صدام حسین کی چند

برہنہ تصاویر شائع کی تھیں۔ یہ تصاویر صدام حسین کے ''سیل'' سے کھینچی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں وہ اپنا ''انڈرویئر'' تلاش کرتے دکھائے گئے تھے' کوہن کوہلن نے اس واقعے سے متاثر ہو کر برطانیہ کے اخبار ''ڈیلی میل'' میں بڑا شاندار مضمون لکھا' اس مضمون میں اس نے لکھا' صدام حسین ایک ایسا شخص تھا جس کی خوش لباسی کے چرچے پوری دنیا میں ہوتے تھے۔ ان کے سوٹ لندن کے مشہور اور معروف ٹیلر سیتے تھے' ایک وقت تھا جب دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی سوٹ صدام حسین کے پاس تھے' ان کی وارڈ روب میں 300 قیمتی سوٹ اور دو اڑھائی ہزار جوتے ہوتے تھے' ان کے 48 محلات تھے جن کی دیواریں سنگ مرمر کی تھیں' باتھ رومز کی ٹونٹیوں اور دروازوں کے ہینڈلوں پر سونے کا پانی چڑھا تھا اور محلات کے اندر آبشاریں گرتی تھیں۔ ان کی سرکاری رہائش گاہوں کی تعداد بھی 70 سے 80 تھی اور وہ بھی اتنی ہی شاہانہ اور افسانوی تھیں' صدام حسین کی تین بیویاں تھیں اور وہ اور ان کی اولادیں بھی اسی شاہانہ انداز سے زندگی گزارتی تھیں۔ کوہن کوہلن کی تحریروں سے صدام حسین کے بارے میں میرا تاثر مزید گہرا ہو گیا۔



یہ صدام حسین کی زندگی کا ایک فیز تھا' اس فیز کو گزرے اب اڑھائی برس ہو چکے ہیں' صدام حسین پچھلے دو برسوں سے اپنے محل کے لان میں پندرہ فٹ کے سیل میں بند ہیں' وہ اس سیل کو خود صاف کرتے ہیں' باتھ روم تک خود دھوتے ہیں' انہیں کپڑوں کے دو جوڑے' پلاسٹک کے سلیپر اور ایک عربی چوغہ فراہم کیا گیا ہے اور کمرے کے مرکزی دروازے کے تالے کا سوراخ ان کا بیرونی دنیا سے واحد رابطہ ہے' وہ جب کمرے کی زندگی سے اکتا جاتے ہیں تو وہ تالے کے سوراخ پر جھک کر باہر دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ صدام حسین کی زندگی کا دوسرا فیز ہے جو انتہائی افسوسناک اور قابل رحم ہے لیکن آپ افسوس کے اوپر ایک اور افسوس ملاحظہ کیجئے میں نے 14 دسمبر 2005ء کے اخبارات میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھی یہ خبر پاکستان کی سرکاری نیوز ایجنسی نے جاری کی تھی' اس خبر میں انکشاف ہوا ''صدام حسین کو دو برسوں میں جوتوں کا صرف ایک جوڑا فراہم کیا گیا اور صدام حسین نے پچھلی پیشی کے دوران عدالت سے مطالبہ کیا انہیں اور ان کے ساتھیوں کو نئے جوتے فراہم کئے جائیں۔ عدالت نے سرکاری وکیل کا موقف پوچھا' سرکاری وکیل نے عدالت کو یقین دلایا صدام حسین کو چند دنوں میں جوتوں کا ایک نیا جوڑا فراہم کر دیا جائے گا۔ صدام حسین نے عدالت کو بتایا انہیں کپڑے دھونے اور سگریٹ پینے کی بھی اجازت نہیں تاہم ان معاملات کے بارے میں عدالت نے کوئی فیصلہ نہیں کیا'' میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے یقین نہ آیا جوتوں کے

ایک جوڑے کا مطالبہ کرنے والا صدام حسین عراق کا وہی حکمران ہے جو دو برس پہلے تک 48 محلات' تین سو قیمتی سوٹوں' اڑھائی ہزار جوتوں' خوشبو کی آٹھ دس ہزار بوتلوں اور گیارہ سو قیمتی کاروں کا مالک تھا' جس نے اپنی مونچھیں رنگنے کیلئے بارہ ماہرین کی ٹیم رکھی ہوئی تھی' جس کے سگار ہوانا سے آتے تھے' جس کیلئے مشروبات فرانس کی کمپنیاں بناتی تھیں اور جس کے سوٹوں کیلئے فیکٹریوں میں خصوصی کپڑا بنتا تھا' جس کا ماپ لینے کیلئے ٹیلر لندن سے آتے تھے' جس کے کپڑے دھونے کیلئے بغداد میں ''رائیل واشنگ سینٹر'' بنایا گیا تھا' جس کے ایک سوٹ کی باری ایک سال بعد آتی تھی اور جس کے لباس' جوتوں اور خوشبوؤں کی حفاظت کیلئے ایک پورا سیکرٹریٹ تھا۔ مجھے یقین نہ آیا وہ صدام حسین آج جوتوں کے ایک جوڑے کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہے۔ افسوس کیا بلندی تھی اور صد افسوس اب کیا پستی ہے۔ میں نے برسوں پہلے کسی کتاب میں پڑھا تھا اقتدار ایک ایسا نشہ ہوتا ہے جو انسان کو اندھا کر دیتا ہے اور بہرہ بھی' جو انسان کو یہ یقین دلا دیتا ہے تم اس کائنات کے لئے ناگزیر ہو۔ عجیب بات ہے دنیا کا ہر حکمران زندگی میں کبھی نہ کبھی اس مغالطے کا ضرور شکار ہوتا ہے۔



میرا جی چاہتا ہے میں صدام حسین کے سیل کی تصویر بناؤں اور یہ تصویر دنیا کے تمام حکمرانوں کے بیڈرومز میں لگا دوں اور اس کے بعد ان سے عرض کروں ''حضور انسان آخر انسان ہے وہ کبھی خدا نہیں بن سکتا اور دنیا میں اللہ کے سوا ہر صاحب اقتدار کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے' حضور دنیا کا ہر حکمران ایک بار اپنی کرسی سے نیچے ضرور اترتا ہے اور وہ اپنے محل سے باہر ضرور آتا ہے' کبھی اپنے قدموں پر اور کبھی دوسروں کے کندھوں پر''۔

# ''افسوس میں مر رہا ہوں''

گبریل گارسیا مارکیز کولمبیا میں پیدا ہوا' کولمبیا ہی میں رہا اور اب وہ کولمبیا ہی میں مر رہا ہے چالیس کی دہائی میں اس نے اپنے کیریئر کا آغاز اخبار سے کیا تھا لیکن پھر جلد ہی پیشہ صحافت ترک کر کے ادب کی وادی پرخار میں داخل ہو گیا' ابتداً اس کے چند افسانے اس کی وجہ توقیر بنے لیکن اسے اصل شہرت اس کے عظیم ناول ''ہنڈرڈ ایئرز آف سالی ٹیوڈ'' سے ملی' یہی وہ ناول تھا جسے نقاد تاریخ کا عظیم ترین ناول کہتے ہیں اور اسی ناول کی بنیاد پر مارکیز کو 1982ء میں ادب کا نوبل پرائز ملا۔

بوڑھے گبریل گارسیا مارکیز کا شمار دنیا کے ان خوش نصیب لکھاریوں میں ہوتا ہے جنہیں قدرت نے زندگی ہی میں عالمگیر شہرت بھی بخشی' دولت بھی دی' آسائش سے بھی نوازا اور محبت بھی ودیعت کی' مارکیز بلاشبہ ایک ایسا خوش بخت انسان تھا جس کے ہونٹوں پر پہنچ کر خواہش قبولیت کا روپ دھار لیتی تھی' جس نے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں لاکھوں نازک ہتھیلیوں پر آٹو گراف دیئے تھے اور جس کی ایک ایک کتاب کے ملین ملین ایڈیشن فروخت ہوئے تھے لیکن آج یہی مارکیز اپنے اداس' خاموش اور ویران بیڈروم میں موت کی چاپ سن رہا ہے' اس کا کینسر بگڑ چکا ہے' اس کا جسم بے حس اور دماغ سن ہو چکا ہے اور اس کے پاؤں ساکت اور ہاتھ بے حرکت ہو چکے ہیں' رہی بینائی تو وہ اب اپنی خوابناک آنکھوں سے صرف دھوپ اور چھاؤں میں تمیز کر سکتا

ہے' آپ اس کی بے بسی کی انتہا دیکھئے وہ آنکھیں جو کبھی چہروں کی جھریوں میں لکھی کہانیاں پڑھ لیتی تھیں اور جو آنکھوں میں چھپے عکس دیکھ لیتی تھیں' وہ آنکھیں اب کھڑکی سے اندر جھانکتی بیلیں اور سوپ کے پیالے سے اڑتی بھاپ تک نہیں دیکھ سکتیں' آپ ستم دیکھئے دنیا کا عظیم لکھاری اب برسوں پرانے ملازمین کو پہچاننے کیلئے ان کی آوازوں کا محتاج ہو چکا ہے' گبریل گارسیا مارکیز زندگی اور زندگی کی گرم جوشیوں سے ریٹائر ہو چکا ہے' اس نے جنوری 2001ء میں اپنے سیکرٹری کو اپنا آخری پیغام لکھوایا' یہ پیغام مارکیز کے کمپیوٹر سے جاری ہونے والی اس کی آخری تحریر ہے' یہ پیغام' یہ خط مارکیز کی اپنے چاہنے والوں کے نام وصیت بھی ہے' ایک مرتے ہوئے انسان کا نوحہ بھی اور انسانی زندگی کا مرثیہ بھی' یہ ایک زندہ انسان کا اعتراف شکست بھی ہے اور ایک مرتے ہوئے انسان کی حسرت بھی' مجھے یہ خط برادر بزرگ افتخار عارف نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر کے بھجوایا تھا جسے میں پورے ایک مہینے سے روزانہ رات سونے سے پہلے پڑھ رہا ہوں اور اور پھر دیر تک جاگتا رہتا ہوں اور سوچتا رہتا ہوں کیا زندگی کے کشکول میں حسرتوں کے سوا بھی کچھ ہے؟



میں یہ پیغام' یہ خط' یہ وصیت آپ کی نذر کرتا ہوں' اس امید کے ساتھ کہ آپ نظم اور نثر کے اس عظیم شاہکار کو اپنی میز کے شیشے کے نیچے رکھ لیں گے اور پھر اسے روز ایک بار جی ہاں صرف ایک بار ضرور پڑھیں گے۔

''اے میرے خدا مجھے ایک لمحے کیلئے بے حس و حرکت گڈے سے انسان بنا دے' ایک جیتا جاگتا انسان' مجھے قسم ہے تمہاری میں پھر بھی وہ نہیں کہوں گا جو میں سوچتا ہوں' میں صرف اور صرف سوچوں گا' اس کے بارے میں سوچوں گا جو میں کہتا رہتا ہوں یا پھر میں کہنا چاہتا ہوں۔

اے میرے خدا تو مجھے ایک بار پھر حرکت دے دے مجھے تمہاری قسم میں زندگی میں کبھی چیزوں کی قیمت نہیں دیکھوں گا' میں ان کی اہمیت دیکھوں گا' میں ان کی قدر کروں گا' اے میرے خدا میں کم سوؤں گا اور زیادہ خواب دیکھوں گا کہ میں جان چکا ہوں ایک منٹ کیلئے آنکھیں بند ہوں تو ہم روشنی کے کتنے سیکنڈ کھو دیتے ہیں۔

اے میرے خدا تو اگر مجھے ایک لمحے کی زندگی بخش دے تو میں اس وقت چلوں گا جب لوگ رک جائیں گے' میں اس وقت جاگوں گا جب لوگ سو جائیں گے اور میں اس وقت خاموش رہوں گا جب لوگ بولیں گے' اے میرے خدا' میں چاکلیٹ کھاؤں گا' آئس کریم کھاؤں گا تو

پورے لطف' پورے مزے کے ساتھ کھاؤں گا' اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں ہمیشہ سادہ کپڑے پہنوں گا اور اپنا جسم اور اپنی روح سورج کے سامنے کھول دوں گا' اے میرے خدا اگر مجھے تھوڑی دیر کیلئے اپنا دل واپس مل جائے تو میں اپنی نفرت برف پر لکھ دوں گا اور پھر اسے سورج کی تمازت میں پگھلنے' پگھل کر بھاپ بنتے اور بھاپ بن کر اڑتے دیکھوں گا' اے میرے خدا میں ستاروں پر "وین گاف" کے خواب پینٹ کروں گا' چاند کیلئے ایک بینی ڈیٹی نظم ایک "سیرات" نغمہ لکھوں گا' میں سرخ گلاب چوموں گا اور اپنی آنکھوں اور اپنے آنسوؤں سے پھولوں کے وہ تمام درد چن لوں گا جو کانٹوں نے انہیں دیئے تھے۔

اے میرے خدا تو اگر مجھے تھوڑی سی زندگی دے دے تو میں کوئی ایسا دن نہیں گزرنے دوں گا جب میں لوگوں کو اپنی محبت کا یقین نہ دلا دوں' میں دنیا کے ہر مرد' ہر عورت کو سمجھاؤں گا' مجھے ان سے محبت ہے' میں محبت میں محبت کے ساتھ رہوں گا اور میں لوگوں کو بتاؤں گا جو لوگ سمجھتے ہیں بوڑھے ہو کر وہ محبت کے قابل نہیں رہتے' وہ بڑے بے وقوف ہیں' انسان تو بوڑھا ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ محبت ترک کر دیتا ہے' میں بچوں کو پر لگا دوں گا لیکن انہیں اپنی اڑان خود لینے کا موقع دوں گا' میں بوڑھوں کو بتاؤں گا موت بڑھاپے سے نہیں آتی' فراموشی سے آتی ہے' بے حسی سے آتی ہے

اور اے انسان' اے میرے پڑھنے والے انسان یہ سب کچھ میں نے تم سے سیکھا تھا' میں نے تم سے سیکھا تھا دنیا کا ہر شخص چوٹی پر پہنچنا چاہتا ہے' یہ جانے بغیر کہ چوٹی کچھ نہیں' اصل چیز تو مسافت ہے' وہ مشقت ہے جو پہاڑ سر کرنے کیلئے کی جاتی ہے' میں نے سیکھا جو بچہ باپ کی انگلی تھام لے وہ سہاروں کا عادی ہو جاتا ہے' میں نے سیکھا' نفرت کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جس نے زندگی بھر لوگوں کو سہارا دیا ہو اور جس نے لوگوں کو کھڑا ہونے میں مدد دی ہو۔

اے لوگو! میں نے آپ سے اور بھی بہت کچھ سیکھا لیکن اس وقت جب موت میری پائینتی پر کھڑی ہے تو میرا دل اداس ہے' میں اداس ہوں کہ میں وہ سب کچھ آپ کو نہیں سونپ پایا' جو مجھے سونپنا چاہیے تھا اور افسوس میں زندگی کی اصل حقیقتیں اپنے سینے میں لے کر جا رہا ہوں' افسوس میں وہ سب کچھ نہیں کہہ پایا جو مجھے کہنا تھا' جو مجھے آپ کو بتانا چاہیے تھا۔

"افسوس میں مر رہا ہوں"

# محبت‘ توجہ اور وقت

کرسٹیانسنڈ سویڈن کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے‘ یہ قصبہ کوپن ہیگن سے ایک سو دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لہٰذا لوگ یہاں پہنچنے کیلئے سٹاک ہوم کے بجائے کوپن ہیگن کا ایئر پورٹ استعمال کرتے ہیں‘ میرے دوست مخدوم عباس نے تین سال پہلے چودھری جہانزیب کے ساتھ مل کر یہاں چاولوں کی صفائی اور پیکنگ کی فیکٹری لگائی‘ یہ تجربہ کامیاب ہو گیا چنانچہ میرے دوست پورے یورپ کو باسمتی چاول سپلائی کرنے لگے‘ یہ لوگ اب پولینڈ میں کئی گنا بڑا کارخانہ لگا رہے ہیں‘ میں شیخ مبشر کے ساتھ 12 مارچ 2007ء کو وہاں پہنچا‘ کرسٹیانسنڈ میں ابھی تک سردی کے آثار باقی تھے‘ سڑکوں کے کناروں پر برف کی اکا دکا ڈھیریاں بھی مل جاتی تھیں‘ قصبے کی گلیاں‘ بازار اور کافی شاپس سرِشام بند ہو جاتی تھیں اور لوگ اندھیرا پھیلنے سے پہلے گھروں میں محبوس ہو جاتے تھے‘ ہم لوگ ایک ویلا ہوٹل میں ٹھہرے تھے‘ ہوٹل میں بھی ہمارے سوا کوئی گاہک نہیں تھا جبکہ کرسٹیانسنڈ اور اس کا ساحل بھی ویران اور سنسان تھا‘ ہم لوگ لندن اور پیرس کی رونقوں سے وہاں پہنچے تھے لہٰذا ہمیں پہلے دن کرسٹیانسنڈ کے ٹھہراؤ اور سستی نے پریشان کر دیا لیکن دوسرے دن ہم اس شہر کے عادی ہو گئے اور ہمیں محسوس ہوا کرسٹیانسنڈ کا ٹھہراؤ اور سستی بنیادی طور پر اس کا سکون تھا‘ یہ ایک دھیما اور پرسکون قصبہ ہے‘ یہاں کے لوگ بھلے مانس اور شور شرابے کی بجائے پرسکون فیملی لائف گزارتے ہیں‘ میرا دوست مخدوم عباس قدرتی اور فطرتاً بزنس مین ہے‘ اسے اللہ تعالیٰ نے بے

تحاشہ ''بزنس سینس'' دے رکھی ہے' وہ مجھ سے دو برس چھوٹا ہے لیکن اس نے چند برس میں ملٹی ملین ڈالرز کی بزنس ایمپائر کھڑی کر دی' مجھے اس کی گروتھ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے وہ چند برس بعد بیسٹ وے کے انور پرویز' وائز کام کے طارق بھٹی اور برطانوی رکن اسمبلی چودھری سرور کے لیول تک پہنچ جائے گا۔

مخدوم عباس' مبشر شیخ اور میں 13 مارچ کی شام کرسٹنا سٹڈ کے ایک ریستوران میں کافی پینے کیلئے گئے' مخدوم نے ایک برطانوی جوڑے کو بھی وہاں بلوا لیا' فرینک اور اس کی پولش بیوی مارکیٹنگ کنسلٹنٹ تھے اور دونوں کی عمریں ساٹھ برس سے زائد تھیں' ہم لوگ گھنٹہ بھر گپ شپ کرتے رہے' شام کے چھ بج گئے تو فرینک کی بیوی نے گھڑی دیکھی اور اپنے شوہر کو اٹھنے کا اشارہ کر دیا' فرینک نے معذرت خواہانہ انداز سے ہماری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا ''ہم دونوں نے چیرٹی کیلئے جانا ہے' آپ لوگ ہمیں اجازت دے دیں'' میں نے مسکرا کر پوچھا ''آپ لوگ کیا چیرٹی کرتے ہیں'' فرینک کی بیوی بولی ''ہم ہفتے میں دو دن چرچ کے اولڈ پیپل ہوم جاتے ہیں' اس ہوم میں لاوارث اور لاچار بوڑھے رہتے ہیں' ہم دونوں ان کے ساتھ بیٹھ کر دو گھنٹے گپ لگاتے ہیں'' لیڈی فرینک نے یہ بتایا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی' فرینک نے اسے کوٹ پہنایا اور دونوں ہمارے ساتھ ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے' ان کے جانے کے بعد مخدوم نے مجھ سے پوچھا ''کیا یہ لوگ دوزخ میں جا سکتے ہیں'' میں مخدوم کے سوال پر خاموش رہا' مخدوم کے سوال کا جواب کوئی عالم دین ہی دے سکتا تھا لیکن جہاں تک چیرٹی کا تعلق ہے میں ان دونوں میاں بیوی کی اپروچ پر حیران رہ گیا تھا' دنیا کا ہر شخص پیسے کی خیرات کرتا ہے' ہم سب لوگ کسی نہ کسی شکل میں محروموں' محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مالی مدد کرتے رہتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت کم لوگ کسی کو وقت دیتے ہوں گے' ہم کسی کے پاس بیٹھتے ہوں گے' ہم کسی کی بات غور سے سنتے ہوں گے اور ہم کسی کو بڑی محبت سے تازہ ترین حالات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوں گے' مجھے لیڈی فرینک کی بات سن کر اندازہ ہوا دنیا کی سب سے بڑی خیرات' صدقہ اور چیرٹی کسی کا ساتھ دینا' کسی سے کمپنی کرنا اور کسی کو اپنے قیمتی وقت میں شامل کرنا ہوتا ہے اور انسان کو بڑھاپے' بیماری اور بے چارگی میں روٹی اور کپڑے سے زیادہ کمپنی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگوں نے چیرٹی یا خیرات کو صرف روپے پیسے تک محدود کر دیا ہے' مجھے محسوس ہوا چیرٹی کے معاملے میں بھی ہماری اپروچ غلط ہے' ہم پوری دنیا کو وقت دیتے ہیں' ہم صدر بش کی تقریر تک کو بے تحاشہ وقت دیتے ہیں لیکن اگر ہمارے پاس

وقت نہیں ہوتا تو اپنے بوڑھے ماں باپ' چاچی چاچے' خالہ خالو' پھوپھی پھوپھا اور تائی تائے کیلئے نہیں ہوتا' ان لوگوں کے ساتھ ہماری محبت صرف روٹی' پانی' کپڑے اور دوا دارو تک محدود رہتی ہے' ہم انہیں اپنے وقت' اپنی توجہ اور اپنی محبت میں شریک نہیں کرتے جبکہ فرینک اور اس کی بیوی ہفتے میں دو دن کرسٹینا سنٹر کے بوڑھوں کے ساتھ اپنی محبت' توجہ اور وقت شیئر کرتے ہیں چنانچہ میں مخدوم کے سوال پر تو خاموش رہا لیکن میں نے دل میں سوچا ''کیا یہ لوگ ہم سے زیادہ مسلمان نہیں ہیں؟''

یورپ کی چیریٹی کا ایک منظر میں نے پیرس میں بھی دیکھا تھا' مبشر شیخ مجھے دریائے سین کے کنارے لے گیا' دریا کے کنارے دور دور تک خوبصورت خیمے لگے تھے اور مختلف عمروں کے سینکڑوں لوگ ان خیموں کے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہے تھے' مبشر نے بتایا' یہ تمام لوگ شرابی اور نشئی ہیں' یہ دن رات نشے میں دھت رہتے ہیں' ان لوگوں کی شراب ختم ہو جائے تو یہ لوگ بوتل لے کر شہر میں نکل آتے ہیں' یہ لوگ ریستورانوں' باروں اور دوکانوں میں چلے جاتے ہیں اور پیرس کے زیادہ تر دوکاندار انہیں مفت شراب دے دیتے ہیں' یہ لوگ بوتل لے کر واپس آتے ہیں اور آپس میں ایک ایک گھونٹ شراب تقسیم کر لیتے ہیں' فرنچ حکومت کے مطابق اس وقت فرانس میں ان لوگوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے' یہ لوگ کھلی جگہوں پر رہتے ہیں اور بے کار ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے شراب اور صرف شراب' یہ لوگ گرمیاں فٹ پاتھوں' میٹرو سٹیشنوں اور پارکوں میں گزار دیتے ہیں' ان لوگوں کیلئے سردیاں بڑی کٹھن اور مشکل ہوتی ہیں' حکومت نے ان کے مسائل کو سمجھتے ہوئے اس سال ان کیلئے دریائے سین کے کنارے خیمے لگا دیئے ہیں' ان خیموں میں بڑے شاندار گدے اور کمبل ہیں' یہ لوگ سارا دن سڑکوں پر پھرتے ہیں لیکن رات کو ان خیموں میں آ جاتے ہیں' حکومت نے ہر دس پندرہ خیموں کے بعد ایک ''ڈائننگ ٹینٹ'' لگا دیا ہے' اس ٹینٹ میں کھانے پینے کا سامان پڑا رہتا ہے' ان لوگوں کو جب بھوک لگتی ہے تو یہ لوگ ڈائننگ ٹینٹ سے اپنی مرضی کی چیزیں اٹھا کر کھا لیتے ہیں' پیرس میں اس وقت 13 این جی اوز ان لوگوں کیلئے کام کر رہی ہیں' یہ این جی اوز انہیں کمبل' گدے اور سلیپنگ بیگز فراہم کرتی ہیں اور ان کے کھانے پینے اور کپڑوں کا بھی خیال رکھتی ہیں' میونسپل کارپوریشن کی گاڑیاں دن میں چار بار ان خیموں کا چکر لگاتی ہیں اور ان کے لئے کھانے پینے کا سامان چھوڑ جاتی ہیں' سردیوں کی راتوں میں کارپوریشن اور پولیس کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کی ضروریات کا بندوبست کرتے رہتے ہیں' میں نے مبشر سے پوچھا ''یہ

لوگ معاشرے کیلئے بیکار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود حکومت اور عوام ان کا کیوں خیال رکھتے ہیں'' مبشر کا کہنا تھا'' فرانس کے لوگ سمجھتے ہیں' نشہ کرنے کے باوجود انسان انسان رہتا ہے اور شراب نوشی کسی انسان سے اس کے انسان ہونے کا حق نہیں چھینتی' یہ لوگ نشے کو گناہ یا جرم کی بجائے بیماری سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے بیمار کو نگہداشت' حفاظت اور نرسنگ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ حکومت سے لے کر عام شخص تک فرانس کا ہر شہری ان لوگوں کی نرسنگ کرتا ہے''

مجھے مبشر کی بات پر بھی حیرت ہوئی کیونکہ میں کروڑوں پاکستانیوں کی طرح نشیوں سے نفرت کرتا تھا اور میں نے آج تک کسی نشئی کی طرف ہمدردی سے نہیں دیکھا تھا' میں ان لوگوں کو گناہ گار' مجرم اور حیوان سمجھتا تھا لیکن دریائے سین کے کنارے نصب یہ خیمے دیکھ کر مجھے پہلی بار شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے سوچا پاکستان کے ہر شہر' ہر قصبے اور ہر گاؤں میں ایسے بے شمار لوگ بکھرے پڑے ہیں' یہ لوگ گرمیوں' سردیوں اور بارشوں میں کھلے آسمان تلے پڑے رہتے ہیں' ان کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھتے ہیں اور انہیں دس دس دن تک روٹی نصیب نہیں ہوتی لیکن ہم میں سے کسی شخص نے آج تک ان لوگوں کے بارے میں نہیں سوچا' ہم نے آج تک انہیں روٹی کے دو نوالے اور پانی کے دو گھونٹ نہیں دیئے' ہم نے آج تک ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہیں رکھا اور ہم نے انہیں اپنی دعا تک کے قابل نہیں سمجھا' مجھے اس وقت یورپ کے لوگوں پر خدا کے کرم اور پاکستان کی محرومی کی اصل وجہ سمجھ آئی اور مجھے محسوس ہوا اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں پر کرم کرتا ہے جو اس کے بندوں پر مہربانی کرتے ہیں' جو بوڑھے اور نشئی کو بھی انسان سمجھتے ہیں' جو انسانوں سے نفرت نہیں کرتے اور جو لوگوں کو محبت' توجہ اور وقت دیتے ہیں' میں نے سوچا' کیا ہم 16 کروڑ مسلمانوں کے ملک میں ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کر سکتے جو فرینک اور اس کی بیوی کی طرح بوڑھوں کو وقت دے اور جو پاکستان کے کسی ایک شہر میں نشیوں کیلئے کھانے کا بندوبست کر سکے' آپ افسوس کا مقام دیکھئے' ہم اس بے حسی کے باوجود خود کو مسلمان بھی کہتے ہیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم بھی۔

# ”میرا کیا قصور تھا“

”آپ کا سفر کیسا رہا“ میں آواز نہیں پہچان سکا‘ میں نے پوچھا ”کون صاحب بول رہے ہیں“ ”نرم اور بھاری آواز میں جواب آیا“ ”کیا یہ کافی نہیں 6 ارب لوگوں میں ایک شخص نے دوسرے شخص کو یاد رکھا اور آٹھ برس بعد اس سے مخاطب ہوا“ میں حیرت سے پریشانی کے فیز میں داخل ہو گیا‘ میں نے عرض کیا ”سر اس کے باوجود اگر آپ نام بتا دیں گے تو مجھے بات کرنے میں سہولت ہو گی“ دوسری طرف چند سیکنڈ کا وقفہ ہوا‘ مخاطب نے لمبا سانس بھرا جذباتی لہجے میں بولا ”جاوید میں پرویز رشید بول رہا ہوں“ میرے منہ سے جوش میں ایک طویل ”جناب عالی“ نکلا اور لندن کی اجنبی فضا اچانک مہربان ہو گئی۔



پرویز رشید سے میری پہلی ملاقات 1997ء میں خلیل ملک صاحب کے دفتر میں ہوئی تھی‘ پرویز رشید حسن جمال اور حسن مزاج سے لبریز ایک خوبصورت شخص تھے‘ وہ ان دنوں تازہ تازہ سینیٹر بنے تھے اور میاں نواز شریف نے انہیں پی ٹی وی کا چیئرمین لگا دیا تھا‘ پرویز صاحب سے میری ملاقاتیں 1998ء تک جاری رہی تھیں‘ 1998ء میں پرویز صاحب مجھے سینیٹر سیف الرحمن کے پاس لے گئے‘ سیف الرحمن کے ساتھ میری تلخی ہو گئی اور اس کے بعد پرویز صاحب سے میری ملاقاتوں میں وقفہ آنے لگا‘ 12 اکتوبر 1999ء کے ”ملٹری کو“ کے بعد خبر آئی پرویز رشید پی ٹی وی ہیڈ کوارٹر سے گرفتار ہو گئے ہیں‘ پھر خبر ملی وہ قید تنہائی میں ہیں‘ پھر ان کی رہائی کی تصویریں شائع

ہوئیں' پتہ چلا وہ لاہور چلے گئے ہیں' وہاں انہوں نے 12 اکتوبر کے قبضے کے خلاف پریس کانفرنس بلا لی' اس کے بعد پتہ چلا وہ ایک بار پھر گرفتار ہو گئے ہیں اور اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی' وہ آٹھ برس تک گوشہ گمنامی میں رہے لیکن پھر اچانک 3 مارچ 2007ء کو مجھے لندن میں ان کا فون آیا اور ٹوٹا ہوا رابطہ ایک بار پھر بحال ہو گیا' پرویز رشید نے مجھے چار مارچ کی شام ملنا تھا اور میں اس شام کا شدت سے انتظار کر رہا تھا۔

لندن میں چار مارچ کو شدید بارش ہو رہی تھی' سرد ہوائیں چل رہی تھیں' میرا خیال تھا شاید وہ نہ آ سکیں لیکن ٹھیک آٹھ بجے بیل ہوئی' میں نے دروازہ کھولا تو باہر پرویز رشید کھڑے تھے' میں انہیں دیکھ کر سکتے میں آ گیا' 1999ء اور 2007 کے پرویز رشید میں زمین آسمان کا فرق تھا' میں نے 99-1998ء میں جس پرویز رشید کو چھوڑا تھا وہ شاندار سوٹ پہننے' قیمتی خوشبو لگانے اور پائپ پینے والا ''سیالکوٹی منڈا'' تھا لیکن اس وقت میرے سامنے ایک ضعیف' مفلوک الحال اور بیمار پرویز رشید کھڑا تھا' میرے دل میں درد کی ایک لکیر سی اٹھی' میں نے انہیں اندر بلایا' انہیں بٹھایا اور بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا' وہ بھی چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گئے' ہم خاموش رہ رہ کر تھک گئے تو وہ مسکرا کر بولے ''چلو کھانا کھانے کیلئے چلتے ہیں'' میرے ساتھ محمد رؤف کلاسرا تھا' ہم دونوں ان کے ساتھ چل پڑے' وہ ہمیں ایجویر روڈ کے ایک لبنانی ریستوران میں لے گئے' پرویز صاحب نے کھانے کا آرڈر دیا' پائپ نکالا اور اس میں تمباکو بھرنے لگے' ان کے ہاتھ میں رعشہ تھا' انہیں تمباکو بھرنے میں وقت ہو رہی تھی' وہ پائپ جلا چکے تو میں نے عرض کیا ''میں 1999ء سے 2007ء تک کی کہانی سننا چاہتا ہوں'' پرویز رشید مضطرب ہو گئے' انہوں نے آنکھوں پر ٹشو رکھ لیا اور نرم آواز میں بولے ''جاوید میں کھانے کے قابل نہیں رہوں گا'' مجھے ان پر بہت ترس آیا لیکن میرے اندر کا صحافی ماننے کیلئے تیار نہیں تھا' میں انہیں بار بار کریدتا رہا یہاں تک کہ انہوں نے پلیٹ سرکائی اور آہستہ آواز میں بولے ''آپ کو لاہور میں میری دوسری گرفتاری تک کے واقعات تو معلوم ہیں'' میں نے ہاں میں گردن ہلا دی' وہ بولے ''مجھے پریس کانفرنس کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا' مجھے ایک عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا اور اس کے بعد مجھے شدید روحانی' نفسیاتی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا' میرے جسم کا ایک ایک پور ہلا دیا گیا' میرے سر سے خون چلتا تھا اور ایڑیوں تک آتا تھا' یہ دس دن تھے یا پندرہ ہیں مجھے کچھ یاد نہیں' میں صرف اتنا جانتا ہوں' مجھے انسانیت کے مقام سے کہیں نیچے گرا دیا گیا تھا' دنیا کا ہر انسان ایک حد

تک جسمانی تشدد سہہ جاتا ہے لیکن اخلاقی تشدد برداشت کرنا کسی شخص کیلئے ممکن نہیں ہوتا' انسان اپنے سامنے شرمندہ ہو جاتا ہے' مجھے اس کے بعد جیل میں پھینک دیا گیا' میری دو بیٹیاں ہیں' میری بچی مجھے جیل میں ملنے آئی' ان ظالم لوگوں نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا' اس وقت میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے' سر میں خاک تھی اور منہ دس پندرہ دنوں سے نہیں دھلا تھا' میں جب بچی کے سامنے بیٹھا تو میری شلوار پنڈلیوں سے اوپر اٹھ گئی' بچی نے میری ایڑیوں تک خون کی لکیریں دیکھیں تو اس نے رونا شروع کر دیا' اس منظر نے اس کی نفسیات بدل دی' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے اسے رات کو نیند نہیں آتی'' وہ رک گئے' ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی' باہر شدید بارش ہو رہی تھی لیکن اندر کا موسم انتہائی گرم تھا' میں خاموشی سے ان کی داستان سن رہا تھا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے'' میں نے 1979ء میں لاہور میں پائپ بنانے کا ایک چھوٹا سا یونٹ لگایا تھا' یہ یونٹ آہستہ آہستہ کارخانہ بن گیا تھا' یہ میرا واحد اثاثہ تھا' حکومت نے پہلے اس کی بجلی کاٹی اور اس کے بعد میرے ہول سیلرز کو مال نہ خریدنے کا حکم دے دیا' میں جیل سے باہر آیا تو میرا کاروبار تباہ ہو چکا تھا' میں کوڑی کوڑی کا محتاج تھا' میرے پاس لاہور سے اسلام آباد تک کا کرایہ نہیں ہوتا تھا' میں نے پاسپورٹ بنوایا اور امریکہ چلا گیا' میں امریکہ میں ایک نفسیات دان سے علاج کرانے لگا' میرے اعصاب نارمل ہوئے تو اس نے ایک دن مجھے ڈنر پر بلایا اور مجھ سے کہنے لگا'' مسٹر رشید میں نسلاً یہودی ہوں' میرا والد ہٹلر کے کیمپ میں نازی تشدد کا شکار ہوا تھا' میں نے یہ منظر نہیں دیکھا لیکن جب میں نے تمہاری کہانی سنی تو مجھے محسوس ہوا میرے بزرگوں پر بھی اسی نوعیت کا ظلم ہوا ہوگا'' اس کے بعد اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میرے ہاتھ پر رکھ کر بولا'' تم نے آج تک مجھے جتنی فیس دی' میں تمہیں وہ واپس لوٹا رہا ہوں'' میں نے اصرار کیا تو وہ بولا'' میں نے اگر تم سے فیس لی تو مجھے محسوس ہوگا' میں نے اپنے مظلوم باپ سے فیس لی تھی؟'' پرویز رشید کی آواز بھرا گئی' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' میں نے شیشے سے باہر دیکھنا شروع کر دیا' وہ بولے'' میں امریکہ سے لندن آ گیا' میرا علاج ابھی جاری ہے' میں بڑی حد تک بہتر ہوں لیکن اب بھی دروازے پر دستک ہوتی ہے تو میں خوف کا شکار ہو جاتا ہوں' میں بند کمرے میں نہیں رہ سکتا اور میں سینما اور ٹی وی نہیں دیکھ سکتا' میں فلموں کا بہت شوقین تھا لیکن میں اب چند منٹ سے زیادہ سکرین کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا' میں اپنے ڈاکٹر سے کہتا ہوں' اگر تم مجھے میری فلمیں واپس کر دو تو یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا'' وہ رکے اور دوبارہ بولے'' مجھے لندن بہت اچھا لگتا تھا

لیکن میں یہاں کبھی تین چار دن سے زیادہ نہیں رہا' مجھے اپنا ملک بہت عزیز تھا لیکن آج جب کوئی شخص میرے سامنے پاکستان کا نام لیتا ہے تو مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی' میں محب وطن تھا لیکن ان تین دنوں نے میری وطن پرستی ختم کر دی' میں اب دنیا کے کسی ملک کا شہری نہیں رہا' میں دن کو میاں صاحب کے دفتر چلا جاتا ہوں' شام تک کام کرتا ہوں' شام کے بعد سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہوں' تھک ہار جاتا ہوں تو کمرے میں آ گرتا ہوں' میری ایک بیٹی پاکستان میں ہے اسے رات کو نیند نہیں آتی' دوسری بیٹی مانچسٹر میں پڑھتی ہے وہ میرے پاس آتی ہے تو مجھے دیکھ کر رونا شروع کر دیتی ہے اور میں ہفتے میں دو دن ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں' ڈاکٹر مجھے کہتا ہے تم لوگوں کو اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے بارے میں بتاؤ' تمہارا دل ہلکا ہو جائے گا لیکن میں سوچتا ہوں' میں کس کو بتاؤں اور اس بتانے کا کیا فائدہ ہوگا' گھر میں اگر دروازے پر دستک ہو جائے تو منہ سے چیخ نکل جاتی ہے اور باقی رات کھڑکی میں کھڑے ہو کر گزار دیتا ہوں" پرویز رشید نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔



رؤف کلاسرا اور میری آنکھوں میں آنسو تھے' ریستوران میں ہا ہا کار مچی تھی' لوگ چیخ رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے لیکن اس ٹیبل کے تین مسافر ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے' ہمارا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا' لبنانی ویٹرس بار بار آتی تھی' ہمیں دیکھتی تھی اور واپس چلی جاتی تھی' میں نے پرویز رشید صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور ان کا ہاتھ دبا کر عرض کیا "میں آپ سے محبت کرتا تھا لیکن اب مجھے آپ پر فخر ہے" پرویز صاحب نے دوسرے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور سسکی لے کر بولے "کیا تمہاری محبت' تمہارا فخر میری پاکستانیت واپس کر سکتا ہے' کیا میری خود اعتمادی' میرا افتخار اور میری حب الوطنی واپس آ سکتی ہے' کیا یہ مجھے میرا پرانا پرویز رشید واپس کر سکتا ہے' کیا یہ میری بیٹی کی نیند واپس لا سکتا ہے' کیا یہ میری بیٹیوں کے آنسوؤں کے داغ مٹا سکتا ہے اور کیا یہ میری ہنسی' میری مسکراہٹ واپس کر سکتا ہے" میں خاموش رہا' وہ بولے "میں ہر بات بھولنے کیلئے تیار ہوں لیکن جب میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں' میرا قصور کیا تھا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اور میں اپنے آپ سے الجھنے لگتا ہوں" وہ رکے اور میری طرف دیکھ کر بولے "تم بتاؤ' میرا کیا قصور تھا" میں نے ہاں میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "آپ نے بکنے سے انکار کر دیا تھا اور کامیاب خریداروں کے سامنے جب کوئی بکنے سے انکار کرتا ہے تو وہ اسے توڑ دیا کرتے ہیں یا اسے روند دیا کرتے ہیں"

# جو چلنا جانتے ہیں

وہ مزدور کا مقدر لے کر پیدا ہوا تھا لیکن اس نے اپنے وژن' محنت اور ایمانداری سے



اپنا مقدر بدل دیا وہ دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص بن گیا۔

وہ 1926ء میں سویڈن کے ایک گاؤں Agonnaryd میں پیدا ہوا' اس کے والدین ایک فارم ہاؤس ایلمٹریاڈ (Elmtaryd) میں مزدوری کرتے تھے' اس کے والدین نے پانچ برس کی عمر میں اسے بھی مزدوری پر لگا دیا لیکن اس نے مزدوری کی بجائے کاروبار کا فیصلہ کیا' اس کا نام تین سال کی عمر میں رکھا گیا' اس کے نام کے دو حصے تھے انگوار اور کیمپارڈ' اس نے گیارہ سال کی عمر میں ماچسیں بیچنا شروع کیں' وہ ماچسوں کے ڈبے لیتا اور سائیکل پر گلی گلی ماچسیں بیچتا رہتا' وہ یہ کام چھ ماہ تک کرتا رہا پھر اسے ایک دن معلوم ہوا اگر وہ شہر سے تھوک میں ماچس خرید لے اور یہ ماچس گاؤں کے دکانداروں اور پھیری بازوں کو بیچ دے تو وہ زیادہ منافع کما سکتا ہے' انگوار اگلے دن سٹاک ہوم چلا گیا اور وہاں سے تھوک میں ماچس خرید لایا' اس نے یہ ماچسیں تھوڑا سا منافع رکھ کر بیچ دیں' اس نے اگلے سال تک ماچسوں کے کاروبار کو مچھلی' کرسمس ٹری' کرسمس کارڈز' پھولوں کے بیج' بال پوائنٹس اور پینسلوں تک پھیلا دیا' وہ یہ ساری اشیاء تھوک میں خریدتا تھا اور بعد ازاں گاؤں کے دکانداروں کو فروخت کر دیتا تھا' وہ 17 سال کا ہوا تو اس کے والد نے اسے تھوڑے سے پیسے دیئے' اس نے اس معمولی سی رقم سے ایک ایسی کمپنی کی بنیاد رکھ دی جس نے

آنے والے دنوں میں پوری دنیا کا لائف سٹائل تبدیل کر دیا' انگوار نے اس رقم سے وزن میں ہلکا لیکن رنگوں میں تیز فرنیچر بنانا شروع کر دیا' لوگوں کا خیال تھا اس کا آئیڈیا ناکام ہو جائے گا کیونکہ اس وقت لکڑی کے بھاری بھرکم فرنیچر کا رواج تھا' لوگ ایک مرتبہ فرنیچر بنواتے تھے اور یہ فرنیچر تین نسلوں تک ان کا ساتھ دیتا تھا چنانچہ اس وقت یورپ میں فرنیچر ایک ایسی پراڈکٹ سمجھا جاتا تھا جس کی مانگ نہ ہونے کے برابر تھی' اس وقت تک فرنیچر کے سٹورز اور شو روم بھی شروع نہیں ہوئے تھے' لوگ ترکھانوں سے اپنی ضرورت کا فرنیچر بنوا لیتے تھے لیکن انگوار نے فرنیچر کو کاروبار کی شکل دینے کا فیصلہ کیا' اس کا خیال تھا آنے والے دنوں میں پوری دنیا میں نقل مکانی شروع ہو جائے گی' لوگ روزگار کیلئے آبائی شہروں سے باہر نکلیں گے لہٰذا اس نقل مکانی کے دوران بھاری فرنیچر کی نقل و حمل مشکل ہو جائے گی' اس کا خیال تھا مستقبل قریب میں بڑے شہروں پر آبادی کا دباؤ بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں مکانوں اور فلیٹوں کا سائز چھوٹا ہو جائے گا چنانچہ لوگوں کو چھوٹے سائز کے مکانوں کیلئے فرنیچر بھی چھوٹے سائز کا چاہیے' اس کا خیال تھا مستقبل رنگوں کا دور ہوگا' آنے والے دنوں میں ہر چیز رنگین ہو جائے گی چنانچہ اس نے ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اکیا (ikea) کے نام سے یورپ میں فرنیچر سازی کی پہلی کمپنی کی بنیاد رکھی۔

''اکیا'' ایک لایعنی لفظ تھا' یہ چار حروف آئی' کے' ای اور اے کا مجموعہ تھا' اس نے چار حرف اپنے نام اور اپنے گاؤں سے لئے تھے' آئی اس کے نام انگوار کو ظاہر کرتا تھا' کے سے مراد کیمپارڈ تھی' ای کا تعلق اس فارم ہاؤس ایلمٹریاڈ سے تھا' جس میں اس نے پرورش پائی تھی اور اے اس کے آبائی گاؤں Agunnaryd کا پہلا حرف تھا' انگوار نے جب اپنی کمپنی کا نام ''اکیا'' رکھا تو لوگوں کا خیال تھا اس کے بزنس کی طرح اس کی کمپنی کا نام بھی لایعنی ہے لہٰذا یہ کاروبار اور یہ کمپنی دونوں چند ماہ میں ماضی کا قصہ بن جائیں گے لیکن انگوار نے آنے والے دنوں میں لوگوں کے سارے خدشات باطل ثابت کر دیئے' اس نے سائز میں چھوٹا' وزن میں ہلکا اور رنگوں میں تیز فرنیچر بنوایا اور یہ فرنیچر آنے والے دنوں میں دنیا کا لائف سٹائل بن گیا' اس نے دنیا کی نفسیات اور طرز رہائش بدل کر رکھ دی' ''اکیا'' بیس برس بعد یورپ کی سب سے بڑی کمپنی بن گئی' اس کی یہ کامیابی اس کے وژن' محنت اور ایمانداری کا نتیجہ تھا' اس نے وقت کی تبدیلی کو بھانپ لیا تھا' وہ سمجھ گیا تھا چھوٹی اور کارآمد چیزوں کا دور آنے والا ہے لہٰذا مستقبل میں صرف وہی چیزیں کامیاب ہوں گی جو سائز میں چھوٹی' وزن میں ہلکی اور استعمال میں وسیع ہوں گی' 1980ء میں اس نے بزنس کو ایک

اور کروٹ دی' اس نے گھر میں استعمال ہونے والی ہر قسم کی مشینری بنانا شروع کر دی' وہ اس وقت کچن میں استعمال ہونے والی چھوٹی چمچ سے لے کر گھر میں استعمال ہونے والے باتھ ٹب تک ہر چیز بنا رہا ہے' اس کا کاروبار یورپ سے لے کر امریکہ تک اور دوبئی سے لے کر نیوزی لینڈ تک دنیا کے 34 بڑے ممالک میں پھیلا ہوا ہے' اس کے سٹورز پر روزانہ 900 ملین ڈالر کی سیل ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے یورپ میں شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جس میں ''آکیا'' کی کوئی نہ کوئی چیز نہ ہو' مارچ 2007ء کے تیسرے ہفتے میں فوربس انٹرنیشنل نے مزدور کے اس بیٹے کو دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص ڈیکلیئر کر دیا' اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں 33 بلین ڈالر جمع تھے جبکہ اس کی دولت میں روزانہ ایک ملین ڈالر اضافہ ہو رہا تھا۔

انگوار کیمپارڈ ایک انتہائی دلچسپ شخص ہے' وہ دنیا کا چوتھا امیر ترین شخص ہونے کے باوجود انتہائی سادہ زندگی گزارتا ہے' وہ پندرہ سال پرانی والو گاڑی استعمال کرتا ہے' اپنی گاڑی خود چلاتا ہے' ہمیشہ جہاز کی اکانومی کلاس میں سفر کرتا ہے اور اس نے سات سال کی عمر میں کرسمس پیپر بیچنے کا کام شروع کیا تھا وہ اب تک یہ کاروبار کر رہا ہے' وہ ہر سال کرسمس پیپر خریدتا ہے اور کرسمس کے بعد ان پیپرز کی سیل لگاتا ہے' اس نے ''آکیا'' کے تمام ملازمین کو کاغذ کی دونوں سمتیں استعمال کرنے کا حکم دے رکھا ہے' اس کے کسی دفتر میں اگر کوئی شخص ایک سمت استعمال کر کے کاغذ ردی کی ٹوکری میں پھینک دے تو وہ لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے' وہ ہمیشہ سستے ریسٹورانوں میں کھانا کھاتا ہے' اس نے چالیس برس قبل ''آکیا'' کے دفاتر اور فیکٹریوں میں ملازموں کیلئے سستا کھانا شروع کرایا تھا' وہ اگر کھانے کے وقت اپنی کسی فیکٹری یا دفتر کے نزدیک ہو تو وہ ہمیشہ ''آکیا'' کے کیفے ٹیریا میں کھانا کھاتا ہے اور دو تین ڈالر' پاؤنڈ' مارک یا کراؤن بچا کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی فراخ دل شخص بھی ہے' اس نے INGKA Fondation کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بنا رکھا ہے' وہ اس ادارے کے ذریعے اب تک 36 بلین ڈالر کی چیرٹی کر چکا ہے' دنیا کے نامور میگزین اکانومسٹ کے مطابق انگوار فلاح عامہ میں بل گیٹس کے مقابلے میں کہیں زیادہ رقم خرچ کرتا ہے لیکن وہ اپنی چیرٹی کے کاموں کی تشہیر نہیں کرتا لہٰذا دنیا اس کی خیرات اور فلاحی کاموں سے پوری طرح واقف نہیں' اگر انگوار کیمپارڈ کی ذات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک ''کنجوس تنی'' محسوس ہوتا ہے' وہ ایک طرف اپنے کسی ورکر کو ایک پنسل ضائع کرنے کی اجازت نہیں دیتا' وہ کاغذ کی دوسری پرت ضائع کرنے کے جرم میں اپنے ایم ڈی تک کو فارغ کر دیتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ اربوں کھربوں ڈالر خیرات کر دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہیں ہوتی' وہ

شاید اس وقت دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد شخص ہوگا۔

مجھے انگوار کا ایک انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا' اس انٹرویو میں اس نے دو دلچسپ باتیں کی تھیں' اس نے بتایا" دنیا میں نوکری کرنے والا کوئی شخص خوشحال نہیں ہو سکتا' انسان کی معاشی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اپنے کام کا آغاز کرتا ہے" اس کی دوسری بات اس سے بھی دلچسپ تھی' اس کا کہنا تھا" کامیابی اور ترقی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' اس کا کہنا تھا" اگر تعلیم سے روٹی کمائی جا سکتی تو آج دنیا کے تمام پروفیسر ارب پتی ہوتے" اس کا کہنا تھا" اس وقت دنیا میں ساڑھے نو سو ارب پتی ہیں لیکن ان میں ایک بھی پروفیسر' ڈاکٹر یا ماہر تعلیم شامل نہیں" اس کا کہنا تھا" دنیا میں ہمیشہ درمیانے پڑھے لکھے لوگوں نے ترقی کی' یہ لوگ وقت کی قدرو قیمت سمجھتے ہیں چنانچہ یہ لوگ ڈگریاں حاصل کرنے کی بجائے طالب علمی کے دور ہی میں کاروبار شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ان کی کامیابی انہیں کالج یا یونیورسٹی سے سٹور' کارخانے یا منڈی میں لے جاتی ہے" اس کا کہنا تھا وہ زندگی میں کبھی کالج نہیں گیا لیکن اس وقت اس کی کمپنی میں 30 ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین و حضرات کام کر رہے ہیں' یہ تعلیم یافتہ لوگ ویژن' علم اور دماغ میں اس سے کہیں بہتر ہیں بس ان میں ایک خامی تھی ان میں نوکری چھوڑنے کا حوصلہ نہیں تھا' انہیں اپنے اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں تھا" اس کا کہنا تھا" اگر کوئی شخص انگوار کیلئے مزدوری کر سکتا ہے تو وہ خود اپنے لئے بھی کام کر سکتا ہے' بس اس کیلئے ذرا سا حوصلہ چاہیے" اس نے دنیا بھر کے نوجوانوں کو پیغام دیا "ترقی چیونٹی کے پاؤں لے کر پیدا ہوتی ہے لیکن جوان ہونے تک اس کے پاؤں ہاتھی جتنے بڑے ہو جاتے ہیں" اس کا کہنا تھا" دنیا میں ہر چیز کا متبادل موجود ہے لیکن محنت کا کوئی شارٹ کٹ نہیں" اس نے کہا" دنیا کا کوئی کیمیائی عمل لوہے کو سونا نہیں بنا سکتا لیکن انسانی ہاتھ وہ طاقت ہیں جو دنیا کی ہر دھات کو سونے میں بدل سکتے ہیں" اس نے کہا" دنیا میں نکمے لوگوں کیلئے کوئی جائے پناہ نہیں جبکہ کام کرنے والوں کیلئے پوری دنیا کھلی پڑی ہے" اس نے کہا" ہنر مند شخص کا ہنر اس کا پاسپورٹ ہوتا ہے" میں نے جب انگوار کے یہ خیالات سنے تو میں نے سوچا کاش میں یہ خیالات پاکستان کے ان تمام بے روزگار نوجوانوں تک پہنچا سکوں جو دن رات بے روزگاری کا رونا روتے رہتے ہیں' کاش میں ان نوجوانوں کو بتا سکوں اگر فارم ہاؤس کا ایک مزدور مسلسل محنت سے انگوار بن سکتا ہے تو پاکستانی نوجوانوں کے راستے میں کیا رکاوٹ ہے؟ یہ لوگ کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے" انگوار نے کہا تھا" آگے بڑھنے کا راستہ انہیں ملتا ہے جو چلنا جانتے ہیں" میرا خیال ہے ہمارے نوجوانوں کو چلنے کا ہنر نہیں آتا۔

# امن و امان

میں جوں ہی اندر داخل ہوا، مجھے محسوس ہوا میں ایک نامہربان دنیا سے مہربان دنیا میں آ گیا ہوں۔ عمارت کے اندر سکون، اطمینان، خوبصورتی، صفائی، فراوانی اور شادابی تھی۔ ہر شخص کے چہرے پر سکون اور آواز میں اطمینان تھا، تمام لوگ ترتیب، سلیقے اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ پورے دفتر میں مساوات تھی، چیف ایگزیکٹو سے چپڑاسی تک اور ڈائریکٹر سے سویپر تک سب لوگوں کو یکساں حقوق حاصل تھے۔ دفتر میں کوئی شخص کسی کو حکم دے رہا تھا اور نہ ہی کوئی ملازم ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا، چیف ایگزیکٹو سے چپڑاسی تک سب ایک ہی کیفے ٹیریا سے کھانا کھا رہے تھے، تمام لوگ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی ٹرے خود اٹھاتے تھے اور سب کا کھانا یکساں تھا۔ تمام لوگوں کے پاس اپنی اپنی ذمہ داریاں تھیں اور ہر شخص اپنے کام کا ذمہ دار تھا۔ اس پوری عمارت میں اونچی آواز میں بات کرنا، گھنٹی بجا کر دوسرے کو بلانا اور شوکاز نوٹس جاری کرنا ممنوع تھا، تمام لوگوں کے پاس چھٹیوں کے یکساں حقوق تھے لیکن چھٹی سے پہلے کام مکمل کرنا ضروری تھا۔ اس دفتر کا پہلا اور آخری اصول سچ تھا، کوئی شخص کسی سے جھوٹ نہیں بولتا تھا، وہ بڑی سے بڑی غلطی کا اعتراف کرتا تھا اور اس کی اصلاح کا وعدہ کر کے دوبارہ کام پر لگ جاتا تھا۔ میں ساری عمارت میں گھوما، میں نے گیٹ سے چھت تک ہر جگہ دیکھی اور مجھے تمام جگہوں پر صفائی، خوبصورتی اور ڈسپلن ملا۔ میں اپنے دوست کے کمرے میں آ گیا۔

میرا دوست کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا، اس کی میز پر پانی کا گلاس پڑا تھا، وہ گلاس سے ایک گھونٹ پانی پیتا تھا اور پھر دوبارہ کمپیوٹر پر مصروف ہو جاتا تھا۔ میرا دوست دس برس پہلے بے روزگار تھا، یہ اپنی ڈگریاں اٹھا کر نوکری کیلئے دھکے کھاتا تھا لیکن اسے کوئی کمپنی، کوئی فرم گھاس نہیں ڈالتی تھی، پھر اس نے اپنی فرم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت اس کے پاس صرف دس ہزار روپے تھے، اس نے دس ہزار روپے لگا کر کمپنی رجسٹر کرائی اور اپنے کلاس فیلو کے دفتر میں میز لگا کر بیٹھ گیا لیکن صرف دس سال بعد اس کا ''ٹرن اوور'' دس ارب روپے سالانہ تھا، دنیا میں اس کے 25 دفتر ہیں اور اس کے ہیڈ کوارٹر میں اڑھائی سو لوگ کام کرتے ہیں، کراچی میں اس کا بہت بڑا کمپلیکس ہے، اس کا کاروبار پاکستان سے افریقہ، چین، آسٹریلیا، کینیڈا اور پولینڈ تک پھیل چکا ہے اور وہ بحری جہاز خریدنے کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا اور میں اس کی کنپٹی پر اترتی سفیدی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بالوں میں ذرا ذرا سی برف اترنا شروع ہو گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر ابھی تک تازگی اور لڑکپن تھا اور وہ کسی بھی طرح اتنے بڑے کاروبار کا مالک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا شاید یہ پاکستان کا نوجوان ترین ارب پتی ہو گا۔ وہ میرے اوپر توجہ دیئے بغیر کمپیوٹر کے بٹنوں سے کھیل رہا تھا۔ میں اس کی اس بے توجہی کی وجہ جانتا تھا، میں اپنے مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ان دس منٹوں میں اپنا کام مکمل کرے گا اور اس کے بعد پورا آدھ گھنٹہ میرے ساتھ گپ لگائے گا۔ میں نے یہ دس منٹ اس کے دفتر کے جائزے میں صرف کرنا تھے، میں نے ایک بار پھر حدود اربعہ کا معائنہ شروع کر دیا۔ یہ دس بائی بارہ کا ایک درمیانے درجے کا دفتر تھا جس میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھی لیکن وہاں بے تحاشا صفائی اور روشنی تھی۔

دس منٹ بعد وہ میری طرف مڑا، مجھے مسکرا کر دیکھا' میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہم دونوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے، اس نے کافی مشین سے کافی کے دو مگ بنائے، دونوں مگ میرے سامنے رکھے اور ہماری گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے اس سے اس ترقی کا راز پوچھا، وہ اٹھا، کمپیوٹر کے پاس پڑی ایک تصویر اٹھائی اور لا کر میرے سامنے رکھ دی۔ یہ چند ٹیلوں کی تصویر تھی، وہ دوبارہ واپس گیا اور ایک اور تصویر اٹھا لایا۔ یہ خشک پہاڑوں کے درمیان گھرے ایک پسماندہ گاؤں کا سکیچ تھا۔ وہ واپس گیا اور تیسری تصویر اٹھا لایا یہ مکہ شہر کا فضائی ویو تھا۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ بولا یہ ٹیلے حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش ہیں۔ ان ٹیلوں کی

جگہ کبھی وہ شہر آباد تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے پرورش پائی تھی۔ اس نے دوسری تصویر پر انگلی رکھی یہ وہ چھوٹی سی بستی ہے، جس جگہ آج دنیا کا سب سے بڑا روحانی مرکز قائم ہے۔ یہ مکہ کا پندرہ سو سال پرانا سکیچ ہے اور وہ تیسری تصویر کی طرف مڑا یہ آج کا مکہ شہر ہے، یہ شہر آج دنیا کے خوشحال ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس سے پوچھا "لیکن ان تینوں تصویروں کا تمہاری کامیابی کے ساتھ کیا تعلق؟" وہ مسکرایا اور بولا "بہت گہرا تعلق ہے، میں نے جب یہ کمپنی شروع کی تھی تو میرے پاس صرف ایک ملازم تھا، اس دور میں مجھے حضرت ابراہیمؑ کی دعا پڑھنے کا اتفاق ہوا، حضرت ابراہیمؑ جب حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی بے آب و گیاہ اور ویران زمین پر چھوڑ کر واپس جا رہے تھے تو انہوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر دعا کی تھی "اے پروردگار تو اس جگہ کو امن و امان کا شہر بنا دے اور اپنے فضل و کرم سے اس شہر میں بسنے والے ان تمام لوگوں کو ہر قسم کا رزق عطا فرما دے جو تجھ پر اور آخرت پر ایمان لے آئیں" وہ رکا اور دوبارہ گویا ہوا "میں نے جب یہ دعا پڑھی تو مجھے محسوس ہوا حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کی خوشحالی سے پہلے امن و امان کی دعا مانگی تھی لہٰذا خوشحالی اور ترقی امن و امان کی دوسری سٹیج ہے۔ میں نے فوراً اپنی کمپنی میں امن و امان قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں جب امن و امان کا فارمولا طے کرنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کسی بھی ادارے، شہر اور کمپنی میں اس وقت تک امن و امان قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہاں میرٹ نہ ہو، جب تک وہاں مساوات نہ ہو، جب تک وہاں یکساں مواقع اور یکساں سہولتیں نہ ہوں، جب تک وہاں مالک اور ملازم کے حقوق برابر نہ ہوں اور جب تک وہاں گورے اور کالے، ادنیٰ اور اعلیٰ کے لیے ایک قانون نہ ہو۔ میں نے محسوس کیا جب تک لوگوں کو روزگار، تربیت، صحت اور انصاف نہیں ملتا اس وقت تک لوگ خود کو محفوظ نہیں سمجھتے اور جب تک لوگوں کو تحفظ کا احساس نہیں ہوتا اس وقت تک امن و امان قائم نہیں رہتا اور جب تک امن و امان قائم نہیں ہوتا اس وقت تک اس ادارے میں خوشحالی نہیں آ سکتی، میں نے اپنے ادارے میں امن و امان قائم کر دیا چنانچہ آج تمہیں اس دفتر میں خوشحالی بھی نظر آ رہی ہے اور ترقی بھی"۔

وہ ذرا دیر رک کر بولا "آج سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیمؑ نے دنیا میں خوشحالی، ترقی اور رزق کی فراوانی کا فارمولا طے کر دیا تھا چنانچہ جب تک کسی ملک میں امن و امان نہیں ہوتا، اس وقت تک وہ ملک خوشحالی اور ترقی یافتہ نہیں ہو سکتا۔ تم امریکہ سے لے کر جاپان اور ملائشیا سے دوبئی تک دنیا کے تمام خوشحال ملکوں کا پروفائل دیکھ لو تمہیں ان سب میں امن و امان

مشترک ملے گا اور تم روانڈا سے افغانستان اور برازیل سے پاکستان تک تمام غیر ترقی یافتہ ممالک کا مطالعہ کرلو تمہیں یہ تمام ملک "لا اینڈ آرڈر" کے مسائل کا شکار ملیں گے لہٰذا فرد ہو یا ملک ہوں وہ دنیا میں اس وقت تک خوشحالی اور ترقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک وہ امن و امان قائم نہیں کرتے" وہ رکا اور ہنس کر بولا "ہم ترقی اور خوشحالی کے لیے دنیا بھر کے ماڈل کاپی کر رہے ہیں لیکن ہم نے آج تک قرآن مجید کی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر 126 نہیں پڑھی جس میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے مکہ کے شہریوں کے لیے رزق سے پہلے امن و امان کی دعا کی تھی، ہم کتنے بے وقوف ہیں ہم قرآن مجید کو چھوڑ کر اس صدر بش کے پیچھے پھر رہے ہیں جس کی اپنی ترقی امن و امان کی مرہون منت ہے" میں نے ٹھنڈی سانس بھری اس کے خوشبودار اور روشن دفتر کی طرف دیکھا اور باہر آ گیا' باہر بدبو بھی تھی' اندھیرا بھی اور افراتفری بھی' میں نے محسوس کیا' اگر ایک شخص امن کی بنیاد پر اتنی بڑی تبدیلی لا سکتا ہے تو حکومت اس اصول کو قانون بنا کر پورا معاشرہ کیوں نہیں بدل سکتی' مجھے سمجھ نہیں آئی لہٰذا میں آگے بڑھ گیا۔

# عصر کی قسم

میں نے عرض کیا ''خواجہ صاحب سائنس نے کمال کر دیا' قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے دو بڑے مسئلے تھے لیکن سائنس ان دونوں کے حل کے قریب پہنچ گئی ہے' اب وہ وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور عذابوں کے ہاتھ سے نکل آئے گا'' وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے رہے' وہ نرم آواز میں بولے ''مثلاً سائنس نے کیا کر دیا'' میں نے عرض کیا ''سر زلزلے' آتش فشاں' آندھیاں' طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں' سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سسٹم بنا لیا ہے' سائنس دانوں نے ایک ایسا کیمرہ بنایا ہے جو آتش فشاں کے پیندے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کر لیتا ہے' ماہرین یہ تبدیلیاں دیکھ کر آئندہ پیش گوئی کر سکیں گے فلاں آتش فشاں فلاں دن اور فلاں وقت ابل پڑے گا' اس سسٹم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں گے' یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی'' خواجہ صاحب سکون سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی سلاخ بھی بنالی ہے جو زمین کی تہہ میں پچاس ساٹھ کلومیٹر تک چلی جائے گی اور یہ زمین کے اندر موجود پلیٹوں کی حرکت نوٹ کرے گی لہٰذا جونہی کسی پلیٹ میں کسی قسم کی حرکت ہو گی ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت' اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے' ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے اور وہ لوگ

زلزلے سے پہلے گھروں اور دفتروں سے باہر آ جائیں گے' یوں ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ جائیں گی' ماہرین نے عمارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنا لئے ہیں جو ساڑھے نو درجے کی شدت سے آنے والے زلزلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچنے دیں گے چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب زلزلے آئیں گے لیکن لوگ اطمینان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے" خواجہ صاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے' میں نے عرض کیا" بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں' سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے ہمارے جینز میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں' ہر بیماری کا ایک الگ جین ہوتا ہے' سائنس دانوں نے اڑھائی ہزار مہلک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں لہٰذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا معائنہ کریں گے' اس میں پروان چڑھنے والے جینز دیکھیں گے اور ان جینز کو صحت مند جینز کے ساتھ بدل دیں گے یوں مریض مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا' انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے' اگلے دس بیس برس میں انسان مرنے سے پہلے دوبارہ جنم لینا شروع کر دے گا" خواجہ صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا" اس طرح سائنس دانوں نے آندھیوں' طوفانوں اور سیلابوں کی پیدائش کے مراکز بھی تلاش کر لئے ہیں ان کا کہنا ہے اگر ان آفتوں کے مراکز تباہ کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہوں گی' سائنس دان ایسے آلے بھی بنا رہے ہیں جو ان ہواؤں' ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو اکٹھی ہو کر آندھی' سیلاب اور طوفان بنتی ہیں چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پا لے گا لہٰذا خواجہ صاحب آنے والا وقت انسان کے لئے بڑا آئیڈیل ہوگا' دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیلنج نہیں ہوگا' لوگ مطمئن' آرام دہ اور سکھی زندگی گزاریں گے"

خواجہ صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجھے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے" تم بڑے بے وقوف ہو' یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا انسان' انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان پچھلے دس ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر انسان کو نہیں پہنچا سکیں' تم یہ دیکھ لو 8 اکتوبر کے زلزلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سڑکوں پر حادثوں میں مارے جاتے ہیں' ہر سال ہمسایوں کے ہاتھوں جتنے ہمسائے قتل ہوتے ہیں' جتنے بیٹے اپنے باپ قتل کرتے ہیں' آشناؤں کے ہاتھوں جتنے خاوند مارے جاتے ہیں' جتنے خاوند اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں' ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راہگیر مارے جاتے

ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں' یہ ساری ہلاکتیں قدرتی آفتوں میں مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں' بش جیسے لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے کتنے لوگ مار دیتے ہیں' وحشت گردوں کے ہاتھوں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں' کشمیر' فلسطین' افغانستان' سری لنکا' عراق اور چیچنیا میں انسانوں کے ہاتھوں کتنے انسان مارے گئے' گورے کے ہاتھوں کتنے کالے مارے گئے اور سرخ رو انسان کتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے' ناگاساگی پر بم کس نے پھینکا تھا' ایک انسان نے! اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان' دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی' ایک انسان نے' اس جنگ کا لقمہ کون بنے' دوسرے انسان' کوریا کی جنگ کس نے چھیڑی تھی' ویتنام پر حملہ کس نے کیا تھا' روس افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی' افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے' اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا' انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست مارا جاتا ہے لہٰذا انسان کا سیلابوں' طوفانوں اور بیماریوں سے مقابلہ نہیں' انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شرست میں تبدیلی نہیں آتی' یہ دنیا دار امن نہیں بن سکتی' اس زمین پر تخریب کا عمل نہیں رک سکتا"



میں خواجہ صاحب کی بات غور سے سنتا رہا' انہوں نے فرمایا "انسان' انسان سے خائف ہے' وہ جب بھی ذرا سا خوشحال ہوتا ہے' اسے جب بھی ذرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے' وہ جب بھی ذرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے' وہ آم کھا کر گٹھلیاں ہمسائے کے گھر پھینک دے گا' وہ دو لاکھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر باندھ دے گا' وہ ایٹم بم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے اور وہ بادشاہ کا مصاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں' سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں' اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے' اس کے اندر بھی وہی خون' وہی انا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے لہٰذا انسان انسان کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں چنانچہ انسان کی انسان کے ساتھ جنگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی' دونوں خسارے میں رہتے ہیں' یہ اس زمین کا قانون ہے لہٰذا انسان جب تک مقدونیہ' سمرقند اور واشنگٹن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا ' وہ جب تک دوسرے انسان پر حکمرانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب

تک دوسرے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا' اس وقت تک اس زمین پر امن نہیں ہوگا" میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا' انہوں نے فرمایا "سائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرست کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہیے' انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہیے جسے کھانے کے بعد صدر بش اور صدام حسین کی انا پر سکون ہو جائے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرانا بند کر دیں' جسے کھانے سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور وہ دونوں خود کو کمزور اور چند سانسوں کے مہمان انسان سمجھ لیں' جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں' جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں' جسے کھانے سے افسان انسان کو معاف کر دے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکرانا بند کر دے"

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا' انہوں نے فرمایا "یقین کرو ایک جنگل میں دو شیر سکون اور آرام سے رہ سکتے ہیں لیکن ایک چھت کے نیچے دو انسان لڑے' ٹکرائے اور مرے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے" شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا عصر کی قسم انسان خسارے میں ہے۔

# سات جمع سات جمع ایک

بادشاہ نے عجیب خواب دیکھا' اس نے دیکھا ''سات موٹی تازی گائیں سات دبلی پتلی گائیوں کو کھا رہی ہیں اور گندم کی سات ہری بھری بالیاں ہیں اور ان کے قریب سات سوکھی بالیاں ہیں'' بادشاہ نے اپنے درباریوں کو تعبیر لانے کا حکم دیا' درباریوں نے بے شمار تعبیریں پیش کیں لیکن بادشاہ مطمئن نہ ہوا آخر میں بادشاہ کے ایک ساقی نے عرض کیا ''حضور میں ایک قیدی کو جانتا ہوں' وہ تعبیروں کا ماہر ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں اس سے خواب کی شرح پوچھ لوں'' بادشاہ نے اجازت دے دی' ساقی قید خانے میں چلا گیا' اللہ کے بندے نے خواب سنتے ہی فرمایا ''ملک پر سات سال خوش حالی کے بعد خشک سالی کا ایک خوفناک دور آئے گا' یہ دور سات سال جاری رہے گا' ان سات برسوں کے بعد بارشوں کا ایک سال آئے گا' اس سال خوب بارشیں ہوں گی' تم بادشاہ سے کہو وہ سات برس تک مسلسل کھیتی باڑی کرائے' اس سے جو فصل حاصل ہو' اسے بالیوں سمیت ذخیرہ کر لے' جب خشک سالی کے سات سال آئیں تو وہ یہ ذخیرہ شدہ اناج عوام میں تقسیم کر دے' اس حکمت سے لوگ قحط سے بچ جائیں گے'' ساقی یہ پیغام لے کر بادشاہ کے پاس چلا گیا' اس کے بعد کہانی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مگر یہ دور ہمارا موضوع نہیں' ہمارا موضوع سات جمع سات' جمع ایک سال ہے۔

یہ واقعہ حضرت یوسفؑ سے متعلق ہے اور قرآن مجید سمیت تمام آسمانی کتب اس کی

حقانیت کی گواہی دیتی ہیں' اس واقعے میں سائنس' ٹیکنالوجی' علم اور عبرت کی بے شمار نشانیاں پوشیدہ ہیں' ان نشانیوں میں سے ایک نشانی ''ویدر سائیکل'' یا موسمیاتی دور ہے' سائنس دانوں نے اس واقعے سے ہزاروں سال بعد یہ اندازہ لگایا' دنیا کے مختلف خطوں میں سات سے پندرہ سال پر محیط دو قسم کے موسمیاتی سائیکل ہوتے ہیں' پہلی قسم کے سائیکل کو ویٹ سائیکل یا مرطوب موسم کہتے ہیں جبکہ دوسری قسم ڈرائی سائیکل یا خشک موسم کہلاتی ہے' یہ دونوں سائیکل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں' ویٹ سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں خوب بارشیں ہوتی ہیں' اس کے بعد بارشوں کی شرح کم ہونا شروع ہو جاتی ہے' یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے اور اس کے آخر میں ڈرائی سائیکل شروع ہو جاتا ہے' اس سائیکل کے ابتدائی سات برسوں میں بارشیں تقریباً ختم ہو جاتی ہیں اور اس خطے میں قحط سالی اور خشک سالی کا آغاز ہو جاتا ہے' یہ سلسلہ سات سال تک جاری رہتا ہے' ان سات برسوں کے آخر میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے' اگلے سات برسوں میں بارشوں کی رفتار اور سائز میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جاتا ہے' جب یہ سات سال پورے ہوتے ہیں تو دوبارہ ویٹ سائیکل شروع ہو جاتا ہے' موسموں کے یہ سائیکل قوموں کا مستقبل طے کرتے ہیں' جو قومیں ان سائیکلوں کو مدنظر رکھ کر آبی ذخائر کا بندوبست کرتی ہیں' جو قومیں ویٹ سائیکل میں اپنے ڈیم اور جھیلیں بھر لیتی ہیں' جو قومیں آنے والے موسموں کو سامنے رکھ کر فصلیں بوتی اور کاٹتی ہیں اور جو قومیں قدرت کے اس فارمولے کو سامنے رکھ کر خوراک کے ذخیرے تیار کر لیتی ہیں وہ قومیں پوری آبرو کے ساتھ مشکل وقت سے عہدہ برآ ہو جاتی ہیں' وہ خشک سالیوں اور قحط سے بچ جاتی ہیں لیکن جو قومیں قدرت کے اس نظام کے تیور نہیں سمجھتیں اور جو قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر اپنی حکمت عملی تیار نہیں کرتیں وہ خشک سالی اور قحط کا شکار ہو جاتی ہیں' وہ مسائل میں گھر جاتی ہیں اور ان کا حال مستقبل کے اندیشوں میں ہچکولے لینے لگتا ہے۔

پاکستان میں 1998ء تک ویٹ سائیکل تھا' اس دور میں پاکستان میں بے تحاشہ بارشیں ہوئیں' ہم نے اس وقت سے پہلے قدرت کے نظام کو سامنے رکھ کر آبی ذخائر تشکیل نہیں دیئے تھے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کی رحمت ہماری زمین پر نازل ہوئی تو ہماری بے وقوفی کے باعث اس رحمت نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی' اس دور میں پاکستان میں بے شمار سیلاب آئے' ہمارے کئی شہر' قصبے اور دیہات اس سیلاب میں بہہ گئے' ہم دنیا میں آفت زدہ علاقہ قرار پا گئے' اس دور کے آخر میں 1999ء سے ہمارا ڈرائی سائیکل یا خشک دور شروع ہو گیا' ہمارا یہ سائیکل پندرہ سال

جاری رہے گا' 1999ء سے ہمارے ملک میں بارشوں میں کمی آنا شروع ہوگئی' 2006ء سے اس ڈرائی سیزن کی پیک شروع ہو رہی ہے' مئی 2006ء سے ہماری خشک سالی کے سات سال شروع ہو رہے ہیں' ان سات برسوں میں ہمارا بلوچستان' سندھ اور جنوبی پنجاب خشک سالی سے بری طرح متاثر ہوگا' یہ سلسلہ 2014ء تک جاری رہے گا اس کے بعد ہم ایک بار پھر ویٹ سیزن میں داخل ہو جائیں گے' 2014ء سے بارشوں کا ہلکا پھلکا سلسلہ شروع ہوگا' یہ سلسلہ 2021ء تک چلتا رہے گا' 2021ء سے بھاری بارشیں شروع ہوں گی اور اس کے بعد 2028ء تک اس خطے میں انتہائی خوفناک بارشیں ہوں گی' ہمارے ملک میں اس قدر سیلاب اور طوفان آئیں گے کہ ہمیں پاؤں تک رکھنے کیلئے خشک زمین نہیں ملے گی لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں' ہمارا فوری مسئلہ انتہائی خوفناک ڈرائی سائیکل ہے اور ہم اس سائیکل کے دہانے پر کھڑے ہیں' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کو اس سائیکل کا احساس ہے لہٰذا حکومت نے آنے والے برسوں میں صرف ان فصلوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جنہیں کم پانی کی ضرورت ہوتی ہے' اس دور میں زیادہ پانی چوسنے والی فصلوں کی حوصلہ شکنی کی جائے گی' حکومت اس سال کپاس کے علاقے کو پانی دے گی جبکہ چاول اور گنے کی فصل کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی' مجھے ان صاحب کی گفتگو سے اندازہ ہوا شاید آنے والے برسوں میں چینی اور چاول کی قیمتوں میں مزید اضافہ ہو جائے۔ مجھے مزید محسوس ہوا یہ ڈرائی سائیکل چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے' ہمیں ملک میں نئے ڈیمز اور جھیلوں کی اشد ضرورت ہے' اگر ہم نے فوری طور پر بڑے فیصلے نہ کیے تو ہم آنے والے چند برسوں میں پانی کی ایک ایک بوند اور روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترس جائیں گے' جن لوگوں کو یقین نہ آئے وہ راول ڈیم کا ایک چکر لگا لیں انہیں راول ڈیم کی خشک سطح سے ہمارے مستقبل کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا' یقین کیجئے اگر ہم نے قدرت کا نظام نہ سمجھا تو یہ صورتحال پورے ملک میں پھیل جائے گی' ہمارا پورا ملک راول ڈیم بن جائے گا۔

میں واپس حضرت یوسفؑ کے واقعے کی طرف آتا ہوں جب انہیں قید سے نکال کر بادشاہ کے دربار میں لے جایا گیا تھا اور بادشاہ نے انہیں وزارت کی پیشکش کی تھی تو حضرت یوسفؑ نے اپنے لیے پیداوار اور خزانے کی وزارت پسند فرمائی تھی' بادشاہ نے اس کی وجہ پوچھی تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا ''کیونکہ میں دیانت دار بھی ہوں اور صاحب علم بھی'' اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قوموں کی ترقی کی بنیاد وضع کر دی ہے' یہ بنیاد دیانت اور علم پر استوار ہے' اللہ تعالیٰ کی نظر

میں جب کسی قوم کی پیداوار اور خزانے کی وزارت دیانت دار اور صاحب علم لوگوں کے پاس ہو تو وہ قوم ترقی کی معراج کو چھو لیتی ہے' کاش ہمیں بھی خزانے اور پیداوار کے شعبوں میں ایسے لوگ مل جائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم اور دیانت کی دولت سے نواز رکھا ہو' جو قدرت کا سات جمع سات جمع ایک کا فارمولا سمجھتے ہوں' جو اللہ کے نظام کو سامنے رکھ کر اس ملک کے وسائل کی تشکیل کریں' جو دبلی پتلی گائیوں کو موٹی تازی گائیوں سے بچائیں' جو سات ہری بالیوں اور سات خشک بالیوں کا فرق سمجھتے ہوں اور جو اس ملک کے ساتھ مخلص ہوں۔

# باب وولمر جیسا دل

رابرٹ انڈریو وولمر عرف باب وولمر اور پاکستانی قوم میں ایک واضح فرق تھا اور یہ فرق قیامت تک برقرار رہے گا۔



باب وولمر نے تین سال کی عمر میں بیٹ پکڑا' وہ 24 اگست 1972ء کو ٹیسٹ کرکٹر بنا اور 17 مارچ 2007ء تک کرکٹ کی دنیا میں رہا' باب وولمر کا کرکٹ کیریئر عملی طور پر 1984ء میں ختم ہو گیا جس کے بعد اس نے ساؤتھ افریقین ہائی سکول کی کوچنگ شروع کر دی' وہ 1991ء میں وارک شائر کا کوچ بن گیا' وارک شائر نے اس کی کوچنگ میں چار ٹورنامنٹ کھیلے اور ان میں سے تین ٹورنامنٹ جیت لئے' وہ 1994ء میں ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا کوچ بن گیا' باب نے آنے والے دنوں میں ساؤتھ افریقہ کو کرکٹ کنٹری بنا دیا' 1994ء سے 1999ء ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کا سنہری دور تھا' اس دور میں کروننئے' جونٹی روڈز اور شان پولاک ایسے بہترین کھلاڑی پیدا ہوئے' یہ کھلاڑی باب وولمر کی محنت کا نتیجہ تھے' باب وولمر کی کوچنگ میں ساؤتھ افریقہ نے 73 فیصد ون ڈے انٹرنیشنل اور 10 ٹیسٹ سیریز جیتیں' 1999ء کے ورلڈ کپ میں باب وولمر ساؤتھ افریقہ کا کوچ تھا' اس نے ورلڈ کپ کو اپنے لئے ہدف مقرر کر رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے ساؤتھ افریقہ اور آسٹریلیا کے درمیان میچ ٹائی ہوا اور ساؤتھ افریقہ سیمی فائنل ہار گیا' باب وولمر نے اسے اپنی ناکامی سمجھا لہٰذا اس نے کوچنگ سے استعفیٰ دے دیا۔ پاکستان نے 2004ء میں باب

وولمر کی خدمات حاصل کیں' وہ پاکستان آیا اور اس نے ہماری کرکٹ ٹیم کی کوچنگ سنبھال لی' باب کا خیال تھا پاکستانی ٹیم اس کی قیادت میں 2007ء کا ورلڈ کپ جیت لے گی لیکن مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہوا تو پاکستانی ٹیم نے باب وولمر کو ہلا کر رکھ دیا' 13 مارچ کو پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان پہلا میچ تھا' پاکستان یہ میچ 54 سکور سے ہار گیا' دوسرا میچ 17 مارچ کو آئر لینڈ کے ساتھ ہوا' آئر لینڈ تاریخ میں پہلی بار ورلڈ کپ کے میدان میں اترا تھا لہٰذا ماہرین آئر لینڈ کی ٹیم کو "بے بی ٹیم" کہتے تھے' میچ شروع ہوا تو آئر لینڈ کی بے بی ٹیم نے دنیا کی بہترین کرکٹ ٹیم کو 132 سکور پر اڑا دیا' پاکستان نے باؤلنگ شروع کی تو آئر لینڈ نے 41 اوورز میں 132 سکور بنا لئے یوں پاکستان بچوں کے ہاتھوں ورلڈ کپ سے باہر ہو گیا' مبصرین نے پاکستان کی ناکامی کو "میچ فکسنگ" قرار دے دیا' ماہرین کا خیال تھا آئر لینڈ "کرکٹ ٹورازم" کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب آئرش ٹیم پاکستان جیسے کسی بڑے ملک کو شکست دے دیتی چنانچہ آئر لینڈ نے خزانے کے منہ کھول دیئے۔ باب وولمر نے اس ناکامی کو سنجیدگی سے لے لیا' وہ ہوٹل کے کمرے میں گیا' کرسی پر بیٹھا' اس نے ناکامی کی وجوہات پر سوچنا شروع کیا اور اسے



ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ ہسپتال کے راستے میں دم توڑ گیا' باب وولمر کا یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب ہماری کرکٹ ٹیم اپنی ناکامی کو اللہ تعالیٰ کا امتحان قرار دے رہی تھی اور قوم کو سیاہ بکرے ذبح کرنے اور کفارہ ادا کرنے کے مشورے دیئے جا رہے تھے۔

میں نے جب سے باب وولمر کے انتقال کی خبر پڑھی ہے' میں اس وقت سے سوچ رہا ہوں پاکستان کی شکست پر ایک برطانوی کوچ کیوں مر گیا اور اس تاریخی ہزیمت پر جناب ڈاکٹر نسیم اشرف اور مولانا انضمام الحق کیوں زندہ ہیں؟ یہ سوال وہ فرق ہے جو پاکستانی قوم کو باب وولمر جیسے لوگوں سے الگ کرتا ہے' ہم لوگ بنیادی طور پر شیخ رشید کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں' پچھلے دنوں ٹرین کے ایک حادثے کے بعد لوگوں نے شیخ رشید سے ریلوے کی وزارت سے استعفے کا مطالبہ کیا تھا تو ہمارے سدا بہار وزیر نے فرمایا تھا "میں وزیر ہوں ٹرین کا ڈرائیور نہیں" شیخ رشید صاحب کے یہ خیالات پاکستانی قوم کا وژن اور فلسفہ حیات ہیں اور یہ فلسفہ حیات ہماری بقاء کی وجہ بھی ہے لہٰذا آپ دیکھ لیجئے 1971ء کے سانحے سے چیف جسٹس کی باعزت حراست تک ہم لوگ ہر قسم کے بحران میں نہ صرف زندہ رہے بلکہ شیخ رشید کی طرح سینہ تان کر دنیا میں چلتے پھرتے بھی ہیں' یہ باب وولمر کی بدقسمتی تھی وہ پاکستان میں رہنے کے باوجود ہم سے سینہ تاننے کا فن نہ سیکھ سکا' اگر وہ

یہ فن سیکھ لیتا تو وہ ہوٹل کے تنہا کمرے میں یوں نہ مارا جاتا' وہ نیول چیف منصور الحق کی طرح وکٹری کا نشان بناتا ہوا اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترتا' کیمروں کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور زیادہ بہتر مراعات پر زندگی گزارتا رہتا لیکن میں نے عرض کیا ناں باب وولمر اور پاکستانی قوم میں ایک فرق تھا اور باب وولمر کی جان اس فرق نے لی تھی' یہ فرق اخلاقیات کی لغت میں ضمیر کہلاتا ہے' باب وولمر کا ضمیر زندہ تھا' وہ اپنے دل کے ''نیب'' کا سامنا نہ کر سکا لہٰذا اس نے جان دے دی۔

آپ باب وولمر اور پاکستانی معاشرے کو مارچ کے مہینے میں رکھ کر دیکھئے' 13 اور 17 مارچ کے میچوں سے پہلے پاکستان میں 9 مارچ کا ''ورلڈ کپ'' ہوا تھا' اس ورلڈ کپ میں یونیفارم میں ملبوس جمہوریت جنرل پرویز مشرف نے چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کو گھر بلا کر غیر فعال کر دیا تھا' نو مارچ تک دنیا میں 245 ممالک تھے۔ ان میں سے 202 ممالک آزاد ہیں اور ان میں سے 193 ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں' دنیا کے ان 245 ممالک' 202 آزاد ملکوں اور اقوام متحدہ کی 193 ریاستوں میں پاکستان واحد ملک تھا جس کی تاریخ میں 9 مارچ کا دن آیا تھا لیکن اس 9 مارچ کو پاکستان کے 16 کروڑ عوام شیخ رشید بن گئے اور انہوں نے مسکرا کر سوچا' ہم اس زمین کے ذاتی نہیں ہیں چنانچہ ہم کیا کر سکتے ہیں' آپ مزید دلچسپ امر بھی ملاحظہ کیجئے اس وقت پاکستان میں تیرہ ہزار شعبے' 7 کروڑ 67 لاکھ 41 ہزار 3 سو جوان شہری اور 16 کروڑ 4 لاکھ 21 ہزار 5 سو 12 لوگ ہیں لیکن ان لوگوں' ان جوانوں اور ان تیرہ ہزار شعبوں میں صرف وکیلوں' ججوں اور میڈیا کے کارکنوں نے 9 مارچ کے ظلم پر احتجاج کیا جبکہ باقی تمام لوگ گھر میں بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہوتے رہے' طلعت عباس اسلام آباد کے نامور وکیل اور میرے دوست ہیں' کل شام ان کا فون آیا تو میں نے ان سے عرض کیا ''مارچ باب وولمر اور وکلاء کا مہینہ ہے' آپ لوگوں نے پوری قوم کا فرض کفایہ ادا کر دیا'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ''اگر ہمارے ساتھ چند ہزار عام لوگ بھی شامل ہو جاتے تو ہم ملک میں انقلاب لے آتے۔'' طلعت عباس کی بات درست تھی' 21 مارچ تک چیف جسٹس کی معطلی پر صرف 18 ججوں نے استعفیٰ دیے تھے اور وکلاء نے صرف پانچ بڑے جلوس نکالے لیکن اس کے باوجود ان استعفوں اور ان مارچوں پر نہ صرف حکومت کی ٹانگیں کانپ گئیں بلکہ حکومت کو ٹیلی ویژن پر جھوٹ بولنے کے لئے کوئی وزیر نہیں مل رہا تھا' ذرا تصور کیجئے اگر پوری عدلیہ استعفیٰ دے دیتی یا پاکستان کے تمام جوان لوگ سڑکوں پر نکل آتے تو حکومت کا کیا بنتا؟ حکومت کہاں جاتی؟ لیکن بات

پھر باب وولمر اور پاکستانی قوم کے فرق پر آ کر رک جاتی ہے' باب وولمر نے ٹیم کی شکست پر جان دے دی لیکن ہم لوگ جمہوریت' اخلاقیات اور ضمیر کے سارے میچ ہارنے کے باوجود نہ صرف زندہ ہیں بلکہ اپنے کندھوں پر جرأت اور بہادری کے تمغے بھی سجا رہے ہیں۔

میرا بس چلے تو میں پاکستان کے ہر شہر میں باب وولمر کا مجسمہ بنواؤں اور لوگوں سے درخواست کروں' وہ روزانہ گھر سے نکلنے کے بعد ایک منٹ کے لئے اس مجسمے کے قریب رک جایا کریں اور اس مجسمے کو دیکھ کر سوچا کریں کیا قوموں کے لئے ذری سی زندگی قیمتی ہوتی ہے یا ایک عزت دار موت؟ لیکن شائد یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ زندہ ضمیر لوگوں کے مجسمے صرف ان ملکوں میں بنائے جاتے ہیں جہاں لوگوں کے دل زندہ ہوتے ہیں اور بدقسمتی سے ہم لوگ ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں 16 کروڑ لوگ تو ہیں لیکن کسی شخص کے جسم میں باب وولمر جیسا دل نہیں۔

# ایک منٹ چودہ سیکنڈ

ولیم ہیلم امریکہ کا ایک ناکام لکھاری تھا۔ اس کے والدین پولینڈ سے امریکہ آئے اور پوری زندگی خوش حال ہونے کی کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہو سکے' وہ مرنے سے پہلے یہ خواہش ولیم ہیلم کو ترکے میں دے گئے' ولیم ہیلم نے اکاؤنٹنگ کی تعلیم حاصل کی' اسے کالج سے واجبی سی ڈگری ملی' وہ مختلف دفتروں میں دھکے کھاتا رہا لیکن اسے اپنی منشاء کے مطابق نوکری نہ مل سکی' اس نے تنگ آ کر امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی' وہ دفتر خارجہ کے کمپیوٹر سیکشن میں نچلے درجے کا کلرک بھرتی ہو گیا' ویت نام کی جنگ شروع ہوئی تو اسے امریکی حکومت کا ملازم ہونے پر شرمندگی ہونے لگی' اس نے استعفیٰ دے دیا' اس کے بعد اس نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک خفیہ اخبار ''واشنگٹن فری پریس'' نکالا' یہ ایک باغی اخبار تھا لہٰذا یہ اخبار اس کا ذریعہ روزگار نہ بن سکا' یہ مشغلہ ختم ہوا تو اس نے لکھنے لکھانے کا پیشہ اختیار کیا' امریکی حکومت کی استعماری پالیسیاں اس کا موضوع تھیں' اس نے ''کلنگ ہوپ'' کے نام سے کتاب لکھی لیکن یہ کتاب کامیاب نہ ہو سکی' اس کے بعد وہ مختلف اخبارات' رسائل اور میگزینز میں مضامین لکھتا رہا لیکن اسے زیادہ قارئین نہ ملے' نائین الیون کے بعد اس نے ''روگ سٹیٹ'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی مگر یہ کتاب بھی اس کی پچھلی کتابوں کی طرح ناکام ہو گئی' وہ تھک گیا' اس کی عمر 74 سال ہو گئی تھی لہٰذا اس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا' اس نے واشنگٹن ڈی سی میں ایک کمرے کا سٹوڈیو

فلیٹ لیا اور اس فلیٹ میں تنہائی کی زندگی گزارنے لگا' وہ سارا دن ٹیلی ویژن دیکھتا' اخبارات اور کتابیں پڑھتا اور سو جاتا' اس کی واحد تفریح کنکٹی کٹ ایونیو کا چکر لگانا تھا' وہ اپنے فلیٹ سے اترتا اور ہلکے ہلکے قدموں سے اس ایونیو کے ایک سرے سے دوسری سمت تک جاتا اور وہاں سے واپس آ جاتا' اس کی خوراک انتہائی کم اور ضروریات زندگی نہ ہونے کے برابر تھیں لہٰذا پنشن اور کچھ کام کتابوں کی کمائی سے اس کا گزارہ ہو جاتا تھا لیکن پھر اچانک اس کے مقدر کا ستارہ چمکا اور وہ امریکہ کا مشہور ترین شخص ہو گیا' ایک دن میں اس کے لئے دو ہزار ایک سو اکیس ٹیلی فون کالز آئیں' یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ ٹیلی فون کمپنی کی لائنیں جام ہو گئیں' فروری کے مہینے میں امریکی اخبارات میں اس کے فلیٹ کی اتنی تصویریں شائع ہوئیں کہ کنکٹی کٹ ایونیو پر پراپرٹی کی قیمتیں دوگنا ہو گئیں' ولیم بیلم کے اس مقدر کے پیچھے اسامہ بن لادن کا ہاتھ تھا۔ جی ہاں یہ اسامہ بن لادن تھا جس نے بوڑھے ولیم بیلم کی قسمت بدل دی۔

جنوری کے آخری ہفتے میں اسامہ بن لادن نے اپنی نئی کیسٹ جاری کی تھی' اس کیسٹ میں انہوں نے بش سمیت تمام امریکیوں کو مخاطب کیا' اس خطاب میں انہوں نے ولیم بیلم اور اس کی کتاب "روگ سٹیٹ" کا ذکر کیا اور پوری امریکی قوم کو مشورہ دیا "اگر آپ لوگ امریکہ کو بچانا چاہتے ہیں تو آپ ولیم بیلم کی کتاب پڑھیں یہ شخص تمام امریکیوں سے زیادہ ذہین اور سمجھدار ہے" اسامہ بن لادن نے ولیم بیلم کا لکھا ہوا ایک پیراگراف بھی پڑھا' اس پیراگراف میں ولیم بیلم نے لکھا تھا "اگر میں امریکہ کا صدر ہوتا تو میں چند دنوں میں امریکہ پر ہونے والے حملے رکوا سکتا تھا' میں سب سے پہلے ان تمام بیوہ خواتین اور یتیم بچوں سے معافی مانگتا جو امریکی حملوں کا شکار ہوئے' اس کے بعد میں امریکی بربریت اور تشدد کے شکار لوگوں سے معافی مانگتا اور اس کے بعد میں ان کروڑوں لوگوں سے معذرت کرتا جو امریکہ کی نوآبادیاتی سوچ کا نشانہ بن رہے ہیں یوں میں چند دنوں میں امریکہ کے خلاف موجود نفرت مٹا دیتا" اسامہ بن لادن کے ان الفاظ کی دیر تھی ولیم بیلم چند گھنٹوں میں امریکہ کا "ہاٹ کیک" بن گیا' اسامہ بن لادن کی اس مہربانی سے پہلے ولیم بیلم کی کتاب "ایمازان ڈاٹ کام" پر دو لاکھ 5 ہزار 7 سو 65 ویں نمبر پر تھی لیکن جوں ہی اسامہ بن لادن کے منہ سے ولیم بیلم کا نام نکلا تو 24 گھنٹے میں ولیم بیلم کی کتاب 26 ویں نمبر پر آ گئی' امریکہ کے گیارہ بڑے پرنٹنگ پریسوں نے دو دو شفٹوں میں کام کیا اور تب جا کر اس کتاب کی مانگ پوری ہوئی' ولیم بیلم نے صرف ایک مہینے میں ایک سو ملین ڈالر کمائے' وہ شخص جو پندرہ جنوری تک دوسری ڈبل روٹی کا روادار نہیں تھا وہ پندرہ فروری تک ارب پتی بن چکا تھا اور اس کے گھر کے

سامنے پبلشروں کی لائن لگی تھی' یہ تمام لوگ اس کے ساتھ نئی کتابوں کا معاہدہ کرنا چاہتے تھے لیکن ولیم بیلم ان لوگوں کو اپنے تین سیکرٹریوں کے حوالے کر کے گالف کھیلنے چلا جاتا تھا' ولیم بیلم کو اس وقت تک امریکہ کی 18 اور یورپ کی 21 یونیورسٹیوں سے خطاب کی دعوت مل چکی ہے جبکہ سو کے قریب نوخیز خواتین اس کے ساتھ شادی کی متمنی ہیں' یوں محسوس ہوتا ہے وہ شہرت' وہ نیک نامی اور وہ دولت جو اسے چالیس برس کی مسلسل محنت سے نہ مل سکی وہ دولت اور وہ شہرت اسے اسامہ بن لادن کے ایک منٹ چودہ سیکنڈ کے ذکر نے دے دی' ولیم بیلم دنیا کی مشہور شخصیت بن گیا۔

میں نے جب ولیم بیلم کا یہ واقعہ پڑھا تو یقین کریں مجھے بڑی جلن ہوئی' مجھے ولیم بیلم اپنا دشمن محسوس ہوا اور میں نے سوچا میں بھی دو کتابوں کا مصنف ہوں اور یہ کتابیں پچھلے پانچ برس سے ٹھیک ٹھاک بزنس کر رہی ہیں لیکن افسوس اسامہ بن لادن کو یہ کتابیں دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی' اگر وہ ان پر ایک نظر ڈال لیتے اور اپنی اس کیسٹ میں آدھا منٹ میرا ذکر کر دیتے تو آج میں بھی ارب پتی ہوتا' میرے گھر کے سامنے بھی کیمرے نصب ہوتے اور دنیا جہان کے رپورٹر میرے تعاقب میں ہوتے اور میں بھی انہیں اپنے تین سیکرٹریوں کے حوالے کر کے گالف کھیلنے چلا جاتا' میں بھی کیوبا کے انتہائی مہنگے سگار خریدتا اور یہ سگار سلگا کر پوری دنیا کو شیخ رشید کی طرح نفرت سے دیکھتا' مجھے محسوس ہوا اگر اسامہ بن لادن کے دل میں اپنے پاکستانی بھائیوں کے لئے ذرا سی بھی ہمدردی ہوتی تو آج میں بھی امیر ہوتا لیکن افسوس انہوں نے جب کسی غریب مصنف کو فائدہ پہنچانے کا فیصلہ کیا تو ان کی نظر انتخاب بھی امریکی رائٹر پر ہی پڑی' انہیں بھی امریکی ہی پسند آیا' گو اس سارے کھیل میں مجھے اربوں روپے کا نقصان پہنچ چکا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے خوشی ہے عالمی مارکیٹ کے ہاتھ اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لئے ایک نیا طریقہ آ گیا ہے' اب اگر کوئی جوتے بنانے والی کمپنی ڈیفالٹ کے قریب پہنچے گی تو اس کی کوشش ہوگی وہ کسی نہ کسی طریقے سے اسامہ بن لادن کو قائل کر لے اور وہ اپنے خطاب میں امریکیوں کو اس کمپنی کے جوتے استعمال کرنے کا مشورہ دے دیں' اسی طرح وہ جو کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں' وہ جس کمپنی کے مشروبات اور قہوہ پیتے' وہ جس کمپنی کا ٹوتھ برش اور پیسٹ استعمال کرتے ہیں' وہ جس کمپنی کا تولیہ' انڈرویئر' بنیان اور کنگھی استعمال کرتے ہیں' وہ جس کمپنی کا آملہ آئل لگاتے ہیں' وہ جس کمپنی کا شہد اور کھجوریں کھاتے ہیں' جس نسل کی بکری کا دودھ پیتے ہیں' جس ٹیکسٹائل مل کا کھدر پہنتے ہیں' جس برانڈ کا کوکنگ آئل استعمال کرتے ہیں۔ جس کمپنی کا موبائل اور ریڈیو خریدتے ہیں اور وہ جس

کمپنی کا سائیکل اور موٹر سائیکل استعمال کرتے ہیں یہ تمام کمپنیاں بھی کسی نہ کسی طرح اسامہ بن لادن کو اپنے اپنے برانڈ کا نام لینے پر قائل کر لیں گی اور اس کے بعد ان کے سٹورز کے سامنے خریداروں کی قطاریں لگ جائیں گی' مجھے یقین ہے اگر ایک بار یہ ٹرینڈ چل نکلا تو مستقبل میں ایڈورٹائزنگ کا سارا اسٹائل بدل جائے گا' کمپنیاں' چھوٹی' موٹی اور کالی ماڈلز کی بجائے اشتہارات میں اسامہ بن لادن کی تصویر شائع کریں گی اور اس کے بعد اعلان کریں گی یہ وہ صابن ہے جس نے اسامہ بن لادن کو چستی دی اور وہ بیس برس تک امریکہ کے قابو میں نہ آئے' یہ وہ اگربتی ہے جسے سلگا کر وہ تورا بورا کے پہاڑوں میں سکون کی نیند سوتے تھے' یہ وہ دری ہے جسے لے کر وہ کابل سے فرار ہوئے تھے اور یہ وہ تیل ہے جس کی مالش نے انہیں ہر قسم کی شرمندگی سے بچائے رکھا اور اس بوتل میں وہ وٹامنز ہیں جو ان کی اصل طاقت ہیں وغیرہ اور لوگ ان چیزوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میں اس گیم میں اربوں روپے کا ''لوزر'' ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے فخر ہے وہ اسامہ بن لادن جنہیں اس وقت امریکہ سمیت پوری دنیا دہشت گرد کہتی ہے ان کے لفظوں میں اتنی طاقت اتنی قوت موجود ہے کہ وہ امریکہ کے 74 سال کے ایک غریب ناکام اور دل گرفتہ مصنف کو ایک منٹ 14 سیکنڈ میں ارب پتی بنا سکتے ہیں' وہ ایک گم نام شخص کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں' وہ ایک گمشدہ' پسماندہ اور محروم شخص کو ٹیلی ویژن سکرین پر لے آتے ہیں اور وہ دو لاکھ 5 ہزار 7 سو 65 ویں درجے پر پڑی کتاب کو چوبیس گھنٹوں میں 26 ویں پوزیشن پر لا سکتے ہیں' وہ ردی کی دکانوں میں بکنے والی کتاب کو کاؤنٹر اور بک شیلف میں لا سکتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے یہ وہ طاقت ہے جس سے بش سمیت دنیا کے تمام حکمران محروم ہیں' اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت صرف اسامہ بن لادن کو بخشی ہے۔

# صرف ایک پلے کارڈ



جبران ہاشمی پاکستانی برطانوی شہری تھا' وہ 20 برس کی عمر میں برطانوی فوج میں بھرتی ہوا' وہ 2004ء میں افغانستان میں تعینات ہوا اور 2006ء میں طالبان کے خلاف لڑتے ہوئے جاں بحق ہو گیا' جبران ہاشمی کی ہلاکت کی خبریں برطانوی میڈیا میں آئیں تو برطانیہ کی پاکستانی کمیونٹی میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی' پاکستانیوں کا خیال تھا امریکہ اور برطانیہ افغانستان میں مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں لہٰذا کسی مسلمان کو ظالموں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے' 2006ء کے آخر میں کسی رکن اسمبلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں حکومت سے پوچھ لیا' برطانوی فوج میں کتنے مسلمان افسر ہیں؟' حکومت نے انکشاف کیا برطانوی فوج میں 330 مسلمان سپاہی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لوگ پاکستانی برطانوی شہری ہیں' پاکستان کمیونٹی نے اس انکشاف پر بھی برا منایا' پاکستانیوں نے میڈیا' مساجد اور کمیونٹی فنکشنز کے ذریعے برطانیہ کی فوج میں موجود مسلمان فوجیوں کے خلاف تحریک شروع کر دی' وہ پاکستانی برطانوی فوجیوں کو افغانستان اور عراق میں مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے' مسلمانوں کی یہ مہم بہت جلد برطانوی پولیس اور ایجنسیوں کی نظر میں آ گئی' یہاں تک کہ 31 جنوری 2007ء کو میڈ لینڈز کا کاؤنٹر ٹیررازم یونٹ نے ویسٹ میڈ لینڈ پولیس اور لندن میٹروپولیٹن پولیس کی مدد سے برمنگھم شہر میں پاکستانیوں کے 12 گھروں پر ریڈ کیا اور 8 پاکستانی نوجوان گرفتار کر لئے' برطانوی پولیس کا کہنا تھا یہ نوجوان برطانوی فوج میں

موجود کسی مسلمان فوجی کو اغوا کرنے' اس کا سر اتارنے اور اس کی ویڈیو ٹیپ نشر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے' یہ نوجوان اس عمل سے برطانوی فوج میں موجود مسلمان سپاہیوں میں خوف پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن پولیس ابتدائی تفتیش میں نوجوانوں کے خلاف الزامات ثابت نہ کر سکی' مقامی آبادی نے بھی نوجوانوں کے کردار اور اچھی عادات کی گواہی دے دی' برطانوی تجزیہ نگاروں کا بھی کہنا ہے ٹونی بلیئر کی حکومت اپنی ناکامیوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے' وہ امریکہ کی طرح برطانوی عوام کو بھی سیکورٹی کے بخار میں مبتلا کرنا چاہتی ہے اور وہ برطانیہ میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنا چاہتی ہے' یہ ایک صورتحال تھی' اب دوسری صورتحال ملاحظہ کیجئے۔

31 جنوری کو جب پولیس نے پاکستانی مسلمانوں کے گھروں پر ریڈ کیا اور پوری دنیا کے میڈیا پر اس کی کوریج شروع ہوئی تو برمنگھم کے گوروں نے پولیس کی اس حرکت پر شدید غصے کا اظہار شروع کر دیا' برمنگھم کی چار بڑی تنظیموں نے حکومت کے اس اقدام کے خلاف پلے کارڈز بنائے اور یہ کارڈز لے کر پارکوں' سڑکوں' ریلوے سٹیشنوں اور شاپنگ سنٹروں کے سامنے کھڑے ہو گئے' ان لوگوں کا کہنا تھا حکومت نہ صرف ان کے شہر کو بدنام کر رہی ہے بلکہ وہ برمنگھم کے مسلمانوں اور عیسائیوں میں کشیدگی بھی پیدا کر رہی ہے' میں نے دو فروری کے ایک پاکستانی انگریزی اخبار میں اس نوعیت کی ایک تصویر دیکھی' یہ برمنگھم شہر کے ایک فٹ پاتھ کی تصویر تھی' تصویر میں چند طالب علم فٹ پاتھ سے گزر رہے تھے جبکہ ان کے سامنے ایک بزرگ خاتون ہاتھ میں سفید رنگ کا پلے کارڈ اٹھا کر کھڑی تھی' پلے کارڈ پر لکھا تھا "I am Offended" یہ خاتون انگریز تھی اور یقیناً عیسائی بھی ہو گی' میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے وہ منظر' وہ پلے کارڈ اور وہ بزرگ خاتون میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے' میں بری طرح اس منظر کا حصہ بن گیا ہوں' میں پچھلے چار پانچ دنوں سے جہاں بھی جاتا ہوں' یہ تصویر اور یہ منظر میرے ساتھ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں معاشرے اور ملک اس بزرگ خاتون جیسے لوگوں کی وجہ سے زندہ اور تابندہ رہتے ہیں' جن ملکوں' جن معاشروں میں لوگ زیادتی پر احتجاج کرتے ہیں' جن میں لوگوں کا ضمیر اور احساس زندہ ہوتا ہے' صرف انہیں معاشروں کو حساس اور متحرک قرار دیا جا سکتا ہے' ہم برطانیہ اور امریکہ کے اقدامات کو برا کہتے ہیں' ہم امریکی' اسرائیلی اور برطانوی سازشوں کی مذمت بھی کرتے ہیں لیکن ہم اس بزرگ خاتون جیسے لوگوں کو بھلا دیتے ہیں' ہم بھول جاتے ہیں امریکہ اور برطانیہ کی

حکومتوں اور عوام کی سوچ میں بڑا فرق ہے' صدر بش اور ٹونی بلیئر ظالم ہیں' ان کی پالیسیاں زیادتی پر مبنی ہیں لیکن برطانیہ اور امریکہ کے عوام کا رویہ مختلف ہے' 2003ء امریکہ اور برطانیہ میں عراق پر حملے کے خلاف تاریخی جلوس نکلے' لندن میں 12 لاکھ لوگوں نے جلوس نکالا جبکہ واشنگٹن اور نیو یارک میں 25 لاکھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے امریکہ میں رہ کر صدر بش کے پتے جلائے' مجھے اچھی طرح یاد ہے برطانیہ میں نکلنے والے جلوسوں میں لوگوں نے ایسے پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر صدر بش اور ٹونی بلیئر کی تصویریں بنی تھیں' صدر بش کے پاؤں میں ایک کتا بیٹھا تھا' صدر بش نے اس کی زنجیر تھام رکھی تھی اور کتے کی شکل برطانوی وزیراعظم سے ملتی تھی۔

ہم اس کے مقابلے میں اگر مسلمان بالخصوص پاکستانی عوام کے احتجاج کا ڈیٹا جمع کریں تو ہمیں معلوم ہوگا' ہماری نفرت صرف زبان تک محدود رہتی ہے' ہم لوگ اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ کر حکومتی اقدامات کی مذمت کرتے ہیں' ہم صرف ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرتے ہیں اور اس سرگوشی کو اپنا فرض سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں' پچھلے پانچ برسوں میں پاکستان میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ لیکن اس پر عوام کا ردعمل کیا تھا' مکمل خاموشی' پاکستان میں 126 لوگ گھروں سے غائب ہیں' ان لوگوں کا کیا جرم تھا؟ ان کا جرم نماز روزہ اور داڑھی تھی لہٰذا یہ لوگ گھروں سے غائب کر دیئے گئے' ان لوگوں کی گمشدگی پر امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات شور کر رہے ہیں' غیر ملکی ٹیلی ویژن چینل ان پر فلمیں چلا رہے ہیں لیکن ہمارے اپنے لوگوں نے اس پر مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے' آپ کراچی سے لے کر طورخم تک پاکستانی عوام کا ردعمل دیکھ لیجئے' کیا کسی طرف سے کوئی آواز' کوئی چیخ اٹھ رہی ہے' بدقسمتی سے کوئی نہیں! ہم لوگوں سے تو اتنا بھی نہیں ہو پایا کہ ہم دس دس روپے کا پلے کارڈ لیں' اس پر سیاہ مارکر سے "I am Offended" لکھیں اور اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہو جائیں، ہم مقامی سیاستدانوں کے دفتروں' پولیس سٹیشنوں اور بس سٹاپوں کے باہر کھڑے ہو جاتے' ہم اس طرح اپنا احتجاج ریکارڈ کرا سکتے تھے' ہمارے وزیرستان میں کیا ہو رہا ہے؟ وہاں دہشت گردی کی مذمت میں دہشت گردی ہو رہی ہے' دانا میں وضو کرتے بچوں پر میزائلوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی ہے اور اس بوچھاڑ میں نوے نوے لوگ شہید ہو جاتے ہیں لیکن اس ظلم' اس زیادتی پر ہمارا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ کیا ہم نے آج تک ان لوگوں کیلئے کسی قسم کا احتجاج کیا؟' کیا ہم نے انہیں اپنی ہمدردی اور محبت کا یقین دلایا؟ کشمیر پر پاکستانی حکومت کیا قدم اٹھانے والی ہے' پوری دنیا اب تک اس قدم سے واقف ہو چکی ہے لیکن ہم نے عوامی سطح پر اس کا

کتنا نوٹس لیا؟ ملک میں مہنگائی اور بے روزگاری کا کیا عالم ہے؟ کیا ہم نے کبھی اس پر احتجاج کیا؟ حق تو یہ ہے ہم میں سے کسی نے آج تک سر اٹھا کر نہیں دیکھا؟ ہم نے کبھی سوچا وردی کا مسئلہ کس سطح پر پہنچ چکا ہے اور ہر سال بسنت کے موقع پر لاہور میں کتنے بچے ذبح ہو جاتے ہیں؟ اور کیا ہم نے آج تک بسنت کے خلاف کوئی جلوس نکالا؟ سچ تو یہ ہے ہم بنیادی طور پر بے حسی کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں غیرت' ضمیر اور احساس جیسے لفظ دم توڑ جاتے ہیں' جہاں انسان گوشت کا ایک بے حس ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔

مجھے برمنگھم شہر کے فٹ پاتھ پر کھڑی اس بزرگ گوری نے احتجاج کا ایک نیا طریقہ سکھا دیا' میں نے سوچا کاش ہم لوگ اس عورت کی پیروی کریں' ہم آج سے انفرادی سطح پر یہ فیصلہ کر لیں' ہم جب بھی کسی ظلم' کسی زیادتی سے متاثر ہوں گے' جب بھی ہمارا دل ٹوٹے گا تو ہم ایک پلے کارڈ لیں گے' اس پر مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں یا میں اس سے اتفاق نہیں کرتا یا یہ زیادتی بند کریں جیسے الفاظ لکھیں گے اور ایک آدھ گھنٹے کیلئے باہر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جائیں گے' ہم منہ سے کچھ نہیں بولیں گے' کوئی نعرہ نہیں لگائیں گے' کوئی گالی نہیں دیں گے' ہم کوئی پتھر نہیں پھینکیں گے اور ہم کسی کو دھمکی نہیں دیں گے' ہم بس ایک آدھ گھنٹہ پلے کارڈ تھامے رکھیں گے اور واپس چلے جائیں گے مجھے یقین ہے ہمارا یہ خاموش احتجاج ظلم کی بنیادیں تک ہلا دے گا' یقین کیجئے جو کام دس لاکھ بددعائیں حل کر نہیں کر سکتیں وہ کام ایک پلے کارڈ ایک گھنٹے میں سرانجام دے دیتا ہے۔

# رائٹ اپروچ

احتجاج کا ایک طریقہ انڈونیشیا کے لوگوں نے اپنایا' انڈونیشیا میں پنڈ ویرناس نام کی ایک گیس کمپنی کام کرتی تھی۔ یہ کمپنی وزیر سماجی بہبود ابوریاض بکری کی ملکیت تھی ان کے قریبی رشتے دار اس کمپنی کا انتظام وانصرام چلا رہے تھے' پنڈ ویرناس نے جاوا میں گیس کے کنوئیں کھود رکھے تھے' پچھلے سال جولائی میں جاوا کا ایک کنواں پھٹ گیا اور کنوئیں سے مٹی اڑنے لگی' یہ گیلی مٹی تھی اور یہ گارے کی صورت میں فضاء میں تیرنے لگی تھی' یہ مٹی جاوا کے پانچ سو دیہات میں پھیل گئی' لوگوں کے کھیت' دکانیں' گاڑیاں اور گھر برباد ہو گئے' فضاء میں گیس اور مٹی کی آلودگی سے آکسیجن کے مسائل پیدا ہوئے اور لوگوں کے لئے سانس لینا دوبھر ہو گیا' فضائی آلودگی کی وجہ سے دس ہزار دیہاتی جاوا سے نقل مکانی کر گئے' یہ ایک سنگین مسئلہ تھا' متاثرین نے کمپنی کے خلاف جلوس نکالے' اخبارات میں بیان دیے اور جلسے کئے' حکومت نے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے متاثرہ علاقوں میں ماہرین کی ایک ٹیم بھجوا دی' پنڈ ویرناس کو ایک آدھ نوٹس بھی جاری کر دیا گیا لیکن مسئلہ حل نہ ہوا' لوگوں نے جب حکومت کی سردمہری دیکھی تو انہوں نے احتجاج کا یہ انوکھا طریقہ وضع کر لیا۔

انڈونیشیا کے وفاقی دارالحکومت میں متاثرہ علاقوں کے بے شمار لوگ رہتے تھے' ان لوگوں نے ایک یونین بنائی' 26 ستمبر 2006ء کا دن متعین کیا' اس دن جاوا کے ہزاروں لوگ

گھروں سے نکلے' ان کے ہاتھوں میں گارے اور کوڑا کرکٹ سے بھرے شاپنگ بیگ تھے' یہ لوگ سماجی بہبود کے وزیر ابوریاض الیکری کی رہائش گاہ کے سامنے پہنچے اور انہوں نے یہ شاپنگ بیگ وزیر کے گیٹ کے سامنے الٹ دیئے' ایک گھنٹے میں وزیر کے گھر کے سامنے کوڑے کرکٹ کا پہاڑ کھڑا ہوگیا' پولیس نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن بعدازاں وہ بھی اس انوکھے احتجاج کو ''انجوائے'' کرنے لگی' ابوریاض الیکری نے میونسپل کارپوریشن کے عملے کو طلب کرلیا' کارپوریشن کا عملہ سارا دن کوڑا کرکٹ صاف کرتا رہا' شام تک کوڑا کرکٹ اور گارا صاف ہوگیا لیکن اس کی بدبو باقی رہی' مظاہرین نے اس کے بعد میڈیا سے خطاب کیا' ان کا کہنا تھا جاوا کے پانچ سو دیہات کے ہزاروں شہری پچھلے دو ماہ سے اس صورتحال کا شکار ہیں' اگر حکومت ایک وفاقی وزیر کے گھر سے کوڑا کرکٹ اور گارا اٹھا سکتی ہے تو وہ متاثرین کے مکانوں سے گارا کیوں صاف نہیں کرسکتی' متاثرین کا کہنا تھا اگر حکومت نے پنڈویرنتاس پر پابندی نہ لگائی اور اگر حکومت نے متاثرین کو ہرجانہ ادا نہ کیا تو وہ تمام وزیروں کے گھروں کے سامنے کوڑے کے ڈھیر لگادیں گے' لوگوں کا کہنا تھا وہ جاوا سے لے کر جکارتہ تک انسانی زنجیر بنائیں گے' تمام لوگ شاپنگ بیگز میں گارا بھریں گے اور یہ شاپنگ بیگ ایک سے دوسرے' دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے شخص سے ہوتے ہوئے جکارتہ پہنچیں گے اور یوں ہم جاوا کا سارا گارا جکارتہ منتقل کردیں گے۔ حکومت کے لئے یہ دھمکی ''الارمنگ'' تھی چنانچہ کابینہ کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا اور اگلے ہی روز مظاہرین کے تمام مطالبات مان لئے گئے' انڈونیشیا میں فضائی آلودگی کا قانون پاس ہوا اور متاثرین کی بحالی تک پنڈویرنتاس کے تمام ''آپریشن'' روک دیئے گئے' پنڈویرنتاس نے مشینری منگوائی اور اس مشینری کے ذریعے جاوا کی فضا صاف کردی۔

انڈونیشیا کے اس احتجاج کی دو بڑی خوبیاں تھیں ایک' مظاہرین نے احتجاج کے دوران شہر کی کوئی بتی توڑی' کوئی ٹائر جلایا' کسی دکان' مکان اور گاڑی پر حملہ کیا اور نہ ہی ٹریفک بلاک کی' لوگ اپنی اپنی گاڑیوں' موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر آئے' اپنے شاپنگ بیگ وزیر کے گھر کے سامنے الٹے اور پیچھے ہٹ کر چپ چاپ کھڑے ہوگئے' یونین کے صدر نے اخبارات' ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندوں کو اپنے لائحہ عمل کے بارے میں بتایا اور یہ لوگ پرامن طریقے سے منتشر ہوگئے' اس احتجاج کی دوسری خوبی نفسیات تھی' جاوا کے لوگ جانتے تھے حکومت اور حکومت کے کارندے جکارتہ میں بیٹھ کر گارے' کوڑے کرکٹ اور بدبو کی سنگینی کا اندازہ نہیں لگاسکتے لہٰذا

جب تک وہ حکومتی عہدیداروں کو ان مسائل سے نہیں گزاریں گے حکومت متحرک نہیں ہو گی چنانچہ جاوا کے لوگوں نے سماجی وزیر کے گھر کے سامنے کوڑا کرکٹ اور گارے کا پہاڑ کھڑا کر دیا اور حکومت کو مسئلے کی سنگینی کا فوراً اندازہ ہو گیا۔ اگر یہ لوگ اس کے برعکس پاکستانی طریقہ استعمال کرتے' یہ ٹریفک بلاک کرتے' شیشے توڑتے' گاڑیاں جلا دیتے اور سڑکوں پر نکل کر گالیاں دیتے تو اس کا وہی نتیجہ نکلتا جو پاکستان میں نکلتا ہے' پولیس آتی' آنسو گیس چلتی' لاٹھی چارج ہوتا' سینکڑوں ہزاروں لوگ زخمی ہوتے اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

مجھے پچھلے دنوں برادرم فیصل صالح حیات کے شہر جھنگ جانے کا اتفاق ہوا' مجھے وہاں چند لوگ ملے' ان لوگوں نے بتایا انگریز نے 1904ء میں جھنگ کو سرگودھا سے ملانے کے لئے دریا پر پل بنایا تھا' یہ برج ''چند پل'' کہلاتا ہے' یہ پل ریلوے ٹریک کے ذریعے جھنگ کو باقی ملک سے ملاتا ہے' یہ اس علاقے کا واحد پل تھا لہٰذا جب موٹر گاڑیاں شروع ہوئیں تو یہ بھی اس پل سے گزرنے لگیں' ساٹھ برسوں میں گاڑیوں کی تعداد میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا لیکن نیا پل نہیں بنا' یہ پل اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہے۔ یہ کسی بھی وقت بڑے حادثے کا باعث بن سکتا ہے' جھنگ کے عوام ساٹھ برس سے نئے پل کا مطالبہ کر رہے ہیں' صدر پرویز مشرف' سابق وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی' گورنر پنجاب اور وزیراعلیٰ پنجاب پل کی تعمیر کا وعدہ بھی کر چکے ہیں لیکن یہ پل نہ بن سکا' ان لوگوں کا کہنا تھا جو حکومت ایک پل نہیں بنا سکی وہ کالا باغ ڈیم کیا بنائے گی' میں ہنس پڑا اور میں نے ان سے عرض کیا' اسلام آباد اور جھنگ میں بڑا فاصلہ ہے' ہماری آدھی حکومت جھنگ کے نام سے واقف نہیں ہو گی' ہمارے صدر اور ہمارے وزیراعظم آج تک جھنگ نہیں آئے لہٰذا ان لوگوں کو جھنگ کے مسائل کا کیسے علم ہو سکتا ہے! اگر اسلام آباد میں کوئی پل ٹوٹا ہوتا' کوئی سڑک خراب ہوتی یا کسی نالے سے بدبو اٹھ رہی ہوتی تو شام سے پہلے اس کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے' کیوں؟ کیونکہ اسلام آباد حکمرانوں کا شہر ہے اور حکمران ان سڑکوں اور ان پلوں سے روز گزرتے ہیں' اگر آپ چند پل بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے اپنا مسئلہ حکمرانوں تک پہنچانا ہو گا اور اس کیلئے آپ کو انڈونیشیا کے لوگوں کی تقلید کرنی چاہئے۔

اگر ہم غور کریں تو جھنگ کے لوگ ہوں' شیخوپورہ' ننکانہ صاحب' فیصل آباد' مظفر گڑھ' راجن پور' اوکاڑہ' رحیم یار خان' ڈیرہ غازی خان' لنڈی کوتل' حیدر آباد' دادو' تربت یا پھر چمن کے لوگ انہیں سب سے پہلے حکومت کی توجہ حاصل کرنی چاہیے' انہیں اپنا مسئلہ مہذب اور شائستہ

طریقے سے حکومت تک پہنچانا چاہیے' انہیں چاہئے یہ جاوا کے لوگوں کی طرح متعلقہ وزیر کے دروازے کے سامنے گارے کا پہاڑ کھڑا کریں اور جب وزیر صاحب گھر سے باہر آئیں تو بڑی عاجزی سے عرض کریں "سر ی ڈی اے کا عملہ ابھی آئے گا اور یہ گند اٹھا کر لے جائے گا لیکن سر ہمارے شہر کا گند کون صاف کرے گا" ان لوگوں کو چاہیے یہ اسلام آباد' لاہور' کراچی' پشاور اور کوئٹہ کی کسی اہم سڑک کے کنارے بیٹھ جائیں اور اس سڑک سے گزرنے والے ہر اہم شخص سے عرض کریں "جناب آپ کی سڑک اور پل تو بن چکا ہے لیکن ہمارا چھوٹا پل اور ہماری سڑک کون بنائے گا" اس سے بھی اچھا نسخہ پارٹنر شپ ہے مثلاً جھنگ کے تمام لوگ "پل فنڈ" قائم کریں' سارا شہر اس فنڈ میں پیسے ڈالے اور اس کے بعد حکومت سے درخواست کرے "جناب ہم نے اتنے پیسے جمع کر لئے ہیں باقی پیسے آپ ڈالیں اور مہربانی فرما کر ہمارا پل بنا دیں" یہ مسائل حل کرنے کی "رائٹ اپروچ" ہے دنیا میں سب سے بڑا اور مضبوط رشتہ بچے اور ماں کا تعلق ہوتا ہے لیکن ماں بھی اس وقت تک بچے کو دودھ نہیں دیتی جب تک وہ روتا نہیں' ہمارے ملک کو بھی ایسے عوام چاہئیں جو تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں رہ کر رونے والے بچے بن جائیں۔

# صرف چند نوجوان چاہئیں

یہ آئیڈیا کس کا تھا' اس آئیڈیے پر کام کس نے شروع کیا' کسی کو معلوم نہیں! اگر کسی کو معلوم بھی ہے تو بھی اتنی تفصیل' اتنی گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت ہے' ہمیں تو صرف آئیڈیا تک محدود رہنا چاہیے۔ اس آئیڈیے تک جو واقعی لاجواب ہے' جو حقیقتاً بے مثال ہے۔



امریکہ میں ایک این جی او ہے اس کا نام ''فوڈ بینک'' ہے۔ اس این جی او کے کارکنوں نے دیکھا امریکہ میں روزانہ ہزاروں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے' لوگ ریستورانوں میں آتے ہیں' کھانے کا آرڈر دیتے ہیں' تھوڑا سا کھاتے ہیں اور باقی ''ڈسٹ بن'' میں پھینک کر چلے جاتے ہیں' فائیو سٹار ہوٹلوں میں صورتحال اس سے بھی کہیں زیادہ افسوسناک ہے وہاں کوالٹی اور سٹینڈرڈ کے نام پر روزانہ لاکھوں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے۔ اس کی وجہ فائیو سٹار ہوٹلوں کا عالمی قانون ہے فائیو سٹار ہوٹلوں میں اگر گاہک کو کوئی ڈش سرو کر دی جائے اور گاہک اسے بغیر چھوئے واپس کر دے تو بھی وہ ڈش ضائع کر دی جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہوا فائیو سٹار ہوٹل خوراک کو ضائع کرنے کیلئے ہر ماہ لاکھوں ڈالر خرچ کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف اسی امریکہ میں ہزاروں لاکھوں لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ ہر سال امریکہ میں سینکڑوں واقعات سامنے آتے ہیں جن میں لوگ بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں جب یہ دونوں حقیقتیں ان لوگوں کو معلوم ہوئیں تو ان لوگوں نے سوچا ہم کیوں نہ ایک ایسا ادارہ بنائیں جو خوراک کی زیادتی سے پریشان لوگوں

سے غذا جمع کر کے ان لوگوں تک پہنچائے جو ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں ان کی آنکھوں کا پانی خشک ہو جاتا ہے اور ان کی رگیں' ان کی نسیں پٹ سن کی رسیاں بن جاتی ہیں۔ خیال اچھا تھا' یہ لوگ میدان میں کود پڑے' این جی او رجسٹر کرائی' انہوں نے اس کا نام فوڈ بینک رکھا فائیوسٹار ہوٹلوں میں گئے اور انتظامیہ کو سمجھایا' اگر "آپ لوگ خوراک ضائع کرنے کی بجائے ہمیں دے دیا کریں تو لاکھوں لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے" انتظامیہ کو کیا چاہیے تھا؟ انہیں ہر ماہ اس کام کیلئے ہزاروں لاکھوں ڈالر خرچ کرنا پڑتے تھے لہٰذا وہ فوراً مان گئے' اب یہ ہوتا تھا "فوڈ بینک" کے کارکن مخصوص اوقات میں مختلف ہوٹلوں میں جاتے تھے وہاں سے خوراک کے پیکٹ اٹھاتے تھے' انہیں دفتر لاتے تھے' کھولتے تھے' صاف کرتے تھے' گرم کرتے تھے' دوبارہ پیک کرتے تھے' گاڑیوں میں رکھتے تھے اور ان بستیوں میں چلے جاتے تھے جہاں زندگی شرمندگی کا کمبل اوڑھے کسی نجات دہندہ کی منتظر ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ جاری رہا' فوڈ بینک کا نیٹ ورک وسیع ہوتا گیا' ہوٹلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا' خوراک وصول کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی' این جی او کے کارکنوں میں بھی اضافہ ہوا' مخیر حضرات بھی آگے آئے اور یوں یہ ادارہ بڑے بڑے ٹرالروں اور وسیع و عریض پچز کا مالک بن گیا۔ ان کے ٹرالروں میں کھانوں کو محفوظ رکھنے' انہیں گرم کرنے اور انہیں پیک کرنے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں' کھانا آتا ہے' ٹرالر کے اندر ہی صاف ہوتا ہے' گرم ہوتا ہے' پیک ہوتا ہے اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کر تقسیم ہو جاتا ہے' جو باقی بچ جاتا ہے وہ ان ٹرالروں کے فریجوں میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ این جی او ہر سال تین لاکھ ٹن خوراک ضرورت مندوں تک پہنچاتی ہے۔

یہ ایک "کافر" ملک کی بات ہے' ایک ایسے ملک کی بات جس سے 56 اسلامی ممالک کے عوام نفرت کرتے ہیں لیکن اس نفرت کے باوجود اگر ہم یہ آئیڈیا لے لیں' اس پر عملدرآمد شروع کر دیں تو میرا خیال ہے ہمارے ایمان پر لکیر نہیں آئے گی' ہمارے ملک میں بھی روزانہ سینکڑوں' ہزاروں ٹن خوراک ضائع ہوتی ہے۔ ہم صرف رمضان میں سحری اور افطاری کے وقت کتنی خوراک ضائع کرتے ہیں۔ اگر کوئی ادارہ ریسرچ کرے تو مجھے یقین ہے اعداد و شمار ہزاروں ٹن سے اوپر چلے جائیں گے۔ ہمارے ریستورانوں' ہمارے فائیوسٹار ہوٹلوں' ہماری دعوتوں اور ہماری پارٹیوں میں کتنا رزق ضائع ہوتا ہے اگر کوئی شخص جائزہ لے تو کانوں کو ہاتھ لگانے پر مجبور ہو جائے' ہم لوگ رمضان میں جتنا بیسن' گھی اور چینی استعمال کرتے ہیں' اتنا ہم مجموعی طور پر سال بھر میں خرچ نہیں

کرتے اور ہم اس ایک مہینے میں جتنی کھجور کھاتے ہیں اتنی ہم پانچ سال میں استعمال نہیں کرتے' ایک طرف تو یہ عالم ہے اور دوسری طرف ہر شہر کے اندر اور ہر شہر کے باہر ایسی ہزاروں کچی آبادیاں ہیں جن میں زندگی کا ایک ہی مقصد ہے روٹی کی چاپ سننا اور خوراک کا راستہ دیکھنا۔ ہمارے ملک میں اس وقت ڈیڑھ کروڑ کے قریب ایسے لوگ ہیں جو گرمی اور سردی میں کھلے آسمان تلے بھوکے پڑے رہتے ہیں' ان لوگوں کو زندگی کی حرارت کے لئے کھانا چاہیے' ان لوگوں سے ذرا پرے پورا افغانستان بھوکا ہے' دو کروڑ لوگ درختوں کی چھال اور کچا چمڑا کھانے پر مجبور ہیں' ان لوگوں کو خود کو صرف زندہ رکھنے کیلئے ہر مہینے 62 ہزار ٹن خوراک چاہیے جبکہ امریکی بم افغانستان کی ستر فیصد زمین بنجر بنا چکے ہیں اور پچھلے دو برس سے ان کی زمینوں پر کچھ نہیں اگا' ان حالات میں یہ لوگ ہماری سحریوں اور ہماری افطاریوں کے صحیح حق دار ہیں۔

یہ درست ہے ہمارا ملک بہت پسماندہ ہے' ہم غریب' بے وسیلا اور غیر منظم لوگ ہیں' ہم ''فوڈ بینک'' جیسے ادارے نہیں بنا سکتے لیکن ہم فوڈ بینک جیسی چھوٹی چھوٹی ''کمیٹیاں'' تو ڈال سکتے ہیں' ہر شہر' ہر قصبے اور ہر محلے کے چند نوجوان مل کر ایسے چھوٹے چھوٹے ''فوڈ بینک'' تو بنا سکتے ہیں جو گھر گھر جا کر لوگوں کو سمجھا سکیں کہ آپ لوگ افطار پر سو روپے خرچ کرتے ہیں اگر آپ اس پر نوے روپے خرچ کر لیں گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا' ہر محلے سے ایسے نوجوان باہر آئیں جو یہ سالن' یہ روٹیاں اور یہ دس دس روپے ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو اپنی اپنی دہلیزوں پر بیٹھ کر سحری اور افطاری کا لطف لینے والوں کے دل نرم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں' جو اللہ کے دیئے رزق سے تھوڑا سا حصہ ان لوگوں تک پہنچا سکیں جو زندگی کی سخت چکی میں پس رہے ہیں اور اللہ کی مدد کا انتظار کر رہے ہیں لیکن شاید ہمیں 16 کروڑ لوگوں سے چند ایسے نوجوان بھی نہ مل سکیں جو اللہ کیلئے باہر نکلیں' ہم کتنے بدنصیب لوگ ہیں' پہلے ہم میں مطالبہ کرنے' انکار کرنے اور حق کو حق کہنے کی جرأت ختم ہوئی اور اب ہم میں نیکی کرنے' قربانی دینے اور خدمت کرنے کا جذبہ بھی مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

۞......۞......۞

# چنوں کا لفافہ

میں نے چنوں کے آخری دانے منہ میں ڈالے' کاغذ کے لفافے کی گیند سی بنائی' آگے پیچھے دیکھا' دور کونے میں ڈسٹ بین تھی' مٹھی میں دبا کر ڈسٹ بین کی طرف چل پڑا' قریب پہنچا' کچھ سوچا اور واپس آ گیا' لفافے کی گیند اسی طرح میری مٹھی میں دبی تھی۔

مجھ سے کالج اور یونیورسٹیوں کے اکثر نوجوان مطالعہ کرنے کا طریقہ پوچھتے ہیں' وہ پوچھتے ہیں' ہمیں کون کون سی کتابیں پڑھنی چاہئیں' ہمیں کون سا علم کہاں سے حاصل کرنا چاہیے اور ہم پڑھی ہوئی چیزوں کو کیسے یاد رکھ سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سوال ہمیشہ میری دلچسپی کا موضوع رہے ہیں' میں ان سے کہتا ہوں' بھائیو اور بہنو' مطالعہ ایک شوق نہیں' ایک عادت' ایک لت ہوتی ہے جس شخص کو یہ لت پڑ جائے اسے پھر اس قسم کے سوال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی' آپ مجھ سے یہ پوچھ سکتے ہیں' یہ لت کیسے پڑتی ہے؟' ہم مطالعے کو اپنی عادت کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس کا صرف ایک طریقہ ہے' آپ اپنی زندگی کا ہر اضافی پل' ہر اضافی لمحہ مطالعے کو دے دیں' میں نے ایک لمبی جدوجہد کے بعد مطالعے کو عادت بنا لیا ہے' میرے سامنے جو چیز پڑی ہوتی ہے' میں اسے اٹھاتا ہوں اور پڑھنا شروع کر دیتا ہوں' میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا ہوں تو پلیٹیں الٹی کر کے کمپنی کا نام پڑھنے لگتا ہوں' چمچوں' چھریوں اور کانٹوں پر کھدے مارکے اور نشان دیکھنے لگتا ہوں' اخبار کا ٹکڑا مل جائے' ٹشو پیپر کا ڈبہ ہو' دوا کا بروشر ہو' گولیوں کی ڈبی ہو' کوئی میگزین ہو' سامنے کوئی سائن

بورڈ ہو نیپرے کے سینے پر لگی نیم پلیٹ ہو یا عینک کے فریم پر کندہ لفظ ہوں میں فوراً پڑھنا شروع کر دیتا ہوں میری یہ عادت اس قدر پختہ ہو چکی ہے کہ میں غیر ممالک کے سفر کے دوران مقامی اخبارات اور میگزین تک پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں ان کی زبان میرے لئے اجنبی ہوتی ہے لیکن میں تصویروں اور نقشوں کی مدد سے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں ایک بار میں نے ہسپانوی زبان کا اخبار خرید ا اور ایک دوست کی مدد سے اس کی ساری سرخیاں پڑھ گیا اس مشقت کے دوران میں خود کو ہسپانوی زبان کا ٹھیک ٹھاک "عالم" سمجھنے لگا میں جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی کاغذ دریافت کر لیتا ہوں اور گفتگو کے دوران آنے والے وقفوں میں وہ کاغذ پڑھ جاتا ہوں میری جیب اور میری ڈائری میں بھی اکثر کوئی نہ کوئی تراشا کوئی نہ کوئی مضمون پڑا ہوتا ہے میں اگر ٹریفک میں پھنس جاؤں یا مجھے کسی کا انتظار کرنا پڑے تو میں فوراً یہ تراشا نکالتا ہوں اور اسے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں رہی کتابیں اور اخبارات تو ان کے بارے میں میرا خیال ہے دنیا کی کوئی کتاب فضول اور کوئی اخبار بیکار نہیں ہوتا اور جو شخص روزانہ دو گھنٹے مطالعہ نہیں کرتا اسے خود کو پڑھا لکھا نہیں کہنا چاہیے اس کی ساری سندیں اور ساری ڈگریاں ضبط ہو جانی چاہئیں یہ تو تھی مطالعے کی بات اب میں آپ کو ایک اور دلچسپ عادت بتاتا ہوں پچھلے بیس برس سے میں جب بھی بازار سے کوئی سودا خریدتا ہوں اور دوکاندار مجھے یہ سودا کسی اخباری کاغذ میں لپیٹ کر دیتا ہے یا یہ سودا مجھے کسی کتاب یا اخبار کے ورق سے بنے لفافے میں ملتا ہے تو میں واپسی پر وہ لفافہ وہ کاغذ سیدھا کرتا ہوں اور اس کا ایک ایک لفظ پڑھ جاتا ہوں اس عجیب وغریب عادت کی وجہ میری عجیب وغریب سوچ ہے میں سمجھتا ہوں خوراک کی طرح فقرے اور لفظ بھی آپ کا رزق ہوتے ہیں اور قدرت مختلف حیلوں اور بہانوں کے ذریعے یہ رزق آپ تک پہنچاتی ہے چنانچہ یقین کیجئے آج تک وہ تمام لفظ وہ تمام فقرے جنہوں نے میری زندگی میں بنیادی کردار ادا کیا جنہوں نے میری سوچ میرے عمل کے سارے دھارے بدل دیئے وہ فقرے وہ لفظ مجھے انہیں لفافوں اخبار کے انہیں کٹے پھٹے کاغذوں سے ملے چنانچہ میری زندگی میں یہ لفافے بڑے قیمتی ہیں۔

دیکھئے بات کہاں سے چلی اور کدھر نکل گئی میں آپ سے عرض کر رہا تھا میں چنوں کا لفافہ ڈسٹ بین میں پھینکنے لگا لیکن کچرے کی ٹوکری کے قریب پہنچ کر واپس آ گیا مجھے اچانک یاد آیا میں یہ لفافہ پڑھے بغیر پھینک رہا ہوں میں واپس گاڑی میں بیٹھا کاغذ کی گیند کھولی لفافہ سیدھا کیا اس کے کنارے کھولے اور اسے جھولی میں پھیلا کر پڑھنے لگا یہ نفسیات کی کسی کتاب کا

ایک ورق تھا' اس ورق پر ولیم جیمز کا ایک نہایت خوبصورت فلسفہ درج تھا' میں ولیم جیمز کے بارے میں بس اتنا جانتا تھا یہ ایک معروف نفسیات دان تھا اور خود کو سگمنڈ فرائڈ کا شاگرد کہتا تھا' باقی اس نے زندگی میں کیا کیا کام کئے' میں ان سے نابلد تھا لیکن اس کاغذ پر درج وہ فلسفہ کمال تھا' اس نے کہا ''انسان کے ہر جذبے کے ساتھ ایک فعل وابستہ ہوتا ہے مثلاً اگر وہ دکھی ہو تو وہ روتا ہے' وہ خوش ہو تو وہ ہنستا ہے' وہ غصے میں آئے تو وہ چیختا چلاتا ہے' وہ محبت کرے تو وہ پچکارتا ہے' بوسا لیتا ہے' وہ خوفزدہ ہو تو وہ بھاگتا ہے' وہ کامیاب ہو تو چھلانگیں لگاتا ہے تالیاں پیٹتا ہے اور وہ بھوکا ہو تو ندیدہ پن کا مظاہرہ کرتا ہے'' ولیم جیمز کی یہ بات یہاں تک تو عام روزمرہ کا مشاہدہ تھا لیکن آگے چل کر وہ کہتا ہے ''اگر انسان اس عمل کو الٹا دے وہ کسی جذبے سے وابستہ فعل یا عمل دہرانا شروع کر دے تو تھوڑی ہی دیر میں اس میں اس عمل یا اس فعل سے وابستہ جذبہ پیدا ہوتا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص بڑا ریلیکس بیٹھا ہو وہ اٹھے اور اٹھ کر ناراضگی اور غصے کی ایکٹنگ شروع کر دے' وہ چیخنے چلانے لگے تو تھوڑی دیر بعد اس کے جسم میں حقیقتاً غصہ پیدا ہو جائے گا' اسی طرح اگر کوئی شخص غصے سے بھرا بیٹھا ہو لیکن وہ اوپری دل سے خوش مزاجی اور وضع داری کی ایکٹنگ شروع کر دے' وہ ہر ملاقاتی سے اٹھ کر ملے اور ناگوار سے ناگوار بات بھی ہنس کر برداشت کرے تو ذرا دیر بعد خوش مزاجی اس کے غصے کی جگہ لے لے گی' وہ حقیقتاً خوشگوار اور ہلکا پھلکا ہو جائے گا'' ولیم جیمز کے ان الفاظ نے میرے اوپر جادوئی کام کیا' ان دنوں میری شوگر عروج پر تھی' شوگر کا ایک اثر انسانی مزاج پر بھی مرتب ہوتا ہے' انسان پژمردہ' اداس اور چڑچڑا رہنے لگتا ہے' وہ مرکیورس ہو جاتا ہے' پل میں تولہ' پل میں ماشہ' ذرا ذرا سی بات اسے بدمزاج اور لڑاکا بنا دیتی ہے' ان دنوں میری شوگر آؤٹ آف کنٹرول تھی لہٰذا میں ان دنوں خود کو تنہا اور اداس محسوس کرتا تھا' لوگوں کی ہنسی' لوگوں کا مذاق گولی کی طرح میرے سینے پر لگتا تھا' اس وقت ولیم جیمز کے یہ الفاظ الہام کی طرح میرے اوپر اترے لہٰذا اس لفافے نے میرا مقدر' میری زندگی بدل دی' اس کے بعد میں نے برے لمحات میں خوشی اور خوشی کے عمل کو اپنا معمول بنا لیا لہٰذا میں چند ہی دنوں میں نارمل اور خوشگوار زندگی گزارنے لگا' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے مجھے جب بھی غصہ آتا ہے' میں جب بھی چڑچڑے پن کا شکار ہوتا ہوں تو میں ہنسنا شروع کر دیتا ہوں' میں لوگوں کو لطائف سنانا شروع کر دیتا ہوں' میں جب بےزار اور اداس ہوتا ہوں' تنہائی اور اکلاپے کا شکار ہونے لگتا ہوں تو میں دن میں دو دو بار شیو کرتا ہوں' بہترین سوٹ پہنتا ہوں' اعلیٰ خوشبو لگاتا ہوں' گاڑی کی سروس کراتا

ہوں' اسے پالش کرتا ہوں اور اپنے دوستوں سے ملاقات کیلئے نکل کھڑا ہوتا ہوں' لوگوں کو دعوت دیتا ہوں' نوجوان بچے اور بچیوں سے گپ لگاتا ہوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی کے مثبت پہلوؤں پر لیکچر دیتا ہوں' مزاحیہ لٹریچر پڑھتا اور کارٹون فلمیں دیکھتا ہوں' شاپنگ کرتا ہوں' اچھی فلمیں دیکھتا ہوں' دوستوں کے ساتھ لمبی لمبی سیریں کرتا ہوں اور نیکی کے کام کرتا ہوں اور چند ہی گھنٹوں' چند ہی دنوں میں میرا مورال کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے' میں اپنے اندر نئی قوت' نئی حرارت محسوس کرتا ہوں' میرے برے موڈ کے دنوں میں اگر گلاس ٹوٹ جاتا ہے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں "چلو اچھا ہوا' اب پرانے گلاس کی جگہ نیا آئے گا" اس سوچ کے باوجود اگر میرا افسوس ختم نہ ہو تو میں شام کو نئے گلاس لے آتا ہوں' یہ نئے گلاس' پرانے گلاس کا دکھ دور کر دیتے ہیں' ان دنوں اگر بچے شور کرنے لگیں اور ان کا شور میرے مزاج پر تیزاب کی طرح گرنے لگے تو میں انہیں ڈانٹنے کی بجائے ان کے ساتھ مل کر شور کرنے لگتا ہوں' میں ان کے کھیل میں شامل ہو جاتا ہوں' یقین کیجئے بچوں کے یہ کھیل میری سنجیدگی' میری اداسی کو بہا لے جاتے ہیں' میں نارمل ہو جاتا ہوں۔



چنوں کا وہ لفافہ اور ولیم جیمز دونوں میرے محسن ہیں' ان دونوں نے مجھے زندگی کا نیا رخ' نیا پہلو دکھایا' زندگی کے اس پہلو اس رخ نے مجھے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھایا لہٰذا میں دن رات ولیم جیمز اور چنوں کے اس لفافے کا شکریہ ادا کرتا ہوں' میں اپنے رب کا شکر گزار ہوتا ہوں۔

# طاقت

نیو یارک میں مین ہیٹن تھا' مین ہیٹن کی 42 منزلہ عمارت تھی اور اس 42 منزلہ عمارت کے 40 ویں فلور پر اس کا دفتر تھا' میں اس کے دفتر میں داخل ہوا تھا تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا' یہ پانچ ہزار سکوائر فٹ کا دفتر تھا جس کا سارا عملہ امریکی تھا' سکیورٹی گارڈ سے لے کر ریسپشنسٹ تک' ریسپشنسٹ سے لے کر آفس سیکرٹری تک اور آفس سیکرٹری سے لے کر ٹیلی فون آپریٹر تک سب لوگ امریکی تھے' اس سارے دفتر میں وہ واحد دیسی شخص تھا' اس نے قیمتی اطالوی سوٹ پہن رکھا تھا' اس کے ہاتھ میں کیوبا کا سگار تھا اور اس کے جسم سے فرانسیسی خوشبو آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا دیسی پن اُمڈ اُمڈ کر باہر آ رہا تھا اور اس کے لہجے اور اس کی چال ڈھال سے اس کے سیالکوٹی ہونے کا صاف پتہ چلتا تھا' سینڈی' اس کی سیکرٹری نے میرے سامنے کافی کا مگ رکھا اور چوہدری کو میرے حوالے کر کے چلی گئی' دفتر کے چاروں اطراف شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں اور ان کھڑکیوں کے نیچے نیو یارک شہر بکھرا ہوا تھا' شہر میں ابھی روشنیاں جاگنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔

وہ مسکرایا ''تم پوچھ رہے تھے میں نے یہ ترقی کیسے کی'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی' اس کی مسکراہٹ میں بڑی جان تھی' وہ مخاطب کی طرف غور سے دیکھتا تھا' اس کے بعد آہستہ سے اس کے ہونٹ کھلتے تھے اور اس کے بعد اس کے چہرے پر

اپنائیت' محبت اور ہمدردی کے سارے رنگ آ جاتے تھے' میں نے پوری زندگی اتنی خوبصورت' مکمل اور جوشیلی مسکراہٹ نہیں دیکھی' اس کی مسکراہٹ میں مقناطیسی کشش تھی' وہ تھوڑی دیر رک کر بولا ''مجھے اس مقام پر میری مسکراہٹ نے پہنچایا۔ میں پاکستان کا ایک ''ان ٹچ ایبل'' شہری تھا' میرے بزرگ کئی نسلوں سے سیالکوٹ کی نالیاں اور ٹوائلٹ صاف کر رہے تھے' میں جوان ہوا تو میں نے یہ کام کرنے سے انکار کر دیا' لوگ ایک ''چوہڑے'' کو دوسرا کام دینے کیلئے تیار نہیں تھے لہٰذا میں بے روزگار ہو گیا' میں بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آ کر لاہور چلا گیا' میرے جیسے لوگ جب چھوٹے شہر سے بڑے شہر پہنچتے ہیں تو وہ ہراساں ہو جاتے ہیں' ان کا دل خوف اور کمتری کے احساس سے بھر جاتا ہے لہٰذا وہ لوگ شہر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی مسکراہٹ سے محروم ہوتے ہیں' میں بھی شہر پہنچ کر ہنسنا اور مسکرانا بھول گیا' میرے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی اور غصہ رہنے لگا' پھر مجھے ایک شخص ملا' یہ شخص ریگل چوک پر فالسوں کی ریڑھی لگاتا تھا' اس نے مجھے دیکھ کر کہا' باؤ جب تک تم مسکرانا نہیں سیکھو گے تم کامیاب نہیں ہو گے' میرے لئے یہ عجیب بات تھی' میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا' اس نے بوری کے نیچے سے شیشہ نکالا اور شیشہ میرے سامنے رکھ دیا' میں نے اپنی شکل دیکھی' میری شکل پر بے تحاشا غصہ' نفرت اور سنجیدگی تھی' اس نے میرے سامنے سے شیشہ ہٹایا اور اس کے بعد بولا ''اب تم میری فرمائش پر ذرا سا مسکراؤ'' میں بے اختیار مسکرا پڑا' اس نے شیشہ دوبارہ میرے سامنے کر دیا' میری شکل پر ٹھیک ٹھاک فرق پڑ گیا تھا' اس کے بعد اس فالسے والے نے مجھے بتایا' جس شخص کے پاس کوئی ہنر نہ ہو وہ اگر صرف مسکرانا سیکھ لے تو اس کا مقدر بدل سکتا ہے۔ اس کی بات میرے دل کو لگی اور میں نے مسکراہٹ کا فن سیکھنا شروع کر دیا' میں نے مسکراہٹ کے بارے میں کتابیں خریدیں اور ان کتابوں کی روشنی میں مسکرانا سیکھنے لگا' مجھے پتہ چلا انسان کے چہرے پر ایسے دو سو زاویئے یا پوائنٹس ہوتے ہیں جو اس کے چہرے پر تاثرات پیدا کرتے ہیں' ہمارے چہرے کا ہر تاثر ان چند پوائنٹس کا مرہون منت ہوتا ہے' مسکراہٹ ہمارا واحد عمل ہے جس میں چہرے کے تمام پوائنٹس حرکت میں آتے ہیں' جو شخص دن میں دس بیس مرتبہ مسکراتا ہے اس کے چہرے کے تاثرات ہمیشہ زندہ رہتے ہیں' وہ چہرے کے ذریعے اپنے تمام جذبات کا اظہار کر سکتا ہے لیکن جو لوگ کم مسکراتے ہیں ان کا چہرہ آہستہ آہستہ مرنے لگتا ہے۔ وہ لوگ ''ایکسپریشن لیس'' ہو جاتے ہیں' مجھے پتہ چلا ہماری مسکراہٹ سے ہمارے جسم میں ایک کیمیکل پیدا ہوتا ہے' یہ کیمیکل ہمارے تنے ہوئے اعصاب' ہمارے سلگتے ہوئے احساسات اور

ہمارے ابلتے ہوئے جذبات کو سکون پہنچاتا ہے' یہ ہمیں سچی خوشی دیتا ہے' اس کی وجہ سے ہم خود کو ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتے ہیں اور یہ ہماری کام کرنے کی صلاحیت اور استعداد میں بھی اضافہ کرتا ہے' میں ان تمام چیزوں کو سامنے رکھ کر مسکرانا سیکھنے لگا' میں شیشے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور گھنٹوں مسکرانے کی پریکٹس کرتا رہتا''

وہ اپنی مسکراہٹ کی پوری تاریخ دہرانے لگا' میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولا'' مجھے پتہ چلا مسکراہٹ کی 21 قسمیں ہوتی ہیں' آپ مسکرا کر سلام کرتے ہیں' آپ مسکرا کر دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں' آپ مسکرا کر معذرت کرتے ہیں' آپ مسکرا کر شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں' آپ مسکرا کر اپنی کامیابی کا اعلان کرتے ہیں اور آپ مسکراہٹ کے ذریعے اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ' میں نے ایک سال میں مسکراہٹوں کی 21 اقسام پر عبور حاصل کر لیا' جس کے بعد مجھے محسوس ہوا میرے حلقہ احباب میں اچانک اضافہ ہو گیا ہے' ہر شخص مجھے پسند کرنے لگا ہے' میں موسٹ وانٹیڈ شخص ہو گیا' لوگ میرا انتظار کرنے لگے ہیں' مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی'' وہ اپنی داستان کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا' میں نے اسے ٹوکا'' آپ اپنی کامیابی کی وجہ بتا رہے تھے'' وہ مسکرایا' اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی' میں اسی طرف آ رہا ہوں' میں ان دنوں بے روزگار تھا' میں سارا دن نوکری تلاش کرتا تھا اور شام کو باغ جناح میں واک کرتا تھا' وہاں ایک گورا بھی واک کرتا تھا' ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے لیکن جب ہم لوگ واک کرتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے سے گزرتے تھے تو میں اسے ''سمائل پاس'' کرتا تھا' وہ میری مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتا تھا' یہ میرا روزانہ کا معمول تھا' یہ سلسلہ ایک برس تک چلتا رہا' اس ایک برس میں مجھے کہیں نوکری نہ ملی' میں نے سینکڑوں درخواستیں دیں لیکن مجھے کسی طرف سے کوئی جواب نہ ملا' اس دوران مجھے کسی دوست نے مشورہ دیا' تم امریکہ چلے جاؤ' وہاں بے تحاشا مواقع موجود ہیں' مجھے اس کا مشورہ اچھا لگا مگر میرے پاس وسائل نہیں تھے' میں اپنی جیب سے پاسپورٹ تک نہیں بنوا سکتا تھا لیکن میں نے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا' میں نے دوستوں سے ادھار لیا' پاسپورٹ بنوایا اور اگلے دن صرف پاسپورٹ لے کر امریکی قونصل خانے کے سامنے کھڑا ہو گیا' وہاں لوگوں کی ایک طویل قطار لگی تھی' سب لوگوں نے ہاتھوں میں لمبی چوڑی بینک سٹیٹ منٹس اور کاروبار کے کاغذات اٹھا رکھے تھے جبکہ اس ساری قطار میں میں واحد شخص تھا جس کے پاس پاسپورٹ کے سوا کچھ نہیں تھا' میری کامیابی کا رتی برابر امکان نہیں تھا' میرے آگے کھڑے

تمام لوگ ناکام ہو کر کھڑکی سے ہٹتے جا رہے تھے لیکن جب میں کھڑکی کے سامنے پہنچا تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا' شیشے کی دوسری طرف وہی گورا بیٹھا تھا جو روزانہ باغ جناح میں واک کرتا تھا' اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا' میں نے بھی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیا' اس نے میرا پاسپورٹ پکڑا' ایک منٹ انتظار کرنے کی ہدایت کی' کھڑکی سے اٹھا' اندر گیا' ایک منٹ بعد واپس آیا اور مجھے پاسپورٹ واپس کر دیا' میں نے پاسپورٹ کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سال کا ویزہ لگا تھا' میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا' اس نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلا کر بائی بائی کر دیا''

اس کی کہانی دلچسپ ہو گئی' اس نے بتایا ''میں جب نیویارک ائیرپورٹ پر اترا تو میری جیب میں صرف دس ڈالر تھے' میں نے جو پہلا کام کیا وہ فرش کی صفائی تھی' اس کے بعد میں ایک فیکٹری میں لوڈر بھرتی ہو گیا' میں سو سو کلو کے کارٹن اٹھا کر ٹرک میں لوڈ کرتا تھا' پھر میں سیلز مین ہو گیا' پھر میں نے کیمسٹ کی دکان پر کام کیا' پھر میں لوگوں کے گھروں میں اخبار پھینکنے لگا اور میں آخر میں سول ایوی ایشن کی ایک کمپنی میں بھرتی ہو گیا۔ غرض کوئی ایسا کام نہیں تھا جو میں نے نہ کیا ہو' ہر کام میں میری مسکراہٹ نے میرا ساتھ دیا' یہ مسکراہٹ مجھے ہر جاب میں آگے سے آگے لے جاتی رہی' میں کامیاب ہوتا چلا گیا' پھر میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا' میرا کاروبار چل نکلا' آج بیس برس بعد میرا شمار نیویارک کے امیر ترین ایشیائی باشندوں میں ہوتا ہے' میری کارگو کمپنی ہے' میرے پاس پاکستان کے کل ہوائی جہازوں سے زیادہ کارگو جہاز ہیں' لوگ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں جبکہ میں اپنے ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں'' وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے آپ صرف مسکراہٹ کو اپنی کامیابی قرار دیتے ہیں'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' اس نے کہا ''تم یقین کرو میں جب فون اٹھاتا ہوں تو ہیلو کہنے سے پہلے مسکراتا ہوں' لوگ میری اس عادت پر میرا مذاق اڑاتے ہیں' میں بھی جانتا ہوں دوسری طرف موجود شخص میری مسکراہٹ نہیں دیکھ رہا لیکن جب میں مسکراتا ہوں تو میری آواز میں ایک خوشگوار تاثر پیدا ہو جاتا ہے' میں سمجھتا ہوں یہ تاثر دوسری طرف موجود شخص تک ضرور پہنچتا ہے' یقین کرو اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسکراہٹ کی شکل میں ایک ایسی صلاحیت دے رکھی ہے جس سے وہ پوری دنیا فتح کر سکتا ہے' لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اس صلاحیت اور اس صلاحیت کی طاقت سے ناواقف ہیں' وہ اس صلاحیت کے کمال سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر یہ لوگ اس طاقت سے آگاہ ہو جائیں تو یقین کرو یہ دنیا ان کے قدموں میں آ گرے۔

# ناں کہنے کا ہنر

بچی کی آنکھ میں آنسو تھے' اس نے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور روتی سسکتی آواز میں بولی "سر میں بھینس بکری ہوں' میں میز کرسی ہوں' میں کپڑے کا تھان ہوں یا پھر میں بالٹی یا پلیٹ ہوں' میں کیا ہوں" میں نے شفقت سے جواب دیا "بیٹا آپ ایک مکمل انسان ہو" اس کی عمر اکیس بائیس برس ہوگی' وہ کالج میں پڑھتی تھی اور بے شمار دوسری ماؤں کی طرح اس کی ماں بھی اس کی شادی کرنا چاہتی تھی' پچھلے دنوں اس کیلئے ایک رشتہ آیا' لڑکا امریکہ میں انجینئر تھا' لڑکے کے والدین دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا وہ بہو اور گائے میں خاص فرق نہیں سمجھتے تھے' بچی جب ان لوگوں کے سامنے آئی تو لڑکے کی ماں نے اس کا اسی طرح جائزہ لیا جس طرح عموماً دیہات میں جانوروں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے' ماں نے اس کے ہاتھ پاؤں دیکھے' اس کی نظر ٹیسٹ کی' اسے اپنے سامنے چلا' پھرا اور بٹھا کر دیکھا' اس کا قد' اس کا وزن معلوم کیا' منہ کھلوا کر اس کے دانت گنے اور اسے سونگھ کر دیکھا' بچی حساس تھی' ان حرکتوں سے اس کا دل ٹوٹ گیا' وہ شاید یہ سب کچھ برداشت بھی کر جاتی لیکن آخر میں لڑکے کی ماں نے ایک اور عجیب حرکت کی' وہ لڑکی کو باہر لے کر گئی اور اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کا رنگ دیکھنا شروع کر دیا' یہ انتہا تھی' بچی روتی ہوئی اندر گئی' اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی لگائی اور پھر پورا دن اندر بند رہی' اس کے والدین میرے جاننے والے تھے' انہوں نے دوسرے دن بچی کو میرے پاس بھیج دیا' وہ اب میرے سامنے

بیٹھی تھی' میں نے کہا" بیٹا آپ ایک مکمل انسان ہو" اس نے سسکتے ہوئے پوچھا" پھر انہوں نے میرے ساتھ ایسے کیوں کیا" میں ہنس پڑا" بیٹا اس لئے کہ وہ لوگ ادھورے تھے' ان لوگوں نے زندگی کو کبھی جانوروں سے اوپر اٹھ کر نہیں دیکھا' ہم لوگ دوسرے لوگوں کو' دوسری چیزوں کو اپنے معیار اور اپنے نقطہ نظر سے پرکھتے ہیں' ایک گائے دنیا کی ہر چیز کو گائے کی نظر سے دیکھے گی اور ایک چڑیا پوری کائنات کو چڑیا کی آنکھ سے پرکھے گی' وہ لوگ کیونکہ انسانوں کے بھیس میں جانور تھے لہٰذا انہوں نے جانوروں کی طرح تمہارا جائزہ لیا' اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں' تم خود سوچو اگر کوئی شخص گھاس کی پلیٹ میں ہیرا ڈال کر گدھے کے سامنے رکھ دے اور گدھا اس ہیرے کو زمین پر پھینک دے تو ہیرے کو تو اس سلوک پر ملال نہیں ہونا چاہیے" بچی نے آنسو پونچھے اور تھوڑا سا مسکرا کر بولی" سر آپ اس موضوع پر ضرور لکھیں' لڑکوں کے ماں باپ کو یہ ضرور بتائیں' لڑکیاں بھی انسان ہوتی ہیں اور اللہ نے ان کو بھی دل اور انا دے رکھی ہے' سر انہیں سمجھائیں اللہ کی مخلوق کو بھیڑ بکریاں نہ بنائیں' انسان کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کریں" میں نے بچی کے ساتھ وعدہ کر لیا' بچی واپس چلی گئی۔



شام کو میرے ایک دوست آئے' میں اداس بیٹھا تھا' انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے ان کو یہ سارا قصہ سنا دیا' وہ بھی دکھی ہو گئے' انہوں نے مجھے اپنے محلے کی ایک بچی کا واقعہ سنایا' بچی ذرا واجبی شکل وصورت کی تھی' اس کے گھر جو بھی لوگ آتے تھے بچی کو دیکھنے کے بعد واپس چلے جاتے تھے' یہ سلسلہ دو تین سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ بچی نفسیاتی مریض بن گئی' علاج شروع ہوا لیکن افاقہ نہ ہوا' آج کل وہ بچی پاگل خانے میں ہے' ہم دونوں مزید دکھی ہو گئے' اسی دوران ہمارا ایک تیسرا دوست بھی آ گیا' اس نے سارا قصہ سنا تو اس نے قہقہہ لگایا' ہم نے اس کی طرف غصے سے دیکھا مگر وہ ہنستا چلا گیا' وہ کئی منٹوں کی ہنسی کے بعد بولا" بے وقوفو! صرف افسوس کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا' اس مسئلے کے حل کیلئے اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو آگے آنا چاہیے' انہیں بولڈ سٹیپ لینا ہو گا" ہم نے پوچھا" وہ کیسے" وہ مسکرا کر بولا" میں نے اپنے بیٹے کی شادی کرنی تھی' ہم نے اس سلسلے میں کم از کم بیس پچیس رشتے دیکھے لیکن ہم نے کسی بچی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی" ہم نے پوچھا" وہ کیسے" وہ مسکرایا" ایک تو ہم براہ راست کسی کے گھر نہیں جاتے تھے' کسی دوست نے اگر کوئی رشتہ بتایا تو ہم اس دوست کے گھر چلے جاتے اور وہ دوست بہانے سے بچی اور اس کے والدین کو وہاں بلا لیتا' ہم غیر محسوس طریقے سے بچی کو دیکھ لیتے' اس

کے والدین کے ساتھ بھی گپ شپ لگا لیتے" ہم نے کسی تقریب میں بچیوں اور ان کے والدین کو بلا لیتے تھے اور غیر محسوس طریقے سے ان کا جائزہ لے لیتے تھے، اس چالاکی کے دوران صرف ایک موقع ایسا آیا جب ہم کسی کے گھر گئے اور اس خاندان نے ہماری آمد کو "لڑکے والے آئے ہیں" قسم کا تاثر دے دیا' ہم وہاں جا کر پریشان ہو گئے' بچی اور بچے کا میل مشکل تھا' ہم لوگ بچی اور اس کے والدین کا دل بھی نہیں توڑنا چاہتے تھے لہٰذا وہاں میں نے ایک عجیب تکنیک استعمال کی' میں نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس سے کہا "بیٹی تم جس گھر بھی جاؤ گی' وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوں گے' مجھے تم بہت اچھی لگی ہو' تم بالکل میری بیٹیوں کی طرح ہو لہٰذا میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا' میرا بیٹا تمہارے قابل نہیں ہے' اس کا آئی کیو لیول' اس کی تعلیم اور اس کے رویے تم سے بہت چھوٹے ہیں' وہ خوبصورتی میں بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا چنانچہ میں تمہارے ساتھ ظلم نہیں کر سکتا" میرے ان الفاظ نے بچی اور اس کے خاندان کی ڈھارس بندھائی' وہ آج تک ہمارا احترام کرتے ہیں" "ہمیں اپنے دوست کی یہ ادا بہت اچھی لگی' وہ ذرا دیر رکا اور پھر مسکرا کر بولا" ہم دوسروں کو پسند کرنے کیلئے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ہمیں لوگوں کو مسترد کرنے کیلئے اس سے چار ہزار گنا زیادہ شائستگی کی ضرورت ہوتی ہے' ہاں تو دنیا میں سب ہی کہہ سکتے ہیں لیکن ناں کہنا ایک آرٹ' ایک ہنر ہے اور یہ آرٹ' یہ ہنر ہمارے ملک کے ہر اس شخص کو اس وقت سیکھ لینا چاہیے جس وقت نرس اس کی گود میں اس کا بیٹا لا کر ڈالے ہے" وہ ذرا سا رکا اور پھر مسکرا کر بولا "ہمیں اس ملک کے تمام لڑکے والوں کو یہ آرٹ' یہ ہنر سکھانا ہو گا"۔

# غربت انعام ہے

''میں تین نسلوں سے غریب ہوں' میرا دادا ہاری تھا' باپ منڈی میں مزدوری کرتا تھا اور میں گریجوایٹ ہونے کے باوجود سائیکلوں کی دکان پر کام کر رہا ہوں' غربت میری دو نسلیں کھا چکی ہے' مجھے یقین ہے' میں بھی اس گڑھے سے نہیں نکل سکوں گا'' نوجوان کی آنکھوں سے پانی کی دھار نکلی' دھار نے اس کے گال پر لکیر سی بنائی اور یہ لکیر تھوڑی پر آ کر رک گئی' وہاں تھوڑی کے بالکل نیچے پانی کا ایک بلب چمک رہا تھا' وہ جب سانس لیتا تھا تو یہ بلب آہستہ سے لرزتا تھا اور اس میں بے شمار رنگ سے گزر جاتے تھے' میں نے اس سے کہا'' بیٹا غربت تو اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہوتی ہے' تم ایک لاکھ 24 ہزار انبیا کو دیکھو چند ایک کے سوا باقی سب نے غربت میں آنکھ کھولی تھی اور سب نے بھوک' غربت اور غریب الوطنی سے ابتدا کی تھی' تم تمام صوفیاء کرام کو دیکھو' یہ سب لوگ غریب' نادار اور محروم طبقوں سے تعلق رکھتے تھے' انہیں بھی کئی کئی دن ایک لقمہ نصیب نہیں ہوتا تھا' انہوں نے پوری زندگی اچھے کپڑے نہیں پہنے' یہ اچھے گھروں میں نہیں رہے تھے اور انہیں اچھی سواری نہیں ملی تھی' تم دنیا کے بڑے بڑے عالموں کو دیکھو' ان میں کون امیر تھا' کس نے بادشاہ کی گود میں آنکھ کھولی تھی' کون منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا' تم دنیا بھر کے سائنس دانوں' شاعروں' ادیبوں' دانشوروں' موسیقاروں اور اداکاروں کو دیکھو' ان میں کون امیر تھا' کون تھا جس کی پیدائش پر سارے شہر میں مٹھائی تقسیم ہوئی تھی' کون تھا جس کا بچپن نوکروں کی فوج

میں گزرا تھا' تم نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ دیکھو' ایک یتیم بچہ جس کی زندگی کا آغاز ہی محرومی سے ہوا تھا' آپؐ کے اصحاب ؓ کو دیکھو' ان میں کون امیر تھا' پورے مدینہ میں پانچ لوگ تھے جنہیں خوشحال کہا جاسکتا تھا' تم اسلام کی پہلی جنگ دیکھو' اللہ کے لشکر کے پاس تلواریں تک نہیں تھیں' جس وقت اللہ کی سلطنت کا پیغام سات براعظموں تک پہنچ رہا تھا اس وقت اللہ کے حبیبؐ کے دسترخوان پر کھجور تک نہیں ہوتی تھی' آپؐ نمک سے روزہ افطار فرماتے تھے اور شکر کر کے نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے تھے' اس وقت دنیا کے فاتحین بھوک سے اتنے نڈھال ہوتے تھے کہ چلتے چلتے گر پڑتے تھے' نماز میں ان کے قیام لمبے اور سجدے طویل ہو جاتے تھے' میرے عزیز یہ بھوک' یہ غربت تو اللہ اپنے مقرب بندوں کو دیتا ہے' وہ جسے پسند کرتا ہے اسے غربت' علم اور عزت سے نوازتا ہے''

نوجوان نے غصے سے آنسو پونچھے اور زہریلے لہجے میں بولا ''آپ بھی مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کر رہے ہیں' آپ بھی مجھے مذہب' دانش اور دلیل کی افیون دے رہے ہیں' میں اگر آپ کی بات مان لوں تو اس کا مطلب ہے مجھ سمیت دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے' انہیں یہ مان لینا چاہیے دنیا میں دولت' آسائش اور نعمتیں صرف آپ جیسے لوگوں کیلئے ہیں اور محرومی' بے بسی اور غربت ہم جیسے لوگوں کا مقدر اور ہم اپنے مقدر کا شکوہ کر کے اللہ کی نعمتوں' اللہ کے کرم سے انکار کر رہے ہیں'' میں نے قہقہہ لگایا ''میرے بچے تم دوسری غلطی کر رہے ہو' تم چیزوں کو دوسری مرتبہ غلط زاویے' غلط انداز سے دیکھ رہے ہو' بیٹا غربت اللہ کا کرم' اللہ کا انعام ہوتی ہے لیکن صرف اور صرف اس شکل میں جب آپ اس سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں' جب آپ اس سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں تو یہ کرم عذاب اور یہ نعمت زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے' اب تم تمام انبیائے کرام کی حیات کا دوسرا پہلو دیکھو' انہوں نے غربت میں آنکھ کھولی تھی لیکن انہوں نے ایک طویل جدوجہد اور کوشش کے بعد ان تمام لوگوں کے حالات بدل دیئے جنہوں نے اللہ کے پیغام پر لبیک کہا تھا' تم مدینہ کی سلطنت دیکھو' جس شہر میں کبھی کھجور تک نہیں ملتی تھی' وہاں صرف 30 برس بعد زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں تھا' حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے ''خزانہ بہت بڑھ گیا ہے اب اس کے خرچ کی بھی کوئی راہ نکالو'' تم صوفیاء کرام کو بھی دیکھو' ان کی حیات ہی میں دنیا جہان کی دولت ان کے دروازے پر آ گری تھی' انہوں نے زندگی میں ایک چولہا چڑھایا تو ہزار سال تک ان کا لنگر چلتا رہا' دنیا کے سارے مصوروں' سارے موسیقاروں' اداکاروں' دانشوروں' شاعروں' مصنفوں اور سائنس دانوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت' عزت اور بڑی حد تک دولت کا مزہ چکھ لیا' تم آج

بھی دیکھو پکاسو کی تصویروں کی مالیت دنیا کے 30 ممالک کے بجٹ کے برابر ہے' الفریڈ نوبل کی آمدنی سے دنیا میں ہر سال بیس تیس لوگوں کو کئی ملین ڈالر دیئے جاتے ہیں' ہفتھون کی سمفنیوں کی رائیلٹی ایک وقت میں جرمنی کے ٹوٹل مالیاتی ذخائر سے زیادہ تھی' سو میرے بچے اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کو غربت دیتا ہے' یہ غربت اس کیلئے تحریک بھی ہوتی ہے' حوصلہ بھی اور عزم بھی' یہ اس کے ہاتھ بھی ہوتی ہے اور پاؤں بھی' دنیا میں عقل ہو یا ہمت' یہ وہ فصلیں ہیں جو صرف اور صرف غربت کی کھاد میں پیدا ہوتی ہیں' اب یہ ہم پر ہے ہم اس غربت کو اپنے لئے تحریک بناتے ہیں' اسے حوصلے اور عزم کی شکل دیتے ہیں یا پھر صبر اور سمجھوتے کی چادر تان کر چپ چاپ لیٹ جاتے ہیں' یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے انسان کو دے رکھا ہے' تم یقین کرو اللہ تعالیٰ جتنا فن' جتنی صلاحیت غریب کو دیتا ہے' اتنی صلاحیت' اتنا فن دس ہزار امیروں کو اجتماعی طور پر نصیب نہیں ہوتا لیکن اس صلاحیت' اس فن سے فائدہ اٹھانا یہ تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کا کام ہوتا ہے''

میں رکا اور ذرا سا سوچ کر کہا'' اچھا تم مجھے ایک سوال کا جواب دو' تم نے کبھی شہد کی مکھی کو شیرے میں پھنسے دیکھا ہے'' نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا' میں نے کہا'' مکھی اس شیرے سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے' یہ کوشش شہد بننے کے عمل کا حصہ ہے' جب یہ مکھی شیرے سے آزاد ہوتی ہے تو اس کا شہد دوسری مکھیوں سے سو گنا گاڑھا' شیریں اور صحت افزاء ہوتا ہے' یہ اس مکھی کو قدرت کی طرف سے انعام ملتا ہے' اگر یہ مکھی جدوجہد کے دوران ہمت ہار دے تو یہ اس شیرے میں غرق ہو جاتی ہے' یہ مر جاتی ہے'' میں نے نوجوان سے ہاتھ ملایا' نوجوان نے ہنس کر آنکھیں صاف کیں اور سلام کر کے چلا گیا باہر زندگی ایک نئے زاویے سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

# دو گھنٹے اپنے لئے

حکومتی نظام میں سیکرٹری سب سے بڑا عہدہ ہوتا ہے' اس عہدے پر متمکن شخص ایک با اختیار اور بارسوخ افسر ہوتا ہے جو لوگ حکومتی سسٹم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں صدر ہو یا وزیراعظم' گورنر ہو یا وزیراعلیٰ' وزیر ہو یا وزیر مملکت تمام احکامات سیکرٹری سے ہو کر نیچے آتے ہیں' یہ تمام لوگ سیکرٹری کو فون کرتے ہیں اور نہایت ادب سے عرض کرتے ہیں' شاہ جی' زیدی صاحب' انور صاحب' طارق صاحب یا جنرل صاحب میں یہ چاہتا ہوں' میری یہ خواہش ہے یا فلاں صاحب بڑے ماہر اور ذہین ہیں آپ مہربانی فرما کر انہیں فلاں پوسٹ پر لگا دیں وغیرہ' سیکرٹری اسی وقت اپنے پی ایس کو بلاتے ہیں اور اسے صدر' وزیراعظم یا وزیر کی خواہش سے مطلع کرتے ہیں اور پھر حکم جاری کرتے ہیں ''ابھی اسی وقت لیٹر تیار کر کے لائیں'' یہ خط عموماً اس قسم کا ہوتا ہے ''میں وزیراعظم' صدر یا وزیر کی ہدایت پر یہ حکم دیتا ہوں فلاں صاحب کو فلاں عہدہ دے دیا جائے اور فلاں کو فلاں ٹھیکہ دے دیا جائے'' وغیرہ وغیرہ' حکومتی نظام سے واقف لوگ جانتے ہیں وزیراعلیٰ' گورنر' وزیراعظم اور صدر کی اصل طاقت سیکرٹری صاحبان ہوتے ہیں' پورے ملک کی بیوروکریسی' سارے سیاستدان' سفیر اور صنعت کار ان کے محتاج ہوتے ہیں' ان کے ایک اشارے سے ادھر کی دنیا ادھر اور ادھر کی کائنات ادھر ہو جاتی ہے' اگر دیکھا جائے تو یہ لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں' ان کا دن عموماً فجر سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور رات دو تین بجے تک جاری رہتا ہے' یہ

روزانہ سینکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں' سینکڑوں فون کرتے اور سنتے ہیں' سینکڑوں خط لکھتے ہیں اور سینکڑوں خط وصول کرتے ہیں' ان لوگوں کی زندگی بہت خوفناک اور قابل رحم ہوتی ہے' یہ عام طور پر کئی دن اپنے بچوں سے ملاقات نہیں کر پاتے' اخبار نہیں پڑھ سکتے اور ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔

میں ایک سیکرٹری کو جانتا ہوں' وہ جب ایڈیشنل سیکرٹری تھے تو میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی' یہ ملاقات آہستہ آہستہ دوستی میں بدل گئی' اس دوستی کی بنیاد لطیفہ گوئی اور حیران کن قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں' وہ مجھے اکثر بلایا کرتے تھے' میں ان کے دفتر میں داخل ہوتا تھا تو وہ فروٹ سلاد منگواتے تھے اور پی اے کو حکم جاری کر دیتے تھے' میں ایک گھنٹہ مصروف ہوں کوئی بندہ اندر آنا چاہئے اور نہ ہی کسی کا فون' اور اس کے بعد لطیفوں کا سیشن شروع ہو جاتا تھا' ہم دنیا جہان کے لطیفے سناتے تھے' دنیا جہان کے چٹکلے اور دلچسپ باتوں کا تبادلہ ہوتا تھا' ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ گھڑی کی طرف دیکھتے اور میں ہاتھ ملا کر واپس آ جاتا تھا' ایک سال کی رفاقت کے بعد وہ سیکرٹری بن گئے' میں نے ان سے رابطہ منقطع کر دیا' ایک روز ان کا فون آیا "بھئی تم کہاں ہو؟" میں نے عرض کیا "میں اسی شہر میں ہوں لیکن اب آپ کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں لہٰذا میں رابطہ نہیں کرتا" انہوں نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر قہقہہ لگا کر بولے "تم آج دو بجے میرے پاس آ جاؤ" ان کا فون بند ہو گیا' میں دو بجے ان کے دفتر پہنچ گیا' فروٹ سلاد میز پر پڑا تھا' انہوں نے پی اے کو حکم جاری کیا اور میرے ساتھ گپ شپ کا سلسلہ شروع کر دیا' میں نے ان سے پوچھا "شاہ جی آپ جس پوسٹ پر ہیں اس پر تو اپنی کمر پر خارش کی باری تیسرے دن آتی ہے آپ مجھ پر اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہیں" وہ سنجیدہ ہو گئے اور ذرا سا آگے جھک کر بولے "میرے چودہ گھنٹوں میں میرا اپنا وقت صرف یہی ایک گھنٹہ ہے باقی سارے گھنٹے حکومت کے ہیں' بیورو کریسی اور عوام کے ہیں' یہ ایک گھنٹہ مجھے ری لیکس کرتا ہے' مجھے حقیقی خوشی اور مسرت دیتا ہے' اگر میں ایک گھنٹہ قہقہے نہ لگاؤں' تمہارے سامنے ٹانگیں پھیلا کر دل کھول کر بکواس نہ کروں تو شاید ایک ہفتے بعد میرا ہارٹ فیل ہو جائے" مجھے ان کی یہ بات عجیب لگی' میں نے ان سے پوچھا "لیکن اس نیک کام کیلئے آپ نے صرف مجھے ہی کیوں منتخب کیا' آپ جانتے ہیں میں جرنلسٹ ہوں اور کسی جرنلسٹ کا قرب بہت خطرناک ہوتا ہے' آپ بخوبی جانتے ہیں" انہوں نے قہقہہ لگایا اور سیب کی قاش اٹھا کر بولے "بے وقوف شخص آخر میرا بھی کوئی تجربہ ہے' آخر میں بھی لوگوں کو سمجھتا اور جانتا ہوں' تمہارے ساتھ دوستی کی تین وجوہات ہیں' نمبر ایک تم ایک وسیع المطالعہ شخص ہو' تم دنیا جہان کی

چیزیں پڑھتے ہو' دوتم ایک انا پرست شخص ہو' میں جانتا ہوں جس دن میں تمہیں نہیں بلاؤں گا تم اس دن نہیں آ ؤ گے اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہم حکومت میں رہ کر ترس جاتے ہیں' ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں ہمیں کوئی ایسا شخص ملے جس کے پیچھے ہم پھریں' وہ ہمارا تعاقب نہ کرے اور تیسری بات' میں جانتا ہوں' تمہیں میری پوزیشن' میرے عہدے سے کوئی غرض نہیں' پچھلے ایک برس میں ہم کم از کم دو سو بار ملے ہوں گے لیکن تم نے آج تک مجھے کوئی کام نہیں کہا' تم نے کبھی کسی کی سفارش نہیں کی' یہ بات بھی حیران کن ہے اور ہم ایسے لوگوں کو بھی ترس جاتے ہیں اور آخری بات میں نے محسوس کیا' تم یاری دوستی کے معاملے میں اپنی صحافیانہ حس قربان کر دیتے ہو''

میں نے ان کی باتوں سے کم و بیش اتفاق کیا اور ان سے پوچھا ''لیکن آپ کو اس سارے کھیل کی ضرورت کیا ہے!'' شاہ جی ہنسے اور ٹشو سے مونچھیں صاف کر کے بولے ''دیکھو یار زندہ رہنے کیلئے ری لیکس ہونا' قہقہے لگانا اور بے لوث دوستوں کی کمپنی ضروری ہوتی ہے' میں جب بیورو کریسی میں آیا تو میں نے ایک توازن قائم کر لیا' میں جہاں بھی جاتا وہاں ایک آدھ ایسا شخص تلاش کر لیتا ہوں جس کے ساتھ میں جی بھر کر گپ لگا سکوں' میں اسے لطیفے سناؤں اور شعروں اور تازہ چھپی ہوئی کتابوں پر بحث کروں' اس کے بعد میں اپنے آفس کو وقت دیتا ہوں' اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا اور لمبی واک کرتا ہوں' یہ سلسلہ میں نے پوری زندگی جاری رکھا' میں آج تک اس پر کاربند ہوں'' میرے لئے یہ بات بھی ایک دلچسپ انکشاف تھا' میں نے پوچھا ''شاہ جی آپ آج کل بھی واک کرتے ہیں'' شاہ جی نے اثبات میں گردن ہلائی ''روز ایک گھنٹہ'' میں نے پوچھا ''اس کیلئے وقت کہاں سے نکالتے ہیں'' انہوں نے پھر قہقہہ لگایا ''ذرا سی شیطانی سے کام لینا پڑتا ہے' یہاں دفتر میں لوگ بیٹھے ہوں تو میں پاؤں کے نیچے لگا بٹن دباتا ہوں اچانک گرین ٹیلی فون بج اٹھتا ہے' لوگ سہم جاتے ہیں' میں فون اٹھا کر مودب انداز سے بات سننے کی اداکاری کرتا ہوں اور پھر یس سر کہہ کر فون رکھ دیتا ہوں' مہمانوں کی طرف بے چارگی سے دیکھتا ہوں اور معذرت کر کے کہتا ہوں' مجھے پی ایم صاحب نے بلا لیا ہے آپ لوگ کافی پئیں میں ابھی آتا ہوں' سب لوگ بڑی خوشی سے مجھے اجازت دے دیتے ہیں' میں اٹھتا ہوں' گاڑی میں بیٹھتا ہوں' سوٹ اتار کر پاجامہ شرٹ پہنتا ہوں' جاگرز چڑھاتا ہوں اور گراؤنڈ میں جا کر جاگنگ شروع کر دیتا ہوں گھنٹے بعد واپس جاتا ہوں تو وہ لوگ ناراض ہوئے بغیر میرا انتظار کر رہے ہوتے ہیں'' میں ہنس پڑا'' اور اگر میٹنگ ہو رہی ہو تو؟'' انہوں نے ایک اور قہقہہ لگایا ''وہاں اچانک مجھے ایک چٹ لا کر دی جاتی

ہے میں حاضرین سے کہتا ہوں بھائیو معاف کرنا مجھے پی ایم بلا رہے ہیں آپ میٹنگ جاری رکھیں میں ان کی بات سن کر ابھی واپس آتا ہوں اور میں گراؤنڈ کی طرف بھاگ جاتا ہوں مجھے معلوم ہے اب تم پوچھو گے اگر میں پی ایم کے دفتر میں ان کے سامنے بیٹھا ہوں تو میں کیا کرتا ہوں'' میں نے ہاں میں گردن ہلادی' انہوں نے دائیں آنکھ دبائی اور ہنس کر بولے'' میں پی ایم سے کہتا ہوں' سر آپ کے احکامات بہت ضروری ہیں مجھے آپ ایک گھنٹہ دے دیں' میں ابھی احکامات ٹائپ کرا کے واپس آتا ہوں' وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہیں' میں واپس آتا ہوں اور وہ احکامات اپنے پی ایس کے حوالے کر کے گراؤنڈ بھاگ جاتا ہوں' ہا' ہا' ہا''

شاہ جی کی باتیں بہت دلچسپ تھیں' میری حیرتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا' انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا' ایک گھنٹہ ہو چکا تھا' میں جانے کیلئے کھڑا ہوا تو وہ ٹشو سے ہاتھ رگڑ کر بولے ''یاد رکھو اگر تم صحت مند ہو' چست و چالاک ہو' اگر تم زندہ ہو تو یہ ساری دنیا تمہاری ہے لیکن جس دن تم بیمار ہو گئے' معذور ہو گئے یا کام کی ٹینشن سے فوت ہو گئے' یہ دنیا اسی دن تمہیں بھلا دے گی' آج مجھے بلڈ پریشر ہو جائے' میری آنکھیں ختم ہو جائیں یا پھر مجھے فالج ہو جائے تو کل اس کرسی پر کوئی دوسرا صحت مند شخص بیٹھا ہو گا' میں اس حقیقت سے واقف ہوں لہٰذا میں تم جیسے دوستوں اور ایک گھنٹے کی واک سے توانائی حاصل کرتا ہوں اور خود کو اگلے روز کیلئے کرسی کا اہل بنا لیتا ہوں'' انہوں نے ہاتھ ملایا اور میں باہر آ گیا' لفٹ سے اترتے ہوئے میں نے سوچا'' شاہ جی واقعی بہت چالاک ہیں' وہ جانتے ہیں ذہنوں پر حکومت کرنے کیلئے حکمرانوں کے ذہن تازہ اور جسم طاقتور ہونے چاہئیں' وہ جانتے ہیں زندہ لوگوں پر صرف زندہ لوگ ہی حکومت کر سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے لئے بھی روزانہ دو گھنٹے نکال لیتے ہیں' اپنے آپ کو بھی قرض دیتے رہتے ہیں''

# ترقی کا سٹیڈیم

فلپ امریکہ میں میرا گائیڈ تھا' میں نے اس کے ساتھ امریکہ کی چھ ریاستوں میں سفر کیا' وہ مجھے ورجینیا لے کر گیا' اس نے مجھے نیویارک' ٹیکساس' واشنگٹن' فلوریڈا اور کیلیفورنیا بھی دکھایا' ہم 25 دن اکٹھے رہے' میں نے جب واشنگٹن میں فلپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی' وہ ایک کمزور بوڑھا تھا اور ذرا سا بیمار بھی دکھائی دیتا تھا' میرا خیال تھا وہ شاید ہی واشنگٹن سے باہر نکل سکے اور اس کے بعد مجھے ایک مردے کے ساتھ سفر کرنا پڑے گا لیکن جب ہم نیویارک پہنچے تو میں فلپ کی چستی' معاملہ فہمی' وقت کی پابندی اور ان تھک شخصیت سے متاثر ہو چکا تھا' وہ پیدل چلتے ہوئے ہمیشہ مجھ سے آگے نکل جاتا تھا اور اس کی سانس تک نہیں پھولتی تھی' میں ایئر پورٹس پر اپنا سامان پورٹرز کے حوالے کر دیتا تھا جبکہ وہ اپنے دونوں بیگ خود اٹھاتا تھا' مجھے آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد ریسٹ کی ضرورت پڑتی تھی جبکہ فلپ بغیر رکے' بغیر دم لئے چلتا رہتا تھا' وہ صبح سوا چھ بجے آنے کا وعدہ کرتا تھا تو ٹھیک چھ بج کر 14 منٹ پر وہ میرے دروازے پر ہوتا تھا' اس نے 25 دنوں میں مجھے کسی فلائیٹ' کسی ٹرین سے لیٹ نہیں ہونے دیا' وہ صبح سے رات تک بلا تھکان میرے ساتھ گھومتا تھا' میں اس کی انرجی پر حیران تھا' میں نے ایک بار اس سے عمر پوچھی تو وہ مسکرایا اور دھیمے لہجے میں بولا ''79 سال'' میں نے اس کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا' اس کا بائیو ڈیٹا بہت دلچسپ تھا' اس نے 15 سال کی عمر میں ایک ریستوران پر

کام شروع کیا تھا‘ وہ شام کو کام کرتا تھا اور دن میں سکول جاتا تھا اس نے نوکری کے ساتھ ساتھ گریجویشن کی یونیورسٹی گیا‘ وہاں سے پی ایچ ڈی کی اور پڑھانا شروع کر دیا‘ پانچ سال پڑھایا اور پھر ایک فرم میں ملازمت کر لی‘ ملازمت چھوڑی اور اپنا کاروبار شروع کر دیا‘ کاروبار سے وہ سیاست میں آیا اور فلوریڈا کی پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا‘ پارلیمنٹ کی مدت ختم ہوئی تو وہ فارن سروس میں چلا گیا‘ اس نے اس سروس میں رہ کر لبنان‘ سوڈان‘ ایران اور پاکستان میں کام کیا‘ وہ 4 سال کراچی رہا‘ فارن سروس چھوڑنے کے بعد اس نے این جی او بنائی اور جب این جی او چل نکلی تو اس نے واشنگٹن میں ٹور آپریٹنگ فرم بنائی‘ مجھے اس وقت پتہ چلا میں جس فرم کے ذریعے امریکہ کی سیر کر رہا ہوں فلپ اس فرم کا مالک ہے‘ میرے لئے یہ خبر انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی‘ میں نے اس سے پوچھا ”تم مالک ہو کر میرے ساتھ کیوں دھکے کھا رہے ہو؟“ اس نے قہقہہ لگایا ”میں سال میں ایک بار گائیڈ کا کام بھی کرتا ہوں‘ اس سے میری استطاعت بھی بڑھتی ہے‘ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور مجھے سیاحوں کی خواہشات اور ضروریات کا اندازہ بھی ہوتا ہے یوں میں اپنے تجربات کی روشنی میں اپنی کمپنی کے کام میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہوں“



میں نے ایک دن فلپ سے پوچھا ”تم چار سال پاکستان میں کام کر چکے ہو‘ تم اپنے تجربے کی روشنی میں بتاؤ‘ کیا پاکستان بھی ترقی کر سکتا ہے“ اس نے ذرا سا سوچا اور مسکرا کر بولا ”ہاں لیکن ایکسر سائز کے ساتھ‘ اگر تم لوگ ورزش شروع کر دو تو تم کمال کر سکتے ہو“ میرے لئے اس کا جواب بم بلاسٹ تھا‘ وہ مسکرایا ”تم میرے جواب کو غیر سنجیدہ سمجھ رہے ہو لیکن میں انتہائی سنجیدہ ہوں‘ میں بچپن اور جوانی میں ایکسر سائز نہیں کرتا تھا‘ میں 6 گھنٹے ریستوران پر کام کرتا تھا اور دس گھنٹے پڑھتا تھا لہٰذا میرے پاس ورزش کیلئے وقت نہیں بچتا تھا‘ میں پڑھائی کے بعد جاب میں مصروف ہو گیا‘ وہاں بھی مجھے وقت نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تو مجھے معلوم ہوا ہماری پارلیمنٹ کے تمام ارکان روزانہ ورزش کرتے ہیں‘ فلوریڈا کی پارلیمنٹ میں 160 ارکان تھے‘ ان میں سے 132 مختلف ”جمز“ کے ممبر تھے جبکہ 28 رکن روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ کرتے تھے‘ مجھے وہاں جا کر علم ہوا امریکہ کی تمام ریاستوں کے 98 فیصد ارکان پارلیمنٹ اور سو فیصد سیاستدان ورزش کرتے ہیں اور جو شخص سیاست میں آنے کے بعد ایکسر سائز نہیں کرتا اسے سیاست میں سنجیدہ نہیں سمجھا جاتا‘ میں نے ذرا سی تحقیق کی تو پتہ چلا امریکی عوام کا خیال ہے جو سیاستدان اپنے آپ کو اہمیت نہیں دیتا وہ ملک اور حلقے کے لوگوں کو بھی اہمیت نہیں دے گا چنانچہ امریکہ میں سیاست کا آغاز انسان کے اپنے وجود سے ہوتا ہے‘ شاید یہی وجہ ہے امریکہ کا ہر

سیاستدان ورزش کا پابند ہے' تم ہمارے صدر بل کلنٹن (اس وقت کلنٹن امریکہ کے صدر تھے) کو دیکھو کلنٹن روزانہ ڈیڑھ گھنٹے جاگنگ کرتے ہیں' اس وقت صدارت کے تین بڑے امیدوار ہیں' جارج بش' جان کیری اور الگور' یہ تینوں ورزش کے عادی ہیں' بش دن میں تین بار ایکسر سائز کرتے ہیں' وہ مہینے کے تین دن اپنے فارم ہاؤس پر گزارتے ہیں' وہ اپنے ہاتھ سے لکڑیاں کاٹتے ہیں' زمینوں میں ٹریکٹر چلاتے ہیں' جانوروں کا دودھ دھوتے ہیں اور پودوں کو پانی دیتے ہیں' الگور کوہ پیما ہیں' وہ کوہ پیمائی کرتے ہیں اور جان کیری جاگنگ کرتے ہیں لہٰذا میں نے دوسرے سیاستدانوں کی پیروی میں ورزش شروع کر دی' میں نے سیاست کے بعد کاروبار شروع کیا تو پتہ چلا امریکہ کے بزنس مین سیاستدانوں سے زیادہ ورزش کے پابند ہیں' اس وقت امریکہ میں 1000 بڑے بزنس مین ہیں' ان میں سے چار سو ارب پتی ہیں' پوری دنیا میں سب سے زیادہ ارب پتی امریکہ میں پائے جاتے ہیں اور یہ تمام ارب پتی نو دولتیے ہیں' ان میں کوئی ایسا شخص نہیں جو تیسری نسل سے امیر ہو' یہ سب پہلی اور دوسری نسل کے امراء ہیں لہٰذا ہم ان تمام ارب پتیوں کو سیلف میڈ کہہ سکتے ہیں' اس وقت دنیا کے 14 بڑے ادارے امریکہ کے ارب پتیوں پر تحقیق کر رہے ہیں' وہ ان کی مشترکہ عادتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں' مجھے چین کے ایک ادارے کی تحقیق پڑھنے کا اتفاق ہوا' اس نے امریکہ کے 1000 کامیاب بزنس مینوں کی عادتوں کا چارٹ بنایا' اس چارٹ کے مطابق ان لوگوں میں 23 عادتیں مشترک تھیں' تم شاید یہ جان کر حیران ہو جاؤ ان 23 عادتوں میں پانچویں عادت ورزش تھی' امریکہ کی ہزار بڑی کاروباری شخصیات ورزش کی عادی ہیں لہٰذا جب میں کاروبار کی دنیا میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا ورزش کے بغیر کوئی شخص اچھا بزنس مین نہیں بن سکتا چنانچہ میں نے روزانہ ایک گھنٹہ جاگنگ شروع کر دی اور آدھ گھنٹہ مسلز ٹریننگ' اس کے بعد میں آج تک روزانہ ورزش کرتا ہوں اور مہینے کے آخری دو دن کسی پہاڑ پر گزارتا ہوں' میں وہاں کیمپنگ کرتا ہوں' پیدل چلتا ہوں اور فطرت کے ساتھ 48 گھنٹے گزار کر واپس آ جاتا ہوں' یہ اسی ورزش کا کمال ہے میں 79 برس کی عمر میں بھی فٹ ہوں' مجھ میں تم سے زیادہ توانائی ہے'' وہ خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی کا وقفہ رہا' وہ دوبارہ بولا'' قوموں کی ترقی سیاست اور معیشت پر استوار ہوتی ہے اور اس کیلئے سیاستدانوں اور بزنس مینوں کا صحت مند' مثبت اور فعال ہونا ضروری ہوتا ہے' امریکہ کے تمام سیاستدان اور بزنس مین صحت مند بھی ہیں اور فعال بھی لہٰذا ہم دنیا کی سب سے بڑی سیاسی اور اقتصادی قوت ہیں' تم اگر ہماری طاقت کے پیچھے

جھانک کر دیکھو تمہیں اس میں ورزش نظر آئے گی' اس وقت دنیا میں ورزش کی سب سے زیادہ مشینیں امریکہ میں خریدی جاتی ہیں' دنیا میں سب سے زیادہ ٹریک سوٹ' جاگرز اور ٹی شرٹس امریکہ میں بکتی ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ فوڈ سپلی منٹس امریکہ میں لئے جاتے ہیں' امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے۔ جس میں ورزش انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکی ہے' امریکہ میں سینکڑوں کمپنیاں ورزش کے نئے آلات اور نئی ورزشیں ایجاد کر رہی ہیں' دنیا میں سب سے زیادہ جم امریکہ میں ہیں اور امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے۔ جس میں ورزش کیلئے باقاعدہ ٹیلی ویژن چینل ہیں' جس میں ورزش کرانے کے کلبز اور کمپنیاں ہیں لہٰذا یہی وجہ ہے ہم دنیا سے بہت آگے ہیں جبکہ میں نے پاکستان میں ایسا نہیں دیکھا' میں کراچی کے ایک پارک میں جاگنگ کرتا تھا' مجھے اس پورے پارک میں کوئی دوسرا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا' میں نے اپنے چار سالہ قیام میں پاکستان کے سیاستدانوں اور بزنس مینوں کو جتنا سست اور بیمار دیکھا اتنا مجھے دنیا کا کوئی دوسرا بزنس مین اور کوئی دوسرا سیاستدان دکھائی نہیں دیا' تم پاکستان جاؤ اور جا کر تحقیق کرو تمہارے ملک کے کتنے سیاستدان اور کتنے بزنس مین ورزش کرتے ہیں' مجھے یقین ہے تمہیں مایوسی ہوگی لہٰذا جس ملک کا سیاست دان اور بزنس مین اپنے ساتھ وفادار نہ ہو' جس کا رویہ خودکش ہو وہ ملک کیسے ترقی کرے گا' ترقی کیلئے مثبت سوچ کی ضرورت ہوتی ہے اور ورزش کے بغیر کسی شخص کی سوچ مثبت نہیں ہو سکتی'' اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر پوچھا ''تمہاری عمر کتنی ہے'' میں نے مسکرا کر جواب دیا ''35 برس'' اس نے قہقہہ لگایا اور اپنے بازو پر ہاتھ پھیر کر بولا ''جس ملک کا 35 برس کا نوجوان مجھ جیسے 79 سال کے بوڑھے کے ساتھ پیدل نہ چل سکتا ہو وہ ملک جدید دنیا کے چیلنجوں پر کیسے پورا اترے گا' وہ ترقی کے سٹیڈیم میں کیسے آگے بڑھے گا'' میں نے مسلز دیکھے اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

# کرے گا کون

نوجوان بہت پریشان تھا' وہ بار بار ہاتھ ملتا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر کہتا ''اٹ از ٹو لیٹ سر' وہاں تو لوگ سردی سے مر جائیں گے'' وہ پریشانی میں گردن ہلاتا' ہاتھ ملتا اور پھر ہم [illegible] سے ہوتا تھا ''ٹینٹس کل یہاں سے نکلیں گی' تین دن بعد اسلام آباد پہنچیں گی اور وہاں سے باغ پہنچنے میں دو دن لگ جائیں گے' اٹ از ٹو لیٹ'' ہم اس کی پریشانی کو دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔

اس کا نام روجر ڈین تھا' وہ آئیر لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر بمشکل 28 برس تھی' اس نے اپنے کیریئر کا آغاز بی بی سی سے کیا تھا' کیریئر کے شروع میں اس کی ڈیوٹی افریقہ لگ گئی وہاں اس نے انسانیت کا ایک انوکھا روپ دیکھا' اس نے غربت' بیماری' جہالت' پریشانی' جنگ اور نقل مکانی کو ایک جگہ اکٹھے دیکھا' وہ جوں جوں انسانی مسائل اور مصیبتوں کا مشاہدہ کرتا گیا توں توں اسے اپنی معاشرت سے نفرت ہوتی گئی' یہ نفرت آنے والے دنوں میں اتنی بڑھی کہ اس نے نوکری چھوڑ دی' ان دنوں آئیر لینڈ کی ایک این جی او ''گول'' یوگنڈا میں کام کر رہی تھی' روجر ڈین اس ''این جی او'' میں شامل ہو گیا اور اس کے بعد وہ چھ سال تک گھر نہیں گیا' وہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور دوسرے ملک سے تیسرے ملک سفر کرتا رہا' 8 اکتوبر کو پاکستان میں زلزلہ آیا تو وہ رضا کاروں کے ایک گروپ کے ساتھ پاکستان آ گیا' ان لوگوں نے آزاد کشمیر میں کام شروع کر

دیا' نومبر کے وسط میں سردی شروع ہوئی تو ''گول'' نے بھارت سے چھتوں کی جستی شیٹس درآمد کرنے کی درخواست دی' یہ شیٹس کراچی آنا تھیں' روجر ڈین ان کی کلیئرنس کے لئے کراچی آیا تھا' میں اس وقت کراچی کسٹم ہاؤس میں اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا تھا' ہم دونوں گپ لگا رہے تھے' کافی پی رہے تھے اور عالمی سیاست پر گفتگو کر رہے تھے لیکن روجر ڈین مسلسل ہاتھ مل رہا تھا اور باغ کے ان متاثرین کے لئے پریشان ہو رہا تھا جو شدید سردی میں ان شیٹس کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں نے توجہ بانٹنے کیلئے اس سے پوچھا ''تم کتنی تنخواہ لیتے ہو'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ''تنخواہ کیا مطلب؟'' میں نے وضاحت کی ''میرا مطلب ہے تمہارا پیکج کتنا ہے'' وہ مسکرایا ''گول میں آئرلینڈ کے 1100 رضا کار کام کرتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی شخص تنخواہ نہیں لیتا' ہم سب لوگ ایک دو کمروں میں فرش پر سوتے ہیں' دن میں دو بار کھانا کھاتے ہیں اور مہینے کے آخر میں ہمارا ادارہ ہمیں ٹوتھ پیسٹ' شیونگ کے سامان یا کپڑوں کے ایک آدھ جوڑے کے لئے تھوڑی سی پاکٹ منی دے دیتا ہے'' میں اور میرا دوست پریشان ہو گیا' ڈین نے بتایا ''گول ایک آئرش نوجوان جان او شیا نے 1977ء میں قائم کی تھی وہ ابھی تک اس این جی او سے وابستہ ہے' اس این جی او کا مقصد آئرش حکومت کو تیسری دنیا کے مسائل سے آگاہ کرنا تھا' اس ادارے نے سب سے پہلے افریقہ میں کام کیا' یہ لوگ آفت زدہ علاقوں کے لئے خوراک' پانی' پناہ گاہوں' ادویات اور پرائمری تعلیم کا بندوبست کرتے تھے' یہ لوگ تیسری دنیا کے متاثرہ علاقوں میں جاتے تھے اور اپنی حکومت کو مقامی مسائل کے بارے میں مطلع کرتے تھے اور اسے قائل کرتے تھے وہ سرکاری سطح پر اس علاقے کی مدد کا اعلان کرے' اس ادارے کا کہنا تھا' آئرش حکومت کو دنیا کے غریبوں کا چیمپئن ہونا چاہیے' یہ لوگ اپنی حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے یہاں تک کہ 2003ء میں آئرلینڈ کی حکومت نے پہلی بار یوگنڈا کے متاثرین کے لئے دس ملین پاؤنڈ امداد کا اعلان کیا' گول ایک چھوٹی سی تنظیم ہے لیکن یہ اس وقت دنیا کے 15 غریب ملکوں میں کام کر رہی ہے' اس کے پاس ایک ہزار ایک سو رضا کار اور 2 ہزار مقامی لوگوں کا عملہ ہے' یہ لوگ ہر سال 350 ملین پونڈ خرچ کرتے ہیں اور ان کے ذاتی اخراجات محض پانچ فیصد ہیں'' ہمارے لئے یہ ساری معلومات حیران کن تھیں۔ روجر نے بتایا ''گول کے گیارہ سو رضا کار دس برس سے اپنے گھر نہیں گئے' یہ لوگ ایک جگہ جاتے ہیں وہاں حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو انہیں کسی دوسرے ملک' کسی دوسرے علاقے میں آفت کی اطلاع مل جاتی ہے اور یہ لوگ اپنا سامان باندھ کر اس علاقے میں

چلے جاتے ہیں۔ خود روجر کو گھر سے نکلے چھ سال ہو چکے ہیں'' میں نے اس سے پوچھا ''تم پاکستان کے بارے میں کیا جانتے تھے'' اس نے ہنس کر جواب دیا ''میں نے آٹھ اکتوبر 2005ء سے پہلے پاکستان کا نام نہیں سنا تھا' یہاں زلزلہ آیا تو ہیڈ کوارٹر نے ہمیں پاکستان جانے کا حکم دیا' ہم لوگ یہاں آ گئے' یہاں حالات بہت خراب تھے' ہم نے آئرلینڈ سے فنڈ منگوایا' اس فنڈ سے بھارت سے شیٹس خریدیں اور اب ہماری کوشش ہے ہم برفباری سے پہلے باغ کے لوگوں کو گھر بنا دیں'' ابھی روجر کی گفتگو جاری تھی' میرے دوست کا اسسٹنٹ اندر داخل ہوا اور روجر کو اس کا کلیئرنس سرٹیفکیٹ دے دیا۔ روجر نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

روجر کے جانے کے بعد ہم بحث کے ایک نئے فیز میں داخل ہو گئے' میرا دوست مجھ سے کہنے لگا ''دنیا میں 56 اسلامی ممالک ہیں' تم ان اسلامی ممالک کا پروفائل نکال کر دیکھو تمہیں کسی اسلامی ملک میں گول جیسی کوئی تنظیم نہیں ملے گی' ہم پاکستانی ایک جذباتی اور درد دل رکھنے والی قوم ہیں لیکن ہمارے ملک میں بھی کوئی ایسی تنظیم نہیں'' میں نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا ''واقعی یہ حیران کن بات ہے' دنیا کا وہ مذہب جس کی بنیاد ہی ویلفیئر تھی اس میں آج عالمی سطح کا ایک بھی ویلفیئر ادارہ نہیں'' میرے دوست نے کہا ''لیکن ہم اگر چاہیں تو گول جیسے سینکڑوں ادارے بنا سکتے ہیں' تم ایدھی فاؤنڈیشن کی مثال لے لو' ایک ان پڑھ شخص نے کام شروع کیا اور آج ایدھی دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایمبولینس سروس ہے' یہ ادارہ پچھلے چار سال سے گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ہے' اس کا مطلب ہے ہم میں پوٹینشل موجود ہے' بس نیت اور ہمت کرنے کی دیر ہے'' میں نے اس سے پوچھا ''ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں'' اس نے قہقہہ لگایا ''جان او شیا اور روجر ڈین کی طرح ہم لوگ بھی چھوٹی چھوٹی تنظیمیں بنائیں' مختلف شعبوں کی تربیت حاصل کریں اور اس کے بعد نیشنل اور انٹرنیشنل سطح پر کام شروع کر دیں' مجھے یقین ہے چند برسوں میں ہماری تنظیمیں بھی عالمی سطح پر پہچانی جائیں گی'' میں نے اس کی تائید کی ''واقعی تم صحیح کہہ رہے ہو' تم حالیہ زلزلے میں ہماری تنظیموں کی کارکردگی دیکھ لو' ہماری مذہبی تنظیموں نے ہنگامی بنیادوں پر متاثرین کی مدد شروع کی اور کمال کر دیا' یورپ اور امریکہ تک کے ادارے الخدمت ٹرسٹ' جماعت الدعوۃ' الرحمت ٹرسٹ اور الرشید ٹرسٹ کی خدمات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے' عالمی ایجنسیوں کے تخمینے کے مطابق ان اداروں نے پانچ ارب روپے سے زیادہ فنڈز جمع کئے اور یہ فنڈز متاثرین تک پہنچائے چنانچہ اگر ہم صرف ان اداروں کو مضبوط بنا دیں' ہم ان کی سرکاری

سرپرستی شروع کر دیں اور ان کے کارکنوں کو ٹریننگ دے دیں تو یہ ادارے دنیا میں کمال کر سکتے ہیں' یہ ہمارا امیج تبدیل کر سکتے ہیں" میرے دوست نے سر ہلایا اور قہقہہ لگا کر جواب دیا" لیکن کرے گا کون' ہم لوگ فارورڈ بلاکوں سے باہر نکلیں گے تو ان چیزوں پر توجہ دیں گے نا' جو قوم آج تک کالا باغ ڈیم کا فیصلہ نہیں کر سکی' تم اس سے توقع رکھتے ہو وہ گول جیسے ادارے بنائے گی' تم بڑے بے وقوف ہو۔"
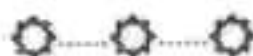
# مرہم کون لگائے گا

1992ء میں راولپنڈی میں پولیس کا عالمی سطح کا ایک سیمینار ہوا تھا، اس سیمینار میں شرکت کیلئے بیرون ملک سے بے شمار پولیس افسر پاکستان آئے۔ ان افسروں میں جاپان کا پولیس چیف بھی شامل تھا۔ سیمینار کے بعد ڈنر تھا، ڈنر میں راولپنڈی کے ڈی آئی جی اور جاپان کے پولیس چیف ایک میز پر بیٹھ گئے اور دونوں نے گفتگو شروع کر دی، گفتگو کے دوران ڈی آئی جی نے جاپانی چیف سے پوچھا ''آپ لوگوں پر کبھی سیاسی دباؤ نہیں آتا؟'' جاپانی پولیس چیف نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد جواب دیا ''صرف 1963ء میں ایک بار آیا تھا'' ڈی آئی جی صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے' چیف نے بتایا ''1963ء میں برطانیہ کے وزیر خارجہ جاپان کے دورے پر آئے تھے، وہ ایک دن کیلئے اوساکا شہر چلے گئے، دوسرے دن ان کی جاپانی وزیراعظم کے ساتھ ملاقات تھی، انہوں نے اوساکا سے سیدھا پرائم منسٹر ہاؤس آنا تھا، راستے میں ٹریفک جام ہو گئی، ان کے ساتھ موجود پروٹوکول افسروں نے ہمارے پولیس چیف سے رابطہ کیا اور ان سے درخواست کی، پولیس کسی خصوصی بندوبست کے ذریعے انہیں ٹوکیو پہنچا دے، پروٹوکول افسروں کا کہنا تھا' برطانوی وزیر خارجہ کی وزیراعظم سے ملاقات انتہائی ضروری ہے اگر وہ انہیں وقت پر نہیں ملتے تو یہ ملاقات ملتوی ہو جائے گی کیونکہ ایک گھنٹے بعد وزیراعظم چین کے دورے پر روانہ ہو جائیں گے، پولیس چیف نے ان کی بات سن کر معذرت کر لی، اس کے بعد وزیراعظم نے بذات خود پولیس چیف سے

درخواست کی لیکن پولیس چیف کا کہنا تھا" ہمارے پاس وی آئی پیز کو ٹریفک سے نکالنے کا کوئی بندوبست نہیں" یوں یہ ملاقات منسوخ ہوگئی' اس ملاقات کی منسوخی کی وجہ سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات میں شدید کشیدگی پیدا ہوگئی" جاپان کے پولیس چیف خاموش ہو گئے' ہمارے ڈی آئی جی نے شدت جذبات میں پہلو بدلا اور ان سے پوچھا" اس کے بعد کیا ہوا" پولیس چیف مسکرائے" اس کے بعد کیا ہونا تھا، یہ خبر اخبارات میں شائع ہوگئی، لوگوں نے وزیراعظم کے رویے پر شدید احتجاج کیا اور وزیراعظم کو قوم اور پولیس دونوں سے معافی مانگنا پڑی" ہمارے ڈی آئی جی کیلئے یہ انوکھی بات تھی چنانچہ انہوں نے حیرت سے پوچھا" اگر پولیس چیف کے انکار سے وزیراعظم برا منا جاتے اور دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو جاتی تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا" پولیس چیف نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا" پہلی بات تو یہ ہے ہمارا وزیراعظم کبھی پولیس چیف کے ساتھ لڑائی نہ کرتا لیکن بالفرض محال اگر دونوں میں جنگ چھڑ بھی جاتی تو اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا" پولیس چیف سانس لینے کیلئے رکا اور سنجیدگی سے بولا" وزیراعظم کو استعفیٰ دینا پڑتا" ہمارے ڈی آئی جی صاحب کا رنگ پیلا ہو گیا اور انہوں نے حیرت سے پوچھا" کیا جاپان میں پولیس چیف اتنا مضبوط ہوتا ہے؟" جاپانی پولیس چیف نے مسکرا کر جواب دیا" نہیں ہمارے ملک کا قانون، انصاف اور سلامتی کا نظام بہت مضبوط ہے۔ ہم نے عوام کی حفاظت کیلئے پولیس بنا رکھی ہے، وی آئی پیز کو پروٹوکول دینے کیلئے نہیں لہٰذا جاپان کا ہر شخص جانتا ہے اگر وزیراعظم اور پولیس چیف میں لڑائی ہوگی تو اس میں وزیراعظم ہی کا قصور ہوگا لہٰذا استعفیٰ بھی اسے ہی دینا پڑے گا۔"

مجھے یہ بات اس ڈی آئی جی نے سنائی تھی، یہ ڈی آئی جی بعدازاں آئی جی بنے اور آج یہ نیشنل پولیس بیورو کے ڈی جی ہیں اور ان کا نام ڈاکٹر شعیب سڈل ہے۔

میں نے پچھلے دس برسوں میں بے شمار سیاستدانوں، وزراء اور پولیس کے اعلیٰ افسروں کو یہ واقعہ سنایا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا جب تک آپ لوگ پاکستان میں جاپان جیسی پولیس نہیں بناتے اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے میاں نواز شریف سے لے کر شوکت عزیز تک سب حکمرانوں نے اس واقعے پر سر دھنا تھا اور اس کے بعد پاکستان میں جاپانی پولیس سسٹم کے نفاذ کا عزم کیا تھا لیکن عملی طور پر نواز شریف نے کوئی قدم اٹھایا اور نہ ہی شوکت عزیز صاحب نے' رہ گئے پولیس کے اعلیٰ حکام تو میں نے جب بھی انہیں "موٹی ویٹ" کرنے کی کوشش کی' ان کا ایک ہی جواب ہوتا تھا جب تک ہمارے سیاستدان پولیس کا سیاسی

استعمال ترک نہیں کرتے یہ نظام ٹھیک نہیں ہو سکتا' میں جب ان کے ساتھ اصرار کرتا تو وہ بے شمار ایسی مثالیں دیتے جن میں کسی پولیس اہلکار یا افسر نے کسی سیاستدان یا کسی سیاسی خاندان کے کسی فرد پر قانون نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد کانسٹیبل سے لے کر ڈی آئی جی تک سب لوگ معطل ہو گئے تھے یا انہیں بیک جنبش قلم بدل دیا گیا تھا' ان افسروں کا کہنا تھا جس ملک میں ایم پی اے کے ملزم بھائی کے لئے چیف منسٹر تھانوں پر حملہ آور ہو جائے' جس میں اشتہاری ملزم کی رہائی کے لئے وزیراعظم کا بھائی تھانے پر حملہ کر دے' لاک اپ کا تالہ توڑ دے اور تھانیدار کو سرے عام پیٹنا شروع کر دے' جس ملک میں گاڑی کے شیشوں سے کالے کاغذ اتارنے پر کانسٹیبل کو ہتھکڑی لگا کر جنرل صاحب کے سامنے پیش کر دیا جائے اور جس ملک میں وی وی آئی پی موومنٹ کے دوران ایمبولینس کو راستہ دینے پر ایس ایس پی فارغ ہو جائے اس ملک کی پولیس میں جاپان جیسی سپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ میں جب پولیس افسروں کے یہ دلائل سنتا تھا تو میں انہیں ''شیطانی جواز'' کہتا تھا' میرا خیال تھا' ان لوگوں نے کام نہ کرنے کے بہانے گھڑ رکھے ہیں اگر یہ لوگ اجتماعی طور پر فیصلہ کر لیں ہم نے آج سے کسی سیاستدان کا غلط حکم نہیں ماننا تو یہ نظام دو دن میں ٹھیک ہو جائے لیکن شاید ان لوگوں میں حوصلہ اور ایمان نہیں ہے اور یہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔



میں اپنے اس نظریئے پر 28 جون 2006ء تک قائم تھا لیکن 28 جون 2006ء کو ہمارے ایک محترم ایم این اے سردار طفیل نے مجھے اپنے نظریئے کو ''ری شیپ'' کرنے پر مجبور کر دیا اور میں نے پہلی بار سوچا جب تک ہمارے سیاستدانوں کا قبلہ درست نہیں ہوتا اور جب تک ان کی گردنوں کا سریا نہیں سرکتا اس وقت تک اس ملک کا قانون اور پولیس ٹھیک نہیں ہو سکتی' سردار طفیل کا واقعہ بہت دلچسپ ہے' سردار صاحب 28 جون کو مری تشریف لے گئے' مری کی انتظامیہ گرمیوں کے سیزن میں شہر میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند کر دیتی ہے لیکن سردار طفیل ایک بڑی کوسٹر اور دو دوسری گاڑیوں کے ساتھ مری میں داخل ہو گئے' ان کی کوسٹر نے ٹریفک بلاک کر دی' پولیس کانسٹیبل آگے بڑھا اور اس نے سردار طفیل سے عرض کیا ''جناب مری میں بڑی گاڑیوں کا داخلہ بند ہے'' سردار صاحب کو کانسٹیبل کی یہ جسارت پسند نہ آئی لہٰذا انہوں نے اسے ڈانٹ دیا جس پر کانسٹیبل محمد یوسف نے اصرار شروع کر دیا' سردار صاحب کے بیٹوں اور سکیورٹی گارڈز کو یہ اصرار اچھا نہ لگا' وہ لوگ نیچے اترے اور انہوں نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے کانسٹیبل کو مارنا شروع کر دیا' ان لوگوں نے کانسٹیبل کو مار مار کر اس کے دانت' ناک کی ہڈی اور بازو توڑ دیا' لوگ یہ ظلم

برداشت نہ کر سکے‘ وہ آگے بڑھے اور انہوں نے بڑی مشکل سے کانسٹیبل کی جان بچائی‘ کانسٹیبل محمد یوسف اس وقت تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال مری میں زیر علاج ہے جبکہ سردار صاحب فتح یاب ہو کر واپس اسلام آباد پہنچ گئے ہیں‘ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو مجھے محسوس ہوا سردار طفیل کے گارڈز اور بیٹوں نے یہ مکے‘ یہ تھپڑ اور یہ ٹھڈے صرف کانسٹیبل محمد یوسف کو نہیں مارے بلکہ انہوں نے یہ تھپڑ ملک کے آئین‘ قانون‘ روایات اور پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو مارے ہیں‘ یہ طمانچہ بنیادی طور پر ہمارے کلچر‘ ہماری پارلیمنٹ اور ہماری سیاسی لاٹ کے منہ پر آیا ہے‘ یہ ٹھڈے ثابت کرتے ہیں ہمارے سیاستدان کس قدر مضبوط اور اتھرے ہیں اور ان کی نظروں میں ہمارے قانون‘ ہمارے نظام اور ہماری پولیس کی کیا اہمیت ہے؟ یہ ثابت کرتے ہیں ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں ہر زور آور شخص قانون سے جوتے صاف کرتا ہے اور اسے کوئی شخص نہیں پوچھتا‘ ہم ایک ایسے ملک میں رہ رہے ہیں جس میں کوئی بڑا شخص قانون اور قانون نافذ کرنے والوں کو تسلیم نہیں کرتا‘ جس میں قانون صرف غریبوں کیلئے ہوتا ہے اور جس میں مضبوط لوگ ہر ضابطے‘ ہر قاعدے کو روند ڈالتے ہیں‘ میں نے جب سے واقعہ پڑھا ہے میرا دل کرتا ہے میں اس واقعے کے گواہوں کو اکٹھا کروں اور ان لوگوں کو اسپیکر قومی اسمبلی چوہدری امیر حسین کے سامنے اکٹھا کروں اور ان سے عرض کروں ”حضور اس ملک میں اگر کوئی ادارہ‘ اگر کوئی پولیس اہلکار کسی ایم این اے کے سامنے چھینک بھی مار دیتا ہے تو پورے ایوان کا استحقاق مجروح ہو جاتا ہے لیکن جب اس ایوان کے کارندے پورے ملک کا استحقاق‘ پورے ملک کی عزت اور آبرو روند ڈالتے ہیں تو کسی ایوان‘ کسی پارلیمنٹ اور قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی“ میں ان سے عرض کروں ”حضور اس ملک کے عوام کے کٹے پھٹے اور ٹوٹے استحقاق پر مرہم کون لگائے گا‘ حضور سردار طفیل صاحب جیسے لوگوں کا ہاتھ کون روکے گا۔“

# ترقی کی شاہراہ

امیر تیمور اسلامی تاریخ کا ایک عجیب کردار تھا، وہ سمرقند کے ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا۔ اس کے والد ایک معمولی زمیندار تھے۔ قدرت نے تیمور کو بلا کے حافظے اور محیر العقول صلاحیتوں سے نوازا۔ وہ نہ صرف حافظ قرآن تھا بلکہ وہ آخری آیت سے پہلی آیت کی طرف الٹی ترتیب سے قرآن مجید پڑھ سکتا تھا۔ وہ فقہ اور تاریخ کا بھی ماہر تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں مہارت سے کام کر سکتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا سکتا تھا۔ گرز گھما سکتا تھا۔ تیر پھینک سکتا تھا اور لکھ سکتا تھا اور وہ شریعت کا اس قدر پابند تھا کہ اس نے پوری زندگی نماز قضا نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بلا کا وحشی اور ظالم بھی تھا۔ وہ پچاس برس تک جنگیں لڑتا رہا، اس نے سارا سنٹرل ایشیا، ایک تہائی ہندوستان، افغانستان، ایران اور عراق فتح کیا' اس نے ترکی اور یورپ کے کئی ملک بھی روند ڈالے' وہ اپنی فتوحات کے باعث ''تیمور دی گریٹ'' کہلایا' وہ قتل کر کے خوش ہوتا تھا' اس کا کہنا تھا' دنیا میں کٹی ہوئی گردن سے ابلتے خون جیسا قیمتی نظارہ کوئی نہیں۔ وہ جو شہر فتح کرتا تھا اس کی ساری آبادی کو قتل کرا دیتا تھا، عمارتیں ڈھا دیتا تھا اور فصلیں گرا دیتا تھا' اس نے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ لوگوں کے سر کٹوا کر کھوپڑیوں کے مینار بنائے لیکن اس تمام تر ظلم اور وحشت کے باوجود اس میں ایک عجیب عادت تھی' وہ جو شہر، جو ملک فتح کرتا تھا وہاں کے علماء، دانشوروں، شاعروں اور صنعت کاروں کو امان دے دیتا تھا' اس نے اپنی فوج کو حکم دے رکھا تھا ''تم مفتوحہ شہر کی آبادی

سے جو چاہو سلوک کرو لیکن خبردار تمہاری آواز اور تمہاری تلوار کسی صنعت کار، کسی شاعر، دانشور اور عالم پر نہیں اٹھنی چاہیے خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے، مذہب اور طبقے سے کیوں نہ ہو، وہ جنگ کے بعد مفتوحہ علاقوں کے علماء سے گفتگو بھی کرتا تھا' ان سے علم اور معلومات حاصل کرتا تھا' انہیں انعام واکرام سے نوازتا تھا اور پھر انہیں عزت کے ساتھ سمرقند میں آباد کر دیتا تھا' اس کی اس عادت کا یہ نتیجہ نکلا' چودھویں اور پندرہویں صدی کے وسط میں دنیا میں سب سے زیادہ شاعر، دانشور، عالم اور صنعت کار تیمور کی سلطنت میں تھے' دنیا میں سب سے زیادہ درس گاہیں، مسجدیں، بازار اور کارخانے بھی سمرقند اور بخارا میں تھے اور دنیا میں سب سے خوشحال لوگ بھی سنٹرل ایشیا میں آباد تھے اس وقت عالم یہ تھا دنیا جہان کے ماہرین تیمور کے پاس آتے تھے، اسے اپنا فن، اپنی مہارت دکھاتے تھے اور وہ انہیں جواہرات سے لاد دیتا تھا، وہ انہیں اپنے ملک کے بہترین علاقوں میں آباد کرتا تھا کوئی آ کر اس سے کہتا تھا ''میں دنیا میں سب سے اچھا چاول اگا سکتا ہوں'' تو وہ اس سے بجٹ پوچھتا تھا، اس کے مطالبے کے مطابق اسے رقم دے دیتا تھا اور اسے پورے اختیارات کے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کرتا تھا، شاید یہی وجہ تھی تیمور کا دور سنٹرل ایشیا کا سنہری ترین عہد تھا۔



تیمور کا یہ اصول آج تک دنیا میں کارفرما ہے دنیا کا ہر وہ معاشرہ جس میں صنعت کاروں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کی تعداد زیادہ ہے اس کا شمار ترقی یافتہ اور خوشحال معاشروں میں ہوتا ہے اور ہر وہ حکومت کامیاب اور کامران ہے جس کی کابینہ میں دانشور اور ماہرین ہیں' آپ امریکہ کی مثال لیجئے، بش کی کابینہ کے بیس ارکان ہیں، ان ارکان میں سے صرف پانچ رکن سیاستدان ہیں جبکہ باقی تمام ارکان عالم اور فاضل ہیں' ان میں وزیر داخلہ نارٹن، وزیر محنت ایلین ایل چاؤ، چیف آف سٹاف اینڈریو ایچ کارڈ، نائب صدر ڈک چینی اور ہوم لینڈ سکیورٹی کے وزیر ٹام رج جیسے لوگ شامل ہیں' بش کی کابینہ کے تین رکن جان پی والٹرز، توانائی کے وزیر سیموئیل ڈبلیو بوڈمین اور وزیر خارجہ کونڈو لیزا رائس تو باقاعدہ یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ مس رائس 1981ء سے 1989ء تک اسٹین فورڈ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی پروفیسر رہی تھیں' انہوں نے تدریس کے قومی سطح کے دو بڑے ایوارڈ بھی حاصل کیے تھے، وہ اس وقت بھی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتی ہیں، بوڈمین ایم آئی ٹی کے کیمیکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھے انہوں نے وہاں چھ سال پڑھایا تھا اور نیشنل ڈرگ کنٹرول پالیسی کے ڈائریکٹر

جان پی والٹرز مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی میں سیاسیات کے پروفیسر تھے، ان کے علاوہ کابینہ کے باقی ارکان صنعت کار، تاجر، بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو اور زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین ہیں مثلاً آپ امریکہ کے وزیر زراعت مائیک جوہانز کو لیجئے وہ ایک زمیندار ہیں۔ انہوں نے نہ صرف اپنے ہاتھوں سے فارمنگ کی تھی بلکہ انہوں نے زرعی کمپنیاں بھی چلائیں۔ وزیر تجارت کارلوس گیوئیرز امریکہ کی ایک مشہور تجارتی کمپنی میں ملازم رہے ہیں اٹارنی جنرل البرٹو گونزالیس مختلف کمپنیوں کے مشیر تھے۔ وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ نیوی میں پائلٹ رہے، ناٹو کے سفیر رہے اور دنیا کی تین بڑی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو رہے، مینجمنٹ اور بجٹ کے ڈائریکٹر جاشوا اور تجارت کے نمائندے رابرٹ بی زے لیک Zoellick سرکاری ملازم تھے۔ خصوصی امور کے وزیر جم نکولسن ایک عام سپاہی تھے، ہاؤسنگ کے وزیر الفانسو جیکسن امریکن الیکٹرک پاور کے عام سے ملازم تھے، وزیر خزانہ جان ڈبلیو سنو امریکہ کے نامور بزنس مین ہیں، سماجی بہبود اور صحت کے وزیر مائیکل لیوٹ طویل عرصے تک سماجی بہبود اور عوامی صحت کے غیر سرکاری اداروں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے عوامی صحت کے بے شمار منصوبوں پر کام کیا، ٹرانسپورٹ کے وزیر نارمن وائی مائیٹا ایک کاروباری شخصیت ہیں، وہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار سے منسلک رہے اور امریکہ کی وزیر تعلیم مارگریٹ سپیلنگز طویل عرصے تک ٹیکساس کی سکول بورڈ ایسوسی ایشن کی ڈائریکٹر رہی ہیں۔

آپ دیکھ لیجئے یہ تمام لوگ اپنے اپنے شعبے کے ماہر ہیں۔ ان کی زندگیاں ان شعبوں میں گزریں جن کے وہ آج وزیر ہیں لہٰذا یہ لوگ حلف اٹھانے سے پہلے اپنے شعبوں کے مسائل اور مشکلات سے واقف تھے انہیں معلوم تھا ان کے نیچے کتنے دفتر کام کر رہے ہیں اور ان میں کس افسر کے پاس کیا اختیارات ہیں اور کس شعبے میں کیا تبدیلی کی جائے تو سسٹم زیادہ بہتر طریقے سے کام کر سکتا ہے، یہ حقیقت ہے زراعت کی وزارت کو ایک زمیندار زیادہ بہتر طریقے سے چلا سکتا ہے اور ایک ڈاکٹر وزارت صحت اور ایک صنعتکار انڈسٹری کی وزارت کو زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے، وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لا سکتا ہے۔ اسی طرح کسی یونیورسٹی کا ایسا وائس چانسلر جس نے عملی زندگی کا آغاز سکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا ہو وہ تعلیم کی وزارت کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، وہ اس میں زیادہ بڑا انقلاب لا سکتا ہے چنانچہ کہنے کا مطلب ہے اگر ہم ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں، اگر ہم ملک کو بہتر بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں امیر تیمور کی طرح یا پھر امریکی نظام کی طرح سیاست اور حکومت میں پروفیسروں اور ماہرین کی تعداد بڑھانی چاہیے۔ ہمیں تمام شعبوں

کی قیادت ماہرین کے حوالے کر دینی چاہیے۔ اگر ایک شوکت عزیز کے آنے سے خزانے کی صورتحال بہتر ہو سکتی ہے، ملک ڈیفالٹ سے نکل سکتا ہے اور ہمارے قرضوں میں کمی آ سکتی ہے تو کیا ہم اپنی انڈسٹری، تعلیم، صحت اور تجارت کے شعبے جناب شوکت عزیز جیسے ماہرین کے حوالے نہیں کر سکتے، کیا ہم ان شعبوں میں یہ تجربہ نہیں کر سکتے۔ مجھے ایک پروفیسر صاحب بتا رہے تھے وہ جب امریکہ میں تھے تو انہیں مشاورت کیلئے پینٹا گان تک میں بلایا جاتا تھا لیکن جب وہ پاکستان آئے تو وہ اپنی تنخواہ کیلئے چھ مہینے تک دفتروں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ انہیں کلرک تک اپنے دفتر میں گھسنے نہیں دیتا تھا۔ ذرا سوچئے کیا بلندی ہے امریکہ میں پروفیسر وزیر ہیں اور کیا پستی ہے پاکستان میں پروفیسر تنخواہوں اور پنشنوں کیلئے دھکے کھا رہے ہیں، امیر تیمور نے کہا تھا وہ ملک کبھی قائم نہیں رہ سکتا جو اپنے عالموں، دانشوروں اور صنعتکاروں کی عزت نہیں کرتا۔ امیر تیمور کے چھ سو سال بعد ہنری کسنجر نے امریکہ میں اعلان کیا تھا ''امریکہ اس وقت تک سپر پاور رہے گا جب تک یونیورسٹی کے پروفیسر، دانشور اور بزنس مین اس کی پالیسیاں بناتے رہیں گے''۔



ہم نے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات کی ہیں کیا ہم اس معاملے میں کوئی اصلاح نہیں کر سکتے؟ پاکستان کی تمام جماعتیں 2007ء کو الیکشن کا سال قرار دے رہی ہیں۔ صدر پرویز مشرف بھی ''الیکشن مہم'' کے سلسلے میں پورے ملک کے دورے کر رہے ہیں' پنجاب حکومت بھی صدر صاحب کو اگلے دس سال تک وردی میں رکھنے کی خواہش مند ہے، یہ سارے کام ہونے چاہئیں کیونکہ یہ پاکستان کے بے شمار لوگوں کی بقا کیلئے ضروری ہے لیکن ہمیں اس کے ساتھ ساتھ ملک کی حقیقی ترقی پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ اگر صدر صاحب وردی کے ساتھ ساتھ یہ قانون بھی بنوا دیں کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنی مرکزی قیادت میں ماہرین کو پچاس فیصد کوٹہ دے گی' اگر صدر آج اعلان فرما دیں ملک کی اگلی کابینہ کے پچاس فیصد وزراء، ماہرین اور پروفیسر ہوں گے تو ملک کے حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہم اس شاہراہ پر آ سکتے ہیں جو ملک کو ترقی کی انتہا تک لے جاتی ہے، جو قوموں کو خوشحال قوم بناتی ہے۔

☼......☼......☼

# ہم بھکاری ہیں

تانگ شان (TANG SHAN) چین کا ایک تاریخی شہر ہے' یہ شہر بیجنگ سے 95 میل دور شمالی چین میں واقع ہے' 1976ء تک اس کا شمار چین کے چند بڑے صنعتی اور کاروباری شہروں میں ہوتا تھا' اس وقت اس کی آبادی دس سے پندرہ لاکھ تھی' یہ ایک ہنستا کھیلتا شہر تھا لیکن 28 جولائی 1976ء کو رات تین بج کر 42 منٹ پر اس شہر پر قیامت ٹوٹ پڑی' صوبے میں زلزلہ آیا' زلزلے کی مختلف لہریں "تانگ شان" میں جمع ہوئیں اور پورا شہر زمین بوس ہو گیا' ریکٹر سکیل پر اس زلزلے کی شدت 7 اعشاریہ 8 تھی' اس زلزلے میں تانگ شان کے 6 لاکھ 55 ہزار لوگ مارے گئے جبکہ 7 لاکھ 80 ہزار شدید زخمی ہوئے' اس شہر میں سات ہزار 2 سو 18 خاندان ایسے تھے جن کا کوئی فرد زندہ نہیں بچا' یہ چین کی ایک ہزار سالہ تاریخ کا دوسرا جبکہ 20 ویں صدی کا سب سے بڑا زلزلہ تھا' اس وقت ماؤزے تنگ زندہ تھے' ان کی عمر 83 سال تھی اور وہ علیل تھے لیکن وہ فوراً تانگ شان پہنچ گئے' اس وقت پوری دنیا نے چین کو امداد کی پیشکش کی لیکن ماؤزے تنگ نے امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا' ان کا کہنا تھا "قدرت نے یہ آفت صرف چین پر اتاری ہے لہٰذا اسے برداشت بھی صرف چین کرے گا" اس دور میں کسی نے ماؤزے تنگ کو مشورہ دیا' زلزلے کے باعث تانگ شان کی زمین کمزور ہو چکی ہے لہٰذا ہمیں اب اس جگہ شہر آباد نہیں کرنا چاہیے' ماؤ نے یہ مشورہ ماننے سے انکار کر دیا' انہوں نے فرمایا "ہم ٹھیک اسی جگہ ایک ایسا تانگ شان آباد

کریں گے جو پچھلے شہر سے خوبصورت اور مضبوط ہو گا" اس اعلان کے چند دن بعد 9 ستمبر 1976ء کو ماؤزے تنگ انتقال کر گئے اور ان کی جگہ کوفنگ کو چین کی کمیونسٹ پارٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا' کوفنگ سیدھے تانگ شان گئے اور انہوں نے ملبے پر کھڑے ہو کر اعلان کیا "ماؤ کے بیٹے اپنے باپ کے قول کا پاس کریں گے" ماؤ کے بیٹوں نے واقعی اپنے باپ کے قول کا پاس کیا' آج تانگ شان کا شمار چین کے چند بڑے شہروں میں ہوتا ہے' اس کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ ہے' اس میں بے شمار فلک بوس عمارتیں' فیکٹریاں' فارم ہاؤسز اور فلیٹس ہیں' دنیا آج اس شہر کو چین کا بہادر شہر (بریوسٹی آف چائنا) کہتی ہے۔

تانگ شان کی تعمیر نو بیسویں صدی کا معجزہ ہے' چینی قوم نے یہ معجزہ کیسے دکھایا یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ یہ کہانی ریلیف کے کاموں سے شروع ہوتی ہے' زلزلے کے بعد شہر میں تین قسم کے لوگ تھے ایک وہ لوگ جو زلزلے میں انتقال کر گئے' دوسرے وہ جو زخمی ہو گئے اور تیسرے وہ لوگ جو اس سانحے میں پوری طرح بچ گئے' چینی حکومت نے فوری طور پر نعشوں کو دفنا دیا' زخمیوں کو نکالا' ان کی مرہم پٹی کی اور زلزلے میں بچ جانے والوں کو ملبہ اٹھانے اور شہر کی تعمیر نو پر لگا دیا۔ دوسرا مرحلہ بحالی کا تھا' اس زلزلے میں تانگ شان کے چار لاکھ خاندان متاثر ہوئے تھے' ان متاثرین کے پاس رہنے کے لئے جگہ نہیں تھی' چینی حکومت نے متاثرہ خاندانوں کی خواتین' بچوں' بوڑھوں اور زخمیوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا' حکومت ایک خاندان کے لوگوں کو جمع کرتی' ان کے ہاتھ میں ریل کا ٹکٹ پکڑاتی اور انہیں حکم دیتی تم لوگ فلاں شہر کے فلاں محلے میں چلے جاؤ وہاں فلاں شخص تمہارا انتظار کر رہا ہے' وہ خاندان وہاں پہنچ جاتا' جس کے بعد میزبان اس خاندان کے نان نفقے کا ذمہ دار ہو جاتا' یہ میزبان رضا کار تھے' حکومت نے زلزلے کے دوسرے دن ملک بھر میں اعلان کر دیا تھا ہمارے پاس چار لاکھ متاثرہ خاندان ہیں جو لوگ متاثرین کو اپنے پاس پناہ دے سکتے ہیں وہ اپنا اپنا نام لکھوا دیں۔ لوگوں نے نام لکھوا دیئے۔ اس کے بعد انتظامیہ متاثرہ خاندان کے افراد دیکھ کر رضا کار کا تعین کرتی اور اس خاندان کو رضا کار گھرانے کے پاس بھجوا دیتی' اس سکیم کے نتیجے میں 8 ہفتوں میں تمام متاثرہ خاندان سیٹل ہو گئے' دوسری طرف حکومت نے پورے ملک سے رضا کار جمع کئے اور ان رضا کاروں کو تانگ شان سے ملبہ اٹھانے کی ذمہ داری سونپ دی' رضا کاروں نے چار ماہ میں پورا شہر صاف کر دیا۔ تیسرا مرحلہ شہر کی تعمیر نو تھی' تعمیر نو میں تانگ شان کے زندہ بچ جانے والے شہریوں نے دل و جان سے حصہ لیا۔ یوں ٹھیک ایک سال بعد تانگ شان اپنے پورے قد کے ساتھ

زمین پر کھڑا تھا' آج جو بھی شخص تانگ شان جاتا ہے وہ شہر کی خوبصورتی اور پائیداری دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور وہ یہ یقین کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتا یہ شہر کبھی موت اور نعشوں کا قبرستان تھا۔

میں نے تانگ شان کی یہ کہانی چین کی ایک کتاب میں پڑھی تھی اور جب 8 اکتوبر 2005ء کو پاکستان میں زلزلہ آیا اور بالاکوٹ سے مظفر آباد تک 25 لاکھ گھرانے اس زلزلے کا شکار ہو گئے تو مجھے فوراً تانگ شان یاد آ گیا اور میں نے سوچا ہمیں بھی تانگ شان سے سبق سیکھنا چاہیے' ہمیں چاہیے ہم پورے ملک سے ایسے خاندانوں کے نام جمع کریں جو چند ماہ کے لئے زلزلے سے متاثرہ خاندانوں کی کفالت کر سکتے ہیں' ہمارے ملک میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جن کے پاس ایک سے زائد مکان ہیں' یہ لوگ زلزلہ زدگان کی مدد بھی کرنا چاہتے ہیں اگر حکومت متاثرہ خاندانوں کو ان کے حوالے کر دے تو یہ لوگ بڑی آسانی سے سال چھ مہینے ان لوگوں کی کفالت کر سکتے ہیں' اس ضمن میں پنجاب گورنمنٹ کی مثال دی جا سکتی ہے' جناب پرویز الٰہی پنجاب میں ''ایک خاندان اپنایئے سکیم'' کا اعلان کر چکے ہیں' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے چوہدری صاحب اس سکیم کا آغاز اپنے آپ سے کریں گے' وہ اپنے گجرات اور لاہور کے گھروں میں زلزلہ زدگان کو آباد کریں گے یہ ایک قابل تقلید روایت ہے' دوسرے صوبوں میں بھی ایسی سکیمیں شروع کی جا سکتی ہیں' اسی طرح میں نے کل اخبار میں پڑھا' مانسہرہ' باغ اور راولاکوٹ میں پرائمری سکولوں کی تعمیر اور بحالی کا کام ایم کیو ایم نے اپنے ذمے لے لیا ہے' یہ بھی ایک اچھی روایت ہے۔ اس وقت پاکستان میں چھوٹی بڑی 127 سیاسی جماعتیں ہیں اگر یہ تمام سیاسی جماعتیں ایم کیو ایم کی طرح متاثرہ علاقوں کے مختلف منصوبے اپنے ذمے لے لیں' کوئی پل بنانا شروع کر دے' کوئی صاف پانی کے پلانٹ لگا دے' کوئی کالج اور ہسپتالوں کی تعمیر شروع کر دے' کوئی دس کلومیٹر سڑک اپنے ذمے لے لے' کوئی بجری لا دے' کوئی سیمنٹ لے آئے اور کوئی کھڑکیاں' دروازے فراہم کر دے تو زلزلے سے متاثرہ لوگ ایک آدھ سال میں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو سکتے ہیں۔ مظفر آباد' باغ' راولاکوٹ اور مانسہرہ کے تمام شہر' قصبے اور دیہات تعمیر ہو جائیں گے۔ ہم متاثرین کے سلسلے میں ایک اور غلطی کر رہے ہیں' ہم اس آفت میں زندہ بچ جانے والوں کو بھی امداد دے رہے ہیں' میں نے امدادی کیمپوں میں ایسے بے شمار لوگ دیکھے ہیں جنہیں زلزلے کے دوران خراش تک نہیں آئی لیکن یہ لوگ اب کیمپوں میں روٹیاں توڑ رہے ہیں' حکومت کو چاہیے وہ ان صحت مند لوگوں کو بحالی کے کاموں پر لگا دے' ان کے بچوں' خواتین اور بزرگوں کو رضا کار خاندانوں کے حوالے

کرے اور ان لوگوں کو متاثرہ دیہات میں لے جا کر امدادی سرگرمیوں پر لگا دے انہیں اپنے اپنے گھر تعمیر کرنے کی ذمہ داری سونپ دے مجھے خطرہ ہے اگر یہ لوگ اسی طرح کیمپوں میں پڑے رہے تو یہ لوگ آہستہ آہستہ بے کار ہو جائیں گے اور یہ لوگ واپس جانے سے انکار کر دیں گے۔

میں ایک بار پھر واپس تانگ شان کی طرف آتا ہوں۔ چین کی حکومت نے جب تانگ شان کی تعمیر نو کا اعلان کیا تھا تو لوگوں نے اس کا بڑا خوبصورت رسپانس دیا' انہوں نے ''ایک چینی ایک اینٹ'' کا فارمولا اپنایا' چین کے تمام شہریوں نے ایک ایک اینٹ خریدی اور یہ اینٹ اپنے خرچ پر تانگ شان پہنچا دی' صرف ایک ہفتے میں تانگ شان میں 50 کروڑ اینٹیں جمع ہو گئیں' یہی عالم سیمنٹ' بجری اور سریے کا تھا' لوگوں نے ایک ایک پاؤ سیمنٹ' ایک ایک بالٹی بجری اور ایک ایک سریا اکٹھا کیا اور تانگ شان بھجوا دیا' ہم بھی یہ کر سکتے ہیں' پچھلے ماہ تک جو لوگ کپڑے' جوتے' خیمے اور خوراک جمع کر رہے تھے وہ لوگ اب تعمیراتی سامان جمع کر سکتے ہیں' وہ لوگ سریا' بجری' سیمنٹ' اینٹیں' لکڑی' کھڑکیاں' دروازے اور فرنیچر جمع کریں' ٹرکوں میں ڈالیں اور ایک ایک گاؤں تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ یقین کیجئے صرف ایک سال میں آزاد کشمیر اور ہزارہ کے تمام متاثرہ علاقے آباد ہو جائیں گے' ہر گھر سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہوں گی اور ہر گھر میں زندگی اور ہر مکان میں خوشیاں ہوں گی' ذرا سوچئے اگر چین یہ سب کچھ کر سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے' دوسری بات پاکستان کے اس زلزلے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہم میں اور چین میں بڑا فرق ہے' چین نے 1976ء میں امداد لینے سے انکار کر دیا تھا جبکہ ہماری فوجی قیادت 2005ء میں کشکول لے کر پوری دنیا میں نکل پڑی تھی' ہم نے جھولیاں پھیلا کر لوگوں سے امداد طلب کی تھی' ہم نے ثابت کر دیا تھا ہم اخلاقی لحاظ سے بھکاری ہیں۔

# کوے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس دور میں ہٹلر نے چرچل کو پیشکش کی ”اگر اتحادی فوج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیڈل برگ اور گوٹن جن پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی“ چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیراعظم کے ایک ساتھی نے ان سے یہ آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تھی تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا تھا ”اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئی تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا“ اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت کرہ ارض پر کوئی محفوظ ترین جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی ہائیڈل برگ اور گوٹن جن لکھا گیا۔

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی افادیت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک‘ کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی

نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں' کالج اور سکول آباد رہتے ہیں ان کے لیکچر ہالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے' اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہو یا آج سے ڈیڑھ دو سو برس بعد کا زمانہ' قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی' اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 ملین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدقماش جاگیرداروں کی جاگیریں بیچ کر سکول بنانے شروع کر دیئے۔ اس دور میں مصر میں دو دو دنوں میں تین تین سکول کھولے گئے' تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے پچھلے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج چوٹی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا 70 فیصد حصہ ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد پرائمری سکولوں میں آج بھی ٹوائلٹ نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں طالبعلم اپنے ٹاٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو استاد نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے اساتذہ کا آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں استاد کی تنخواہ فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے' جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آ گئی اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈکلیئر کرنے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہمارا کمال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود دنیا فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں' ہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں' ہم لال قلعے پر جھنڈے لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں' ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں' وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جس کے صرف ایک شہر ٹوکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا ایجنڈا مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا فوکس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دے ٹیکنالوجی کی

پچاس ساٹھ نئی یونیورسٹیاں بنائے' شہروں' قصبوں اور دیہات سے چن چن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے' بھاری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے' انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی نئی پود پیدا کرے جو علم' ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو' حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے' احتساب بیورو نے ڈیفالٹروں اور لٹیروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے تھے' یہ وہ رقم ہے جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا' حکومت یہ سمجھے یہ رقم لٹیروں سے واپس نہیں ملی' وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول' کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے جن میں صرف سائنس کی تعلیم دی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آ جائے گا' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پیشکش کی تھی اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سود معاف کر دیں گے۔ حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بنیادی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟

ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں صرف وہ چیزیں اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فوائد نظر آتے ہیں لہٰذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے' کسی ایسی پالیسی کو جگہ نہیں دیتے جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ سکے' جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر نواب اکبر خان بگٹی کو موت کے گھاٹ اتارنا ہو یا تحفظ حقوق نسواں کا بل پیش کرنا ہو تو وہ دو دن لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم' روزگار' صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو دو دو سال تک فائل ہی جنم نہیں لیتی لہٰذا جس ملک' جس معاشرے میں حکومت کی ترجیحات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے چمکے گی' اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ ہم بڑے دلچسپ لوگ ہیں' کوے کے انڈوں سے ہنس نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

# دو نعشیں

زندگی میں بعض اوقات یوں ہی چلتے پھرتے کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے' کوئی ایسا حادثہ پیش آ جاتا ہے جو آپ کے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتا ہے اور پوری زندگی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا' میری زندگی میں بھی دو ایسے واقعات پیش آئے تھے جو برگد کی جڑوں کی طرح میرے شعور میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے اور میں پوری کوشش کے باوجود انہیں اپنے ذہن سے نہیں جھٹک سکا۔



پہلا واقعہ 2001ء میں پیش آیا' ان دنوں حکومت اخبارات میں انتہائی مطلوب مجرموں کے بارے میں ایک اشتہار شائع کرایا کرتی تھی' اس اشتہار میں سب سے اوپر ایک نوجوان کی تصویر ہوتی تھی' یہ نوجوان حکومت کو دہشت گردی کی بے شمار وارداتوں میں مطلوب تھا' حکومت نے اس کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر رکھی تھی' یہ نوجوان اس وقت افغانستان میں روپوش تھا اور اس کی وجہ سے پاکستان میں شدید قسم کی فرقہ وارانہ کشیدگی پائی جاتی تھی' یہ نوجوان بعد ازاں گرفتار ہوا اور ایک پولیس مقابلے میں جاں بحق ہو گیا' اس نوجوان نے ایک رات مجھے فون کیا اور مجھ سے درخواست کی' آپ حکومت تک میری ایک اپیل پہنچا دیں' میں نے پوچھا "کیا؟" اس نے کہا "اگر حکومت یہ وعدہ کرے وہ ہمیں پولیس مقابلے میں نہیں مارے گی' وہ ہمیں عدالت میں پیش ہونے اور اپنے اوپر لگائے گئے تمام الزامات کی صفائی کا موقع دے گی تو ہم لوگ

گرفتاری دینے کیلئے تیار ہیں‘‘ میں نے اس سے وعدہ کیا میں ان کی یہ پیش کش حکومت کے کسی اعلیٰ عہدیدار تک پہنچا دوں گا‘ اس کے بعد میں نے اس سے وہ سوال پوچھا جو عموماً ایسی صورتحال میں میرے جیسے لوگ پوچھا کرتے ہیں‘ میں نے اس سے پوچھا ’’وہ کیا وجہ تھی جس نے ایک عام سے نوجوان کو اتنا بڑا دہشت گرد بنا دیا‘‘ اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ’’نواز شریف کے پہلے دور میں حکومت نے بیروزگار نوجوانوں کو چھوٹے قرضے دینے شروع کئے تھے‘ میں ان دنوں غربت اور بے روزگاری کے انتہائی دور سے گزر رہا تھا‘ میں نے پچاس ہزار روپے کے قرضے کیلئے اپلائی کیا‘ میرا خیال تھا‘ میں اس رقم سے چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر لوں گا‘ میں پورا سال اس قرضے کے پیچھے خوار ہوتا رہا لیکن مجھے قرضہ نہ ملا آنے والے دنوں میں غربت‘ بے روزگاری‘ مذہبی شدت پسندی اور حکومتی رویے مجھے اس طرف لے آئے‘ میں دہشت گرد مشہور ہو گیا‘‘ میں نے اس کی بات پر افسوس کیا‘ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا ’’افسوس کی بات تو آگے آئے گی‘ جس حکومت نے مجھے 50 ہزار روپے قرضہ نہیں دیا تھا آج اسی حکومت نے میرے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر رکھی ہے‘‘ اس نے ان الفاظ کے ساتھ ہی فون بند کر دیا لیکن وہ الفاظ اس کا لہجہ اور اس کے لہجے کی تلخی آج تک میرے ذہن میں تازہ ہے‘ مجھے ہر روز کسی نہ کسی وقت اس کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں ہم وہ لوگ ہیں جو کسی بے روزگار کو 50 ہزار روپے قرض نہیں دیتے لیکن بعد ازاں اسی کے سر کی قیمت ایک کروڑ روپے مقرر کر دیتے ہیں۔



دوسرا واقعہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے‘ میں ایک دوست کے دفتر میں بیٹھا تھا‘ ایک درمیانی عمر کا بیمار شخص وہاں آیا‘ کرسی پر بیٹھا‘ پانی کا گلاس مانگا‘ پانی پیا اور اس کے بعد درخواست کی‘ میں بے روزگار ہوں‘ میرے پانچ چھ بچے ہیں‘ گھر میں دو تین دن سے فاقے ہیں‘ مجھے کوئی ایسی نوکری چاہیے جس سے میں بال بچوں کا پیٹ پال سکوں‘ میرے دوست نے اس سے فوراً معذرت کر لی‘ میرے دوست کا کہنا تھا‘ اس کا چھوٹا سا کاروبار ہے جس میں کسی نئے ملازم کی گنجائش نہیں‘ اجنبی نے منت کرنے کے انداز میں چند فقرے بولے لیکن میرے دوست نے اس سے سخت لہجے میں معذرت کر لی‘ وہ شخص اٹھا اور چپ چاپ باہر چلا گیا‘ چند لمحے بعد میرے دوست کا نوکر بھاگتا ہوا اندر آیا اور ہانپتے ہوئے بولا ’’ابھی ابھی جو شخص باہر نکلا تھا وہ دفتر کی دہلیز پر بے ہوش پڑا ہے‘‘ ہم لوگ گھبرا کر باہر نکلے‘ وہ شخص حقیقتاً دہلیز پر گرا پڑا تھا‘ ہم نے اسے اٹھایا لیکن وہ اس وقت تک مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا‘ وہ فوت ہو چکا تھا‘ دفتر کے سامنے مجمع لگ گیا‘ ہم نے پولیس کو بلایا‘ نعش کو ہسپتال

لے کر گئے' ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد موت کی وجہ دل کا دورہ قرار دیا' ہم نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی' اندر سے تین چار روپے کی ریزگاری اور ایک چھوٹی سی ڈائری نکلی' ہم نے اس ڈائری کی مدد سے اس کا پتہ تلاش کیا' وہ راولپنڈی کے نالہ لئی کے کنارے ایک کمرے کے مکان میں رہتا تھا' ہم جب اس کی نعش لے کر اس کے گھر پہنچے تو پتہ چلا واقعی اس گھر کا چولہا بجھے ایک ہفتہ ہو چکا تھا' میرے دوست نے اسی وقت دفتر سے پچاس ہزار روپے منگوائے اور بیوہ کی ہتھیلی پر رکھ دیئے' وہ دن ہے اور آج کا دن ہے میرا دوست اس گھرانے کو پانچ ہزار روپے ماہانہ دے رہا ہے' میں جب بھی اس سے ملتا ہوں' میں اس سے کہتا ہوں' ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں' ہم نے اس شخص کو دو تین ہزار روپے کی نوکری نہیں دی لیکن ہم اس کے یتیم بچوں کو ہر مہینے پانچ ہزار روپے دے رہے ہیں' اگر ہم اس وقت اس کی حالت پر غور کر لیتے تو شاید اس کی جان بچ جاتی' شاید اس کے بچے یتیم نہ ہوتے' میرا دوست اس وقت اپنے آنسو پونچھتا ہے اور ڈوبی ہوئی آواز میں کہتا ہے' "میں پانچ ہزار میں ایک زندگی خرید سکتا تھا لیکن میں نے پچاس ہزار روپے دے کر ایک نعش خرید لی۔"

ایک کروڑ روپے کی گردن کا مالک وہ نوجوان اور 50 ہزار کی یہ نعش آج تک میرے کندھے پر پڑی ہے' میں روز یہ نعش اٹھا کر اس معاشرے میں پھرتا ہوں' میں روز کسی ایسے قبرستان کی تلاش میں نکلتا ہوں جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں' جہاں میں یہ بوجھ اتار سکوں لیکن مجھے اس ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی' مجھے زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا نہیں ملتا جہاں میں یہ دونوں نعشیں پھینک کر آؤں' جہاں میں ان دونوں کو دفن کر سکوں۔

# لوگ بھی ضروری ہیں

مریم کا سر چکرایا‘ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملیں‘ گردن کو جھٹکے دیئے لیکن چکر ختم نہ ہوئے‘ وہ آہستہ آہستہ ایک جانب جھکتی چلی گئی یہاں تک کہ فرش پر گر گئی۔ مریم کا سکول بھی مہنگا تھا اور اس سکول میں پڑھنے والے بچے بھی امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا ایسے سکول میں کسی بچی کا بے ہوش ہو جانا خطرے سے خالی نہیں تھا‘ انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے‘ پرنسپل سے لے کر چپڑاسی تک سب مریم کی کلاس میں جمع ہو گئے‘ ایمبولینس منگوائی گئی‘ بچی کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا‘ بچی کے والدین بھی ہسپتال پہنچ گئے‘ مریم تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ گئی لیکن ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ جاری رکھا‘ شام کو خون کی رپورٹس آئیں تو پتہ چلا ساڑھے چار سال کی مریم بلڈ کینسر کی مریضہ ہے‘ مریم کی والدہ غش کھا کے گر گئی اور والد ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ مریم کے والد محمود صاحب قالینوں کے بہت بڑے تاجر ہیں‘ مریم محمود صاحب کی واحد اولاد تھی‘ محمود صاحب نے مریم کا علاج شروع کرا دیا‘ وہ اسے امریکہ تک لے کر گئے لیکن مریم کی سانسیں مختصر تھیں‘ مریم پچھلی جنوری میں انتقال کر گئی‘ ایک کہانی یہاں ختم ہو گئی‘ دوسری کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے‘ محمود صاحب کو جون میں امریکہ سے ایک خط موصول ہوا‘ یہ خط اس ہسپتال کی انتظامیہ نے لکھا تھا جس میں مریم زیر علاج رہی تھی‘ خط میں محمود صاحب اور بیگم صاحبہ کے خون کی رپورٹس تھیں اور ان رپورٹس کی روشنی میں ہسپتال انتظامیہ نے ان کو مشورہ دیا تھا ”آپ دونوں کے

خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جن کے ملاپ سے بلڈ کینسر پیدا ہوتا ہے' ہمیں خدشہ ہے آپ کے ہاں جو بھی بچہ پیدا ہوگا اسے بلڈ کینسر ہوگا چنانچہ آپ اس ضمن میں احتیاط کریں'' محمود صاحب کیلئے یہ ایک ''شاکنگ'' خبر تھی' انہوں نے پاکستان کی تین چار بڑی لیبارٹریوں سے ٹیسٹ کرائے سب لیبارٹریوں نے امریکی رپورٹ کی تصدیق کر دی' محمود صاحب آج کل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں' ان کا کہنا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ بچے دیے ہوتے تو آج تک ان کا سینہ بچوں کا قبرستان بن چکا ہوتا' وہ بچوں کی اموات کا دکھ سہتے سہتے فوت ہو چکے ہوتے۔

پاکستان میں اس وقت محمود صاحب جیسے لاکھوں والدین ہیں' جو لاعلمی کی وجہ سے اپنے بچوں کو موت کا تحفہ دے دیتے ہیں اور ان کے بچے آنکھ کھولتے ہی موت کی طرف سفر شروع کر دیتے ہیں' میڈیکل سائنس کے مطابق دنیا کا ہر مرد ہر عورت اور ہر عورت ہر مرد کیلئے ''سوٹ ایبل'' نہیں ہوتی' بعض مردوں کے خون میں ایسے کیمیکل پائے جاتے ہیں جو مخصوص کیمیکل کی حامل خواتین کے جسم میں پہنچ کر خوفناک بیماری کی شکل اختیار کر جاتے ہیں' یہ امراض بعد ازاں بچوں میں منتقل ہو جاتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے پاکستان کے پانچ فیصد بچے تھیلیسیمیا کا شکار ہوتے ہیں یا پھر ان میں شکار ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں' تھیلیسیمیا کی وجوہات خالصتاً موروثی ہوتی ہیں' کینسر کی وجہ بھی والدین کے جینز ہوتے ہیں' اگر ماں اور باپ دونوں میں کینسر کے جینز موجود ہیں تو بچے میں کینسر کے امکانات بڑھ جاتے ہیں' اسی طرح اس وقت دنیا میں ایڈز' ہیپا ٹائٹس' ٹی بی اور سفلس سمیت بے شمار ایسے امراض ہیں جو عورت سے مرد اور مرد سے عورت کو لگ جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں' یہ بیماریاں آگے چل کر دوسری اور تیسری نسل کو منتقل ہو جاتی ہیں' اسی طرح جسمانی معذوری' پاگل پن' نفسیاتی بیماریوں اور منفی سماجی رویوں کا تعلق بھی عورت اور مرد کی ''فارمیشن'' سے ہوتا ہے' اگر میاں بیوی میں کوئی جسمانی' نفسیاتی یا ذہنی عیب موجود ہو تو وہ عیب کسی نہ کسی شکل میں اگلی نسل میں منتقل ہو جائے گا' اسی لئے میڈیکل سائنس ''کزن میرج'' کے خلاف ہے' امریکہ نے آج سے 70 برس پہلے قانون بنایا تھا امریکہ میں جو بھی شخص شادی کرے گا وہ پہلے اپنا میڈیکل ٹیسٹ کرائے گا' یہ قانون اس وقت امریکہ کی 9 ریاستوں میں موجود ہے اور اسے ''Premarital Certificate'' کہا جاتا ہے' اس قانون کے تحت امریکہ میں شادی کا خواہش مند ہر جوڑا اپنا خون ٹیسٹ کراتا ہے' یہ ٹیسٹ بعد ازاں ٹاؤن کمیٹی میں جمع کرا دیا جاتا ہے' یہ سرٹیفکیٹ صرف 65 دنوں تک کارآمد رہتا ہے' اگر

اس دوران شادی نہ ہو تو جوڑے کو دوبارہ ٹیسٹ کرانا پڑتا ہے' اس ٹیسٹ کی وجہ سے نہ صرف امریکہ کا ہیلتھ بجٹ کم ہو گیا بلکہ وہاں بے شمار موروثی اور متعدی امراض بھی ختم ہو گئے' امریکہ کے بعد اب یورپ' مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں بھی شادی سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ کا قانون لاگو ہو چکا ہے۔

پاکستان کا شمار اس وقت دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں ایڈز' ہیپاٹائٹس بی اور سی' ٹی بی اور تھیلیسیمیا تیزی سے پھیل رہے ہیں' ان امراض کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ شادی ہے' اگر شادی سے پہلے نوجوانوں کا میڈیکل ٹیسٹ ہو جائے تو بے شمار لوگ ان امراض سے بچ سکتے ہیں اور یوں ہماری اگلی نسل زیادہ صحت مند اور شاندار ہو سکتی ہے' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے پچھلے دنوں پاکستان کی ایک بڑی پرائیویٹ یونیورسٹی کے ایم بی اے ڈیپارٹمنٹ کے طالبعلموں کا طبی معائنہ ہوا' کلاس میں 70 طالب علم تھے' ان 70 طالبعلموں میں سے 7 طالب علم ہیپاٹائٹس کے مریض نکلے' ان طالب علموں کو اپنی بیماری کا علم تک نہیں تھا' یہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کی صرف ایک کلاس کی صورتحال تھی' آپ باقی معاشرے کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں' میری حکومت سے درخواست ہے اگر پاکستان میں بھی ایسا قانون بن جائے تو محمود صاحب جیسے لاکھوں لوگ تباہ ہونے سے بچ سکتے ہیں' پاکستان میں شادی بیاہ کی رسموں پر ہر سال اربوں روپے ضائع ہوتے ہیں' ہم لوگ مایوں' مہندی' چراغاں اور آتش بازی پر بھی کروڑوں روپے لگا دیتے ہیں اگر ہم ان اخراجات میں میڈیکل ٹیسٹ کو بھی شامل کر لیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن اس کا ہماری قومی اور سماجی زندگی پر بڑا اچھا اثر پڑے گا' آج کل اچھی لیبارٹریاں خون کی سکریننگ کیلئے تین سو روپے لیتی ہیں اور ہیموگلوبن کے ٹیسٹ (اسے میڈیکل زبان میں ELECTRO PHRESIS کہتے ہیں) چار سو روپے میں ہو جاتے ہیں لہٰذا صرف 700 روپے میں ہماری اگلی نسل کا مستقبل محفوظ ہو سکتا ہے' میری حکومت سے درخواست ہے وہ کالا باغ جیسے بڑے بڑے ایشوز کے ساتھ ساتھ ایسے چھوٹے چھوٹے ایشوز پر بھی توجہ دے' ان ایشوز سے کروڑوں لوگوں کو فائدہ ہو سکتا ہے' ڈیم بہت ضروری ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ لوگ بھی ضروری ہوتے ہیں کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو ملک میں ڈیم تو بن جائیں لیکن ان ڈیموں سے فائدہ اٹھانے والے لوگ نہ بچیں۔

# بیڈ کوالٹی پرائس

پروفیسر صاحب بہت دکھی تھے' انہیں دکھی ہونا بھی چاہیے تھا' آپ خود سوچئے آپ پی ایچ ڈی ہوں یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوں' علم آپ کا اوڑھنا بچھونا ہو' لوگ آپ کی باتیں سننے آپ سے علم حاصل کرنے آتے ہوں لیکن ایک شام دو پولیس کانسٹیبل آپ کو سڑک کے کنارے کھڑا کریں اور آپ کی عزت نفس کو بوٹوں تلے روند ڈالیں' آپ احتجاج کریں تو وہ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں آپ کو گالیاں دیں' آپ کے کپڑے پھاڑ دیں اور آپ کے بازو مروڑیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا' آپ خود کو بے بس اور لاچار محسوس نہیں کریں گے؟ یقیناً آپ کے جذبات بھی وہی ہوں گے جو اس وقت پروفیسر صاحب کے تھے۔

میں نے ان سے عرض کیا "میں آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن میرا خیال ہے آپ اس سلوک کے مستحق تھے' آپ کے ساتھ وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہیے تھا" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے ان سے پوچھا "پروفیسر صاحب آپ نے گھر کیلئے پنکھا خریدنا ہو تو آپ کس کمپنی کو فوقیت دیں گے" پروفیسر صاحب نے کسمسا کر جواب دیا "ظاہر ہے میں اچھی کمپنی کو فوقیت دوں گا' میں ایسا پنکھا خریدوں گا جو کارکردگی میں اچھا اور دیرپا ہوگا" میں نے ہاں میں گردن ہلائی "اگر آپ اس کی جگہ ایک سب سٹینڈرڈ پنکھا خریدتے ہیں تو اس کا کیا نقصان ہوگا" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا "میرے پورے گھر کی وائرنگ جل جائے گی' میرا فریج' میرا

ٹی۔وی اور میری دوسری اشیاء برباد ہو جائیں گی یا پھر میں اس پنکھے کو اٹھا کر الیکٹریشنوں کی دکانوں کے چکر لگا تا رہوں گا" میں بھی مسکرایا اور میں نے ان سے پوچھا "اکنامکس کی زبان میں اس نقصان کو کیا کہتے ہیں" انہوں نے فوراً جواب دیا "بیڈ کوالٹی پرائس" میں نے قہقہہ لگایا "پروفیسر صاحب ہماری پولیس بیڈ کوالٹی پراڈکٹ ہے جس کی پرائس پورے معاشرے کو کسی نہ کسی شکل میں ادا کرنا پڑ رہی ہے" پروفیسر صاحب نے ذرا سا سوچا اور پھر غیر یقینی لہجے میں بولے "کیا تم اس کی مزید وضاحت کرو گے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "کیوں نہیں! فرض کریں آپ کے گھر میں پچاس لاکھ روپے نقد ہیں اور تیس چالیس لاکھ روپے کے زیورات پڑے ہیں' اس گھر میں آپ اور آپ کے بچے بھی رہتے ہیں لیکن آپ ان سب کی حفاظت کیلئے ایک کمزور' بے وقوف اور سست چوکیدار رکھ لیتے ہیں' آپ اس چوکیدار کو صرف 2 ہزار روپے ماہانہ دیتے ہیں' اس شخص کو اس دو ہزار روپے میں اپنی رہائش کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے' اپنے کھانے پینے اور آنے جانے کا بندوبست بھی کرنا پڑتا ہے اور اپنے لئے وردی اور جوتے بھی لینا پڑتے ہیں آپ بتائیے وہ شخص کیا کرے گا؟ کیا وہ شخص پورے خلوص سے آپ کے مال اور جان کی حفاظت کرے گا؟" پروفیسر صاحب نے انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا "آپ کی حفاظت تو رہی دور ہو سکتا ہے وہ شخص ایک روز آپ ہی کو لوٹ لے' اس کے برعکس اگر آپ ایک ماہر جوان اور پڑھا لکھا گارڈ رکھتے ہیں' اسے اس کی ضرورت کے مطابق تنخواہ دیتے ہیں' اسے کھانا' وردی اور ہتھیار دیتے ہیں اور اسے رہائش کیلئے مناسب جگہ دیتے ہیں تو وہ بڑے خلوص کے ساتھ آپ اور آپ کے مال کی حفاظت کرے گا اور آپ زیادہ سکون اور آرام سے سو سکیں گے"



پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر دھیمے لہجے میں بولے "لیکن اس سارے فلسفے کا میرے مسئلے کے ساتھ کیا تعلق" میں نے عرض کیا "پروفیسر صاحب اس کا بڑا گہرا تعلق ہے' پولیس حکومتی اداروں میں سب سے اہم اور با اثر محکمہ ہوتا ہے' یہ وہ واحد ڈیپارٹمنٹ ہے جس کا پندرہ کروڑ لوگوں اور پندرہ بلین ڈالرز مالیت کی حکومت کے ساتھ روزانہ رابطہ رہتا ہے' پولیس کسی بھی ملک کی مالیاتی' قانونی' سماجی' ثقافتی' سیاسی اور اخلاقی دولت کی محافظ ہوتی ہے لہٰذا اس کا انتخاب' اس کی ٹریننگ' اس کی سہولتیں اور اس کی مراعات کا تعین سائنسی بنیادوں پر ہونا چاہیے' پولیس کی تنخواہیں ملک کے تمام دوسرے اداروں سے زیادہ ہونی چاہئیں' ان کے پاس وزیراعظم اور صدر سے زیادہ جدید گاڑیاں اور انتہائی شاندار رہائش گاہیں ہونی چاہئیں' ان کی تعلیم

اور تربیت تمام دوسرے اداروں سے بہتر اور معیاری ہونی چاہیے لیکن بدقسمتی سے ہم پاکستان میں تین بلین ڈالر سے گوادر پورٹ تو بنا دیتے ہیں لیکن اس کی حفاظت کی ذمہ داری ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ کے ایس ایچ او کو سونپ دیتے ہیں' ہم اس ملک میں تعلیم بھی عام کر رہے ہیں' ہم اس ملک میں 50 ہزار پی ایچ ڈی بھی پیدا کر رہے ہیں' ہم دنیا جہان کے سرمایہ کاروں کو اس ملک میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دے رہے ہیں لیکن ہم ان سرمایہ کاروں' ان پی ایچ ڈی ڈاکٹروں اور ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی حفاظت کا بندوبست نہیں کر رہے' ہم ان لوگوں کی عزت نفس کی حفاظت کی پلاننگ نہیں کر رہے' ہم اس ملک کو انڈسٹریل سٹیٹ بھی بنانا چاہتے ہیں' ہم اس ملک کو دہشت گردی سے بھی پاک کرانا چاہتے ہیں' ہم اسے اعتدال پسند اور روشن خیال بھی بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا اس ساری روشن خیالی' اس ساری آزادی اور اس ساری انڈسٹری کی حفاظت کون کرے گا؟ کیا ساڑھے تین ہزار روپے لینے والے اے ایس آئی یا جون جولائی کی گرمی میں جلنے والے پولیس کانسٹیبل میں اتنی اہلیت ہے؟ ہم نے کبھی یہ سوچا؟"

پروفیسر صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا اور پوچھا "پھر اس کا حل کیا ہے!" میں نے قہقہہ لگایا "آپ چولستان میں پتھر کا ایک ایسا گھر بنائیں جس میں کوئی روشن دان' کوئی کھڑکی نہ ہو لیکن ساتھ ہی آپ اس کے اندر داخل ہونے سے پہلے یہ خواہش کریں اس کا ماحول سوئٹزر لینڈ جیسا ہو تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ اس وقت آپ کے پاس دو آپشن ہوں گے' آپ چولستان سے نکل کر سوئٹزر لینڈ چلے جائیں یا پھر پتھر کے اس مکان کے اندر ان سارے آلات' ان ساری سہولتوں کا بندوبست کریں جو آپ کو سوئٹزر لینڈ کا ماحول فراہم کریں' اگر آپ اس ملک میں عزت نفس' وقار اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو پولیس کو وہ ساری سہولتیں دینا پڑیں گی جو امریکہ' یورپ اور مشرق بعید میں حاصل ہیں' اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو پھر آپ اسی طرح بیڈ کوالٹی پرائس پے کرتے رہیں گے" پروفیسر صاحب نے مسکرا کر میری اس بات سے بھی اتفاق کیا لیکن پھر پوچھا "اس کیلئے رقم کہاں سے آئے گی' حکومت کے پاس تو پیسے ہی نہیں ہیں" میں نے قہقہہ لگایا "اگر حکومت گوادر پورٹ بنا سکتی ہے' اس کے پاس انٹرنیشنل سطح کے ائیر پورٹس بنانے کیلئے رقم ہے' اگر وہ 80 ارب روپے کا موٹر وے بنا سکتی ہے تو وہ پولیس پر بھی پانچ دس ارب روپے لگا سکتی ہے' اگر آپ چار پانچ کھرب سے کالا باغ ڈیم بنا سکتے ہیں تو آپ اس مشینری پر دو چار ارب روپے کیوں نہیں لگاتے جس نے آنے والے دنوں میں اس ڈیم کی حفاظت کرنی ہے' اگر آپ اس

معاشرے کو روشن خیال اور اعتدال پسند بنانے کیلئے دس بیس ارب روپے خرچ کر سکتے ہیں تو آپ اس ادارے پر چار پانچ ارب روپے کیوں نہیں لگا سکتے جس نے کل کو اس روشن خیالی اور اس اعتدال پسندی کی حفاظت کرنی ہے' پروفیسر صاحب ہم عجیب لوگ ہیں' ہم پانچ کروڑ روپے کا گھر تو بنا لیتے ہیں لیکن ہم چوکیدار کو صرف اڑھائی ہزار روپے دیتے ہیں" میں رکا اور پھر آہستہ آواز میں کہا" جب تک ہم گھر کی مالیت اور چوکیدار کی تنخواہ میں توازن قائم نہیں کرتے ہم لوگ اس وقت تک اسی طرح بیڈ کوالٹی پرائس پے کرتے رہیں گے' ہم اسی طرح سڑکوں پر پولیس کے ہاتھوں مار کھاتے رہیں گے ہم اسی طرح کانسٹیبلوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہیں گے"

# ماہ نور بنام مملکت خداداد

یہ 18 فروری کی شام تھی' لیاقت علی قریشی اچھرہ سے اپنی ساس کے گھر سے نکلا' اس کی موٹر سائیکل پر چار لوگ سوار تھے' اس کے پیچھے اس کی بیگم فوزیہ بیٹھی تھی اس کے آگے اس کی بڑی بچی تھی اور سب سے آگے تین سال کی ماہ نور بیٹھی تھی' یہ لوگ فیروز پور روڈ پر پہنچے تو اچانک ماہ نور نے چیخ ماری' لیاقت علی قریشی گھبرا گیا' اس نے آگے جھک کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیر چھا گیا' ماہ نور کی گردن کے ساتھ ڈور لپٹی تھی اور اس کی شہ رگ سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے' لیاقت علی قریشی نے ڈور ہٹانے کی کوشش کی' موٹر سائیکل غیر متوازن ہوئی اور وہ چاروں سڑک پر گر گئے' لیاقت علی قریشی' اس کی بیگم فوزیہ' بڑی بیٹی اور ماہ نور کو شدید چوٹیں آئیں' لیاقت قریشی نے فوراً ماہ نور کو جھولی میں اٹھایا' سڑک کے کنارے بیٹھا اور رونا شروع کر دیا' بچی کا نصف گلا کٹ چکا تھا' حلق سے خون کی آبشاریں بہہ رہی تھیں' لیاقت علی قریشی کے گریبان سے لے کر دامن تک خون ہی خون تھا' بچی کو سروسز ہسپتال لے جایا گیا' ڈاکٹروں نے ماہ نور کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن بچی کا کٹا ہوا گلا سیا نہ جا سکا' ماہ نور نے ہسپتال کے بیڈ پر جان دے دی۔

یہ بچی بسنت کا آغاز تھی' میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا' بھارت میں ایک ایسا فرقہ موجود ہے جو اپنے تہواروں کا آغاز معصوم بچوں کے خون سے کرتا تھا' اس عمل کو وہ بلی چڑھانا کہتے تھے' ماہ نور کا خون ہمارے ملک کے سب سے شاندار اور خوبصورت ترین تہوار کا آغاز ہے' ہم

لوگ ہر سال اس تہوار کا آغاز بچوں کے خون سے کرتے ہیں اور مختلف عمروں کے دس پندرہ لوگوں کی قربانی دے کر اس تہوار کو نقطہ انجام تک پہنچاتے ہیں' یہ بڑی خوشی کی بات ہے ہم نے اس سال بھی نہ صرف یہ روایت نبھائی بلکہ اس روایت کی جڑوں کو ماہ نور کا خون دے کر اسے اپنے لئے نیک شگون بنالیا' میری حکومت سے درخواست ہے وہ ماہ نور کی اس قربانی کو ''آمین'' کا حصہ بنا لے' وہ اس ملک میں قانون پاس کر دے ہم ہر سال فروری میں ماہ نور جیسی ایک بچی کی قربانی دیا کریں گے اور اس کے بعد جب تک جشن بہار کا تہوار جاری رہے گا' ہم روز صبح شام اس تہوار کو بچوں کا لہو پلاتے رہیں گے۔ ہم اسے روز دس بیس بچوں کی قربانی پیش کریں گے لیکن ذرا رکئے ماہ نور ہم سے اپنا جرم پوچھ رہی ہے' وہ ہمارا ہاتھ تھام کر ہم سے پوچھ رہی ہے اس کا قصور کیا تھا!

ماہ نور کے چار جرائم تھے ایک وہ ایسے ملک میں پیدا ہوئی تھی جس میں تفریح انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے' جس میں قانون اور انصاف نام کی کوئی چیز نہیں۔ دو، وہ لیاقت علی قریشی کے گھر پیدا ہوئی تھی' اس موٹر سائیکل سوار لیاقت علی قریشی کے گھر جو اسے پچاس ساٹھ لاکھ کی گاڑی میں بٹھا کر اس کی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا' تین، جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اسے گلا، شہ رگ اور شہ رگ میں خون کی نالی دے دی تھی اور چار' وہ پاکستان کے کسی فیصلہ ساز شخص کی بیٹی نہیں تھی' وہ ایک عام بے بس اور بے کس انسان کی بچی تھی اور یہ حقیقت ہے اس ملک کے عام بے کس اور بے بس لوگوں کے بچے قربانی کے جانور ہوتے ہیں اور یہ نظام' یہ سسٹم اور یہ معاشرہ ان کی قربانی بچپن میں قبول کر لے یا پھر بالغ ہونے کے بعد انہیں بے روزگاری' لاقانونیت' دہشت گردی اور منشیات کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا دے' ماہ نور بھی ان بچوں میں سے ایک بچہ تھی اور یہ اس معاشرے کا اس بچی پر خصوصی کرم تھا اس نے صرف تین سال کی عمر میں اس کی قربانی قبول کر لی۔ اسے دنیا کے دکھوں سے آزاد کر دیا۔

دنیا کی ہر دوڑ کے پیچھے ایک ہاتھ ہوتا ہے' یہ حقیقت ہے جب پتنگ ہوا میں لہراتی ہے تو ڈور والے ہاتھ اس کی منزل کا تعین نہیں کر سکتے اور یہ بھی حقیقت ہے جب پتنگ کٹتی ہے تو ہاتھوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا ان کی بے مہار ڈور اب کس کس کا گلا کاٹے گی' اس ڈور کی دھار پر کون کون سی ماہ نور آئے' اس دھار سے ٹپکتا ہوا لہو کس کس لیاقت علی قریشی کا دامن بھگوئے گا' یہ کس کس کے خواب' کس کس کے ارمان اور کس کس کی خواہشوں کی شہ رگ کاٹے گی' یہ کتنے لوگوں کو زندگی کے دکھوں سے آزاد کر کے واپس لوٹے گی اور یہ دوبارہ اڑنے کے بعد کس کس کی مانگ' کس کس کی گود

اجاڑ دے گی' دنیا ہو سکتا ہے ان ہاتھوں کو مورد الزام ٹھہرائے' وہ ان نوجوانوں کو الزام دے جو چھتوں' مٹیوں اور دیواروں پر چڑھ کر پتنگیں اڑاتے ہیں لیکن میں ان نوجوانوں کو بے گناہ سمجھتا ہوں' میرا خیال ہے ڈور کے سرے ہمارے نظام' ہمارے قانون اور ہماری حکومتوں کے ہاتھوں تک جاتے ہیں' ان کے ایک سرے پر ماہ نور جیسی بچیاں ہوتی ہیں اور دوسرے سرے پر ہماری حکومتیں' ہماری عدالتیں' ہمارا قانون اور ہمارا نظام ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے ہماری حکومتوں' ہمارے نظام کے ہاتھوں پر دستانے چڑھے ہیں' یہ بینائی سے محروم ہے' اس کے کانوں تک آواز نہیں پہنچتی اور اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نصب ہے۔ میں نے بڑے عرصے پہلے اپنے ایک بزرگ سے پوچھا تھا قدرت' دو دو تین تین سال کے بچوں کو گٹروں میں گرا دیتی ہے اور انہیں سڑکوں اور ریلوے ٹریکس پر مروا دیتی ہے' قدرت کو اتنے چھوٹے بچوں سے کیا دشمنی ہوتی ہے' وہ ان پر اتنا ظلم کیوں کرتی ہے' میرے بزرگ نے مسکرا کر جواب دیا تھا' انسان کا سب سے بڑا اثاثہ اس کے بچے ہوتے ہیں' قدرت یہ اثاثہ چھین کر انسان کو یہ سبق دیتی ہے تمہارے مین ہولز کے ڈھکن غائب ہیں' تمہاری سڑکیں اور تمہاری ریل گاڑیاں غیر محفوظ ہیں' تمہارا قانون نامکمل ہے' تمہارے انصاف کا نظام پوری طرح کام نہیں کر رہا اور تمہاری حکومتیں ظالم ہیں اور اگر تم نے اور تمہاری نسلوں نے اس ملک' اس معاشرے میں رہنا ہے تو تمہیں اپنی حکومتوں' اپنی عدالتوں' اپنے قانون' اپنی سڑکوں اور اپنے مین ہولز کو ٹھیک کرنا ہوگا' قدرت اس کو بتاتی ہے اگر تم نے ان چیزوں پر توجہ نہ دی تو تم اپنی نسلیں کھو دو گے' تم بے اولاد مر جاؤ گے۔

ماہ نور کی تصویر میرے سامنے پڑی ہے' اس کا گلہ روئی میں لپٹا ہوا ہے' اس کی آنکھیں بند ہیں' اس کے سر پر کفن کا کونہ لپٹا ہے اور اس کے چہرے پر بے شمار سوال ہیں' یہ سوال اس مملکت خداداد کے نام ایک عرضی' ایک درخواست' ایک استغاثہ' ایک اپیل اور ایک رٹ ہیں' ہم سب لوگ' اس ملک میں رہنے والے ہم 16 کروڑ لوگ ماہ نور کے مجرم ہیں۔ صدر پرویز مشرف سے لے کر بائیس روپے روزانہ کے مزدور عبدالکریم تک سب اس بچی کے مجرم ہیں' یہ بچی اپنا استغاثہ کفن پر لکھ کر اس منصف کی عدالت میں حاضر ہو گئی ہے جو اس کائنات کا سب سے بڑا جج ہے' جو اس کائنات کی ساری شہ رگوں کا خدا ہے اور جس نے انسان کے ہاتھ میں قلم اور کتاب پکڑانے سے پہلے اس کتاب' اس قلم کی قسم کھائی تھی' جو عادل ہونے پر فخر کرتا ہے اور جس کا کہنا ہے میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور یہ وہ شہ رگ ہے جو 18 فروری کو فیروز پور روڈ پر کٹ گئی

تھی۔

ماہ نور کا مقدمہ اللہ کی عدالت میں دائر ہو چکا ہے' مجھے یقین ہے اگر اس بچی کا کفن میلا ہونے سے پہلے انسانوں کی عدالت نے اس استغاثہ کا فیصلہ نہ کیا تو اللہ اس رٹ کا فیصلہ دے دے گا' اللہ اس بچی کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دے گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا میں دجلہ کے کنارے پڑے کتوں کی پیاس تک کا ذمہ دار ہوں' میرے اس ملک کے حکمران بتائیں یہ تین سال کی ماہ نور کس کی ذمہ داری تھی' اس کا خون کس کی گردن پر تحریر ہوتا ہے؟ خدا کیلئے خدا کے عذاب سے ڈرو' خدا کیلئے انسانوں کے خون سے نہ کھیلو' انسانوں کے رب سے نہ کھیلو۔

# پروین بنام ابرار الحق

مجھے پروین نے چند روز پہلے لاہور سے پچاس روپے کا نوٹ بھجوایا' میں نے یہ نوٹ اپنی میز پر رکھ دیا اور میں اس دن سے یہ نوٹ اٹھا کر دیکھتا ہوں اس کے ساتھ پہنچا خط پڑھتا ہوں اور میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں اس بچی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمہ دار کون ہے اور وہ کون سا شخص' کون سا ادارہ ہے جو اس بچی کے دل پر مرہم رکھے گا' جو اس کے ساتھ انصاف کرے گا' جو اس کی عزت بحال کرے گا' مجھے سمجھ نہیں آتی اس بچی کے ساتھ ہونے والے ظلم کا ذمہ دار ابرار الحق ہے' ہماری حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی ہے یا پھر بے حسی کی گہری نیند میں سویا ہوا یہ پورا معاشرہ اور میں یہ بھی تعین نہیں کر پاتا اس بچی کے آنسو ابرار الحق پونچھے گا' صدر معظم اس کیلئے وقت نکالیں گے' اس کی فریاد وزیراعظم سنیں گے' قائم مقام چیف جسٹس جناب رانا بھگوان داس سوموٹو ایکشن لیں گے یا پھر پورا معاشرہ مل کر کوئی ایسا ضابطہ اخلاق بنائے گا جس کے بعد پروین جیسی بچیاں اس ملک میں عزت اور آبرو کے ساتھ زندگی گزار سکیں گی' میں جب بھی سوچتا ہوں تو مجھے کوئی جواب نہیں ملتا' میں سوچتا ہوں ابرار الحق ایک بین الاقوامی سٹار ہیں چنانچہ ان کے پاس تھرڈ ایئر کی اس بچی کے لئے کوئی وقت نہیں' صدر معظم دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں بری طرح مصروف ہیں' انہوں نے ابھی چیف جسٹس اور یونیفارم جیسے اہم مسائل بھی حل کرنے ہیں چنانچہ ان کے پاس بھی ایسے چھوٹے مسئلوں کیلئے وقت

نہیں وزیر اعظم اور ان کی حکومت ملک کو معاشی آزادی کا تحفہ دینا چاہتی ہے چنانچہ ان کے پاس بھی پروین کیلئے وقت نہیں' قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس عدلیہ کے بحران میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ایسے چھوٹے مسائل کیلئے وقت نہیں اور اگر ان کے پاس وقت ہو بھی تو عدل کا نظام اس وقت تک خاموش رہتا ہے جب تک کوئی سائل اپنا سارا اثاثہ بیچ کر زنجیر عدل نہیں ہلاتا اور پیچھے رہ جاتا ہے معاشرہ تو جس معاشرے نے قرآن مجید کا اثر نہیں لیا' جس نے اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے احکامات سے آنکھ اور کان بند کر لئے وہ پروین جیسی بچیوں کی آواز کیسے سنے گا لیکن اس کے باوجود میں پروین کے خط اور اس کے بھجوائے پچاس روپے کے نوٹ کو اپنے اوپر قرض سمجھتا ہوں اور میں یہ قرض اس مملکت خداداد کے کندھوں پر ڈال کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں' میں پروین کا مقدمہ اس پورے معاشرے کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں اور اس معاشرے سے درخواست کرنا چاہتا ہوں اگر تم لوگوں نے پروین جیسی بچیوں کی آواز نہ سنی تو تم لوگ کوئی آواز سننے کے قابل نہیں رہو گے۔

پروین کے پچاس روپے کے نوٹ کے ساتھ خط تھا اور اس خط میں لکھا تھا ''میرا نام پروین ہے اور میں آج سے 4 دن پہلے تک لاہور کے ایک کامرس کالج میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی لیکن ابرار الحق کے ایک گانے کی وجہ سے نہ صرف مجھے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی بلکہ اس گانے نے میری زندگی مشکل بنا دی' میں اس خط کے ساتھ آپ کو 50 روپے بھیج رہی ہوں تاکہ جب بھی آپ میرا یہ 50 روپے کا نوٹ دیکھیں تو آپ کو میرا خط یاد آ جائے اور آپ بازار سے ابرار الحق کی کیسٹ ''نعرہ ساڈا عشق ہے'' خریدیں اور اس کی اے سائیڈ کا دوسرا گانا سنیں جس میں ابرار الحق نے پروین کا نام لے کر ایسی بے ہودہ باتیں کی ہیں کہ اگر آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پروین ہوتا تو آج میری طرح آپ کی بیٹی یا بہن بھی آپ سے آنکھیں چرا رہی ہوتی' ابرار الحق نے اس گانے میں پاکستان کی تمام پروینوں کے بارے میں جو الفاظ کہے ہیں مجھے وہ لکھتے ہوئے شرم آ رہی ہے' ابرار الحق گانے میں کہتا ہے ''نی پروین تو بڑی نمکین' اوپر سے تو مسکین' اندر سے تو بڑی شوقین'' میرے کالج میں کو۔ایجوکیشن تھی' میں جب کالج کی کینٹین کے قریب سے گزرتی تھی تو لڑکے کورس کی شکل میں یہ گانا گانے لگتے تھے اور اس کے بعد قہقہے لگاتے تھے' ایک دن میں نے ہمت کی اور ان لڑکوں سے اس شرارت کے بارے میں پوچھ لیا تو ان کا کہنا تھا ہم ابرار الحق کا گانا گا رہے ہیں' میں نے اس وقت تک یہ گانا نہیں سنا تھا' اس شام جب میں نے یہ گانا اپنے کانوں سے سنا تو

میرے دل نے چاہا زمین پھٹ جائے اور میں اس کے اندر چلی جاؤں لیکن نہ زمین پھٹی اور نہ میں اس کے اندر جا سکی مگر میں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی' جاوید صاحب کاش آپ کی بیٹی یا بہن کا نام پروین ہوتا تب میں آپ سے پوچھتی ابرارالحق کا یہ گانا سن کر آپ کے دل پر کیا گزرتی ہے' آپ یہ گانا سن کر کس طرح اپنی بیٹی یا بہن سے آنکھ چراتے ہیں' جاوید صاحب میں پوچھتی ہوں اگر ابرارالحق کی بہن کا م نام پروین ہوتا تو کیا وہ اپنی بہن کے متعلق بھی گا گا کر دنیا کو یہ بتاتا ''پروین تو بڑی نمکین' تو بڑی شوقین'' میری دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ ابرارالحق کو ایک بیٹی دے اور اس کا نام پروین ہو پھر میں اس سے پوچھوں اب تو یہ گانا سنا اور اس کے بعد اپنی بیٹی کی طرف دیکھ' جاوید صاحب مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اس ملک کے کسی بااختیار شخص کی بیٹی یا بہن کا نام پروین نہیں ورنہ یہ گندی کیسٹ کب کی بین ہو چکی ہوتی' جاوید صاحب خدا کیلئے یہ کیسٹ یا میری یہ فریاد ایوان صدر پہنچا دیں تا کہ اس ملک کی تمام پروینوں کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے شرم نہ آئے۔ دوسرا مجھے بتائیں میں اپنے والد اور بھائیوں کو کیا بتاؤں میں نے کالج کیوں چھوڑ دیا تھا؟ کیا میں یہ بتاؤں لڑکے ان کی بیٹی یا بہن کو نمکین اور شوقین کہتے تھے اور ان میں یہ الفاظ سننے کا حوصلہ نہیں تھا' جاوید صاحب میری یہ فریاد اور میرا یہ خط آپ پر قرض ہے میں آپ کو یہ خط لکھ کر اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا محسوس کر رہی ہوں۔ کاش میرے والدین نے میرا نام پروین نہ رکھا ہوتا''

میں جانتا ہوں ابرارالحق اس معاملے میں قصوروار نہیں ہیں اور انہوں نے کسی پروین کو ذہن میں رکھ کر یہ گانا لکھا ہوگا اور نہ ہی گایا ہوگا لیکن بعض اوقات ہماری ذرا سی لاپروائی بے شمار لوگوں کی زندگیوں میں تلخی گھول دیتی ہے' ہماری ذرا سی بے احتیاطی پروین جیسی لڑکیوں کیلئے زندگی مشکل کر دیتی ہے' ابرارالحق ایک اچھے انسان ہیں' انہوں نے نارووال جیسے دورافتادہ شہر میں جدید ہسپتال بنا کر کمال کر دیا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے وہ گلوکاری میں احتیاط نہیں کرتے' ان کے گانے اکثر اوقات اخلاق کی ساری حدیں عبور کر جاتے ہیں' وہ کبھی بلو کے نام سے ایسی بے ہودہ باتیں منسوب کر دیتے ہیں کہ سن کر شرم آتی ہے' کبھی پورے پنجاب کی خواتین کو ناچنے کی دعوت دے دیتے ہیں اور کبھی پروین جیسی بچیوں کیلئے عزت اور آبرو کے ساتھ جینے کے راستے بند کر دیتے ہیں' اگر ابرارالحق گانا بناتے وقت لفظوں کا ذرا سا خیال رکھ لیں' وہ ناموں سے پرہیز کریں تو میرا خیال ہے ان کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا اور ان کے ضمیر پر بھی بوجھ نہیں پڑے گا' مجھے اچھی طرح یاد ہے انہوں نے ''نچ پنجابن نچ'' پر ردعمل کے بعد پنجابن کو مجاجن بنا دیا تھا

اس تبدیلی سے ان کے گانے پر بھی کوئی اثر نہ پڑا اور پنجابیوں کی دل آزاری کا سلسلہ بھی بند ہو گیا تھا' اسی طرح اگر وہ پروین کی جگہ پری کر دیں' شہزادی یا ملکہ لکھ دیں اور ناموں کے وزن کو سامنے رکھ کر کمپوزیشن میں تھوڑی بہت تبدیلی کر دیں تو اس سے بھی پروین جیسی بے شمار بچیاں شرمندگی سے بچ جائیں گی' اس میں کوئی شک نہیں فن عظیم ہوتا ہے لیکن انسانی جذبات اس سے بھی عظیم تر ہوتے ہیں چنانچہ فنکار کو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانی جذبات کی عظمت کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے' انہیں یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہیں ان کے فن سے کسی کی دل آزاری تو نہیں ہو رہی' ان کے لفظ کسی کے دل پر بلیڈ کی طرح تو نہیں گر رہے' یہ سوال تخلیقی عمل کے دوران دنیا کے ہر فنکار کے مدنظر ہونا چاہیے' مجھے ایک بار نبی اکرم کی حیات پر بننے والی فلم ''دی میسج'' کے پروڈیوسر کا انٹرویو دیکھنے کا موقع ملا تھا' انٹرویو لینے والے نے ان سے پوچھا تھا ''آپ نے فلم میں کسی جگہ نبی اکرم کا سایہ نہیں دکھایا' کیوں؟'' انہوں نے جواب دیا ''میں یہ جسارت کر سکتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا میری اس حرکت سے عالم اسلام کی دل شکنی ہو گی' لوگ میری جسارت کو قبول نہ کریں گے'' اگر ہم فن کے مغربی نقطہ نظر سے دیکھیں تو پروڈیوسر کی بات غلط محسوس ہو گی لیکن اگر ہم انسانی جذبات' احساسات اور عقیدت کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیا جائے تو پروڈیوسر سچا دکھائی دے گا' اخلاق' تہذیب اور شائستگی ہر دور میں فن سے عظیم رہی ہے اور رہے گی' یہ حقیقت ہے دنیا کا کوئی گانا' کوئی نظم' کوئی غزل' کوئی افسانہ' کوئی ناول' کوئی فلم اور کوئی تصویر کبھی انسانی جذبات کی جگہ نہیں لے سکے گی کیونکہ دنیا کا ہر گانا اور ہر گلوکار وقتی ہوتا ہے جبکہ انسانی جذبات اور انسانی اخلاقیات ابد تک قائم رہنے والی سچائیاں ہیں لہٰذا دنیا کا کوئی گانا اور کوئی گلوکار خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو جائے معاشرہ اسے ماں' بہن اور بیٹی کے رشتے پامال کرنے کی اجازت نہیں دے گا' میرا دل چاہتا ہے میں ابرارالحق سے پوچھوں یہ کیسی گلوکاری ہے جسے سننے کے بعد بچیوں کو اپنے نام اور اپنے وجود سے گھن آنے لگتی ہے' بھائی اپنی بہن سے نظریں چراتا ہے اور بیٹیاں اپنے باپ سے شرمندہ ہو جاتی ہیں' میرا دل چاہتا ہے میں بھی ابرارالحق سے پوچھوں کیا واقعی ان کی بہن یا بیٹی کا نام پروین ہوتا تو بھی وہ یہ گانا گاتے؟ اس وقت ان کا کیا رویہ ہوتا!

یہ پروین کا مقدمہ ہے اور اس مقدمے میں ملک کے مشہور گلوکار ابرارالحق مجرم ہیں' کیا یہ معاشرہ' اس معاشرے کے سولہ کروڑ لوگ' اس معاشرے کی دو ہزار عدالتیں' تین ہزار جج اور ڈیڑھ لاکھ وکیل یہ مقدمہ لڑیں گے' کیا ہم شاعروں' ادیبوں' موسیقاروں اور گلوکاروں کیلئے بھی کوئی

ضابطہ اخلاق طے کریں گے اور کیا ہم پروین جیسی بچیوں کو تحفظ دیں گے میں یہ سارے سوال آج کے دن پر چھوڑتا ہوں' میں یہ سوال اس ملک کے لوگوں پر چھوڑتا ہوں۔

نوٹ: (اس کالم کی اشاعت کے فوراً بعد قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے سوموٹو ایکشن لے لیا تھا' عدالت نے ابرار الحق کو طلب کیا اور ان کے اس گانے پر پابندی لگا دی بعد ازاں عدالت نے گانے میں موجود الفاظ ایڈٹ کرنے کا حکم دے دیا)

۞......۞......۞

# رباب بنام پاکستان

رباب احمد کراچی کی ایک صحافی ہیں' ان سے میری ملاقات پانچ برس پہلے ہوئی تھی' وہ ان دنوں کسی میگزین میں کام کرتی تھیں' اس کے بعد ان سے رابطہ منقطع ہو گیا' گزشتہ روز مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا' اس خط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا' یہ خط ایک عام شہری کا پاکستانی معاشرے اور حکومت پر سچا اور تلخ تبصرہ ہے۔ اس خط میں وہ سارے احساسات پائے جاتے ہیں جو اس ملک کی سڑکوں اور گلیوں میں پھرنے والے کروڑوں لوگوں کے دل سے گزرتے ہیں۔ اس خط میں وہ سارے زخم اور وہ سارے گلے بھی موجود ہیں جو اس ملک کے عوام کی زبان پر ہیں، میں آپ کو رباب کے دکھ میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔

رباب احمد اس ملک کے لوگوں کو ایک سچی کہانی سنانا چاہتی ہیں' ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا عامر' عامر بے انتہا شرارتی اور ذہین تھا' اچھا لباس اور اچھی خوراک اس کی خاص کمزوری تھی' بچپن میں اسے کوئی لڑکی اچھی لگتی تھی تو وہ کہتا تھا میں اسی سے شادی کروں گا' 29 مئی 2006ء کو اس کی شادی ہو گئی اس وقت عامر کی عمر 32 سال تھی' عامر شادی کے بعد خود کو مکمل تصور کرنے لگا تھا۔ اسے بیٹی کی شدید خواہش تھی' وہ کہتا تھا اگر اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹی عنایت کی تو وہ اس کا یہ نام رکھے گا۔ اسے سکول میں داخل کرائے گا اور اس کے ساتھ اس طرح کھیلے گا وغیرہ۔ رباب اور اس کا خاندان عامر کی ان باتوں پر ہنستا رہتا تھا' ابھی عامر کی شادی کو فقط دو ماہ گزرے تھے کہ اس کے

خاندان میں ایک شادی آ گئی۔ رباب' عامر کی بیوی اور عامر گاڑی میں بیٹھ کر شادی گھر پہنچ گئے' عامر تھوڑی دیر ہال میں بیٹھا رہا اور اس کے بعد بور ہو کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ 8 اگست 2006ء کی رات تھی' عامر کو ابھی گاڑی میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہاں ایک نوعمر لڑکا آ گیا' لڑکے نے عامر کی گاڑی کا شیشہ بجایا' عامر نے شیشہ نیچے کیا تو لڑکے نے عامر کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ لڑکے نے عامر سے اس کا موبائل مانگنا شروع کر دیا' عامر نے جیل وجت سے کام لیا تو لڑکے نے گولی چلا دی۔ گولی عامر کی چھاتی سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی تک پہنچی اور ہڈی کو چھیلتی ہوئی نکل گئی۔ رباب اور اس کا خاندان شادی کے ہنگامے میں گم تھا' اتنے میں باہر شور ہوا اور چند لوگ بھاگتے ہوئے رباب کے پاس پہنچے اور اسے حادثے کی اطلاع دی۔ یہ لوگ باہر کی طرف بھاگے' گاڑی میں عامر خون میں لت پت پڑا تھا' ان لوگوں نے عامر کو اٹھایا اور فوراً ہسپتال پہنچ گئے' ہسپتال پہنچنے کے بعد ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں جا کر ان لوگوں کو پتہ چلا جب تک پولیس نہیں پہنچتی اس وقت تک مریض کا علاج ممکن نہیں۔ رباب کا بھائی خون میں لت پت تھا جبکہ ہسپتال میں پولیس کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ عامر کبھی آنکھیں کھولتا تھا' کبھی چیخیں مارتا تھا اور کبھی خاموش ہو جاتا تھا' وہ بار بار رباب کا ہاتھ پکڑ کر کہتا تھا ''آپا میں مر جاؤں گا'' رباب اس کی بات سن کر پاگلوں کی طرح رونا شروع کر دیتی تھی۔ کسی نے اس مظلوم خاندان کو مشورہ دیا تم لوگ فوری طور پر کسی سفارش کا بندوبست کرو کیونکہ پولیس کے آنے کے بعد بھی عامر کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ رباب نے جیسے تیسے ایک سفارش کا بندوبست کیا' سفارشی ٹیلی فون موصول ہونے کے بعد ڈاکٹروں نے عامر کا علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا سب سے پہلے مریض کا سٹی سکین ہو گا۔ جب تک سٹی سکین کی رپورٹ نہیں آتی وہ مریض کے بارے میں کچھ نہیں بتا یا جا سکتا۔ عامر اس رات اپنے درد کے ساتھ دست و گریبان رہا۔ صبح عامر کی سٹی سکین کی رپورٹ آئی تو پتہ چلا عامر نہ صرف دونوں ٹانگوں سے معذور ہو چکا ہے بلکہ اس کا ایک پھیپھڑا بھی زخمی ہے' گولی لگنے کی وجہ سے اس کی ایک پسلی بھی زخمی ہے' اس کی ریڑھ کی ہڈی بھی متاثر ہے اور اس کے ایک بازو میں بھی زخم موجود ہے۔ رباب اور اس کا خاندان ہسپتال میں پاگلوں کی طرح گردش کرتا رہا' انہیں یوں محسوس ہوا اس ہسپتال کی انتظامیہ کے پاس وقت ہے' نہ ہی ڈاکٹر اور نہ ہی دوا۔ ان لوگوں نے فوراً عامر کو اس ہسپتال سے نکالا اور اسے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں منتقل کر دیا۔ اس کے بعد ہسپتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد

چوتھا ہسپتال آیا یہاں تک کہ چار ماہ میں بارہ ہسپتال تبدیل ہوئے لیکن عامر کی حالت ٹھیک نہ ہوئی۔ وہ ٹانگوں سے مکمل طور پر معذور ہوگیا۔ رباب کا کہنا تھا عامر کو جب بھی ہوش آتی تھی تو وہ اپنی ٹانگوں کے بارے میں پوچھتا تھا۔ رباب' عامر کی بیوی اور دوسرے رشتہ دار اسے کھوکھلی تسلی دے دیتے تھے۔ رباب کا کہنا تھا ہم لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے عامر کو کم از کم زندگی تو دے دی۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی تھا ہمارا بھائی آنکھیں کھولتا ہے' چند لفظ بولتا ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہاتھ ملا لیتا ہے۔ عامر کی صحت تیزی سے گرتی چلی گئی' عامر کا خاندان ہسپتال تبدیل کرتا رہا لیکن اس خاندان کو ڈاکٹروں کے بھیس میں پیشہ ور ٹھگ تو ملے لیکن پورے شہر میں انہیں کوئی مسیحا نہ ملا' کسی نے اس خاندان کا ہاتھ نہ تھاما' کسی نے اس نوجوان کی زندگی کیلئے کوشش نہیں کی۔ پورا خاندان چھ ماہ تک امید اور ناامیدی کی صلیب پر لٹکا رہا' ان چھ ماہ میں وہ روز اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے خواب دیکھتا تھا' وہ ایک خوبصورت اور صحتمند زندگی کی دعائیں کرتا تھا لیکن 31 دسمبر 2006 کو عامر اور اس کی دعائیں دونوں انتقال کر گئیں' عامر مر گیا اور جاتے جاتے پورے خاندان کو زندہ در گور کر گیا۔



رباب کا کہنا تھا کہ وہ مسلمان ہونے کے ناطے یہ سمجھتی ہے اللہ تعالیٰ نے عامر کو صرف 32 سال کی عمر دی تھی لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اس ملک، اس ملک کے قانون اور موبائل چھیننے والوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کیا صرف چند ہزار روپے کے موبائل کے لئے عامر جیسے نوجوان کا قتل انصاف ہے؟ وہ سوچتی ہے اس کا مجرم کون ہے اور وہ عامر کے خون کا پرچہ کس کے خلاف کٹوائے' وہ ناظم شہر کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے یا وہ کراچی کے گورنر اور وزیراعلیٰ کا گریبان پکڑے' وہ وزیراعظم اور صدر کے سامنے کھڑی ہو جائے یا وہ پورے شہر کو اپنا مجرم سمجھے۔ رباب کا کہنا ہے ہماری حکومت کو اس ملک میں القاعدہ کی چیونٹی تک نظر آجاتی ہے لیکن اسے شہر میں مرنے والے ہزاروں عامر دکھائی نہیں دیتے۔ اس کا کہنا تھا پاکستان کے کسی شہر میں جب بھی عامر جیسے دس بیس لوگ مر جاتے ہیں تو حکومت "مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی" کا اعلان کر کے مظلوموں کی قبر پر پتھر اور لواحقین کے سینے پر صبر کی سل رکھ دیتی ہے۔ رباب کا کہنا تھا اگر عامر کسی وی آئی پی کا بیٹا ہوتا تو کیا وہ اسی طرح سڑک پر مارا جاتا اور اگر وہ مارا جاتا تو کیا حکومت اس کے مجرموں کو بھی اسی طرح چھوڑ دیتی؟ کیا اس ملک کے کسی وی آئی پی کا عامر بھی اسی طرح چھ ماہ تک خواہشوں اور دعاؤں کی صلیب پر لٹکے لٹکے ختم ہو جاتا اور کیا اس

کے خاتمے کے بعد حکومت اسی طرح خاموش رہتی؟ رباب کا کہنا تھا اس ملک میں جب کسی وزیر کا کوئی بیٹا جرم کرتا ہے تو پوری حکومت اس کے سیاہ کرتوت پر سفید چادر ڈال دیتی ہے' وزیروں کے بیٹوں کے جرم میں بے گناہ پکڑے جاتے ہیں اور ان بے گناہوں کو بے گناہی کی پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ہے' اس ملک میں امریکہ کسی کا نام دے دے تو حکومت اس نام کے تمام لوگوں کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیتی ہے۔ ہمارے سیاستدان' ہمارے حکمران امریکہ کے اشارے پر زمین تک کھود ڈالتے ہیں' ہماری پولیس' ہماری ایجنسیوں کی تمام تر مہارتیں اس ملک کے حکمران خاندانوں کی حفاظت میں صرف ہوتی ہیں اگر امریکہ ایمل کانسی کی تصویر ہماری ایجنسیوں کے حوالے کر دیتا ہے تو ہماری ایجنسیاں ماچس کی ایک ڈبی کے ذریعے ایمل کانسی تک پہنچ جاتی ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس عامر جیسے شہریوں کے لئے کوئی وقت نہیں۔ رباب پوچھتی ہے یہ کون لوگ ہیں جو روز پستول لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور راستے میں آنے والے عامر جیسے ہر نوجوان کے دل میں سوراخ کر جاتے ہیں اور کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں، وہ کہتی ہے یہ کون لوگ ہیں جن کی نظر میں ایک موبائل فون انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے اور وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے عامر جیسے نوجوانوں کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا' جنہیں ہم اس لئے اپنا پیٹ کاٹ کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ کڑے وقت میں ہماری مدد کریں گے' ہماری حفاظت کریں گے۔ رباب کا کہنا تھا وہ کون لوگ ہیں جو پاکستان میں اسلحہ لا رہے ہیں اور یہ اسلحہ گلی گلی تقسیم ہو رہا ہے' وہ کون لوگ ہیں جو اس اسلحے کو عوام پر استعمال کر رہے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا اسے پورا پاکستان جرم کی آماجگاہ محسوس ہو رہا ہے' وہ جب بھی اخبار میں کسی واردات کی خبر پڑھتی ہے یا اسے کسی نعش کی تصویر نظر آتی ہے تو اس کے سینے میں عامر زندہ ہو جاتا ہے۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے محسوس کرتی ہے اب اس ملک کے لوگوں کو پانی' بجلی' گیس اور ٹیلی فون کے بلوں کے ساتھ ساتھ اپنی جانوں کا خراج بھی دینا پڑے گا' اب اس ملک کے لوگوں کو پراپرٹی ٹیکس کی طرح حکومت کو جانیں بھی دینا پڑیں گی۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس نے عامر کو مرتے دیکھا ہے وہ اپنے بڑے بھائی کو پاکستان واپس نہ آنے کی درخواستیں کر رہی ہے کیونکہ اس کے اندر یہ خوف بیٹھ گیا ہے اگر اس کا دوسرا بھائی بھی پاکستان آ گیا تو وہ بھی کسی دن اسی طرح دہشت گردی کا شکار ہو جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کیا اقتدار اعلیٰ کو کراچی کے یہ مسائل نظر نہیں آ رہے' کیا حکومت کو کراچی میں عامر جیسے لوگوں کی نعشیں نظر نہیں آ رہیں' کیا حکومت کی نظر میں عام انسان اور عام انسان کی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ رباب کا کہنا تھا عامر کے بعد

بھی لاکھوں ہزاروں موبائل چھینے جا چکے ہیں ہر روز کتنی ہی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں ہر روز کراچی میں بے شمار وارداتیں ہوتی ہیں لیکن حکومت کی طرف سے قرار واقعی سزا کی ایک دھمکی کے سوا کچھ سامنے نہیں آتا۔ رباب کا کہنا تھا ہم کب تک اسی طرح قربانیاں دیتے رہیں گے ہم کب تک اس ملک میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکتے رہیں گے۔ رباب کا کہنا تھا اس ملک میں ایک زندگی عامر جیسے لوگ گزار رہے ہیں اور دوسری طرف بڑی بڑی گاڑیوں شرابوں کی محفلوں غیر ملکی دوروں بڑے بڑے پلاٹوں اور اونچی اونچی سفارشوں والی زندگی ہے۔ اس کا سوال تھا عامر جیسے لوگوں اور بڑے لوگوں کے درمیان یہ فرق کب تک قائم رہے گا۔ ہم لوگ عوام کا خون نچوڑ کر کب تک لاقانونیت کا بازار گرم کرتے رہیں گے اور ہم یہ کیوں نہیں مان لیتے ہم ایک تباہ شدہ قوم ہیں ہم یہ اعتراف کیوں نہیں کر لیتے ہم دنیا میں امریکہ جیسے بڑے ممالک کے مفادات کی حفاظت کرنے کیلئے اترے ہیں۔ رباب کا کہنا تھا وہ ہر روز جب عامر کی چوبیس سالہ بیوہ کو دیکھتی ہے اپنے والد کے افسردہ چہرے اور اپنے خاندان کی رندھی ہوئی آواز سنتی ہے اور وہ اپنے گھر کے خالی پن اور چھپتے ہوئے جالے کو محسوس کرتی ہے تو اس کے دل پر آرے چلتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے وہ کسی شہر میں نہیں بلکہ کسی قتل گاہ میں زندہ ہے۔ اس وقت اس کا دل چاہتا ہے کاش پاکستان کے حکمرانوں کی اولاد کے ساتھ بھی ایسا ہو کاش کبھی یہ لوگ بھی ہسپتالوں کے دھکے کھائیں کاش یہ لوگ بھی کبھی اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھا کر ایک کلینک سے دوسرے کلینک جائیں۔ کاش ان لوگوں کی اولاد بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خواہش کرتے کرتے فوت ہو جائے اور کاش کبھی اس ملک کے حکمرانوں کو بھی عام انسانوں جیسی زندگی گزارنا پڑے۔ رباب کا کہنا ہے اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے وہ کس طرح حکمران طبقے کو ان حالات کا شکار ہوتے دیکھے جن کا وہ اور اس کا خاندان شکار ہے۔ اس کا کہنا تھا وہ اس ملک کے تمام حکمرانوں کو اپنا مجرم سمجھتی ہے اسے محسوس ہوتا ہے اس کے بھائی کی جان اس ملک کی حکومت نے لی۔ اس کا کہنا ہے یہ معاشرہ فرعونیت کا شکار ہو چکا ہے لہٰذا اسے سانس لینے کیلئے اب کسی موسیٰ کی ضرورت ہے۔ اس نے خط میں لکھا، مجھے کوئی ایسی عدالت بتائی جائے جس میں وہ اس معاشرے کے عام انسانوں کا مقدمہ دائر کر سکے اسے کوئی ایسا شخص بتایا جائے جس کا وہ گریبان پکڑ سکے۔ اس کا کہنا تھا جب سے اس کا بھائی قتل ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دن رات قیامت کی دعائیں مانگ رہی ہے وہ اس دن سے روز محشر کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو سکے اور وہ اس ملک کے حکمرانوں کا

گریبان پکڑ سکے۔

یہ رباب کا مقدمہ تھا' رباب نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی میں اس کا مقدمہ کسی اعلیٰ عدالت میں پیش کر دوں۔ میں نے یہ خط پڑھنے کے بعد آگے پیچھے دیکھا لیکن مجھے اس ملک میں دور دور تک کوئی ایسا ایوان' کوئی ایسی عدالت نظر نہیں آئی جس میں رباب کا مقدمہ دائر ہو سکے لہٰذا میں نے بے بس ہو کر رباب کا یہ مقدمہ عوام کی عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین ہے عوام کی عدالت بھی یہ مقدمہ دوسرے کان سے خارج کر دے گی کیونکہ مقدمے اور بین انسان سنا کرتے ہیں اور بدقسمتی سے یہ ملک بے حسی کا قبرستان بن چکا ہے اور بے حسی کے قبرستانوں میں انسان نہیں بستے صرف اور صرف قبریں بستی ہیں' ہم سب 16 کروڑ قبروں میں آباد ہیں۔

# رٹ آف دی گورنمنٹ

ساریہ میڈیکل سٹور اسلام آباد کے جی ایٹ مرکز میں دواؤں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے 4 دسمبر 2006ء کو تین نوجوان سٹور میں داخل ہوئے انہوں نے مختلف چیزوں کی قیمت پوچھی چند کاسمٹکس اٹھائیں کاؤنٹر کی طرف آئے اور جیب سے پرس کی بجائے پستول نکال لیا' سٹور کے مالک احتشام الحق کاؤنٹر پر بیٹھے تھے' نوجوانوں نے انہیں ساری نقدی حوالے کرنے کا حکم دیا' احتشام الحق صاحب جرأت مند قسم کے انسان تھے' وہ ڈاکوؤں کے ساتھ الجھ پڑے' ایک نوجوان نے ان کی طرف پستول کیا اور گولی چلا دی' احتشام الحق صاحب فرش پر گرے اور تڑپنے لگے' نوجوانوں نے دراز کھولی' اس میں موجود رقم نکالی اور اطمینان سے چلتے ہوئے سٹور سے باہر نکل گئے جبکہ احتشام الحق صاحب موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ میں نے یہ واقعہ پانچ دسمبر 2006ء کے اخبارات میں پڑھا تھا اور اس کے بعد اپنے ایک ساتھی سے پوچھا تھا ''ڈاکوؤں کو اس چھوٹے سے سٹور سے کتنی رقم مل گئی ہوگی'' میرے ساتھی نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا ''ایک یا دو ہزار روپے'' میں نے اس سے پوچھا ''تین نوجوان ایک دو ہزار روپے لوٹنے کیلئے آئے اور وہ ایک شخص کو قتل بھی کر گئے' یہ انتہائی خوفناک صورتحال نہیں؟'' میرے ساتھی نے افسوس سے سر ہلا دیا اور کہا ''آج کل لوگ ایک کلو چینی کیلئے دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں''

میرے ساتھی کا کہنا تھا آج سے دس برس پہلے تک ڈاکے صرف بینکوں' سیٹھوں اور

بڑی بڑی کمپنیوں تک محدود تھے' ڈاکو بڑے منظم انداز سے آتے تھے اور کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ روپے لوٹ کر لے جاتے تھے لیکن اب ہمارے معاشرے میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی گھٹیا کلاس پیدا ہو چکی ہے جو ضروریات زندگی کیلئے ڈاکے ڈالتی ہے' یہ لوگ روز ایک ریکٹ بناتے ہیں اور راستے میں آنے والے ہر شخص کو لوٹ لیتے ہیں' سائیکل سوار سے لے کر کریانہ مرچنٹ تک سب لوگ ان کا شکار ہوتے ہیں' یہ لوگ راہ چلتے لوگوں کو روک کر ان کی جیب سے موبائل فون تک نکال لیتے ہیں' ان کی گھڑی' عینک اور پرس چھین لیتے ہیں اور سلام کر کے چلے جاتے ہیں' مجھے اپنے ساتھی کی بات سن کر ایبٹ آباد کے ایک دوست کا واقعہ یاد آ گیا' میرے دوست نے بتایا۔ ایک دن تین ڈاکو اس کے گھر گھس آئے' گھر میں صرف ان کی والدہ تھی' ڈاکوؤں نے اماں جی کے پاؤں چھوئے اور بڑے احترام سے بولے ''اماں جی ہمیں صرف سات ہزار روپے چاہئیں' مہربانی کر کے دے دیں'' اماں جی نے سات ہزار روپے نکال کر دے دیئے' ڈاکوؤں نے رقم لی' اماں جی کے دوبارہ پاؤں چھوئے اور ہنس کر بولے' ہم نے دراصل بجلی کا بل جمع کرانا تھا' ہمارے پاس پیسے نہیں تھے لہٰذا ہم نے سوچا ڈاکہ مار لیتے ہیں'' میرے دوست نے بتایا وہ شام کو واپس آیا تو اس نے اپنی والدہ کو رقم کی بجائے ڈاکوؤں کیلئے متفکر پایا' میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب ضرورت کی وجہ سے بھی ڈاکے مارتے ہیں' شاید میرے دوست کی بات درست ہو۔ آپ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو اس میں ڈاکے اور ایکسیڈنٹ کی خبر ضرور ملے گی' ایک اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان میں روزانہ بیس سے پچاس ہزار وارداتیں ہوتی ہیں جن میں آدھی سے زیادہ وارداتیں ڈاکے ہوتے ہیں' میری پچھلے دنوں ایک سابق ڈاکو سے ان وارداتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی' یہ شخص دس برس پہلے تک ایک نامور ڈاکو تھا لیکن پھر وہ ایک پیر صاحب کی مہربانی سے توبہ تائب ہو گیا' میں نے اس سے ان وارداتوں کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا'' پاکستان میں اب پارٹ ٹائم ڈاکو آ چکے ہیں'' میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا'' پیشہ ور ڈاکو کبھی قتل نہیں کرتا' وہ کبھی کسی شخص کے سینے یا سر میں گولی نہیں مارتا' وہ زیادہ سے زیادہ کسی شخص کے سر میں پستول کا بٹ مارے گا' اسے بے ہوش کرے گا اور دوسرے لوگوں کو اس کی بے ہوشی سے ڈرا کر رقم نکلوا لے گا' ڈاکے کے دوران قتل ہمیشہ پارٹ ٹائم اور واقعاتی ڈاکو کرتے ہیں'' میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا'' پارٹ ٹائم ڈاکوؤں کو پستول پکڑنے اور پستول چلانے کی تکنیک نہیں آتی' دوسرا یہ لوگ واردات کے دوران اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ پاتے لہٰذا یہ لوگ سیدھی گولی

چلا دیتے ہیں'' اس نے بتایا ''ماہرین صرف رقم کی مقدار اور واردات کے دوران زخمی ہونے والوں کی تعداد دیکھ کر ڈاکوؤں کے '' کیلی بر'' کا اندازہ لگا لیتے تھے' کوئی بھی پروفیشنل ڈاکو لاکھوں سے کم کا ڈاکہ نہیں ڈالتا' وہ ہدف پر باقاعدہ تحقیق کرتا ہے اور ہمیشہ اس دن واردات کرتا ہے جس دن ہدف کے پاس ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہو وہ واردات کے دوران سیدھی گولی بھی نہیں چلاتا اور وہ کبھی پکڑا نہیں جاتا' یہ گھٹیا قسم کے پارٹ ٹائم ڈاکو ہوتے ہیں جو دس بیس ہزار روپے کیلئے واردات کرتے ہیں اور بندے بھی مار دیتے ہیں''

مجھے نہیں معلوم اس سابق ڈاکو کی بات کہاں تک درست تھی لیکن یہ بات حقیقت ہے پاکستان میں ڈاکوؤں کی ایک ایسی کلاس پیدا ہو چکی ہے جو دس بیس ہزار روپے کیلئے کسی بھی وقت اور کہیں بھی ڈاکہ ڈال سکتی ہے اور اس واردات کے دوران اگر اسے ایک آدھ بندہ بھی مارنا پڑے تو وہ دریغ نہیں کرتی' سوال یہ ہے یہ ڈاکو کون ہیں' میرا خیال ہے یہ ڈاکو اس ملک کے بے روزگار نوجوان بھی ہیں اور ضروریات زندگی اور مہنگائی کے ڈسے ہوئے شریف شہری بھی' یہ ڈاکو فلموں اور ٹیلی ویژن چینلوں کے تربیت یافتہ بھی ہیں اور متاثرہ بھی' میں نے پچھلے دنوں ایک سٹڈی رپورٹ پڑھی تھی' اس سٹڈی میں انکشاف ہوا تھا شہری زندگی کا ایک بچہ بالغ ہونے تک ٹیلی ویژن اور فلموں کے ذریعے اوسطاً 26 ہزار قتل دیکھ چکا ہوتا ہے' یہ قتل یقیناً اس کی نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں' شاید یہی وجہ ہے آپ کسی گھر' کسی دکان پر جا کر دیکھ لیں آپ کو اس کے گیٹ پر ایک دو مسلح گارڈز ضرور ملیں گے' یہ گارڈز کون ہیں اور یہ کیوں ہیں؟' یہ گارڈز اس معاشرے میں پروان چڑھنے والا خوف ہیں' یہ گارڈز ثابت کرتے ہیں ہمارا معاشرہ واردات کے خوف میں مبتلا ہو چکا ہے لہٰذا اب ہمارے ملک میں صرف وہ شخص اطمینان سے سو سکتا ہے جس کے گیٹ پر دو گارڈ جاگ رہے ہیں' میرا خیال ہے ہمارے معاشرے کو بے روزگاری' مہنگائی' میڈیا اور لاقانونیت تیزی سے اس موڑ کی طرف لے جا رہی ہے جس پر پہنچ کر انسان اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے' جس میں ہر دوسرا شخص قاتل اور ہر پہلا شخص ڈاکو بن جاتا ہے۔

یہ حالات کس نے ٹھیک کرنے ہیں؟ سیدھی سی بات ہے اس صورتحال کو صرف حکومت سنبھال سکتی ہے لیکن آپ دلچسپ امر ملاحظہ کیجئے ہماری حکومت وانا اور بلوچستان میں تو اپنی ''رٹ'' قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے' اسے وزیرستان اور کوہلو میں تو اپنی رٹ چیلنج ہوتی نظر آتی ہے لیکن اسے ڈاکوؤں کی وہ فوج دکھائی نہیں دیتی جو روز ملک کی ہر گلی' ہر محلے' ہر مکان اور ہر دکان

میں حکومت کی رٹ کو چیلنج کرتے ہیں' حکومت کے پاس اپنی گلیوں میں رٹ قائم کرنے کے لیے وقت ہے اور نہ ہی حکومت کا کوئی اہلکار ان ڈاکوؤں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے لہذا حکومت کی رٹ کا یہ عالم ہے آج ایس ایچ او تک سیکورٹی کی گاڑیوں اور مسلح سپاہیوں کے بغیر تھانے سے نہیں نکلتے' ہمارے آئی جی صاحبان کو بھی اپنی حفاظت کیلئے سو پچاس گارڈز کی ضرورت رہتی ہے اور حکومت کا کوئی وزیر سیکورٹی کور کے بغیر آفس نہیں جاتا' حالت یہ ہے لوگ روز لٹتے ہیں لیکن کوئی شخص تھانے میں پرچہ درج نہیں کراتا کیونکہ لوگ انصاف اور قانون سے مایوس ہو چکے ہیں' وہ سمجھتے ہیں وہ رپٹ لکھوانے کے بعد مزید خوار ہو جائیں گے' یہ ہے ہماری ساری رٹ اور یہ ہے حکومت' ہم لوگ بھی عجیب ہیں' ہم امریکہ کو افغانستان اور عراق میں امن قائم کرنے کے مشورے تو دیتے ہیں لیکن ہمارا اپنا یہ عالم ہے ہمارا وزیراعظم ایک عام شہری کی حیثیت سے شادی کی کسی تقریب میں نہیں جا سکتا' ہمارے ایس ایس پی صاحبان تک کی جیب کٹ جاتی ہے اور ہمارے ججوں تک کی گاڑیاں چوری ہو جاتی ہیں۔ ہم دنیا کے انتہائی دلچسپ لوگ ہیں' ہمیں وزیرستان اور کوہلو کے باغی تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اسلام آباد' لاہور اور کراچی میں امن قائم نہیں کر سکتے' ہم اپنے قرب و جوار کے محلوں کو ڈاکوؤں اور چوروں سے نہیں بچا سکتے' یہ ہے ہماری رٹ اور یہ ہے ہماری حکومت۔

# افسوس ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا

مرزا طاہر حسین کی داستان میں بے شمار کہی اور ان کہی کہانیاں چھپی ہیں، طاہر حسین ایک سابق پاکستانی تھا، وہ اپنے خاندان کے ساتھ برطانوی شہر لیڈز میں رہتا تھا۔ وہ 17 دسمبر 1988ء کو راولپنڈی آیا، وہ چکوال میں اپنے رشتے داروں سے ملنے جا رہا تھا، راستے میں اس کی ٹیکسی ڈرائیور سے لڑائی ہو گئی، اس لڑائی میں ڈرائیور جمشید خان ہلاک ہو گیا۔ طاہر حسین کا کہنا تھا جمشید خان اور اس کے ساتھی نے اسے لوٹنے کی کوشش کی، اس نے مزاحمت کی جس کے نتیجے میں جمشید خان اپنے ساتھی کے پستول سے مارا گیا، طاہر حسین نے ثبوت میں یہ جواز پیش کیا "میں نے جمشید کی نعش اٹھائی، ٹیکسی میں رکھی اور نعش لے کر خود تھانے میں پیش ہو گیا، اگر میں گناہگار ہوتا تو میں جمشید کی نعش جنگل میں پھینکتا اور وہاں سے فرار ہو جاتا" قصہ مختصر پولیس نے طاہر حسین کو گرفتار کر لیا' طاہر حسین کا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا اور 1989ء میں سیشن کورٹ اسلام آباد نے اسے سزائے موت دے دی۔ طاہر حسین کے لواحقین نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی لیکن ملزم اپنی بے گناہی ثابت نہ کر سکا، مقدمہ شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ چلا گیا، دونوں عدالتوں نے اس کی سزا بحال رکھی، لواحقین نے 2005ء میں صدر سے رحم کی اپیل کی لیکن صدر نے بھی یہ درخواست مسترد کر دی جس کے بعد طاہر حسین کو مئی 2006ء کو پھانسی دینے کا فیصلہ ہو گیا، اس فیصلے تک پہنچتے پہنچتے طاہر حسین 18 برس قید کاٹ چکا تھا، طاہر حسین کے لواحقین نے صدر پرویز مشرف کو

مجرم کی سزا عمر قید میں بدلنے کی اپیل کی، طاہر حسین کے لواحقین نے برطانوی حکومت سے سفارش کی درخواست بھی کی، برطانوی حکومت نے یہ درخواست پاکستان میں اپنے ہائی کمیشن کو بھجوا دی، برطانیہ کے ہائی کمشنر یہ درخواست لے کر صدر جنرل پرویز مشرف سے ملے، صدر نے طاہر حسین کی سزا پر عملدرآمد ایک ماہ کے لیے معطل کر دیا، اس دوران طاہر حسین کی داستان اخبارات تک پہنچی اور اخبارات نے طاہر حسین کے حق میں لکھنا شروع کر دیا، سزا کی معطلی کا دورانیہ ختم ہوا تو صدر نے اس میں ایک ماہ کی توسیع کر دی، اس دوران طاہر حسین کے بھائی مقتول جمشید کے لواحقین سے سمجھوتے کی کوشش کرتے رہے، انہوں نے دو کروڑ روپے تک خون بہا دینے کی پیش کش کی لیکن مقتول کے لواحقین نے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ صدر نے تیسری بار سزا معطل کر دی، طاہر حسین کے بعض جاننے والے مقتول کے گاؤں گئے اور خاندان کو مختلف ترغیبات دینے لگے لیکن وہ لوگ نہ مانے، صدر نے چوتھی بار پھانسی رکوا دی، اس دوران 29 اکتوبر 2006ء کو برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس اپنی اہلیہ کمیلا پارکر کے ساتھ پاکستان آئے اور انہوں نے صدر پرویز مشرف سے مرزا طاہر حسین کی رہائی کی سفارش کی۔ اکتوبر 2006ء کے آخر میں برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے مرزا طاہر حسین کیلئے صدر پرویز مشرف کو ٹیلی فون کیا۔ برطانوی وزیراعظم نے 18 نومبر 2006ء کو تین روزہ دورے پر پاکستان آنا تھا' اس دوران برطانوی میڈیا اور این جی اوز نے بھی پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اب طاہر حسین کی پھانسی کے لیے نومبر کا مہینہ طے ہوا تھا، اکتوبر میں برطانوی وزیراعظم کے دورے کے سلسلے میں ہائی کمیشن کے عملے اور پاکستانی دفتر خارجہ میں ملاقاتیں شروع ہوئیں، ان ملاقاتوں کے دوران پاکستانی اہلکاروں کو محسوس ہوا ٹونی بلیئر، اپنے دورے میں وزیراعظم شوکت عزیز اور صدر پرویز مشرف کے سامنے طاہر حسین کا مسئلہ اٹھائیں گے اور برطانوی وزیراعظم کی طرف سے دوسری بار سفارش سفارتی لحاظ سے ٹھیک نہیں ہو گی، صدر نے بھی صورتحال کی نزاکت کو محسوس کیا لہٰذا انہوں نے 15 نومبر 2006ء کو مرزا طاہر حسین کی پھانسی کو عمر قید میں بدل دیا۔ وزارت دفاع نے قید کے دنوں کا تخمینہ لگایا تو پتہ چلا طاہر حسین سزا کے دن پورے کر چکے ہیں چنانچہ 16 اور 17 نومبر کی درمیانی شب طاہر حسین کو برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ برٹش ہائی کمیشن کا ایک اہلکار 17 نومبر کی صبح طاہر حسین کو لے کر برٹش ایئر لائن میں سوار ہو گیا یوں مرزا طاہر حسین 18 نومبر دوپہر ایک بج کر 15 منٹ پر ہیتھرو ایئرپورٹ پہنچ گئے۔ ہیتھرو ایئرپورٹ پر ان کی تصویریں بنیں اور یہ تصویریں

دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئیں، یہ تصویریں پاکستان کے اخبارات میں بھی چھپیں۔

مرزا طاہر حسین نہ صرف لیڈز میں اپنے خاندان کے پاس پہنچ چکے ہیں بلکہ وہ نئے سرے سے ایک خوبصورت اور محفوظ زندگی بھی شروع کر چکے ہیں۔ ان کی زندگی بچ گئی یہ فیصلہ اس لحاظ سے خوش آئند ہے لیکن جہاں تک طاہر حسین کے کیس کا معاملہ ہے تو یہ مقدمہ پاکستان کی دستوری، قانونی اور سفارتی زندگی پر بے شمار ایسے دھبے چھوڑ گیا ہے جن کو دھونے میں ہمیں مدتیں لگ جائیں گی' اس کیس کا پہلا پہلو برطانوی حکومت کا رویہ تھا، برطانیہ نے ایک بار پھر دنیا پر اپنی اخلاقی برتری ثابت کر دی، برطانیہ نے ثابت کر دیا وہ اپنے شہریوں کے مسائل کو انتہائی سنجیدگی سے لیتے ہیں، وہ اپنے ایک مسلمان شہری کے لیے پرنس چارلس تک کو پاکستان بھجوا سکتے ہیں۔ دوسرا پہلو ہم نے دنیا پر ایک بار پھر اپنی قانونی، آئینی اور سفارتی کمزوری ثابت کر دی۔ ہم نے ثابت کر دیا ہم بیرونی دباؤ میں آخری حد تک جا سکتے ہیں، یقیناً ہماری حکومت کے پاس دوسرے اقدامات کی طرح اس فیصلے کے حق میں بھی بے شمار ٹھوس دلائل موجود ہوں گے لیکن سوال یہ ہے اگر مرزا طاہر حسین پاکستان کے شہری ہوتے' ان سے یہ جرم برطانیہ میں سرزد ہوتا اور وہ برطانوی عدالتوں سے ہوتے ہوئے پھانسی تک پہنچ جاتے تو کیا ہماری حکومت ان کے لیے بھی پرنس چارلس اور ٹونی بلیئر جتنی کوشش کرتی اور کیا ہماری ان کوششوں کے نتیجے میں برطانیہ انہیں رہا کر دیتا؟ سوال یہ ہے اگر صدر پرویز مشرف یا وزیر اعظم شوکت عزیز برطانیہ کے دورے پر جاتے تو کیا لندن میں ان کی لینڈنگ سے پہلے برطانوی حکومت مرزا طاہر حسین کو پاکستان بھجوا دیتی؟ مجھے یقین ہے ان تمام سوالوں کا جواب انکار ہے، ہم جانتے ہیں برطانیہ کبھی پاکستان کے لیے اپنا قانون یا ضابطہ تبدیل نہ کرتا' ہم یہ بھی جانتے ہیں ہمارے اس مطالبے پر ٹونی بلیئر بڑے آرام سے کندھے اچکاتے اور سوری کہہ کر دوسری طرف منہ موڑ لیتے، اس وقت بھی برطانوی جیلوں میں سوا دو سو اور امریکی جیلوں میں 190 پاکستانی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کیا ہماری حکومت نے کبھی ان قیدیوں کے لئے برطانوی حکومت سے بات کی؟ گوانتانامو بے میں اس وقت 29 پاکستانی محبوس ہیں، سوال یہ ہے کیا پاکستان نے کبھی ان پاکستانیوں کا مقدمہ لڑا؟ کیا پاکستان نے صدر بش کے دورے سے پہلے امریکہ سے یہ مطالبہ کیا تھا ''جب تک آپ ہمارے ان قیدیوں کو رہا نہیں کرتے اس وقت تک آپ پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکتے'' مجھے معلوم ہے ہم نے آج تک ایسا کیا اور نہ ہم کبھی کریں گے کیونکہ ہم نے خود کو ایک غلام ریاست تسلیم کر لیا ہے لہٰذا ہم کبھی امریکہ کے احکامات

کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، کبھی سعودی عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنی پالیسیاں تبدیل کرتے ہیں، کبھی برطانوی وزیراعظم کو اپنے قانون اور ضابطوں کا تحفہ پیش کرتے ہیں اور کبھی چین کی خوشنودی کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم کبھی مشرق کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی مغرب کو للچائی نظروں سے تکنے لگتے ہیں، ہم روز اپنے لیے نیا قبلہ تراشتے ہیں، ہم روز اپنے خدا بدلتے ہیں اور اس کے بعد شکوہ کرتے ہیں دنیا ہماری عزت نہیں کرتی، ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں دنیا کبھی خادموں اور ملازموں کی عزت نہیں کیا کرتی، عزت کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے، جو لوگ خود اپنی عزت نہیں کرتے دنیا کبھی ان کی عزت نہیں کیا کرتی، افسوس قدرت نے ہمیں خود کو باوقار اور عزت دار ثابت کرنے کا ایک موقع فراہم کیا تھا لیکن ہم نے یہ موقع بھی کھو دیا، ہم نے ایک بار پھر ثابت کر دیا، لالچ اور خوف ہماری قومی پالیسی ہے اور دنیا کا ہر دوسرا ملک ہماری اس پالیسی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

# اندھی آنکھوں کے خواب

یہ پانچ برس پہلے کا واقعہ ہے' اٹلی کے شہر میلان میں ایک ہسپتال کی عمارت گر گئی' تحقیقات ہوئی' پتہ چلا عمارت کی تعمیر میں ناقص میٹریل استعمال ہوا تھا' مزید تحقیق ہوئی تو معلوم ہوا تعمیراتی کمپنی کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی اس نے ماضی میں جتنی عمارتیں بنائی تھیں ان میں بھی تعمیراتی نقائص پائے گئے تھے' سوال پیدا ہوا پھر اس بدنام فرم کو ٹھیکہ کس نے دیا۔ انکشاف ہوا ٹاؤن میئر ٹھیکے میں ملوث تھا۔ کیس کارپوریشن مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ مجسٹریٹ نے میئر کو طلب کر لیا۔ سماعت ہوئی' جرم ثابت ہو گیا' مجسٹریٹ نے فیصلے کی تاریخ دے دی' اس دوران میئر نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور فیصلے کے دن سے پہلے مجسٹریٹ کے تبادلے کے احکامات آ گئے۔ مجسٹریٹ نے چارج چھوڑ دیا۔ عوام کو خبر ہوئی تو عوام سڑکوں پر آ گئے' ٹرانسپورٹ بند ہو گئی' شٹر ڈاؤن ہو گئے' تعلیمی اداروں میں چھٹی ہو گئی اور پورا میلان شہر جام ہو گیا' عوام کا ایک ہی مطالبہ تھا ''ہمیں ہمارا مجسٹریٹ واپس چاہیے'' میلان کے عوام کا خیال تھا جو مجسٹریٹ میئر کو عدالت میں بلا سکتا ہے وہ یقیناً ایک نڈر' بے باک' ایماندار اور شفاف جج ہے اور میلان شہر کو ایسا افسر نہیں کھونا چاہیے' آنے والوں دنوں میں احتجاج اس قدر زور پکڑ گیا کہ حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا' اس مجسٹریٹ نے دوبارہ اسی عدالت کا چارج سنبھالا' میئر کا کیس سنا اور عدالتی کارروائی کے بعد میئر کو باقاعدہ سزا سنائی۔

آپ یہ واقعہ سن کر ہر گز یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ اٹلی کوئی آئیڈیل ملک ہے' وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں اور اس ملک میں تمام بکریاں اور شیر ایک ہی گھاٹ پر پیتے پلاتے ہیں' اٹلی دراصل یورپ کا جنوبی ایشیا اور وسطی افریقہ ہے' وہاں سیاسی کرپشن عروج پر ہے اور وہ جرائم میں تیسری دنیا کے جاہل ممالک کا مقابلہ کرتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاسی جماعتیں اٹلی میں ہیں اور وہاں تیزی سے حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اٹلی میں سیاسی رشوت' ہارس ٹریڈنگ' اختیارات کا ناجائز استعمال' اقربا پروری' لوٹ کھسوٹ اور کرپشن انتہا پر ہے' پورا ملک مافیا کے کنٹرول میں ہے اور سرکاری ادارے اور حکومتیں پریشر گروپوں کے زیر اثر رہتی ہیں لیکن ان تمام قباحتوں کے باوجود اٹلی کے عوام بیدار مغز اور روشن ضمیر ہیں' وہ اچھے اور برے کی تمیز رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں اگر شہری اپنی ''ایماندار اقلیت'' کی حفاظت کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مستقبل نہیں لوٹ سکتی لہٰذا اٹلی کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جن میں ہر ایماندار افسر کی نوکری اور عزت دونوں محفوظ ہیں اور اگر کوئی اتھارٹی' کوئی حکومت ان ایماندار افسروں پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرے تو شہری فوراً سڑکوں پر آجاتے ہیں' شاید یہی رویہ ہے جس کے باعث اٹلی تمام تر کرپشن اور بدامنی کے باوجود معاشی اور سماجی سطح پر ترقی کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ بات صرف اٹلی کی نہیں' یہ ایک ناقابل تردید سچ ہے دنیا کے ہر ملک میں ایسے چند ہی لوگ ہوتے ہیں جن کی ان ٹیگریٹی' جن کا ایمان' جن کی مہارت اور جن کی ایمانداری شک وشبے سے بالاتر ہوتی ہے۔ جنہیں دنیا کے سارے ٹیکسال مل کر نہیں خرید سکتے اور جنہیں دنیا داری کا سارا بوجھ نہیں جھکا سکتا۔ اگر معاشرے' اگر ملک ان لوگوں کی حفاظت کر لیں' اگر ان کی عزت' ان کی حرمت بچا لیں تو وہ ملک' وہ معاشرے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ اس وقت میرے دوست اور میرے عزیز تحریک عدم اعتماد کی ناکامی کا ماتم کر رہے ہیں' میں ان کے اس دکھ' اس افسوس میں ان کے ساتھ ہوں لیکن میرا خیال ہے اس ملک' اس معاشرے میں تحریک عدم اعتماد کی ناکامی سے بڑے حادثے بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں' یہاں بڑے بڑے سانحے ہو رہے ہیں اور ہونے کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن ہمارے ضمیر پر جوں تک نہیں رینگتی مثلاً آپ جسٹس طارق محمود کا کیس دیکھیں' طارق محمود بلوچستان ہائی کورٹ کے جج تھے' انہوں نے صدر پرویز مشرف کے ریفرنڈم سے اختلاف کیا' الیکشن کمیشن کی سیٹ چھوڑی' دباؤ بڑھا تو انہوں نے بلوچستان ہائی کورٹ سے بھی استعفیٰ دے دیا' اس ملک' اس معاشرے میں جسٹس طارق محمود جیسے کتنے لوگ ہیں؟ کون ہے اس ملک میں

جس میں حکومت وقت سے اختلاف کی جرأت ہے؟ کون لوگ ہیں جو حکومتی اقدامات کی یوں مخالفت کی جرأت کرتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو اپنے موقف کی سچائی پر اپنی نوکری قربان کر دیتے ہیں' جسٹس طارق محمود کا اختلاف صحیح تھا یا غلط آئینی تھا یا غیر آئینی اس سے قطع نظر انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا ایک سرکاری ملازم بھی حکومت سے اختلاف کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور اسے بھی اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا حکومت ایسے قیمتی شخص کی قدر کرتی۔ ان سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کرتی لیکن حکومت نے ان کا استعفیٰ فوراً منظور کر لیا' اس سے بھی کہیں افسوسناک بات عوامی رویہ تھا۔ عوام کی طرف سے جسٹس طارق محمود کے حق میں کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ عوام جو ابرار الحق اور نصیبو لال کا گانا سننے کیلئے جمع ہو جاتے ہیں' انہوں نے جسٹس طارق محمود پر استعفیٰ واپس لینے کیلئے دباؤ ڈالا اور نہ ہی حکومت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور ملک میں کوئی تحریک چلی تھی اور نہ ہی احتجاج کا کوئی سلسلہ' اگر اس وقت عوام جسٹس طارق محمود کے ساتھ کھڑے ہو جاتے تو سوچئے ہمارے نظام میں موجود ان جیسے دوسرے لوگوں کی کتنی حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ لوگ جو اپنے ایمان کے چراغ کے گرد ہاتھوں کی دیوار بنائے بیٹھے ہیں' ذرا سوچئے ان کے احساس تنہائی میں کتنی کمی آتی؟ کیا ان کے دلوں سے سفر رائیگاں کا احساس ختم نہ ہو جاتا؟ ہماری تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں' ہمارے سامنے کئی لوگوں نے اپنے ضمیر کے خلاف انتظامیہ کا ساتھ دینے سے انکار کیا لیکن لوگ کھڑے ہو کر ان کا تماشا دیکھتے رہے اور کسی شخص نے آگے بڑھ کر ان لوگوں کا ساتھ نہ دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اپریل 1999ء میں سرگودھا کی سول جج روبینہ سعید بھٹی اور لاہور کے سول جج طاہر نعیم نے استعفے دیئے تھے' ان ججوں کا کہنا تھا' ججوں کی تنخواہیں کم ہیں' کرپشن بہت زیادہ ہے اور ہمارے رشتے دار بھی فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا ہمارے لئے انصاف کرنا ممکن نہیں' میں اس دور میں ایسے لوگ تلاش کرتا رہا جو آگے بڑھ کر ان روشن ضمیر ججوں کا ساتھ دیتے' جو ان کا حوصلہ بڑھاتے لیکن عوام کی طرف سے خاموشی رہی۔ اب یہ لوگ بھی کہیں برتن مانجھ رہے ہوں گے یا ٹیوشن پڑھا رہے ہوں گے۔

معاشرے تحریکوں اور ریلیوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں' اگر ان میں زندگی موجود ہو تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں شکست نہیں دے سکتی مگر افسوس کا مقام ہے ہمارے معاشرے کی رگوں سے زندگی ہی خارج ہوتی جا رہی ہے' لوگوں میں اچھائی کا ساتھ دینے کی جرأت ہی مرتی جا رہی

ہے اور یہ سچ ہے اگر معاشرے مر جائیں' اگر لوگوں کی رگوں سے جرأت ختم ہو جائے تو آپ تحفظ حقوق نسواں بل لے آئیں یا بش بل' لوگ ایک ہی جواب دیں گے قبول ہے' عوام مٹی کی طرح ہوتے ہیں' مٹی اچھی اور صحت مند ہو تو فصلیں اور پودے بھی اچھے ہوتے ہیں لیکن ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں' ہم عوام پر توجہ دینے کی بجائے اچھی اور مضبوط جمہوریت کے خواب بنتے ہیں' ہم اندھی آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں۔

☼......☼......☼

# بنیادی اصول

آرنلڈ شیوازنگر 30 جولائی 1947ء کو آسٹریا کے قصبے تھال میں پیدا ہوا‘ وہ ایک نیچرل پہلوان تھا‘ اس نے باڈی بلڈنگ شروع کی اور 20 سال کی عمر میں مسٹر یونیورس بن گیا‘ وہ آسٹریا کی فوج میں بھرتی ہوا‘ آسٹریا میں اس کا مستقبل بہت روشن تھا لیکن ایک دن اس نے امریکہ جانے کا فیصلہ کر لیا‘ اس کے دوستوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا کہنا تھا ’’مسٹر یونیورس کو وہاں جانا چاہیے جہاں سے یونیورس شروع ہوتی ہے‘‘ وہ امریکہ چلا گیا‘ آرنلڈ شیوازنگر امریکہ پہنچا اور اس نے وہاں معمولی کاموں سے عملی زندگی کا آغاز کیا‘ وہ ان کاموں سے ہوتا ہوا ہالی ووڈ پہنچ گیا‘ ہالی ووڈ میں اسے ’’ٹرمینیٹر‘‘ جیسی شہرہ آفاق فلم مل گئی‘ ٹرمینیٹر اپنے دور کی بین الاقوامی فلم ثابت ہوئی‘ اس فلم سے آرنلڈ نے کروڑوں ڈالر کمائے‘ اس فلم کے بعد اس کا شمار ہالی ووڈ کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے اداکاروں میں ہونے لگا‘ اس کے گھر کے سامنے فلم سازوں کی لائنیں لگ گئیں‘ 1986ء میں اس نے ماریا کے ساتھ شادی کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نوازا‘ 2001ء تک وہ محض ایک اداکار اور سپر سٹار تھا لیکن اپریل 2001ء میں اس کی ملاقات کارل رووسے ہوئی‘ کارل صدر بش کا سیاسی مشیر تھا‘ کارل نے آرنلڈ کو مشورہ دیا ’’ہم لوگ کیلیفورنیا کے لئے نیا گورنر تلاش کر رہے ہیں‘ تم سیاست میں کیوں نہیں آجاتے‘‘ آرنلڈ کیلئے یہ ایک حیران کن پیشکش تھی‘ اس نے گھبرا کر جواب دیا ’’میں ایک باڈی بلڈر

اور اداکار ہوں' کیا تم یہ سمجھتے ہو میں کیلیفورنیا جیسی بڑی ریاست چلا سکتا ہوں'' کارل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ پر ہاتھ رگڑ کر بولا'' تجربہ کرنے میں کیا ہرج ہے'' کارل نے تجربہ کیا' آرنلڈ کوری پبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر کیلیفورنیا میں الیکشن لڑایا اور وہ حیرت انگیز طریقے سے جیت گیا جس کے بعد 17 نومبر 2003ء کو اس کی زندگی نے ایک اور کروٹ لی' اس نے کیلیفورنیا کے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا اور وہ اس ریاست کا ''بادشاہ'' بن گیا جس میں اس نے مزدور کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا۔

کیلیفورنیا نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا کی امیر ترین ریاست ہے' کیلیفورنیا دنیا میں دولت کے لحاظ سے 5 ویں نمبر پر آتی ہے' پہلے نمبر پر امریکہ ہے' دوسرے نمبر پر جاپان' تیسرے نمبر پر جرمنی' چوتھے پر برطانیہ اور پانچویں نمبر پر کیلیفورنیا ہے' کیلیفورنیا کے بعد فرانس کا نمبر آتا ہے اور فرانس کے بعد باقی پوری دنیا' آپ نے اکثر ریاست کے اندر ریاست کا محاورہ سنا ہوگا' یہ محاورہ کیلیفورنیا سے شروع ہوا تھا' کیلیفورنیا حقیقتاً ریاست کے اندر ایک مضبوط ترین ریاست ہے' دنیا کی تین بڑی انڈسٹریاں فلم' کمپیوٹر اور جوا خانے کیلیفورنیا میں ہیں اور آرنلڈ شیوازنگر اس کیلیفورنیا کا گورنر ہے' آرنلڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دنیا کا واحد شخص ہے جو کاغذ کے ایک ٹکڑے پر دستخط کر کے ایک منٹ میں کسی بھی شخص کو ایک منٹ میں ارب پتی بنا سکتا ہے' یہ پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کر کے سینکڑوں ارب پتیوں کو فٹ پاتھ پر بھی لا سکتا ہے۔ آرنلڈ 21 ویں صدی کا قارون بھی کہلاتا ہے' اسے دنیا کے طاقتور ترین انسان کا خطاب بھی مل چکا ہے مگر دنیا کے اس طاقتور ترین انسان کے ساتھ جنوری 2006ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا' جنوری کے آخر میں اس نے اپنی ''ہارلے ڈیوڈسن'' موٹر سائیکل نکالی' موٹر سائیکل کے ساتھ چھوٹی ٹرالی لگائی' اس ٹرالی میں اپنے 13 سالہ بیٹے پیٹرک کو بٹھایا اور سیر پر نکل گیا' سیر کے دوران اس کی موٹر سائیکل دیوار سے ٹکرا گئی' آرنلڈ اور اس کا بیٹا شدید زخمی ہو گئے' پولیس فوراً موقع پر پہنچ گئی' کیلیفورنیا کے قانون کے مطابق آرنلڈ سے ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا گیا' گورنر نے پولیس کو لائسنس پیش کر دیا۔ لائسنس دیکھنے کے بعد سارجنٹ نے گورنر کو سیلوٹ کیا اور اس سے عرض کیا'' سر یہ گاڑی کا لائسنس ہے آپ اس لائسنس پر موٹر سائیکل نہیں چلا سکتے'' آرنلڈ گھبرا گیا اور اس نے گھبرا کر پوچھا ''اب کیا ہوگا'' سارجنٹ نے جواب دیا ''میں آپ کو گرفتار کروں گا' کورٹ میں پیش کروں گا اور کورٹ آپ کے بارے میں فیصلہ کرے گی'' آرنلڈ نے فوراً اپنے وکیل کو طلب کر لیا' وکیل نے آ

کر صورتحال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد پولیس کو سمجھایا جب یہ حادثہ ہوا تھا' اس وقت موٹر سائیکل کے ساتھ ٹرالی بندھی تھی اور قانون کے مطابق کیلیفورنیا میں گاڑی کا لائسنس رکھنے والا شہری تین اور تین سے زیادہ پہیوں والی گاڑی چلا سکتا ہے۔ ٹرالی کی وجہ سے موٹر سائیکل تین پہیوں والی گاڑی بن گئی تھی۔ وکیل کا موقف درست تھا لہذا پولیس نے آرنلڈ کو وارننگ دے کر چھوڑ دیا۔ آرنلڈ کا خیال تھا اگر اس دن اس کی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹرالی نہ ہوتی تو وہ پہلے دن جیل میں ہوتا اور دوسرے دن اس کی گورنری ختم ہو جاتی' آرنلڈ نے اگلے ہی دن موٹر سائیکل کے لائسنس کے لئے اپلائی کر دیا' جنوری سے جولائی تک پولیس نے چھ ماہ اس کے جسمانی' ذہنی اور تحریری ٹیسٹ لئے' اس کی ''ڈرائیونگ سکل'' دیکھی اور 9 جولائی 2006ء کو اسے موٹر سائیکل چلانے کا لائسنس دے دیا۔

میں نے گزشتہ روز امریکہ کے ایک اخبار میں آرنلڈ کی تصویر دیکھی' آرنلڈ کے دائیں ہاتھ میں ڈرائیونگ لائسنس تھا اور وہ فاتحانہ انداز سے کیمرے کی طرف دیکھ رہا تھا' میں یہ تصویر دیکھ کر مسکرا اٹھا' میرے ساتھ میرے ایک دوست بیٹھے تھے انہوں نے مسکرانے کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں جواب دیا ''یہ تصویر بتاتی ہے امریکہ آج سپر پاور کیوں ہے'' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے' میں نے عرض کیا ''اول' امریکہ کا طاقتور ترین انسان بھی ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر موٹر سائیکل نہیں چلا سکتا' دوم' کیلیفورنیا کے گورنر کو بھی تحریری' زبانی اور عملی ٹیسٹ کے بغیر لائسنس نہیں ملتا اور سوم اگر لاس اینجلس کے ایک عام شہری کو چھ ماہ میں لائسنس ملتا ہے تو گورنر کو بھی لائسنس کیلئے چھ ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے'' میرے دوست خاموشی سے سنتے رہے' میں نے عرض کیا ''آپ یہ تصویر دیکھیں اور اس کے بعد اپنے حکمرانوں کا پروفائل نکالیں' پاکستان کی کابینہ کے 40 ارکان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے لیکن یہ لوگ روز گاڑی چلاتے ہیں اور آج تک پولیس کے کسی اہلکار کو انہیں روکنے اور ان سے لائسنس طلب کرنے کی جرات نہیں ہوئی'' میں نے عرض کیا ''اور اگر یہ لوگ لائسنس بنوانا چاہیں تو مجھے یقین ہے پولیس آدھ گھنٹے میں لائسنس لے کر ان کے گھر حاضر ہو جائے گی اور اگر یہ لوگ موٹر سائیکل کے لائسنس پر ہوائی جہاز چلانا چاہیں تو بھی انہیں کوئی شخص نہیں روکے گا'' میں نے عرض کیا ''قانون وہ بنیادی اصول ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے قصبوں کو لاس اینجلس جیسے شہروں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو کیلیفورنیا جیسی امیر ترین سٹیٹس میں تبدیل کرتا ہے جو قوموں کا مستقبل طے کرتا ہے' قانون پہاڑ کی وہ چوٹی' سمندر کا

وہ کنارا اور زمین کا وہ کونا ہوتا ہے جہاں سے آنے والے کل کے سورج طلوع ہوتے ہیں' جہاں سے قومیں اور ان کے آنے والے دن جنم لیتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسا کوئی کونا ایسا کوئی کنارا اور ایسی کوئی چوٹی نہیں جہاں سے ہمارا کل طلوع ہو سکے' ہماری بنیادوں میں اصول اور قانون کا کوئی ایسا پتھر' کوئی ایسی اینٹ بھی نہیں جس پر ہم ترقی اور خوشحالی کی عمارت تعمیر کر سکیں" میرا دوست خاموشی سے سنتا رہا' میں نے عرض کیا "کاش میں آرنلڈ کی یہ تصویر پاکستان کے ہر با اختیار شخص کی میز پر رکھ سکوں اور اس کے بعد اس سے عرض کر سکوں "حضور جس طرح ہتھیلی پر گنا نہیں اگایا جا سکتا بلکہ اسی طرح قانون کے بغیر زمین کے کسی ٹکڑے کو ملک' دس بیس کروڑ لوگوں کے ہجوم کو قوم اور 200 قومیتوں کو اچھی قوم نہیں بنایا جا سکتا" میں نے عرض کیا "کاش میں انہیں بتا سکوں ہم چھوے کی کوکھ سے ہاتھی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

# قانون

ایوب خان کے دور میں چند چینی ماہرین کا ایک وفد پاکستان کے دورے پر آیا۔ یہ لوگ واہ کے آرڈیننس کمپلیکس لے گئے۔ کمپلیکس اس وقت نیا نیا بنا تھا۔ دورے کے دوران انہوں نے ایک چھت ٹپکتی پائی' وفد کا ایک رکن یہ دیکھ کر ہنس پڑا' میزبان معاملہ بھانپ گیا لہٰذا اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ''چھت نئی بنی ہے ہم فالٹ تلاش کر رہے ہیں'' مہمان نے قہقہہ لگایا اور پورے اعتماد سے بولا ''شروع شروع میں ہماری چھتیں بھی ٹپکتی تھیں' پھر ہم نے ایک ٹھیکیدار کو گولی ماردی اس کے بعد چھت نئی ہو یا پرانی کبھی نہیں ٹپکی'' یہ چینی مثال ہے۔ آپ سعودی عرب کو لیجئے پورے ملک میں جب اذان ہوتی ہے تو تمام دکاندار اپنی دکانیں' اپنی ورکشاپیں اور اپنے دفتر کھلے چھوڑ کر مسجد چلے جاتے ہیں' صرافوں کی دکانیں سونے اور جوہریوں کے شوکیس جواہرات سے بھرے ہوتے ہیں لیکن مجال ہے کوئی ان کی طرف میڑھی آنکھ سے بھی دیکھ لے' کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں اگر اس ملک میں کوئی شخص چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے تو اگلے جمعہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ چوری کے معاملے میں چین کے قوانین زیادہ سخت ہیں وہاں چور کو موت کی سزا دی جاتی ہے اور موت بھی بڑی بھیانک۔ چور کے سر میں گولی ماری جاتی ہے اور جب لواحقین نعش لینے آتے ہیں تو انہیں پہلے اس گولی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

پوری دنیا جرم وسزا کے معاملے میں اس بات پر متفق ہے سزا کا طویل یا خوفناک ہونا اتنا

Kashif Azad@OneUrdu.com

ضروری نہیں ہوتا جتنا ضروری اس کا قطعی ہونا ہے مثلاً آپ کسی معاشرے میں سرعام کھانسنے کی سزا موت رکھ دیں لیکن اس سزا پر عملدرآمد نہ ہو تو آپ اس کا نتیجہ خود ملاحظہ کر لیں گے' سارا شہر کھانستا رہے گا جبکہ اس کے برعکس آپ اس ''جرم'' کی سزا چھ ماہ طے کر دیں لیکن مجرم کو معلوم ہو جس دن اس سے یہ جرم سرزد ہو گا دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکے گی آپ دیکھ لیجئے گا چھ ماہ کی یہ سزا پھانسی سے زیادہ پراثر ثابت ہو گی۔ یہ بھی حقیقت ہے جن معاشروں میں سزاؤں پر عملدرآمد کمزور ہوتا ہے' جن میں انصاف میں تاخیر اور تفتیشی نظام کرپٹ ہوتا ہے' ان معاشروں میں آپ سزائیں جتنی چاہیں طویل اور قانون جتنا چاہیں مضبوط بنا دیں وہاں جرم نہیں رک سکتے کیونکہ ان معاشروں کا مجرم یہ جانتا ہے وہ رشوت اور سفارش کے ذریعے سزا سے بچ جائے گا' وہ جانتا ہے اگر اسے سفارش نہ مل سکی تو بھی وہ عدالتی نظام کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا لے گا' اسے وکیل بچا لیں گے چنانچہ پاکستان جیسے تمام معاشروں' تمام ممالک میں ہر سال نئی بیرکوں' نئی جیلوں' نئی عدالتوں اور نئے ججوں کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ معاشرے میں انصاف کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن انصاف نہیں ہوتا آپ اس معاشرے میں جھانک کر دیکھیں اس کا تفصیل سے جائزہ لیں یہاں ڈکیتی کی سزاؤں میں اضافہ ہوا' آبروریزی اور دہشتگردی کیلئے نئی سزائیں اور نئی عدالتیں بنیں لیکن ہر آنے والا دن ان جرائم میں اضافے کی خبر لے کر طلوع ہوا۔ کیوں؟ کبھی کسی نے سوچا' بات بہت سادہ اور عام فہم ہے' ہم سزاؤں میں تو اضافہ کر دیتے ہیں' نئی عدالتیں اور نئے قانون بھی بنا دیتے ہیں لیکن ہم سزاؤں پر عملدرآمد کا نظام نہیں بناتے' قانون کو اٹل' قطعی اور سب کیلئے یکساں بنانے کی کوشش نہیں کرتے لہٰذا ہمارا ہر مجرم یہ سمجھتا ہے قانون کوئی بھی ہو' سزا خواہ کتنی بھی سخت ہو اس نے بالآخر چھوٹ جانا ہے چنانچہ وہ جرم پر جرم کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ ملاوٹ کو لیجئے' میر ظفر اللہ جمالی صاحب کی حکومت نے ادویات اور کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کرنے والوں کیلئے 25 سال قید' جائیداد کی قرقی اور لائسنس ضبط کرنے کی منظوری دی تھی' اس معاشرے کیلئے یہ قانون اور یہ سزا بہت ضروری تھی کیونکہ جتنی ملاوٹ اس ملک میں ہوتی ہے شاید ہی دنیا کے کسی ملک' کسی معاشرے میں ہوتی ہو۔ اس ملک میں اسپرین تک خالص نہیں ملتی۔ میں شوگر کا مریض ہوں' میں ہر مہینے امریکہ سے دوائیں منگوایا کرتا تھا کیونکہ میں

جب بھی پاکستانی برانڈ استعمال کرتا تھا تو میری شوگر آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی تھی' میں سوچتا تھا کیا یہ ظلم نہیں ایک ہی برانڈ' ایک ہی کمپنی کی دوا امریکہ میں کچھ ہے اور پاکستان میں کچھ' ہمارے ملک میں چائے کی پتی سے کیکر کا برادہ' مرچ کے پاؤڈر سے رنگا ہوا بورا' دال سے پلاسٹک کے باریک دانے اور ہلدی سے پیلا رنگ برآمد ہوتا ہے' ہمارے ملک میں گوشت ناخالص ہوتا ہے' آٹے اور گھی میں ملاوٹ ہوتی ہے' ہمارے ملک کے ٹیکے' گولیاں اور کیپسول خالی ہوتے ہیں' ہمارے ملک میں دودھ کا ایک گلاس تک صاف ستھرا نہیں ملتا' پاکستان میں آپ کسی یونانی دوا خانے کی کوئی مشہور دوا ٹیسٹ کرا لیجئے۔ آپ کو اس میں "سٹیرائڈز" ملیں گے۔ اس ملک میں ہزاروں لاکھوں ایسے دوا خانے ہیں جو رجسٹرڈ ہیں اور نہ ہی ان کی ادویات لیکن ان کے کارخانے بھی موجود ہیں' سٹورز بھی ہیں اور ترسیل کا نظام بھی ہے۔ آپ پورے ملک کا دورہ کریں آپ کو ہر دو فٹ بعد کسی نہ کسی دوا یا کسی نہ کسی حاذق طبیب کا بورڈ ملے گا۔ یہ کون لوگ ہیں اور انہیں کس نے یہ دھندہ کرنے کی اجازت دی ہے اور ان کی ادویات میں کون کون سے اجزاء ہیں۔ آج تک کسی نے دیکھا اور نہ ہی کسی نے سوچا' پاکستان کے سوا دنیا میں کون سا ملک ہے جس میں اس کاروبار کی گنجائش موجود ہے۔ یہ اعزاز صرف ہمارے ملک کو حاصل ہے' ہمارے ملک میں گوالوں کے برتنوں سے مینڈک برآمد ہوتے ہیں اور اس میں خراب' بدبودار اور مضر صحت گندم پیس کر لوگوں کو کھلا دی جاتی ہے لہٰذا اس ملک کو ملاوٹ ایکٹ کی بڑی ضرورت تھی' جمالی صاحب نے جب اس ایکٹ کا اعلان کیا تو مجھے بہت خوشی ہوئی اور میں نے اس قانون کو خوش آمدید کہا تھا' میں یہ سمجھتا تھا ملاوٹ کے مجرموں کے لئے 25 سال کی سزا بھی کم ہے لیکن بات پھر وہی نکلی اس قانون پر بھی عملدرآمد نہ ہوا لہٰذا آج اس قانون کو پاس ہوئے تین برس گزر چکے ہیں لیکن تا حال 15 کروڑ لوگوں کے اس ملک میں ایک بھی "ملاوٹیا" گرفتار نہیں ہوا۔ قانون بن چکا ہے' اعلان بھی ہو چکا ہے لیکن ملاوٹ کا کاروبار بھی اسی طرح جاری ہے' مجھے یقین ہے اس ملک میں ملاوٹ کا کاروبار آئندہ بھی جاری رہے گا کیونکہ اس ملک کے ملاوٹیے جانتے ہیں سزا 25 سال ہو یا 225 سال اس ملک میں کوئی شخص ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا اور اگر کبھی غلطی سے ان پر کوئی ہاتھ اٹھ بھی گیا تو وہ دس بیس پچاس ہزار روپے خرچ کریں گے اور اگلے ہی روز اپنے تھڑے' اپنے چبوترے پر بیٹھے ہوں گے۔ یہ ہے قانون اور اس کی اصل پوزیشن' میں نے چند روز پہلے اخبارات میں چیف

جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری کا ایک بیان پڑھا تھا' انہوں نے زیر تربیت ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن ججوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''انصاف کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کیا جائے'' میں نے بے اختیار سوچا اس ملک میں عدالتیں اور جج ہیں لیکن انصاف نہیں' قانون ہے لیکن قانون کا خوف نہیں' میں نے سوچا' قانون اور سزاؤں کا خوف وہاں ہوتا ہے جہاں سزائیں دی جاتی ہیں جس ملک میں قانون بھولنے کیلئے بنائے جاتے ہوں اور سزائیں کتابوں میں رکھنے کیلئے وہاں سزائیں اور قانون کیا حیثیت رکھتے ہیں! وہاں انصاف کون کرے گا۔

# کاش ملک کی ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں

دنیا میں کیمپس کا تصور انگریز نے دیا تھا' وہ جب تعلیمی ادارے بناتے تھے تو ان میں دو باتوں کا خاص خیال رکھتے تھے' وہ ایک ان کے تعلیمی ادارے شہر سے باہر ہوتے تھے' انگریزوں کا خیال تھا شہر میں کمرشل ازم ہوتا ہے' شہر میں ہنگامے' رش اور پالوشن بھی ہوتا ہے اور یہ تمام چیزیں طالب علموں کی کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں' دو وہ تعلیمی اداروں کو سب سے زیادہ رقبہ دیتے تھے' وہ سکول اور کالج میں بے شمار لان' گارڈن اور کھیل کے میدان بناتے تھے' انگریز کے تعلیمی ادارے مختلف بلاکوں میں منقسم ہوتے تھے اور ان بلاکوں کے درمیان لان' گارڈن اور فوارے ہوتے تھے' انگریزوں کا کہنا تھا کیمپس کی وسعت طالب علموں کا ذہنی افق وسیع کرتی ہے اور یہ ان کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ کرتی ہے' دوسرا ان کا خیال تھا وقت گزرنے کے ساتھ تعلیمی اداروں کی ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے' ان میں طالب علموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے' یہ ''اپ گریڈ'' ہوتے رہتے ہیں' سکول' ہائیر سیکنڈری سکول اور کالج' یونیورسٹیاں بن جاتے ہیں لہٰذا جب یہ اپ گریڈ ہوتے ہیں تو انہیں زیادہ زمین اور زیادہ رقبے کی ضرورت پڑتی ہے' ان کا خیال تھا جب ان کے تعلیمی ادارے ''اپ گریڈیشن'' کے مرحلے پر پہنچیں تو ان کے پاس زمین کی کمی نہ ہو' انہیں نئی عمارتیں بنانے میں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے چنانچہ آج آپ پاکستان میں انگریز کے بنائے سکول' کالج اور یونیورسٹیاں دیکھ لیں آپ کو ان میں یہ دونوں خوبیاں ملیں گی۔

انگریز نے اس خطے کے ہر قصبے' ہر شہر اور ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر میں کوئی نہ کوئی تعلیمی ادارہ بنایا تھا۔ یہ تمام تعلیمی ادارے شہروں سے باہر بنائے گئے تھے لیکن آبادی میں اضافے کے باعث شہر پھیلتے گئے یہاں تک کہ ان 60 برسوں میں زیادہ تر تعلیمی ادارے شہروں کے درمیان آ گئے' ان تعلیمی اداروں کے ارد گرد کمرشل ازم کا دریا بہا اور ان تعلیمی اداروں کی زمینیں ''پرائم لینڈ'' کا درجہ اختیار کر گئیں' پاکستان میں جب پلاٹ کا مرض ابھرا اور قبرستان تک پلاٹ بن کر بک گئے تو اس سوچ نے پاکستان میں ایک نیا طبقہ پیدا کیا' اس طبقے کا نام لینڈ مافیا تھا' اس مافیا نے سرکاری زمینوں پر قبضہ شروع کر دیا' تعلیمی ادارے ان لوگوں کا سب سے بڑا ہدف تھے' اس کی وجہ تعلیمی اداروں کی ''یتیمی'' تھی' پاکستان میں تعلیم اور تعلیمی اداروں دونوں کا کوئی والی وارث نہیں چنانچہ پاکستان کے زیادہ تر تعلیمی اداروں کی زمینوں پر لینڈ مافیا قابض ہو چکا ہے۔ ان اداروں میں چکوال کا کالج بھی شامل ہے۔ چکوال کے پوسٹ گریجویٹ کالج کی ''فرنٹ سائیڈ'' چکوال کی مین سڑک پر آ گئی تھی' یہ سائیڈ کروڑوں روپے مالیت کی تھی' چکوال کی سیاسی انتظامیہ اس زمین کی قدر وقیمت سے واقف تھی لہٰذا اس نے کالج کی 300 کنال جگہ پر قبضے کا فیصلہ کیا' یہ لوگ اس جگہ 180 دکانیں اور ان دکانوں پر فلیٹس بنانا چاہتے تھے سیاسی انتظامیہ نے اس منصوبے کی اجازت کیلئے پنجاب گورنمنٹ کو لکھا' پنجاب گورنمنٹ نے جنوری 2006ء کو انہیں اجازت دے دی' حکومت نے محکمہ تعلیم کو بھی اس فیصلے سے مطلع کر دیا' اس تحریری اجازت کے بعد چکوال کے تحصیل ناظم نے کالج کی ''باؤنڈری وال'' توڑ دی' کالج کے لیکچراروں اور پروفیسروں نے اس واقعہ پر احتجاج شروع کر دیا' انہوں نے ضلعی انتظامیہ کے خلاف ایک قرارداد مذمت پاس کی' یہ قرارداد اور پروفیسروں کا احتجاج اخبارات میں شائع ہونے لگا' انہی دنوں انگریزی کے ایک معاصر اخبار ''ڈان'' میں اس واقعے کے بارے میں ممتاز کالم نگار ایاز امیر نے کالم بھی لکھا' یہ کالم چیف جسٹس آف پاکستان جناب افتخار محمد چودھری کی نظروں سے گزرا' انہوں نے اسی وقت ''سوموٹو ایکشن'' لے لیا' سپریم کورٹ نے چکوال کے ناظم غلام عباس' تحصیل ناظم اور ڈی سی او سمیت تمام متعلقہ حکام کو عدالت میں طلب کر لیا' یہ حضرات 5 مئی کو سپریم کورٹ میں حاضر ہوئے' چیف جسٹس نے انہیں 300 کنال جگہ کالج کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا' ضلعی ناظم نے اسی وقت عدالت سے معذرت کی اور وہ دکانوں اور فلیٹس کے منصوبے سے دستبردار ہو گئے' اس کے بعد چیف جسٹس نے بڑے تاریخی ریمارکس دیئے' چیف جسٹس نے فرمایا ''تعلیمی ادارے کمرشل

مقاصد کیلئے استعمال نہیں کیے جا سکتے' تعلیم کی فراہمی اور تعلیمی ادارے کی حفاظت ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے' آپ اپنی آنے والی نسلوں کو کیا دینا چاہتے ہیں اگر آپ تعلیمی اداروں کی جگہ کاروبار کیلئے استعمال کریں گے تو وہاں کاروبار ہوگا' وہاں ہوٹل بنیں گے وہاں منشیات بھی فروخت ہوں گی جس کے بعد وہاں تعلیمی ماحول برقرار نہیں رہ سکے گا'' یہ ریمارکس 6 مئی 2006ء کو روزنامہ جنگ سمیت تمام اخبارات میں شائع ہوئے۔

سپریم کورٹ کے اس حکم کے بعد شاید پاکستان کے وہ تمام تعلیمی ادارے بچ جائیں جن کی زمینیں بدقسمتی سے شہر میں آ گئی تھیں اور ان پر شہروں کے ناظم اور ان کے پروردہ مافیا نظریں جمائے بیٹھے تھے' یہ لوگ کس قدر سنگدل اور خوفناک ہیں اس کا اندازہ آپ کو چھوٹے اضلاع اور چھوٹے شہروں میں جا کر ہوتا ہے' یہ لوگ مسجدیں، درگاہیں اور قبرستان تک بیچ چکے ہیں' ہر سال یہ لوگ قبروں پر ٹریکٹر چلاتے ہیں اور اس کے بعد ان پر دکانیں بنا کر کروڑوں روپے سمیٹ لیتے ہیں' ان لوگوں کی دست برد سے سرکاری زمینیں تک محفوظ نہیں ہیں' انہوں نے کوئی سکول چھوڑا، نہ ہسپتال اور نہ ہی کوئی کھیل کا میدان' سکول اور کالج ان لوگوں کا خصوصی ہدف ہوتے ہیں، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے بھکر اور وہاڑی شہر میں بھی کالجوں کی زمینوں کے ساتھ یہ سلوک ہو چکا ہے جو چکوال کی سیاسی انتظامیہ پوسٹ گریجویٹ کالج کے ساتھ کرنا چاہتی تھی' میں اس ایکشن پر سپریم کورٹ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، جب سے جسٹس افتخار محمد چودھری سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے ہیں اور انہوں نے عام اور غریب لوگوں کے مسائل پر سوموٹو ایکشن لینے شروع کیے ہیں یقین کیجیے لوگوں کے دل میں عدالتوں کا احترام پھر انگڑائی لینے لگا ہے' لوگوں کی عدالتوں کے ساتھ ایک بار پھر توقعات وابستہ ہونے لگی ہیں' نور محمد تا جک کا کیس ہو' شادی بیاہ کے کھانوں کا مسئلہ ہو' ونی اور سوارہ کی رسم ہو یا پھر سپریم جوڈیشل کونسل کا معاملہ چیف جسٹس کے سوموٹو ایکشنز نے عوام کے دل میں عدالت کی محبت اور احترام میں اضافہ کیا' چیف جسٹس صاحب ٹیلی ویژن' اخبارات اور عوام کی عام درخواستوں تک پر سوموٹو ایکشن لیتے ہیں' وہ اسی وقت علاقے کی ساری سرکاری مشینری کو عدالت میں طلب کر لیتے ہیں' ان کے یہ اقدامات بیوروکریسی کے مزاج میں بہت بڑی تبدیلی لا رہے ہیں، مجھے ایک ڈی آئی جی بتا رہے تھے آج جب اخبار میں کسی جرم یا زیادتی کے بارے میں کوئی خبر شائع ہوتی ہے تو ہم لوگ فوراً خوفزدہ ہو جاتے ہیں' ہمیں معلوم ہوتا ہے ابھی ہمیں سپریم کورٹ سے ٹیلی فون آ جائے گا جس کے بعد ہمارے لئے نوکری بچانا مشکل ہو جائے گا' ڈی

آئی جی کا یہ اعتراف میرے لیے ایک کمپلیمنٹ تھا' اس وقت میں نے دل سے دعا کی اللہ کرے ہماری عدلیہ کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے' سوموٹو ایکشن کی یہ روایت اعلیٰ عدالت سے لوئر کورٹس تک جائے اور اس ملک کے تمام جج اسی سپرٹ اور اسی جذبے کے تحت کام کریں تاکہ پاکستان میں وہ وقت آ جائے جب کوئی مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار یہ سوچے اس ملک کے جج اور اس ملک کی عدالتیں جاگ رہی ہیں اور اگر میں نے یہ جرم کیا تو میں ان جاگتی عدالتوں اور ان بیدار ججوں سے بچ نہیں پاؤں گا؟ مجرم جرم کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے اگر اس نے جرم کیا تو اسے پورے ملک میں کوئی ایسی جگہ' کوئی ایسا مقام نہیں ملے گا جہاں چھپ کر وہ عدالتوں اور ججوں سے اوجھل ہو سکے گا۔ میرے دل سے دعا نکلی کاش ہمارے ملک میں ایسا وقت آ جائے جب اس ملک کے تمام مجرم یہ یقین کر لیں وہ جرم کے بعد قانون اور انصاف سے نہیں بچ سکیں گے' وہ حساب دیے بغیر اس زمین پر نہیں رہ سکیں گے' کاش اس ملک میں ایسا وقت آ جائے' کاش ہماری ساری عدالتیں ایسی ہو جائیں۔

# بُرا قانون

میں نے کارڈ کھول کر دیکھا' کارڈ پر جلی حروف میں "عقیقہ" لکھا تھا' میں نے حیرت سے قریشی صاحب کی طرف دیکھا' وہ مسکرا کر بولے "آج کل ہوٹلوں میں ولیمے پر پابندی ہے' پولیس چھاپے مارتی رہتی ہے چنانچہ میں نے بیٹے کی دعوت ولیمہ اور نواسے کا عقیقہ اکٹھا کر دیا' ہم لوگ کارڈ عقیقے کے تقسیم کر رہے ہیں لیکن دعوت ولیمے کی دے رہے ہیں" میں نے عرض کیا "جناب آپ کو اس لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت تھی' آپ چپ چاپ قانون پر عملدرآمد کریں' لوگوں کو ایک کولڈ ڈرنک' چائے یا سوپ پلائیں' خود بھی پریشانی سے بچیں اور دوسروں کو بھی کوفت سے بچائیں" قریشی صاحب مسکرائے "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں ذات برادری والا آدمی ہوں' مجھے قانون کے ساتھ ساتھ دس دوسری چیزوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے' جنید میرا اکلوتا بیٹا ہے' میرے پاس اللہ تعالیٰ کا دیا بہت کچھ ہے لہٰذا میں ایک بھرپور ولیمہ افورڈ کر سکتا ہوں" میں نے ان سے عرض کیا "آپ ولیمے کی رقم کسی ضرورت مند کو دے دیں آپ کو ثواب بھی ہوگا اور آپ قانون توڑنے کی ذلت سے بھی بچ جائیں گے" قریشی صاحب نے فوراً فرمایا "میں ہر سال کروڑوں روپے کی چیریٹی کرتا ہوں' میں نے تین ٹرسٹ بنا رکھے ہیں' بیٹے کی شادی سے پہلے میں نے بیس غریب لڑکیوں کی شادیاں کرائی تھیں' میں اس چیریٹی کے باوجود بیٹے کا ولیمہ افورڈ کر سکتا ہوں لہٰذا تم خود بتاؤ' اب میں کیا کروں" میرے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اگر ہم شادی کی تقریبات کے بارے میں تحقیق کریں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ تقریبات ہماری ثقافت' ہماری روایات کا حصہ ہیں' یہ روایات اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے چلی آ رہی ہیں' آپ برصغیر پاک و ہند کے ہندوؤں' سکھوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کی شادیوں کا جائزہ لیں آپ کو ان تمام مذاہب کی شادیوں میں بے شمار رسمیں ''کامن'' ملیں گی' یہ کلچر اور روایات کی یکسانیت ہے' اس خطے میں جب بھی کسی گھر میں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کی ماں اس کا جہیز بنانا شروع کر دیتی ہے' اسی طرح جب بھی لڑکے کے ماں باپ بہو کی تلاش میں نکلتے ہیں تو وہ لڑکی والے کی حیثیت ضرور دیکھتے ہیں' وہ عموماً جہیز کی توقع بھی رکھتے ہیں' یہ عادت مالدیپ سے لے کر جلال آباد تک لوگوں میں ''کامن'' ہے اور اس خطے میں پانچ چھ ہزار سال سے لوگ لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے اور لڑکیوں کے جنم پر سنجیدہ ہوتے آ رہے ہیں' یہ روایات اس خطے کی جڑوں' اس خطے کی بنیادوں میں موجود ہیں اور پچھلے پانچ چھ ہزار سال میں دنیا کی کوئی طاقت انہیں مکمل طور پر ختم نہیں کر سکی' ہاں البتہ پاکستان میں چند ایسی برادریاں ضرور موجود ہیں جنہوں نے اتفاق رائے سے ان روایات کو کسی حد تک قابل برداشت بنا لیا' یہ وہ برادریاں ہیں جو اپنے بچوں کی شادیاں عموماً خاندان میں کرتی ہیں اور جب ان لوگوں کو محسوس ہوا ان کے بعض بہن بھائی شادی بیاہ کی رسمیں افورڈ نہیں کر سکتے تو انہوں نے سب کی سہولت کیلئے ان روایات میں بعض چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر دیں' مثلاً بعض برادریوں میں سارے رشتے دار مل کر لڑکی کا جہیز بناتے ہیں' پورا خاندان کنٹری بیوشن کر کے بارات کی خورد و نوش کا بندوبست کرتا ہے' بعض خاندان مساجد میں نکاح کرتے ہیں اور ان خاندانوں میں بارات اور ولیمے کی رسمیں ختم ہو چکی ہیں' بعض خاندانوں میں لڑکی والوں کے اخراجات بھی لڑکے والے برداشت کرتے ہیں اور بعض خاندانوں میں شادی انتہائی سادگی سے ہوتی ہے لیکن اس کے بعد نیا جوڑا باری باری اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر جاتا ہے اور وہ رشتے دار انہیں قیمتی تحفے تحائف دے کر واپس بھجواتے ہیں لیکن رسومات میں یہ تبدیلیاں صرف چند خاندانوں تک محدود ہیں' یہ معاشرتی شکل اختیار نہیں کر سکیں' ان کے اثرات پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکے۔ ہماری شادی بیاہ کی رسمیں مذہبی نہیں سماجی اور ثقافتی ہیں' آپ ہار یا مالا کو لیجئے عرب دولہے کے گلے میں ہار نہیں ڈالتے' عرب دولہے کو سلامی بھی نہیں دیتے لیکن برصغیر کے تمام مسلمان دولہے کے گلے میں ہار بھی ڈالتے ہیں اور اسے سلامی بھی دیتے ہیں' مالا ڈالنے اور سلامی دینے کی رسم چھ ہزار سال پہلے ہندوستان میں رائج ہوئی

تھی اور یہ آج تک ہندوستان کے تمام مذاہب' فرقوں اور نسلوں کے لوگوں میں موجود ہے' یہی صورتحال مہندی کی ہے' برصغیر کے تمام مذاہب کے لوگ دلہن کو مہندی لگاتے ہیں' اسی طرح چراغاں' دلہن کا شادی کا جوڑا' ڈھولکی' مٹھائی' ناچ گانا' دودھ پلائی' شہ بالا اور مبارکبادیں بھی اس خطے کی روایات ہیں اور یہ روایات خطے کے تمام مذاہب' قوموں اور نسلوں میں یکساں موجود ہیں' ان روایات کو آج تک کوئی مذہب اور کوئی نظریہ تبدیل نہیں کر سکا' ولیمہ بھی ان روایات میں سے ایک روایت ہے اور یہ بھی ہزاروں سال سے اس خطے میں چلی آ رہی ہے۔

آزادی سے پہلے انگریز مقامی روایات اور رسموں کے خلاف کوئی قانون نہیں بناتے تھے' وہ رسموں اور عقیدے کے خلاف قانون کو برا قانون (BAD LAW) کہتے تھے' ان کا خیال تھا قانون بنانا کمال نہیں ہوتا اصل کمال اس قانون پر عملدرآمد کرانا ہوتا ہے لہٰذا جس قانون پر عملدرآمد ممکن نہ ہو حکومت کو وہ قانون نہیں بنانا چاہیے' شاید یہی وجہ تھی انگریز نے کبھی کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس پر وہ عملدرآمد نہیں کرا سکتا تھا مثلاً انگریز چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف تھا لیکن اس نے 1947ء تک اس کے خلاف کوئی قانون پاس نہیں کیا' وہ جانتا تھا ہندوستان کے تمام مذاہب اور تمام علاقوں میں یہ روایت موجود ہے اور لوگ اس قانون کو تسلیم نہیں کریں گے' انگریز ذات برادری اور طبقاتی تفرق کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن اس نے کبھی برہمن کو شودر کے ساتھ بٹھانے کی کوشش نہیں کی' اس نے تمام ریلوے سٹیشنوں پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے پانی کے الگ الگ کولر لگوا دیئے' اس نے فوج تک میں ہندو اور مسلمانوں کے باورچی خانے علیحدہ علیحدہ رکھے' انگریز نے ڈیڑھ سو سال میں کبھی اندرون شہر کرفیو لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا پرانے شہروں کی گلیاں تنگ ہوتی ہیں اور ان میں پولیس کے گھوڑے' تانگے' موٹر سائیکل اور جیپیں نہیں جا سکتیں لہٰذا حکومت وہاں کرفیو پر عملدرآمد نہیں کرا سکے گی اور گائے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف کا باعث بنتی تھی چنانچہ انگریز نے ڈیڑھ سو سال میں گائے کے بارے میں کوئی قانون نہیں بنایا' انگریز کہتا تھا حکومت کو قانون بنانے سے پہلے معاشرے میں "سوشل چینج" لانی چاہیے' اسے مقامی لیڈروں اور این جی اوز کی مدد سے پہلے معاشرے کا مزاج بدلنا چاہیے' جب معاشرے کا مزاج بدل جائے تو اس کے بعد قانون کی باری آتی ہے' اس سلسلے میں ہم "ستی" کی مثال بھی دے سکتے ہیں' انگریز نے ستی کی رسم کے خلاف قانون بنانے سے پہلے راجہ رام موہن کے ذریعے ہندو معاشرے میں ایک سوشل چینج کی بنیاد رکھی' جب راجہ رام موہن کی تعلیمات ایک

تحریک کی شکل اختیار کر گئیں تو اس کے بعد انگریز نے ستی کے خلاف قانون پاس کیا اور اس قانون پر پوری طرح عملدرآمد کرایا۔

میں دل سے شادی بیاہ پر اسراف کے خلاف ہوں' میں ولیمے اور بارات کے اخراجات کو بھی پسند نہیں کرتا لیکن جہاں تک اس قانون کی بات ہے تو میرا خیال ہے یہ ایک "بیڈ لاء" ہے اور اس قانون نے معاشرے کی الجھنوں میں اضافہ کر دیا ہے' اس نے ہماری معاشرتی منافقت بڑھا دی ہے۔ اس نے رشوت' لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری کے نئے دروازے بھی کھول دیئے ہیں' اس نے لوگوں کو ولیمے کو عقیقے کا نام دینے پر مجبور کر دیا ہے اور اس قانون نے بااختیار اور بے اختیار کی خلیج میں بھی اضافہ کر دیا ہے' آج حالت یہ ہے بااختیار لوگ دھڑلے سے ولیمے کرتے ہیں' ان کی دعوت میں قانون بنانے اور نافذ کرنے والے دونوں شریک ہوتے ہیں اور پولیس باہر کھڑی ہو کر ان وی آئی پی کی حفاظت کرتی ہے لیکن جب کسی بے اختیار شخص سے ولیمے کا جرم سرزد ہو جاتا ہے تو پولیس اس کی دیگیں تک اٹھا کر لے جاتی ہے' یہ تفریق عوام کے دلوں میں نفرت کے بیج بو رہی ہے میرا خیال ہے حکومت کو اس ملک کے اصل مسائل پر توجہ دینی چاہیے حکومت کو دیکھنا چاہیے اس ملک کی نصف سے زائد دوائیں جعلی ہیں' ان جعلی دواؤں سے ہزاروں لوگ ہلاک ہو چکے ہیں لیکن آج تک پولیس نے کسی ڈرگ سٹور پر چھاپہ نہیں مارا' پاکستان کا شمار دنیا کے ان دس ملکوں میں ہوتا ہے جن میں خالص خوراک نہیں ملتی اور جس میں دودھ سے لے کر آٹے تک میں ملاوٹ ہوتی ہے لیکن آج تک کسی عدالت نے ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا' پاکستان میں آج تک کسی ملاوٹ باز اور کسی جعل ساز کو پھانسی نہیں ہوئی' ہمارے ملک میں دنیا میں سب سے زیادہ ٹریفک حادثے ہوتے ہیں لیکن آج تک ان حادثوں کی روک تھام کیلئے کوئی قانون نہیں بنا اور تعلیم اور صحت ہر شہری کا بنیادی حق ہے لیکن آج تک پاکستان میں اس بنیادی حق کیلئے کوئی قانون نہیں بن سکا' ہم پاکستانی جب ان معاملات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے ہماری حکومت کو جب بھی پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ ماؤنٹ ایوریسٹ کے نیچے دیا جلا کر بیٹھ جاتی ہے اور ہماری حکومت زخمی کی مرہم پٹی کے بجائے اسے بانسری سنانا شروع کر دیتی۔ ہم عجیب لوگ ہیں جس رسم کو چھ ہزار سال کی تاریخ نہیں بدل سکی ہم اس کے سامنے ڈنڈے لے کر کھڑے ہیں لیکن جو مسائل ہماری معمولی سی توجہ سے حل ہو سکتے ہیں ہم ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے ہم واقعی بہت دلچسپ لوگ ہیں' برا قانون بنانے میں پوری دنیا میں کوئی ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

# چیف جسٹس صاحب کے حضور

میں 2004ء میں آسٹریا گیا' فاروق چودھری ویانا میں میرے میزبان تھے' چودھری صاحب اقوام متحدہ میں ملازمت کرتے ہیں اور پچھلے پچیس برسوں سے آسٹریا میں مقیم ہیں' مجھے آسٹریا یورپ کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھرا' پرسکون اور خوبصورت ملک لگا۔ ویانا شہر کے عین درمیان سے دریائے ڈینیوب گزرتا ہے' یہ دریا آگے چل کر آسٹریا کو سمندر سے ملاتا ہے' میں فاروق صاحب کے ساتھ ویانا شہر میں گھوم رہا تھا تو مجھے شہر کے درمیان سنہری رنگ کی ایک خوبصورت عمارت دکھائی دی' یہ شہر کی دیدہ زیب اور مصورانہ قسم کی عمارت تھی' مجھے چودھری صاحب نے بتایا' یہ ویانا کا ٹریٹمنٹ پلانٹ ہے' پورے ویانا شہر کا سیوریج یہاں آتا ہے' یہ پلانٹ سیوریج کے پانی کو صاف کرتا ہے' اسے گندگی' بو' جراثیم اور کیمیائی عناصر سے پاک کرتا ہے اور پھر یہ پانی دریائے ڈینیوب میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس پلانٹ کی وجہ سے ڈینیوب یورپ کا صاف ترین دریا ہے' مجھے یہ بات عجیب لگی لہٰذا میں نے چودھری صاحب سے پوچھا ''اس سارے تردد کی کیا ضرورت تھی' یہ لوگ سیوریج کا پانی براہ راست دریا میں پھینک دیتے'' چودھری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا ''آسٹریا کے لوگ اسے ظلم سمجھتے ہیں' ان کا خیال ہے پچھلی نسلوں نے انہیں ایک صاف ستھرا دریا دیا تھا لہٰذا ہمیں بھی آنے والی نسلوں کو ایک شفاف' رواں اور بے بو دریا دینا چاہیے' یہ لوگ دریاؤں' جنگلوں' پہاڑوں' جھیلوں اور پارکوں کو امانت سمجھتے ہیں

چنانچہ امانت کی طرح ان کی حفاظت کرتے ہیں" میں نے کہا" یہ ایک عجیب منطق ہے" چودھری صاحب نے فرمایا" یہ عجیب منطق نہیں' یہ عقل مندی ہے' آسٹریا کی حکومت نے پچاس برس پہلے تحقیق کرائی تو پتہ چلا اگر دریا آلودہ ہوگا تو آنے والے دنوں میں ویانا کا صحت کا بجٹ آٹھ گنا بڑھ جائے گا چنانچہ ان لوگوں نے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگانے کا فیصلہ کیا' آج ویانا کا صحت کا بجٹ یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں سے کہیں کم ہے" میں نے حیران ہو کر پوچھا" ٹریٹمنٹ پلانٹ کا صحت کے بجٹ سے کیا تعلق؟" چودھری صاحب مسکرائے" یہ دریا آسٹریا کی ہزاروں ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے' اس کا پانی جنگلوں' پارکوں اور جھیلوں تک پہنچتا ہے' یہ بارش کا باعث بھی بنتا ہے اور یہ مضافات کی آبی ضروریات بھی پوری کرتا ہے' اگر یہ پانی آلودہ ہوگا تو اس سے پیدا ہونے والی مچھلیاں' سبزیاں' پھل' بارش اور ہوا بھی زہریلی ہوگی' ماحول کا یہ زہر شہریوں کو بیمار کرے گا اور اس بیماری سے صحت کے بجٹ میں اضافہ ہو جائے گا چنانچہ آسٹریا کی حکومت نے ماحول اور شہریوں کو صحت مند رکھنے کے لئے دریا کی صفائی کا فیصلہ کیا لہٰذا آج ویانا کے لوگ صحت مند بھی ہیں اور ان کی عمریں بھی لمبی ہیں آپ کو آج اس دریا کی وجہ سے ویانا میں ہزاروں کی تعداد میں بوڑھے ملیں گے اور یہ سارے بوڑھے ٹھیک ٹھاک صحت مند ہوں گے"۔ میں ویانا کے اس ٹریٹمنٹ پلانٹ اور دریائے ڈینیوب کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے میری نظروں سے چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر جسٹس افتخار محمد چودھری کے چند ریمارکس گزرے اور مجھے ویانا کی وہ تمام خوبصورت دوپہریں اور شامیں یاد آ گئیں جو میں نے دریائے ڈینیوب کے صاف ستھرے پانیوں کے قریب بیٹھ کر گزاری تھیں' چیف جسٹس نے ایک مقدمے کے دوران ریمارکس دیئے" فیکٹریوں کے فضلات پانی میں پھینکنے سے ہیپاٹائٹس کا مرض پھیل رہا ہے لہٰذا فیکٹریوں کی گندگی دریاؤں اور نہروں میں نہ پھینکی جائے' سی ڈی اے نالہ لئی میں گندگی پھینکنے کا نوٹس لے" چیف جسٹس نے یہ ریمارکس سپریم کورٹ کے پانچ رکنی لارجر بنچ کی ایک سماعت کے دوران دیئے تھے' یہ بنچ ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں دائر ایک پٹیشن کیلئے تشکیل دیا گیا تھا۔ بنچ نے سماعت کے آخر میں ماحولیات کے ڈائریکٹر جنرل آصف شجاع کو اسلام آباد کے فیکٹری ایریا آئی نائن کا دو ہفتوں میں سروے کرنے اور چاروں صوبوں میں ماحولیاتی ٹریبونل بنانے کا حکم دیا۔

مجھے یہ احکامات اور چیف جسٹس کے ریمارکس پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی' چیف جسٹس کو اللہ تعالیٰ ایسے مزید احکامات جاری کرنے کی استطاعت عطا فرمائے' چودھری صاحب عدلیہ کی

تاریخ کے مقبول ترین چیف جسٹس ہیں۔ چیف جسٹس صاحب اخبارات میں چھپنے والی چھوٹی چھوٹی خبروں پر سوموٹو ایکشن لے لیتے ہیں اور اس ایکشن کے نتیجے میں ان سینکڑوں ہزاروں مظلوموں کو انصاف اور ریلیف ملتا ہے جو شاید برسوں عدالت کے دروازے تک نہ پہنچ پائیں۔ میں واپس موضوع کی طرف آتا ہوں، ہماری بزرگ نسل بتاتی ہے ان کی جوانی میں پاکستان کے تمام ندی، نالے، جھیلیں اور دریا صاف ستھرے تھے۔ 1970 تک راولپنڈی اور اسلام آباد کے شہری نالہ لئی کا پانی پیتے تھے۔ اس نالے کا پانی "منرل واٹر" ہوتا تھا کیونکہ مارگلہ کی وادی کے بے شمار چشمے اور جھرنے نالہ لئی میں شامل ہوتے تھے اور یہ آگے چل کر ہزاروں لوگوں کی ضرورت پوری کرتے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے لئی ایک گندے اور بدبودار نالے کی شکل اختیار کر گیا۔ دریائے سواں بھی کسی وقت اس علاقے کا انتہائی صاف ستھرا اور شفاف دریا تھا لیکن آج یہ دریا ہے اور نہ ہی اس کا صاف شفاف پانی، یہی صورتحال دریائے جہلم، چناب، ستلج اور راوی کی ہے۔ راوی کبھی ملکہ نور جہاں اور جہانگیر کا دریا ہوتا تھا لیکن آج کوے تک اس کا پانی نہیں پیتے، کیوں؟ فقط اس لیے کہ ہم لوگ سارا شہر کا گند، سیوریج اور کیمیائی فضلات ان دریاؤں، نہروں، ندیوں اور نالوں میں پھینک دیتے ہیں۔ ہماری آبادی میں جوں جوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہماری ندیوں، نالوں اور جھیلوں میں آلودگی بڑھ رہی ہے اور ہمیں اس آلودگی کا تاوان بیماری اور موت کی شکل میں ادا کرنا پڑ رہا ہے، یہ آلودگی آگے چل کر ہمارے کھیتوں اور باغوں تک پہنچتی ہے اور ہم لوگ اس آلودگی میں پروان چڑھنے والی سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں۔ ہمارے دیہات کے لوگ ان دریاؤں، نہروں اور ندی نالوں کا پانی پیتے ہیں۔ یہ ندی نالے زمین میں رس کر ہمارے آبی وسائل کو بھی آلودہ کر رہے ہیں اور یہ آلودگی نلکوں اور ٹونٹیوں سے ہو کر ہمارے معدوں تک پہنچ رہی ہے چنانچہ آج ہم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی طبی مسئلے کا شکار ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بیمار ہے، ہیپاٹائٹس اور کینسر دنیا کے مہلک ترین امراض ہیں اور اس آبی آلودگی کے باعث یہ دونوں امراض پاکستان میں بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں لہٰذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ پاکستان کی تمام سرکاری اور غیر سرکاری ہاؤسنگ سکیموں کو قانونی طور پر پابند کر دیں وہ اپنی سیوریج لائن کے آخر میں ویانا جیسے ٹریٹمنٹ پلانٹ لگائیں، عدالت تمام ٹاؤن کمیٹیوں، میونسپل کارپوریشنوں اور میٹروپولیٹن انتظامیہ کو بھی پابند کر دے کہ وہ اپنی اولین فرصت میں سیوریج کے ساتھ ٹریٹمنٹ پلانٹس لگائیں اور پاکستان میں اس وقت تک کسی ہاؤسنگ سکیم کو اجازت نہ دی

جائے جب تک وہ سکیم سیوریج کا ٹریٹمنٹ پلانٹ نہ خریدے اور یہ پلانٹ سیوریج لائن کے ساتھ لگانے کا تحریری معاہدہ نہ کرلے۔ میں ہاؤسنگ کے وفاقی وزیر سے بھی درخواست کر چکا ہوں' انہوں نے بھی اس پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا تھا لیکن میرا خیال ہے اس کے لیے بڑی سطح پر قانون سازی اور غور وفکر کی ضرورت ہے لہٰذا میری چیف جسٹس صاحب سے درخواست ہے وہ ٹریٹمنٹ پلانٹس کو بھی اپنے ایجنڈے کا حصہ بنالیں' وہ اس ملک کی اگلی نسل پر احسان کر جائیں' ہم آج کیا کھا رہے ہیں' کیا پی رہے ہیں' اس کو سامنے رکھ کر سوچیے ہماری آنے والی نسل کل کیا کھائے گی اور کیا پیئے گی' میری چیف جسٹس کے حضور درخواست ہے وہ کل عدالت میں بیٹھتے ہوئے 2010ء کا کیلنڈر دیکھ لیں اور اس کے بعد اپنے دریاؤں اور ندی نالوں پر نظر ڈالیں اور سوچیں ہمارے بزرگوں نے ہمیں کتنا صاف ماحول دیا تھا لیکن ہم اپنے بچوں کیلئے کیسا ماحول چھوڑ کر جا رہے ہیں' ہم انہیں کیا دے کر جا رہے ہیں۔

☼......☼......☼

# انصاف

لندن میں دن کے گیارہ بجے تھے اور یہ 9 مارچ کا دن تھا' میں چودھری عنصر محمود کا انتظار کر رہا تھا' عنصر پیشے کے لحاظ سے وکیل ہیں اور وہ لندن میں امیگریشن کا کام کرتے ہیں' عنصر نے مجھے واٹرلو سٹیشن پر چھوڑنا تھا' میں اس شام لندن سے پیرس جا رہا تھا' دن گیارہ بجے مجھے اچانک برمنگھم سے فون آیا اور کسی صاحب نے ہانپتے ہوئے بتایا "صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کو معطل کر دیا ہے' اس خبر نے لندن کی خنکی کو تپش میں تبدیل کر دیا' میں نے بارھویں منزل کے اس فلیٹ کی کھڑکی کھولی اور ایک لمبا سانس لیا' مجھے دو دن پہلے میاں شہباز شریف کا ڈنر یاد آ گیا' میاں صاحب نے مجھے کھانے کی دعوت دی تھی' ہم دونوں ایجویر روڈ کے ایک لبنانی ریستوران میں بیٹھ گئے اور تین گھنٹے تک پاکستان کے حالات پر گفتگو کرتے رہے تھے' میاں شہباز شریف کا کہنا تھا "میں دیکھ رہا ہوں پاکستان کے عوام سڑکوں پر کھڑے ہیں اور حکمران جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں" میں نے سوچا کیا اس شروعات کی شروع ہو چکی ہے' مجھے میاں نواز شریف سے اپنی ملاقات بھی یاد آ گئی' میاں صاحب کا کہنا تھا "فوجی حکمران ایک غلطی کے فاصلے پر کھڑے ہیں" میں نے سوچا "کیا یہ وہی غلطی ہے جو پھیل کر حکمرانوں کی ٹانگیں جلا دے گی" مجھے الطاف حسین سے ملاقات بھی یاد آ گئی 8 مارچ کو ایم کیو ایم کے انٹرنیشنل ہیڈ کوارٹر میں الطاف حسین سے میری گفتگو ہوئی تھی' اس گفتگو میں الطاف حسین نے دعویٰ کیا تھا "وہ دن دور

نہیں جب عوام کو اختیار ملے گا" میں نے سوچا "کیا عوام کو اختیار ملنے کا دن آ چکا ہے" کیمبرج سکوائر کے اس فلیٹ کے نیچے زندگی رواں دواں تھی' پورے لندن پر سورج چمک رہا تھا اور میں کھڑکی کھول کر اپنے ملک کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن میرے ہاتھ کوئی سرا نہیں آ رہا تھا۔

میرا سفر دو مارچ کو شروع ہوا' میں نے سات دن لندن رک کر پیرس جانا تھا' میں نے خود کو پندرہ دن چھٹی دے دی تھی' پورے ملک میں بم دھماکے ہو رہے تھے' پورے بیس دن تک روز کوئی نہ کوئی بری خبر ملتی تھی اور یہ خبر کانوں سے لے کر روح تک ہر چیز کو چھیل ڈالتی تھی لہٰذا میں نے حالات سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا لیکن برادرم عابد عبداللہ کا خیال تھا "اخبار نویسوں کو چھٹی نہیں ملا کرتی' لوگ کالموں کا انتظار کرتے ہیں' میں نے درمیان کا راستہ نکالا' میں نے ایڈوانس کالم لکھ دیئے' یہ سدابہار قسم کے کالم تھے' میرا خیال تھا' لوگوں کو میری غیر موجودگی کا اندازہ نہیں ہوگا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا نو مارچ آیا اور پاکستان میں ہر چیز تبدیل ہوگئی' لندن میں میرے پانچ ہدف تھے' میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف' میرے دوست پرویز رشید' بے نظیر بھٹو اور ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین' میں نے سوچا میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر پاکستان کے آنے والے سیاسی دنوں کا اندازہ لگاؤں گا لیکن بے نظیر بھٹو میرے لندن پہنچنے سے پہلے دبئی چلی گئیں لہٰذا میرے پاس صرف چار ہدف رہ گئے۔ میں میاں شہباز شریف کا "فین" ہوں' میں نے سوچا میں ان سے ان دنوں کی ناگفتہ تفصیلات سنوں گا جب انہوں نے پنجاب میں سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی' میاں شہباز شریف کو اقتدار سے فارغ ہوئے ساڑھے سات سال گزر چکے تھے لیکن مجھے ان ساڑھے سات برسوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس نے شہباز شریف کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف نہ کی ہو' شہباز شریف نے حقیقتاً پنجاب میں حکمرانی کا ایک نیا معیار طے کر دیا تھا لہٰذا ان کے بعد پنجاب کا تاج جس شخص کے سر پر بھی رکھا گیا وہ دانستگی یا غیر دانستگی میں شہباز شریف کا مقابلہ کرتا دکھائی دیا' آپ گورنر خالد مقبول کو دیکھ لیجئے یا وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی کا مطالعہ کر لیجئے آپ کو پنجاب کے یہ دونوں حکمران میاں شہباز شریف کے چیلنج کا مقابلہ کرتے دکھائی دیں گے' لندن کے بعد میں نے پیرس اور سویڈن جانا تھا' ان دونوں ملکوں میں میرے دوست مبشر شیخ اور مخدوم عباس رہتے ہیں' یہ دونوں غیر سیاسی اور غیر صحافتی قسم کے دوست ہیں لہٰذا میں ہمیشہ ان کی کمپنی کو "انجوائے" کرتا ہوں لیکن درمیان میں نو مارچ آ گیا چیف جسٹس آف پاکستان معطل ہوئے اور میری چھٹی کینسل ہو گئی اور میں پندرہ مارچ کو واپس آ گیا۔

چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے ساتھ کیا ہوا؟ کیا وہ اس سلوک کے مستحق تھے اور کیا صدر جنرل پرویز مشرف کو ایسا قدم اٹھانا چاہئے تھا؟ ان سوالوں کا جواب وقت دے گا اور یہ وقت زیادہ دور نہیں لیکن جہاں تک چیف جسٹس آف پاکستان کی ذات کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں' میری چیف جسٹس آف پاکستان کے ساتھ چند ملاقاتیں رہی ہیں' سپریم کورٹ کے دوسرے سینئر ترین جج جسٹس رانا بھگوان داس میرے مہربان اور دوست ہیں' رانا صاحب کے ساتھ میری اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں' رانا صاحب کی محفل میں بعض اوقات دوسرے جج حضرات بھی موجود ہوتے ہیں لہٰذا مجھے رانا صاحب کی رہائش گاہ پر چیف جسٹس کی شخصیت کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا' کسی صاحب اختیار کے کولیگ اور عام لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہوتا ہے' دنیا کا ہر شخص اپنے سینئر افسروں کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن دنیا کا کوئی شخص اپنے آپ کو اپنے جونیئر افسروں سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی دھوکہ دے سکتا ہے' لوگ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں' وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں یہ بات نقارہ خدا ہوتی ہے' عوامی پذیرائی پبلک امیج وہ عزت اور وہ ذلت ہوتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ دعویٰ فرماتے ہیں لہٰذا ہم لوگ کسی بھی شخص کا پبلک امیج دیکھ کر اس کے مستقبل کے بارے میں بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں' چیف جسٹس آف پاکستان ان دونوں معاملات میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں، میں نے ان کے کولیگس کے منہ سے ہمیشہ ان کی تعریف سنی، ان کے ساتھی ججوں کا کہنا تھا وہ انتہائی ان تھک شخص ہیں، وہ رات گئے تک دفتر میں کام کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی زیر التواء مقدمے نمٹانا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے کیس ملتوی کرنے پر پابندی لگا دی تھی وہ وکیلوں کو کیس لٹکانے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور وہ عدلیہ کے امیج کے بارے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے وغیرہ۔ چیف جسٹس کا پبلک امیج اس سے بھی کہیں آگے تھا۔ چودھری صاحب نے اپنے سوموٹو اختیار کو عوام کے لیے وقف کر دیا تھا انہوں نے سپریم کورٹ میں انسانی حقوق سیل قائم کیا۔ یہ سیل عام شہریوں کی سادہ کاغذ پر تحریر درخواستوں پر متحرک ہو جاتا تھا چنانچہ منو بھیل کا کیس ہو یا رسول بخش کی پولیس قبضے میں ہلاکت، ٹھل کی پانچ بچیوں کی زبردستی شادی کا مسئلہ ہو یا حیدر آباد میں تین نابالغ بچوں کی گرفتاری اور ٹنڈو آدم خان میں پانچ سالہ بچی کا رشتہ کرنے کا معاملہ ہو یا کوٹ غلام محمد میں بجلی کے کرنٹ سے تین بچوں کی ہلاکت چیف جسٹس نے ان تمام معاملات پر سوموٹو ایکشن لیا

اور خود کو عام شہری کا چیف جسٹس ثابت کیا۔ وہ روز اخبارات پڑھ کر سوموٹو ایکشن لیتے تھے اور آئی جی سے لے کر وزراء اور جاگیرداروں تک کو کورٹ میں طلب کر لیتے تھے لہٰذا ان کے دور میں عام شہریوں کو انصاف بھی ملا اور ریلیف بھی، پچھلے دو اڑھائی برسوں میں چیف جسٹس اور ان کا سوموٹو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا اگر ان کا مسئلہ چیف جسٹس تک پہنچ گیا تو انہیں ضرور ریلیف ملے گا، چودھری صاحب کے سوموٹو فیصلوں نے انہیں ریکارڈ مقبولیت عنایت کی یہاں تک کہ وہ عام لوگوں کی آخری امید بن گئے۔ چودھری صاحب نے عدلیہ کے وقار میں بھی اضافہ کیا، انہوں نے عوام میں انصاف کے خراب ہوتے امیج کو بھی سہارا دیا لہٰذا آج یہ ان کی مقبولیت کا نتیجہ ہے پاکستان کے عوام ان کے لیے سڑکوں پر کھڑے ہیں اور پاکستان کا بچہ بچہ حکومتی اقدامات کی مذمت کر رہا ہے۔

میں نے کل اپنے ایک دوست سے پوچھا ''اب کیا ہوگا'' اس نے ہنس کر جواب دیا نیولے کے منہ میں سانپ آگیا ہے، اگر نیولے نے سانپ نگل لیا تو وہ مارا جائے گا اور اگر اس نے سانپ اگل دیا تو سانپ کو اژدھا بنتے دیر نہیں لگے گی'' میرے دوست کا کہنا تھا۔ یہ وہی صورتحال ہے جو جنرل ضیاء الحق کو ذوالفقار علی بھٹو کے سلسلے میں درپیش تھی اس دور کے تجزیہ نگار کہتے تھے ''قبریں دو ہیں اور مردہ ایک'' میرے دوست کا کہنا تھا سپریم کورٹ کے ایشو نے ایک بار پھر ثابت کر دیا حکمرانوں کو وسیع القلب اور متحمل مزاج ہونا چاہیے، اگر صدر محترم 9 مارچ کو ذرا سا تحمل کا مظاہرہ کرتے، اگر وہ وسعت قلبی سے کام لیتے تو آج پاکستان کے کونے کونے میں آگ نہ لگتی اور آج حکومت کو عوام کی توجہ ہٹانے کیلئے ٹیلی ویژن چینلوں پر حملے نہ کرانا پڑتے، میرے دوست کا کہنا تھا ''حکومت کے بعض بہی خواہ صدر اور چیف جسٹس کی صلح کی کوشش کر رہے ہیں، یہ بہی خواہ چیف جسٹس سے جان کی امان طلب کر رہے ہیں، اگر چیف نے حکومت کو جان کی امان دے دی تو حکومت کیس واپس لے لے گی بصورت دیگر چیف جسٹس کا کیس عدالت سے گلیوں میں چلا جائے گا اور اس کا فیصلہ لوگ کریں گے'' میں نے اپنے دوست سے اتفاق کیا کیونکہ میں بھی سمجھتا ہوں جب عدالتوں اور حکومتی ایوانوں میں انصاف نہیں ہوتا تو پھر لوگ گلیوں اور سڑکوں پر انصاف کرتے ہیں اور ہم لوگ بدقسمتی سے بڑی تیزی سے ایوانوں سے سڑکوں کی طرف آ رہے ہیں، ہم اپنا انصاف لوگوں کے حوالے کر رہے ہیں۔

کاشف آزاد

# 358 برس بعد

وہ نارفوک کے علاقے مائیل ہام میں پیدا ہوا' اس کے والد نے اس کا نام کوک رکھا لیکن وہ سر ایڈورڈ کوک کے نام سے مشہور ہوا۔



ایڈورڈ کوک 1556ء میں نارویچ گرامر سکول میں داخل ہوا اور وہاں سے ہوتا ہوا ٹرینٹی کالج کیمبرج تک پہنچ گیا' ٹرینٹی کالج کا شمار دنیا کے نامور کالجوں میں ہوتا ہے' اس کالج نے دنیا کو سینکڑوں ہزاروں معروف لوگ دیئے' دنیا ٹرینٹی کالج پر ناز کرتی ہے لیکن ٹرینٹی کالج سر ایڈورڈ کوک پر فخر کرتا ہے۔ آج سر ایڈورڈ کوک کو ٹرینٹی کالج سے فارغ ہوئے 4 سو 32 برس ہو چکے ہیں لیکن کالج کی دیواروں' کالج کی لائبریری' کالج کے کیفے ٹیریا اور کالج کے لانوں میں آج بھی ایڈورڈ کوک کے نقش باقی ہیں' آپ آج بھی ٹرینٹی کالج میں داخل ہوں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے آپ ایڈورڈ کوک کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں اور یہ دنیا چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے قانون بنانے اور قانون کی حرمت بچانے والے کبھی فوت نہیں ہوتے' دنیا کا کوئی بادشاہ' کوئی حکمران اور کوئی آمر قانون سازوں کو نہیں مٹا سکتا' سر ایڈورڈ کوک 1578ء میں لندن بار کا ممبر بنا' وہ 1589ء میں برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر بن گیا' 1592ء میں وہ سولیسٹر جنرل اور ریکارڈر آف لندن بنا' 1593ء میں اسے دارالعوام کا سپیکر بنا دیا گیا اور وہ 1594ء میں وہ سر فرانسس بیکن کو شکست دے کر اٹارنی جنرل بن گیا' برطانیہ میں 1603ء بہت اہمیت کا حامل ہے' اس سال سٹوارٹ

خاندان کا ایک شہزادہ جیمز اول آگے بڑھا اور اس نے ٹیوڈر خاندان سے برطانیہ کا تخت چھین لیا' جیمز اول ایک طالع آزما اور آمرانہ فطرت کا بادشاہ تھا' وہ ملک کے تمام اختیارات اور اقتدار اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا' بادشاہ کی خواہش تھی اس کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو حکم الٰہی سمجھا جائے لیکن اس وقت تک برطانیہ کے عام شہری بیدار ہو چکے تھے لہٰذا ان پر حکمرانی جتانا آسان نہیں رہا تھا' جیمز اول ایک مکار شخص تھا' اس نے حالات کو بھانپ لیا چنانچہ اس نے عدالت کو ساتھ ملانے کا فیصلہ کیا' اس دور میں سر ایڈورڈ کوک کا طوطی بولتا تھا' جیمز اول نے 1606ء میں ایڈورڈ کوک کو چیف جسٹس بنا دیا' جیمز اول کا خیال تھا ایڈورڈ کوک چیف جسٹس بننے کے بعد اس کے غیر قانونی احکامات کی حمایت کرے گا اور یوں بادشاہ قانون کے لبادے میں رہ کر اپنے آمرانہ اختیارات سے لطف اندوز ہوتا رہے گا لیکن بادشاہ کے ارادوں پر بہت جلد اوس پڑ گئی کیونکہ ایڈورڈ کوک نے چیف جسٹس کا حلف اٹھایا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے سر پر سفید بالوں کی وگ اور جسم پر چیف جسٹس کا گاؤن دیکھا اور اپنے آپ سے پوچھا ''کیا تاریخ مجھے بادشاہ کا غلام نہیں کہے گی؟'' اس نے ایک لمبی سانس لی اور اس کی کایا پلٹ گئی۔



سر ایڈورڈ کوک نے بادشاہ کی بجائے عام شہری کا جج بننے کا فیصلہ کیا' اس نے برطانیہ کے مظلوم شہریوں کا ہاتھ پکڑ لیا' اس کا کہنا تھا ''جب تک قانون بادشاہ سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتا اس وقت تک ہم برطانوی معاشرے کو مہذب قرار نہیں دے سکتے'' اس کا کہنا تھا ''معاشروں کو قانون عزت دیتا ہے بادشاہ نہیں اور بدقسمتی سے برطانیہ قانون کی بجائے بادشاہوں کا ملک ہے'' آنے والے دنوں میں سر ایڈورڈ کوک کے خیالات نے شاہی خاندان کو ہلا کر رکھ دیا' بادشاہ پریشان ہو گیا لیکن اس کے پاس اس پریشانی کا کوئی مداوا نہیں تھا' سر ایڈورڈ کوک اس وقت تک اپنے فیصلوں کے ذریعے عام شہریوں کے دل میں گھر کر چکا تھا اور لوگ اس کی کارکردگی اور ایمانداری سے مطمئن تھے' 1610ء میں ایڈورڈ کوک نے برطانیہ کے شاہی خاندان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی' اس نے فیصلہ دیا ''بادشاہ قانون میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کر سکتا جس سے عام شہریوں کے حقوق متاثر ہو سکتے ہیں'' یہ فیصلہ بادشاہ کی اتھارٹی کو براہ راست چیلنج تھا' اس وقت تک بادشاہ کاغذ پر دو سطریں لکھ کر نہ صرف قانون کی کسی بھی شق کو معطل کر سکتا تھا بلکہ وہ کسی بھی وقت تمام شہری حقوق بھی ساقط کر سکتا تھا لیکن ایڈورڈ کوک کے اس فیصلے نے بادشاہ کے اختیارات کے سامنے قانون کی دیوار کھڑی کر دی۔ بادشاہ نے ایڈورڈ کوک کو دبانے کیلئے اسے

شاہی بینچ کا اضافی چارج دے دیا' اس دور میں سپریم کورٹ کے دو بینچ ہوتے تھے' ایک بینچ کامن لاء کہلاتا تھا جبکہ دوسرا کنگز بینچ تھا' کامن لاء کا چیف جسٹس عام شہریوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کرتا تھا جبکہ کنگز بینچ کا چیف جسٹس شاہی خاندان کے اختیارات اور حقوق کا محافظ ہوتا تھا' کنگز بینچ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہوتا تھا اور اس کا چیف جسٹس تخت کے سامنے جوابدہ تھا' بادشاہ کا خیال تھا ایڈورڈ کوک کنگز بینچ کا چارج لینے کے بعد قانونی لحاظ سے بے بس ہو جائے گا لیکن ایڈورڈ کوک کنگز بینچ کا چارج لینے کے باوجود خاموش نہ ہوا' وہ نہ صرف عام شہریوں کے حقوق کے لئے لڑتا رہا بلکہ وہ بادشاہ کے بے لگام اختیارات کو بھی چیلنج کرتا رہا' نومبر 1616ء کو اس وقت کے ''وصی ظفر'' فرانس بیکن نے بادشاہ کی شہ پر ایڈورڈ کوک کے خلاف ریفرنس دائر کر دیا اور بادشاہ نے اس ریفرنس کی بنیاد پر 14 نومبر 1616ء کو ایڈورڈ کوک کو معطل کر دیا۔ سر ایڈورڈ کوک کی معطلی کی خبر جوں ہی عام ہوئی برطانیہ کے شہریوں نے ہنگامہ کر دیا' لوگ سڑکوں پر آ گئے اور انہوں نے برطانیہ کا نظام درہم برہم کر دیا' یہ احتجاج ایک سال تک جاری رہا یہاں تک کہ حکومت 1617ء میں اسے رہا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ 1620ء میں برطانیہ میں الیکشن ہوئے تو لوگوں نے سر ایڈورڈ کوک کو بادشاہ کے حلقے سے الیکشن لڑایا' اسے الیکشن میں بھاری ووٹوں سے کامیاب کرایا اور اسے کندھوں پر اٹھا کر دارالعوام پہنچا دیا۔ پارلیمانی سر ایڈورڈ کوک آنے والے دنوں میں چیف جسٹس ایڈورڈ کوک سے زیادہ خطرناک نکلا۔ اس نے دارالعوام میں بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کر دیا۔ وہ جس دن دارالعوام میں تقریر کرتا تھا اس دن لندن کی گلیاں لوگوں سے بھر جاتی تھیں۔ لوگ پارلیمنٹ ہاؤس کی گیلری سے تقریر سنتے تھے اور باہر آ کر لوگوں کے سامنے یہ تقریر دہرا دیتے تھے' یہ تقریر منہ سے منہ اور شخص سے شخص تک ہوتی ہوئی پورے برطانیہ میں پھیل جاتی تھی' ایڈورڈ کوک نے اپنی تقریروں سے شاہی خاندان کو نفرت کا استعارہ بنا دیا۔ اس نے پارلیمنٹ میں فرانس بیکن کو رشوت خور بھی ثابت کر دیا۔ 1621ء میں حکومت نے اسے جیل میں پھینک دیا لیکن حکومت نو ماہ کی کوشش کے باوجود اس پر الزام ثابت نہ کر سکی۔ 1625ء میں جیمز اول کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ چارلس اول بادشاہ بن گیا۔ چارلس اول پرانے بادشاہ کے مقابلے میں کئی گنا آمر اور ظالم تھا۔ اس نے ایڈورڈ کوک پر حملے شروع کرا دیئے۔ ایڈورڈ کوک 1628ء کو پارلیمنٹ سے ریٹائر ہوا اور 1634ء کو انتقال کر گیا لیکن اس وقت تک وہ بادشاہ کے اختیارات میں دراڑ ڈال چکا تھا چنانچہ ایڈورڈ کوک کے انتقال کے بعد پارلیمنٹ اور تخت کے درمیان لڑائی

شروع ہوگئی' یہ جنگ پارلیمنٹ ہاؤس سے گلیوں میں پہنچی اور برطانیہ میں سول وار شروع ہوگئی، لوگوں نے بادشاہ چارلس اول کو پکڑا اور اسے 1649ء میں پھانسی دے دی، چارلس کی پھانسی کے بعد برطانیہ میں شاہی خاندان ختم ہوگیا اور اقتدار ''کونسل آف سٹیٹ'' کو منتقل ہوگیا۔ سر ایڈورڈ کوک کا مشن مکمل ہوگیا۔ 1660ء میں برطانیہ میں بادشاہت بحال ہوئی لیکن اس بادشاہت کے منہ میں آمریت کے دانت نہیں تھے۔

آج اس واقعے کو 358 برس گزر چکے ہیں لیکن لوگ آج بھی سر ایڈورڈ کوک کو یاد کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کا یہ قول دہراتے ہیں ''معاشرے اس وقت تک مہذب نہیں ہو سکتے جب تک ان میں قانون کی بجائے بادشاہ حکمران رہتے ہیں'' میں نے 16 مارچ 2007ء کو سر ایڈورڈ کوک کا یہ قول پڑھا اور سوچا' برطانوی بادشاہ جیمز اول' چارلس اول اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف میں کتنا فکری اشتراک پایا جاتا ہے' برطانوی بادشاہوں نے 351 برس پہلے سر ایڈورڈ کوک کو معطل کر دیا تھا اور ہمارے بادشاہ صدر جنرل پرویز مشرف نے 9 مارچ 2007ء کو ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو کیمپ آفس میں بلا کر ''غیر فعال'' کر دیا' میں نے سوچا کیا ہم مہذب معاشرے کی تعریف پر پورے اترتے ہیں' کیا ہم 358 برس بعد بھی ضمیر اور ایمان کے اس درجے پر پہنچ پائے ہیں جس پر 1649ء میں برطانیہ کے عوام تھے، میں نے اپنے آپ سے پوچھا' کیا ہم میں 358 برس بعد بھی اتنی جرأت نہیں کہ ہم اس ملک میں قانون، قانون کی حکمرانی اور چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کیلئے لڑ سکیں؟' کیا ہم آج بھی برطانیہ کے 358 برس پرانے معاشرے سے ہزاروں قدم پیچھے نہیں ہیں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال پوچھے اور لمبی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

# بڑی عدالت

یہ اپریل کی گیارہ تاریخ 2007ء کا دن تھا' صبح کے پونے دس بجے تھے اور کراچی ہائیکورٹ کا بار روم تھا' سینیٹر وسیم سجاد پی ایس او کی نج کاری کے کیس کی پیروی کیلئے کراچی آئے تھے' وسیم سجاد سماعت کے بعد کورٹ روم سے نکلے اور ٹہلتے ٹہلتے بار روم میں چلے گئے' بار روم میں اس وقت زیادہ وکلاء نہیں تھے' وسیم سجاد ایک میز پر بیٹھ گئے' انہوں نے چائے منگوائی اور آہستہ آہستہ چائے کی چسکیاں لینے لگے' دس بجے کے قریب وکلاء کا ایک دستہ بار روم میں داخل ہوا' انہوں نے وسیم سجاد کو دیکھا تو وہ ٹھٹک گئے اور انہوں نے وسیم سجاد کے خلاف چہ میگوئیاں شروع کر دیں' ان وکلاء میں صلاح الدین گنڈاپور بھی شامل تھے' وہ آگے بڑھے' وسیم سجاد کے پاس پہنچے اور ذرا سے تیز لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے "وسیم صاحب آپ بار روم سے باہر چلے جائیں" وسیم سجاد نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں پوچھا "کیوں؟" گنڈاپور نے اسی لہجے میں جواب دیا "آپ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف ریفرنس میں حکومتی وکیل ہیں' آپ قانون کے پیشے کی توہین کر رہے ہیں' ہم لوگ آپ کو پسند نہیں کرتے چنانچہ آپ فوراً بار روم سے چلے جائیں" وسیم سجاد نے چائے ختم کرنے کی مہلت مانگی لیکن گنڈاپور نے ساتھی وکلاء کی طرف اشارہ کیا اور وسیم سجاد کو بتایا "یہ لوگ مشتعل کھڑے ہیں' یہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیں" وسیم سجاد نے جونیئر وکلاء کی طرف دیکھا' وہ انہیں شعلہ بار نظروں سے گھور رہے تھے' وسیم سجاد معاملے کی سنگینی بھانپ گئے لہٰذا انہوں نے چائے چھوڑی اور بار روم سے نکل گئے' عینی

شاہدین کا کہنا ہے وہ بعدازاں ہائی کورٹ کے کینٹے ٹیریا میں گئے اور انہوں نے وہاں سے چائے پی۔

چیف جسٹس آف پاکستان کے معاملے میں اب تک تین قسم کی صورتحال سامنے آئی' پہلی صورتحال وکلاء کا اتحاد' ان کا ردعمل اور عدلیہ کے ساتھ ان کا اخلاص ہے' وکلاء نے چیف جسٹس کے حق میں سڑکوں پر نکل کر پوری دنیا کو حیران کر دیا' یہ وہ کام تھا جو پاکستان کی تاریخ میں بڑی سے بڑی سیاسی جماعت نہیں کر سکی' اگر دیکھا جائے تو صدر پرویز مشرف کو پچھلے ساڑھے سات برسوں میں پہلی بار کسی منظم ردعمل کا سامنا کرنا پڑا' اس معاملے میں کراچی سے طورخم اور سکردو سے چمن تک سارے وکلاء ہم خیال ہیں اور حکومت پوری کوشش کے باوجود ان میں "ڈنٹ" نہیں ڈال سکی' حکومت پوری کوشش کے باوجود وکلاء اور بار کونسلوں کو تقسیم بھی نہیں کر سکی' حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وکلاء کی تحریک مضبوط اور تیز ہوتی جا رہی ہے اور معاشرے کے دوسرے طبقے بھی اس میں شامل ہو رہے ہیں' دوسری صورتحال غیر فعال چیف جسٹس کی مقبولیت میں اضافہ ہے' حکومت کا خیال تھا چیف جسٹس وکلاء برادری' بیورو کریٹس' سیاستدانوں اور بزنس مینوں میں غیر مقبول ہیں اور یہ سارے طبقے ریفرنس کے بعد حکومت کا ساتھ دیں گے لیکن وکلاء' سیاستدانوں' میڈیا اور عام شہریوں نے غیر فعالیت کے بعد چیف جسٹس کو تاریخی اہمیت دی اور چودھری صاحب دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بنتے چلے گئے' یہاں تک کہ لوگ ان کے قلم' ان کے چشمے اور ان کے پھٹے ہوئے کوٹ کی لاکھوں روپے بولی لگانے لگے' لوگ آج ان کے ہاتھ چومتے ہیں اور ان کے حق میں وہ سارے نعرے لگاتے ہیں جن کیلئے پاکستان کے بڑے بڑے سیاستدان ترس رہے ہیں' 14 اپریل کو چیف جسٹس بار کونسل سے خطاب کے لئے سکھر گئے تھے' وہ جب سکھر ائیر پورٹ پر اترے تو آدھا شہر وہاں جمع تھا' چیف جسٹس کو جلوس کی شکل میں بار کونسل ہال تک لایا گیا' چیف جسٹس کا یہ استقبال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا اگر چیف جسٹس پاکستان کی دس بڑی بار کونسلوں میں خطاب کر لیں تو حکومت کے خلاف وہ تحریک شروع ہو جائے گی جو پچھلے سات برسوں میں مسلم لیگ' پیپلز پارٹی اور ایم ایم اے شروع نہیں کرا سکی اور تیسری وسیم سجاد جیسی صورتحال ہے' حکومت کو سپریم جوڈیشل کونسل میں اپنا موقف ثابت کرنے کے لئے وکیل نہیں مل رہے' چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کی شروعات نعیم بخاری نے کی تھی' نعیم بخاری نے فروری میں چیف جسٹس کے خلاف ایک کھلا خط لکھا تھا جس میں انہوں نے افتخار محمد چودھری کی ذات کو ہدف تنقید بنایا تھا' یہ خط پاکستان اور بیرون پاکستان بڑی سطح پر پڑھا گیا تھا لیکن حکومت نے

جوں ہی چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس دائر کیا نعیم بخاری کیلئے عدالتوں میں جانا مشکل ہو گیا' وہ پچھلے دنوں سندھ کی ایک عدالت میں پیش ہوئے تو وکلاء نے ان پر حملہ کر دیا' پنجاب کی ایک تحصیل میں ان کا ایک ہم شکل پٹ گیا اور ایک ریستوران میں ویٹروں نے انہیں کھانا دینے سے انکار کر دیا' حکومت نے ریفرنس کیلئے جناب شریف الدین پیرزادہ سے رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی انکار کر دیا' یہ شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے کسی حکومت کو پہلا انکار تھا' حکومت نے بڑی مشکل سے انہیں منایا اور وہ مئی کے مہینے میں عدالت میں پیش ہونے لگے' حکومت نے فخر الدین جی ابراہیم' ایس ایم ظفر اور حفیظ پیرزادہ سے بھی رابطہ کیا لیکن انہوں نے بھی "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" جیسا جواب دے دیا' حکومت نے سرکاری وکیلوں اور ایڈووکیٹ جنرلوں کو حکم دیا لیکن انہوں نے بھی استعفوں کی دھمکیاں دے دیں' اس نازک وقت میں صرف خالد رانجھا اور وسیم سجاد جیسے جرأت مند وکیلوں نے سر دھڑ کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا لیکن وہ بھی اس وقت شدید دباؤ کا شکار ہیں' خالد رانجھا کورٹس میں داخل نہیں ہو پا رہے' وہ اب سڑک پر بھی نہیں نکل پاتے' مختلف بار کونسلیں ان کی رکنیت منسوخ کر رہی ہیں جبکہ وسیم سجاد کے ساتھ ہونے والا سلوک آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ جس سے یوں محسوس ہوتا ہے اگر یہ مقدمہ لمبا چلا تو حکومت کے سارے گواہ بھاگ جائیں گے اور حکومت کیلئے اپنا دعویٰ ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔



مجھے اس سارے منظر میں وسیم سجاد کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز محسوس ہوتا ہے' یہ بنیادی طور پر معاشرے کا احتساب تھا' یہ واقعہ ثابت کرتا ہے جب معاشرہ کسی شخص کا احتساب کرتا ہے یا جب عام شخص کی عدالت کسی کے خلاف فیصلہ دیتی ہے تو "ملزم" کے پاس اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا' بالغ معاشرے عدالتوں سے باہر بھی فیصلے کیا کرتے ہیں اور یہ فیصلے معاشروں کا اصل حسن ہوتے ہیں' ذرا تصور کیجئے وسیم سجاد کے ساتھ جو کچھ کراچی ہائیکورٹ کے بار روم میں ہوا یا ان کے ساتھ جس لہجے میں صلاح الدین گنڈا پور نے گفتگو کی اگر یہ لہجے اور یہ صورتحال وسیم سجاد اور خالد رانجھا کے ساتھ پورے ملک میں پیش آنے لگے اور لوگ جہاز میں ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیں' انہیں ریستورانوں میں کھانا سرو نہ کیا جائے' یہ لوگ سٹوروں سے سودا سلف نہ خرید سکیں' سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباء ان کے بچوں کو روک کر سوال پوچھنا شروع کر دیں' لوگ ان کی تقریبات کا بائیکاٹ کر دیں' میڈیا انہیں بلانا چھوڑ دے اور لوگ ان کے ساتھ کھڑا ہونے سے پرہیز کرنے لگیں تو ان کا کیا بنے گا؟ میرا خیال ہے یہ لوگ بھی جلد دوسرے وکلاء کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور دوسرے لوگ بھی

حکومت کا ساتھ دینے سے پہلے دس دس مرتبہ سوچیں گے‘ ہم اگر اس صورتحال کو ذرا سا پھیلا کر دیکھیں‘ اگر ہم اس میں مارشل لاء لگانے والوں کو بھی شامل کر لیں‘ اگر ہم حکومتی پارٹیوں میں شامل ہونے والے سیاستدانوں اور وزراء کو بھی اس کیٹگری میں ڈال دیں اور اگر لوگ وسیم سجاد کی طرح ان کا احتساب بھی شروع کر دیں تو شاید پورے ملک کا قبلہ درست ہو جائے اور کوئی طالع آزما اس کے بعد ملک کے مقدر سے کھیلنے کی جرأت نہ کرے‘ عام شخص کی نظر اور عوام کی نفرت دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک معاشرے اس عدالتی نظام میں داخل نہیں ہوتے اس وقت تک ان میں ق اور پیٹریاٹ قسم کی سوچ جنم لیتی رہتی ہے‘ اس وقت تک وہ ترقی نہیں کرتے چنانچہ میرا خیال ہے جناب وسیم سجاد کے ساتھ ہونے والے سلوک کا کینوس ذرا سا وسیع ہونا چاہیے‘ یہ فارمولا دوسرے سیاستدانوں اور فوجی حکمرانوں پر بھی آزمایا جانا چاہیے‘ میں نے ایک بار برطانیہ کے ایک ریٹائرڈ جنرل سے پوچھا تھا ”کیا فوج برطانیہ میں مارشل لاء نہیں لگا سکتی“ اس نے فوراً جواب دیا تھا ”بالکل لگا سکتی ہے‘ دنیا کی ہر فوج اپنے ملک میں مارشل لاء لگا سکتی ہے“ میں نے اس کے بعد پوچھا ”پھر تم لوگ کیوں نہیں لگاتے“ اس نے بڑا خوبصورت جواب دیا تھا‘ اس کا کہنا تھا ”ہم مارشل لاء لگا تو لیں گے لیکن ہمارے عوام اسے تسلیم نہیں کریں گے“ اس گورے جرنیل سے مجھے معلوم ہوا تھا عوامی رائے دنیا کی سب سے بڑی عدالت ہوتی ہے اور جب تک یہ رائے نہیں جاگتی اس وقت تک قوموں کا مقدر سویا رہتا ہے‘ آج پانچ وکیلوں کی رائے نے حکومتی وکیل کو چائے کی پیالی ختم نہیں کرنے دی‘ ذرا سوچئے جب سولہ کروڑ لوگوں کی رائے جاگ اٹھے گی تو اس وقت ہمارے ان حکمرانوں کا کیا بنے گا جو آئین‘ قانون‘ دستور اور اخلاقیات پر دسترخوان بچھا کر کاک ٹیل پارٹیاں کر رہے ہیں‘ جو اس ملک کو ”سافٹ ٹارگٹ“ سمجھ رہے ہیں‘ میرا خیال ہے ہم بڑی تیزی سے اس بڑی عدالت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

# لیگل پروفیشنلز

وسیم سجاد صاحب ملک کے نامور سیاستدان اور قانون دان ہیں' وہ چیف جسٹس آف پاکستان کے خلاف دائر ریفرنس میں حکومت کے وکیل بھی ہیں' میں نے چند دن قبل ایک کالم میں وسیم سجاد کا ذکر کیا تھا' یہ کالم کراچی بار روم میں وسیم سجاد کے ساتھ پیش والے ایک واقعے کے بارے میں تھا' وسیم سجاد کراچی بار میں چائے پینے گئے تھے لیکن وہاں موجود ایک وکیل گنڈاپور نے انہیں بار روم سے چلے جانے کا "مشورہ" دیا اور وسیم سجاد اس مشورے کے احترام میں بار روم سے باہر چلے گئے' اس کالم کے ردعمل میں وسیم سجاد نے گزشتہ روز مجھے خط لکھا جس میں انہوں نے فرمایا" مجھے چائے پر کراچی بار کے چند وکلاء نے مدعو کیا تھا' چائے بھی وہاں بیٹھے وکیل ساتھیوں نے منگوائی تھی' آپ نے درست لکھا' بار روم میں اس وقت وکلاء کی تعداد کم تھی' یہ بھی درست ہے ایک وکیل جن کا نام بعد میں گنڈاپور صاحب معلوم ہوا وہ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے کہا تھا آپ یہاں سے چلے جائیں کیونکہ آپ وفاقی حکومت کے ریفرنس میں وکیل ہیں' یہ درست ہے میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے فوراً چلا گیا تھا لیکن میں نے ان سے کوئی بحث کی تھی اور نہ ہی مجھے وہاں کسی نے گھورا تھا' میں نے وہاں ناراض لہجہ بھی اختیار نہیں کیا تھا' مجھے اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی تھی' میں لیگل پروفیشن سے تعلق رکھتا ہوں اور ایک وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں' میں یہ کام صرف عدالت میں کروں گا' یہ ایک وکیل کا حق ہے' لوگ عدلیہ کی

آزادی کو بجا طور پہ اہمیت دیتے ہیں لیکن انتہائی اہم تصور وکالت کی آزادی بھی ہے' یہ جمہوری روایات کا حصہ ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وکیل جس جانب سے چاہے پیش ہو اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنے موکل کا دفاع کرے' اگر دفاع Case کی Popularity کی بنا پر کیا جائے تو پھر وکلاء اپنا فرض ادا نہیں کر سکیں گے۔ وکلاء نے ہمیشہ Rule of Law کیلئے جدوجہد کی ہے لیکن وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر ملک میں Rule of Law کا نفاذ ادھورا ہوگا"

میں نے وسیم سجاد کے قانونی اور "وکیلانہ" حق کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا ردعمل آپ کے سامنے پیش کر دیا لیکن جہاں تک ان کے موقف کا تعلق ہے تو مجھے اس سے اتفاق نہیں' میں اپنے اعتراضات کی وضاحت آگے چل کر کروں گا' ہم سر دست وسیم سجاد کے خط کی ابتدائی سطروں کی طرف آتے ہیں' وسیم صاحب نے تسلیم کیا گنڈاپور صاحب نے ان سے کراچی بار روم سے جانے کا "کہا" تھا اور وہ اس "کہا" کے "احترام" میں اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے چلے گئے تھے' وسیم سجاد نے یہ بھی تسلیم کیا گنڈاپور صاحب نے انہیں چیف جسٹس کیس میں حکومت کی وکالت پر بار روم سے نکل جانے کی "درخواست" کی تھی چنانچہ جناب وسیم سجاد کے ان دونوں اعترافات کے بعد صرف "بے عزتی" کے سائز اور وزن کا تخمینہ پیچھے رہ جاتا ہے' میں یہ سمجھتا تھا کراچی بار روم میں وسیم سجاد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ بے عزتی تھی لیکن وسیم سجاد اسے بے عزتی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں' ان کا خیال ہے کسی بار روم میں کوئی جونیئر وکیل کسی سینئر وکیل' کسی سابق چیئرمین سینٹ اور کسی سابق صدر کو چائے پینے سے روک دے یا حکومت کی وکالت کے جرم میں اسے بار روم سے چلے جانے کا حکم دے دے اور بار روم میں موجود وکلاء اس جونیئر وکیل کی "بد تمیزی" پر خاموش رہیں اور سینئر وکیل بار روم سے چپ چاپ نکل جائے اور اس بدتمیزی پر بار روم کی انتظامیہ جونیئر وکیل کے خلاف کسی قسم کی تادیبی کارروائی نہ کرے اور پاکستان بھر کے وکلاء اس جونیئر وکیل کو اس "بدتمیزی" پر مبارکباد پیش کریں تو یہ بے عزتی نہیں ہوتی' میں نے جب سے وسیم سجاد کا یہ جواز پڑھا ہے مجھے انشورنس ایجنٹوں کا ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے' آج انشورنس ایک باعزت اور قابل تقلید پیشہ ہے لیکن لوگ ابتدائی دنوں میں انشورنس کے تصور' انشورنس کمپنیوں اور انشورنس ایجنٹوں کو پسند نہیں کرتے تھے' یہ لطیفہ اس دور سے متعلق ہے' انشورنس کے ابتدائی دنوں میں کسی جونیئر انشورنس ایجنٹ نے اپنے سینئر سے شکایت کی "سر ہمارا پیشہ بہت اچھا ہے' ہمیں اس پیشے میں ایوارڈ اور ریوارڈ بھی ملتا ہے اور ہم لوگوں کو معاشی ضمانت بھی فراہم کرتے ہیں لیکن سر اس کے

باوجود ہمارے ساتھ لوگوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا' لوگ ہماری بے عزتی کرتے رہتے ہیں" سینئر نے جونیئر ایجنٹ کی شکایت سن کر قہقہہ لگایا اور جونیئر کی طرف دیکھ کر بولا "نوجوان تم لوگوں نے ایک آئیڈیل دور میں پروفیشن جوائن کیا' جب ہم لوگ اس پیشے میں داخل ہوئے تھے تو لوگ ہم پر کچرے کی ٹوکریاں الٹ دیتے تھے' وہ ہم پر کتے چھوڑ دیتے تھے اور پورا محلہ مل کر ہمیں گالیاں دیتا تھا لیکن ہماری بے عزتی کبھی نہیں ہوئی" سینئر رکا اور دوبارہ گویا ہوا "نوجوان بے عزتی صرف محسوس کرنے والی چیز ہوتی ہے' اگر تم محسوس نہ کرو تو دنیا کا کوئی شخص تمہاری بے عزتی نہیں کر سکتا لہٰذا جب بھی کوئی شخص تمہاری بے عزتی کرنے لگے تو تم فوراً ہمارے بارے میں سوچو اور محسوس کرنا بند کر دو' تمہاری بے عزتی نہیں ہوگی" اگر اس سینئر انشورنس ایجنٹ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو واقعی اس سارے کھیل میں وسیم سجاد کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی' وہ چائے پینے کیلئے بار روم گئے تھے "گنڈاپور صاحب نے انہیں اٹھا دیا' وہ چپ چاپ اٹھ کر باہر چلے گئے اور دوسری جگہ بیٹھ کر چائے پی لی لہٰذا اس میں بے عزتی والی کیا بات تھی!۔



وسیم سجاد نے خط میں اپنے لیگل پروفیشن پر بھی فخر کا اظہار کیا' میں ان کے اس اعزاز کو تسلیم کرتا ہوں یہ حقیقت ہے قانون دنیا کا باعزت ترین پروفیشن اور وکلاء معاشروں کے معزز ترین لوگ ہوتے ہیں' یہ لوگ مظلوموں کو انصاف لے کر دیتے ہیں اور اللہ اور معاشرے کی نظر میں انصاف دینے اور انصاف میں مدد دینے والے لوگ دونوں انتہائی معزز سمجھے جاتے ہیں' میں یہاں تک وسیم سجاد کے اعزاز سے اتفاق کرتا ہوں لیکن جوں ہی وہ فرماتے ہیں "میں وکیل کی حیثیت سے وفاقی حکومت کی نمائندگی کر رہا ہوں" تو ان سے میرے اختلافات شروع ہو جاتے ہیں' اس میں کوئی شک نہیں لیگل پروفیشن ایک نوبل پروفیشن ہوتا ہے لیکن اس پروفیشن کو نوبل رکھنا وکیل کی ذمہ داری ہوتی ہے' دنیا کا بہترین وکیل جب عدالت میں کھڑا ہو کر شیطان کی وکالت کرے گا یا وہ وقت کے فرعون' نمرود یا یزید کا وکالت نامہ لے کر عدالت میں چلا جائے گا تو اس کا پروفیشن صرف پروفیشن بن کر رہ جائے گا اس سے "نوبیلٹی" ختم ہو جائے گی' لوگ اس وکیل پر تف کریں گے اس میں کوئی شک نہیں' وسیم سجاد کل تک ایک "نوبل لیگل پروفیشنل" تھے لیکن آج انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا وہ صرف "پروفیشنل" بن چکے ہیں اور ان کے ایک وکالت نامے کی وجہ سے ان کے ساتھی ان سے نفرت کر رہے ہیں' ایمان اور ایمانداری کے بغیر پروفیشن پروفیشن نہیں رہتے وہ رنڈی کا کوٹھا بن جاتے ہیں اور میرے محترم وسیم سجاد کوٹھوں کے دور میں داخل ہو گئے ہیں لیکن ان کا اصرار ہے

ان کی اس ایمان فروشی کے باوجود ان کی عزت کی جائے انہیں تکریم دی جائے انہیں یہ عزت اب صرف بازار سے مل سکتی ہے معاشرے سے نہیں وسیم سجاد نے اپنے ردعمل میں "وکالت کی آزادی" کا ذکر بھی کیا' میں ان کی اس آزادی کا احترام بھی کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں' کیا معاشروں کیلئے وکالت کی آزادی ضروری ہوتی ہے یا انصاف کی' وسیم سجاد نے وکالت کی آزادی کو جمہوری روایات کا حصہ بھی قرار دیا' میں ان کی یہ بات بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں' وہ کس جمہوریت اور کون سی روایات کی بات کررہے ہیں' جس ملک میں وسیم سجاد جیسے قانون دان یونیفارم کے سائے میں پناہ لے لیں اور جس میں وسیم سجاد جیسے "لیگل پروفیشنل" سینٹ کے ٹکٹ کیلئے اپنی وفاداریاں اور اپنی سیاسی وابستگیاں بدل لیں اس ملک میں روایت اور جمہوریت کہاں باقی رہتی ہے۔

وسیم سجاد نے فرمایا "وکلاء نے ہمیشہ رول آف لاء کیلئے جدوجہد کی اور وکالت کی آزادی کے تحفظ کے بغیر رول آف لاء کا نفاذ ادھورا ہوگا" میں ان کے اس نکتے سے بھی اتفاق کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ان سے یہ پوچھنے کی جسارت بھی کرتا ہوں' اگر وسیم سجاد اور خالد رانجھا رول آف لاء کے لئے لڑ رہے ہیں تو ملک کے باقی ڈیڑھ لاکھ وکیل کس کیلئے لڑ رہے ہیں' یہ لوگ کالے کوٹ پہن کر ہر تیسرے دن سڑک پر کیوں آجاتے ہیں اور یہ لوگ سپریم کورٹ کے سامنے احتجاج کیوں کررہے ہیں' وسیم سجاد نے اپنے خط میں جمہوری روایات کا حوالہ دیا تھا' میں ان سے عرض کرنا چاہتا ہوں جمہوریت کا پہلا اصول اکثریت ہوتی ہے' جمہوریت میں اکثریت ہمیشہ سچی اور اقلیت جھوٹی ہوتی ہے لیکن چیف جسٹس کے معاملے میں حکومت اور وسیم سجاد دونوں یہ اصول ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں' اس معاملے میں وسیم سجاد اور خالد رانجھا جیسے دو "لیگل پروفیشنل" خود کو سچا کہتے ہیں جبکہ فخر الدین جی ابراہیم سے ایس ایم ظفر تک باقی ڈیڑھ لاکھ وکیلوں کو غلط اور غیر جمہوری سمجھتے ہیں' کیا یہ سچ ہے؟ میں آخر میں مزید وسیم سجاد سے پوچھنا چاہتا ہوں معاشروں کو رول آف لاء چاہیے یا رول آف جسٹس' اگر معاشروں کو رول آف جسٹس چاہیے تو پھر ہمیں ماننا پڑے گا اس کنگڈم آف جسٹس کا چیف اس وقت خود انصاف مانگ رہا ہے اور وسیم سجاد اور خالد رانجھا جیسے "لیگل پروفیشنلز" اس انصاف کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کررہے ہیں۔

(نوٹ:۔ اگر جناب وسیم سجاد اور خالد رانجھا چیف جسٹس آف پاکستان کا کیس سپریم کورٹ کے بجائے اخباری صفحات اور کالموں میں لڑنا چاہیں تو میں حاضر ہوں)

# وہ کون ہے؟

کراچی کی ایک شاہراہ پر تین نعشیں پڑی تھیں' نعشوں کے قریب ایک گاڑی جل رہی تھی اور پورے شہر سے دھواں اٹھ رہا تھا' اس نے اخبار میرے سامنے رکھا اور ان نعشوں پر انگلی رکھ کر پوچھا ''یہ کون لوگ ہیں'' میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا' اس نے ذرا دیر بعد دوسرا سوال کیا ''انہیں کس نے مارا'' میں اس سوال پر بھی خاموش رہا' اس نے ذرا توقف کے بعد تیسرا سوال کیا ''یہ سب کون کر رہا ہے'' لیکن میرے پاس اس سوال کا جواب موجود تھا' میں نے فوراً جواب دیا ''خوف۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے اس سے عرض کیا ''بزرگ کہتے ہیں ہاتھی جب خوفزدہ ہوتا ہے تو وہ جنگل میں اندھا دھند بھاگتا ہے اور وہ راستے میں آنے والی ہر چیز کو کچلتا چلا جاتا ہے' طاقتور لوگ بھی ہاتھی کی طرح ہوتے ہیں' یہ لوگ جب خوفزدہ ہوتے ہیں تو یہ بھی راستے کی ہر رکاوٹ گراتے چلے جاتے ہیں'' میں رکا اور دوبارہ عرض کیا ''یہ طاقتور لوگ خوف کے عالم میں ہمیشہ نعشوں کے پیچھے پناہ لیتے ہیں'' وہ بڑی دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا' اس نے آخر میں ایک لمبی آہ بھری' اخبار اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

یہ بارہ مئی کی آہ تھی' 9 مارچ اور 12 مئی کے درمیان واقعات کا ایک سمندر حائل ہے' دیکھنے والے واقعات کی رفتار اور ترتیب پر حیران ہیں' 9 مارچ 2007ء سے پہلے صدر پرویز مشرف حکومت کے پاس بے شمار راستے تھے' حکومت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اور سپریم

کورٹ آف پاکستان کے اختیارات کو تسلیم کر لیتی' عدالت کے تمام احکامات پر چپ چاپ عملدرآمد کرتی اور اپنی نیک نامی میں اضافہ کرتی رہتی' صدر صاحب وعدے کے مطابق یونیفارم اتارتے اور مقبول ترین سویلین لیڈر کی حیثیت سے دوبارہ مسند صدارت پر فائز ہو جاتے اور حکومت بے نظیر بھٹو کے ساتھ ڈیل کر لیتی' اکتوبر میں الیکشن کراتی اور اگلے پانچ برس کیلئے اقتدار میں آ جاتی لیکن پھر اچانک نو مارچ آیا اور حکومت کیلئے ''آپشن'' محدود ہوتے چلے گئے' میں نے چند دن پہلے ایک سابق سیکرٹری سے پوچھا تھا' صدر صاحب بڑے سکون سے حکومت کر رہے تھے' انہیں 9 مارچ کا ''کٹا'' کھولنے کی کیا ضرورت تھی' سیکرٹری صاحب نے مسکرا کر جواب دیا ''یہ بحران صدر صاحب نے پیدا نہیں کیا تھا' یہ آمریت اور اتھارٹی کا پیدا کردہ کرائسس تھا' آمریت کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتی' وہ ہمیشہ بحران پیدا کرتی ہے'' میں نے ان کی بات سنی اور خاموش ہو گیا' نو مارچ کے بعد بھی حکومت کے پاس تین آپشن تھے' حکومت چیف جسٹس کے خلاف دائر ریفرنس واپس لے لیتی جس کے نتیجے میں سارا ایشو ''فیوز'' ہو جاتا' حکومت سپریم جوڈیشل کونسل پر ''ورک'' کرتی اور اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر لیتی اور تین حکومت میرٹ پر فیصلے کا انتظار کرتی' اگر سپریم کورٹ چیف جسٹس کو بحال کر دیتی تو حکومت یہ فیصلہ چپ چاپ قبول کر لیتی لیکن ان تینوں آپشنز سے پہلے ایک نئی صورتحال نے جنم لے لیا' چیف جسٹس نے ملک بھر کے دورے شروع کر دیے اور ان کے اعزاز میں تاریخی جلوس نکلنے لگے' لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر آ گئے' اس صورتحال کے بعد بھی حکومت کے پاس ایک راستہ موجود تھا حکومت چیف جسٹس کو جلسے جلوس اور ریلیوں کی کھلی اجازت دے دیتی' ملک میں گرمی کی شدید لہر آ چکی تھی' لوگوں کیلئے دو ہفتے بعد باہر نکلنا مشکل ہو جانا تھا' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے چودھری شجاعت حسین نے حکومت کو یہ مشورہ دیا تھا' صدر صاحب اس پر رضامند بھی تھے لیکن اس میں ایک خطرہ تھا اپوزیشن پارٹیاں تیزی سے چیف جسٹس کے سائے میں پناہ لے رہی تھیں اور حکومت کے بعض بہی خواہوں کا خیال تھا یہ چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل کر سیلاب کی شکل اختیار کر لیں گے اور یہ سیلاب آنے والے دنوں میں ساری حکومت کو بہا لے جائے گا چنانچہ حکومت نے سیلاب کے سامنے بند باندھنے کا فیصلہ کر لیا' ایک طرف یہ سارے آپشن چل رہے تھے اور دوسری طرف حکومت ججوں پر بھی ''ورک'' کر رہی تھی' ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی نے دو ہفتے قبل سپریم کورٹ کے سینئر ترین جج اور قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس سے ملاقات کی کوشش کی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا' حکومت

نے نواب سرفراز نام کے ایک شخص کے ذریعے بھی ججوں سے رابطوں کی کوشش کی' رانا صاحب کے ایک استاد لاڑکانہ سے اسلام آباد تشریف لائے اور انہوں نے بھی دبے دبے لفظوں میں "ملاقات" کی سفارش کی لیکن رانا صاحب نے ملاقات' گفتگو اور رابطے سے صاف انکار کر دیا' چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو نے بھی کراچی میں قائم مقام چیف جسٹس سے ملاقات کی کوشش کی لیکن انہیں بھی شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا' سومرو صاحب بعد ازاں سپریم کورٹ کے ایک سینئر جج سے ملنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جج صاحب نے انہیں مشورہ دیا حکومت کیلئے ایک ہی آبرومندانہ راستہ بچا ہے وہ ریفرنس واپس لے لے' سومرو صاحب نے اوپر رابطے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گئے لیکن تاحال ان کا اوپر رابطہ نہ ہو سکا' سومرو صاحب نے چند روز پہلے لاہور ایئرپورٹ پر چیف جسٹس افتخار محمد چودھری سے بھی ملاقات کی تھی' یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی اور اس ملاقات میں بھی انہوں نے چیف جسٹس کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی لیکن چیف جسٹس نے "سمجھنے بجھنے" سے انکار کر دیا تھا' مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کو اس بحران سے نکالنے کیلئے تین شخصیات کام کر رہی ہیں ان میں محمد میاں سومرو' شریف الدین پیرزادہ اور ڈی جی آئی ایس آئی شامل ہیں۔



اب آتے ہیں 12 مئی کے بحران کی طرف' یہ بحران حکومت کے ایک "جادوگر" نے پیدا کیا تھا' اس جادوگر کا کہنا تھا پاکستان کی عدالتیں سڑکوں کی صورتحال کو سامنے رکھ کر فیصلے دیتی ہیں' چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی زندگی کے تیس برس عدالتوں میں گزرے ہیں وہ عدالتوں کی اس نفسیات سے واقف ہیں چنانچہ وہ جان بوجھ کر دورے کر رہے ہیں' وہ سڑکوں پر لوگوں کو اکٹھا کر رہے ہیں اور ان کی اس حکمت عملی کا اثر عدالتوں پر ظاہر ہو رہا ہے' اس جادوگر کا کہنا تھا عدالت نے چیف جسٹس کی مقبولیت دیکھ لی ہے لہٰذا وہ اب کوئی ایسا فیصلہ نہیں دے گی جس سے عوام میں عدلیہ کا امیج خراب ہو اور اگر فرض کریں عدالت چیف جسٹس کے خلاف فیصلہ دے بھی دے تو بھی لوگ اسے قبول نہیں کریں گے چنانچہ اب حکومت کو بھی اپنا مقدمہ سڑکوں پر لڑنا چاہیے' اسے بھی چیف جسٹس اور اپوزیشن کی طرح اپنی سٹریٹ پاور کا مظاہرہ کرنا چاہیے' اسے بھی ریلیاں نکالنی چاہئیں' حکومت نے جادوگر کا مشورہ مان لیا چنانچہ پہلے مئی کے شروع میں اسلام آباد میں حکمران پارٹی نے ریلی نکالی اور اس کے بعد 12 مئی کو کراچی کی حکمران جماعت ایم کیو ایم کو وہاں عوامی طاقت کے بھرپور "مظاہرے" کا موقع دے دیا گیا' حکومت کی اس کھلی چھٹی کے بعد جوں ہی چیف جسٹس نے کراچی ایئرپورٹ پر قدم رکھے' ان کے قدموں میں 34 نعشیں ڈال دی گئیں' اسی شام صدر

نے اسلام آباد میں عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر سے خطاب کیا اور کراچی کے واقعات کو "عوامی طاقت" قرار دیا' ابھی کراچی کے قتل عام کے دھبے نہیں دھلے تھے کہ 14 مئی کو سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کو قتل کر دیا گیا' سید حماد رضا ڈی ایم جی افسر تھے اور انہیں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری ڈیپوٹیشن پر سپریم کورٹ لائے تھے' وہ چیف جسٹس کے سٹاف افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے اور ان کے بہت قریب سمجھے جاتے تھے' سید حماد رضا کے قتل نے ایک بار پھر سارے نظام کو ہلا کر رکھ دیا' 14 مئی کی سہ پہر جب سپریم کورٹ کے سینئر جج تعزیت کیلئے حماد رضا کے گھر پہنچے تو مرحوم کی بیوہ شبانہ حماد نے اسے "ٹارگٹ کلنگ" قرار دیا' ان کا کہنا تھا خفیہ اداروں کے اہلکار ان کے خاوند کو پچھلے کئی دنوں سے "ڈی بریفنگ" کیلئے بلا رہے تھے' ڈی بریفنگ کے ان سیشن کے دوران حماد رضا سے چیف جسٹس اور ان کی فیملی کے بارے میں پوچھا جاتا تھا' حماد رضا کو وعدہ معاف گواہ بننے کی پیش کش بھی کی گئی تھی لیکن حماد رضا نے انکار کر دیا جس پر اسے قتل کر دیا گیا' حماد رضا کی بیوہ کا کہنا تھا یہ قتل بنیادی طور پر ججوں کیلئے وارننگ ہے' اگر ہم 9 مارچ کے بعد میڈیا کی صورتحال دیکھیں تو یہ بھی سید حماد رضا سے ملتی جلتی ہے' ان دو ماہ میں دو مقبول ٹیلی ویژن چینلز پر حملے ہو چکے ہیں' 12 مئی کو "آج" ٹیلی ویژن پر ہونے والا حملہ انتہائی افسوسناک تھا' اس حملے کے دوران "آج" کے کارکن جس کرب سے گزرے اور انہوں نے جس صورتحال میں اپنی پروفیشنل ذمہ داریاں پوری کیں اس نے بھی عالمی سطح پر حکومت کا امیج ٹھیک ٹھاک خراب کیا۔

ہم اگر موجودہ صورتحال کا تجزیہ کریں تو یوں محسوس ہوتا ہے کوئی طاقت میڈیا' ججوں اور عوام تینوں کو ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے' کوئی ہے جو خوف کے عالم میں پورے معاشرے کو خوفزدہ کر رہا ہے' وہ کون ہے! میرا خیال ہے اس کا نام صدر پرویز مشرف ہے!

# ہم لوگوں نے تو

وہ شخص تپتی دوپہر میں سڑک پر دیوانہ وار ناچ رہا تھا' کیمرہ کبھی اس کے چہرے پر آتا تھا' کبھی اس کے حرکت کرتے ہاتھوں کو "زوم" کرتا تھا اور کبھی اس کے ننگے پاؤں کو "فوکس" کر لیتا تھا' آسمان سے آگ برس رہی تھی اور سڑک دوزخ کی طرح تپ رہی تھی لیکن وہ شخص سرمستی کے عالم میں ناچتا چلا جا رہا تھا' غیر فعال چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا قافلہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا' ڈھول والے ڈھول پیٹ رہے تھے اور لاؤڈ سپیکر سے نعرے بلند ہو رہے تھے' کیمرہ مین ایک لمحے کیلئے ہجوم کی طرف گھوما تو تاحد نظر گاڑیاں ہی گاڑیاں اور لوگ ہی لوگ تھے' افتخار محمد چودھری کبھی کبھی ہاتھ گاڑی سے باہر نکال کر لہراتے تھے اور لوگ ان کا ہاتھ دیکھ کر دیوانہ وار نعرے لگاتے تھے۔



میرے دوست نے ٹیلی ویژن کی آواز بند کی اور میری طرف مڑ کر بولا "کیا واقعی چیف جسٹس اتنے پاپولر ہیں" میں نے فوراً نفی میں سر ہلا دیا' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ٹیلی ویژن سکرین پر نظر ڈال کر بولا "پھر یہ کیا ہے!" میں نے جواب دیا "یہ حکومت کی غیر مقبولیت ہے" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا' میں نے عرض کیا "9 مارچ تک افتخار محمد چودھری ایک غیر مقبول چیف جسٹس تھے' وہ وکلاء' بیورو کریسی اور ساتھی ججوں میں زیادہ پسند نہیں کئے جاتے تھے' وہ بھری عدالت میں سینئر وکلاء کو ڈانٹ دیتے تھے' وہ وکلاء کی درخواست پر کیس بھی

Kashif Azad@OneUrdu.com

ملتوی نہیں کرتے تھے' وہ بیوروکریسی کے ساتھ بھی بہت تلخ تھے وہ ایس ایچ او سے آئی جی اور ڈی سی او سے چیف سیکرٹری تک سب کو "ٹف ٹائم" دیتے تھے' وہ ساتھی ججوں میں پاپولر نہیں تھے' انہوں نے چیف جسٹس بننے کے بعد برسوں سے زیر التوا مقدمے نمٹانا شروع کر دیئے تھے' وہ خود بھی رات گئے تک دفتر بیٹھتے تھے اور ساتھی ججوں کو بھی بٹھائے رکھتے تھے' ان کے ساتھیوں کو پانچ پانچ بجے تک چائے نصیب نہیں ہوتی تھی' کام کی کثرت کے باعث چار جج دل کے مریض بن گئے جبکہ زیادہ تر ہائی بلڈ پریشر اور ٹینشن کا شکار ہو گئے' چودھری صاحب کی ذات سے اگر کسی کو فائدہ پہنچا تو وہ صرف عام لوگ تھے' چیف جسٹس اخبار پڑھ کر سوموٹو ایکشن لے لیتے تھے جس کے نتیجے میں ان مظلوموں کو ریلیف مل جاتا تھا جن کی وکیل اور عدالت تک رسائی نہیں ہوتی تھی لہٰذا اگر سچ بولا جائے تو وہ وکلاء' بیوروکریسی اور ساتھی ججوں میں غیر مقبول اور چند ہزار عام شہریوں میں مقبول تھے" میرے دوست نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ٹیلی ویژن سکرین کی طرف دیکھ کر بولا "لیکن پھر یہ ہجوم" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "یہ ہجوم حکومت کے خلاف ریفرنڈم ہے' عوام بنیادی طور پر حکومت سے تنگ تھے' آمر سونے کا بنا ہو اور وہ لوگوں کو چاندی کے نوالے بھی کھلاتا ہو تو بھی عوام اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کرتے" میرے دوست نے بڑی بے صبری سے پوچھا "لیکن کیوں" میں نے عرض کیا "اس کی دو بڑی وجوہات ہوتی ہیں' اول آمر کو اقتدار میں رہنے کیلئے بے شمار سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں اور ان میں سے ہر سمجھوتہ عوام کی رگوں سے نکلتا ہے اور دوم آمر ہمیشہ طاقت کا بہیمانہ استعمال کرتا ہے اور عوام یہ دونوں چیزیں برداشت نہیں کرتے چنانچہ ان کے دلوں میں آمر کے خلاف نفرت جنم لینے لگتی ہے' ہماری حکومت اور ہمارے جنرل صاحب کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا' جنرل پرویز مشرف کو اقتدار میں رہنے کیلئے امریکی ایجنڈے سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا' انہیں افغانستان میں امریکی آپریشن کی حمایت کرنا پڑی' وہ طالبان اور مجاہدین کی گرفتاریوں پر بھی مجبور ہوئے' انہوں نے جنوبی وزیرستان اور قبائلی علاقوں میں بھی فوجی آپریشن کئے' انہیں بلوچستان میں فوج کشی بھی کرنا پڑی اور وہ مشرقی روایات میں گوندھے معاشرے کو روشن اور اعتدال پسند بنانے پر بھی مجبور ہو گئے' یہ سارے سمجھوتے عوام کو پسند نہ آئے' ہمارے صدر سات برسوں میں عوام کیلئے بھی کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے تھے' ان سات برسوں میں پٹرول کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا' آٹا' دالیں' گھی' چینی اور چاولوں کے نرخ دوگنا ہو گئے' ٹرانسپورٹ کے کرایوں میں سہ گنا اضافہ ہوا' بجلی' گیس اور پانی کے بل کہیں سے کہیں پہنچ گئے' تعلیم

صحت اور روزگار عام شہری کی زندگی سے دور ہو گیا اور بے روزگاری اپنی انتہائی سطح کو چھونے لگی' اس کے علاوہ ملک میں امن وامان اور سیکورٹی کے مسائل بھی پیدا ہو گئے' لوگ دن دیہاڑے لٹنے لگے' پولیس چوروں اور ڈاکوؤں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گئی' ڈاکوؤں اور چوریوں کی وجہ سے ہر دوکاندار اور ہر صاحب حیثیت شخص گھر پر سیکورٹی گارڈز رکھنے پر مجبور ہو گیا' موٹر وے تک پر گاڑیاں لٹنے لگیں اور موبائل چھیننے کی وارداتیں معمول بن گئیں' عام شہری اس سے بھی بری طرح متاثر ہوا' جنرل صاحب احتساب کا نعرہ لگا کر اقتدار میں آئے تھے' نیب نے شروع میں غیر جانبداری دکھائی' ماضی کے تمام کرپٹ سیاستدان گرفتار کر لئے گئے لیکن پھر ان تمام کرپٹ سیاستدانوں کو جمع کر کے حکومتی پارٹی بنائی گئی اور اس پارٹی نے بعد ازاں جنرل صاحب کو یونیفارم اور صدارت کا تحفہ دیا' اس سارے کھیل کے دوران احتساب کا عمل غیر جانبداری کھو بیٹھا اور لوگ قومی احتساب بیورو کو سر عام الیکشن کمیشن کہنے لگے' اس کے بعد رہی سہی کسر گھروں سے غائب ہونے والے لوگوں نے پوری کر دی' یہ لوگ اپنے خاندانوں' عزیزوں' رشتے داروں' محلوں اور شہروں میں ایماندار اور نیک سمجھے جاتے تھے' یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کا الزام خفیہ اداروں اور حکومت پر لگا تو عوام کا خون کھول اٹھا' ان حالات میں لوگوں کو حکومت کے خلاف کھڑا ہونے کیلئے کوئی بہانہ چاہیے تھا' یہ لوگ کسی بڑے واقعے کے منتظر تھے اور 9 مارچ 2007ء کو انہیں وہ بہانہ بھی مل گیا اور افتخار محمد چودھری کی شکل میں لیڈر بھی لہٰذا آج لوگ 50 سینٹی گریڈ کی گرمی میں سڑکوں پر کھڑے ہیں'' میں خاموش ہو گیا۔

میرے دوست نے پوچھا ''کیا تم افتخار محمد چودھری کو لیڈر سمجھتے ہو'' میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا' میرا دوست غور سے میری طرف دیکھنے لگا' میں نے عرض کیا'' پاکستان میں اس وقت تین بڑے لیڈر ہیں' محترمہ بے نظیر بھٹو' نواز شریف اور الطاف حسین لیکن بدقسمتی سے یہ تینوں لیڈر ملک سے باہر ہیں' ان میں سے الطاف حسین حکومت کے اتحادی ہیں' بے نظیر بھٹو ایک کچی پکی ڈیل میں بندھی ہوئی ہیں جبکہ میاں نواز شریف کسی اچھے وقت کے انتظار میں لندن میں بیٹھے ہیں' میرا دعویٰ ہے اگر یہ لوگ 2005ء کے بعد ملک میں ہوتے تو اس وقت حالات ان کے ہاتھ میں ہوتے لیکن یہ لوگ ملک میں آنے کی جرأت نہ کر سکے اور جرأت لیڈروں کا پہلا وصف ہوتی ہے' عوام بھاگنے یا پشت دکھانے والے لوگوں کو پسند نہیں کیا کرتے' ان حالات میں افتخار محمد چودھری سامنے آئے اور لوگ ان کے گرد جمع ہوتے چلے گئے' تم بتاؤ لوگوں کو چودھری صاحب کی

کس خوبی نے متاثر کیا" وہ خاموش رہا' میں نے عرض کیا" وہ 9 مارچ کو حکومت کے سامنے پسپا نہیں ہوئے تھے' وہ حکومت کے سامنے ڈٹ گئے تھے چنانچہ لوگوں نے انہیں کندھے پر اٹھالیا' میں اس فقید المثال استقبال کے باوجود یہ سمجھتا ہوں وہ لیڈر ہیں اور نہ ہی وہ زیادہ دیر تک اس صورتحال کو سنبھال سکیں گے' یہ صورتحال اپنے نئے گارڈ فادر پیدا کرے گی اور یہ گارڈ فادر آگے چل کر فائدے اٹھائیں گے" میں خاموش ہوگیا' میرے دوست نے آخری سوال پوچھا" کیا حکومت سمجھوتے پر مجبور ہو جائے گی" میں نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلا دیا' میں نے عرض کیا" چیف جسٹس سپریم کورٹ سے بحال ہو جائیں گے لیکن حکومت اس فیصلے کو قبول نہیں کرے گی' حکومت کے ماہرین دن رات آئین سے ایسی دفعات تلاش کر رہے ہیں جن کے ذریعے سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد چیف جسٹس کو دوبارہ غیر فعال کیا جا سکے' حکومت صدر صاحب کو پارلیمنٹ سے بھی نئے اختیارات لے کر دینے کی پلاننگ کر رہی ہے چنانچہ جب تک حکومت قائم ہے چیف جسٹس واپس سپریم کورٹ نہیں جا سکیں گے" میں خاموش ہوگیا' میرا دوست اٹھا اور ذرا دیر سوچ کر بولا" اگر حکومت ریفرنس واپس لے لے تو یہ سارا بحران چند لمحوں میں ختم ہو سکتا ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور مسکرا کر جواب دیا" ہاں لیکن حکومت ریفرنس واپس نہیں لے گی" میرے دوست نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا" آمریت پوری دنیا کے سامنے جھک سکتی ہے لیکن وہ اپنے لوگوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرتی' تم نپولین بونا پارٹ سے میسولینی تک دنیا کے تمام آمروں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو یہ لوگ دشمنوں کے قدموں میں جھک گئے تھے لیکن انہوں نے اپنے لوگوں کے خلاف دائر ریفرنس واپس نہیں لئے' صدر پرویز مشرف بھی اس صورتحال سے نکلنے کیلئے امریکہ سے سمجھوتہ کر لیں گے لیکن وہ افتخار محمد چودھری کے ساتھ ہاتھ نہیں ملائیں گے' ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے تو آدھا ملک بھارت کو دے دیا تھا لیکن بنگالیوں کو اقتدار نہیں دیا تھا' ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے 8 کروڑ بنگالیوں کی بات نہیں مانی تھی' ہم ایک چیف جسٹس کی بات کیسے مانیں گے"

# ججوں کی ذمہ داری باقی ہے

مجھے ایک بار سپریم کورٹ کے موجودہ جسٹس خلیل الرحمن رمدے کے ساتھ سفر کرنے کا



اتفاق ہوا تھا' یہ 1999ء کا سال تھا' عطاء الحق قاسمی صاحب اس وقت ناروے میں پاکستان کے سفیر تھے اور جسٹس خلیل الرحمن رمدے اور میں ان کے مہمان تھے' بزرگ کہتے ہیں اگر کسی شخص کو سمجھنا ہو تو اس کے ساتھ سفر کریں' اس کے ساتھ کھانا کھائیں اور اس کے ساتھ معاملہ کریں' میں نے اس سال رمدے صاحب کے ساتھ سفر بھی کیا' قیام بھی کیا اور کھانا بھی کھایا بس میں معاملہ نہیں کر سکا' جس کا مجھے ابھی تک افسوس ہے' جسٹس صاحب اس وقت لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے اور میری ان کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی' اس ملاقات میں جسٹس صاحب کی شخصیت کے بے شمار رنگ میرے سامنے آئے' ان رنگوں میں ان کی کمیونیکیشن پاور' حس مزاح اور دانشوری بھی شامل تھی' میں نے ان ملاقاتوں میں جج کے پردے میں ایک شاندار شخص دریافت کیا' اس ملاقات کی بے شمار یادیں آج تک میرے ذہن میں تازہ ہیں' مجھے آج بھی یاد ہے جسٹس رمدے نے اوسلو میں عطاء الحق قاسمی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر فرمایا تھا ''انصاف صرف ججوں کی ذمہ داری نہیں' معاشرے کا ہر شخص جج یا منصف ہوتا ہے' اس پر بھی انصاف کی اتنی ہی ذمہ داری ہوتی ہے جتنی ججوں پر' اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح الفاظ میں تحریر کیا' تم لوگ انصاف قائم کرو' اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا صرف جج انصاف قائم کریں چنانچہ انصاف پورے معاشرے کی ذمہ داری ہوتا

ہے۔"

جسٹس رمدے نے احساس ذمہ داری پر بھی بڑی خوبصورت مثال دی تھی' انہوں نے فرمایا تھا" اگر انسان کے پاس سائیکل ہو تو وہ زیادہ سے زیادہ اس کی ہوا چیک کرتا ہے' اگر اس کے پاس موٹر سائیکل ہو تو وہ اس کا پٹرول' انجن آئل اور بیٹری کا پانی چیک کرے گا' اگر وہ گاڑی کا مالک ہے تو وہ گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ریڈی ایٹر کا پانی اور چاروں پہیوں کی ہوا دیکھ لے گا' وہ مہینے میں ایک بار گاڑی کا چیک اپ بھی کرالے گا لیکن جب ہوائی جہاز کسی ایئر پورٹ پر اترتا ہے تو اس کا ایک ایک قبضہ' ایک ایک نٹ' ایک ایک بولٹ اور ایک ایک پرزہ چیک کیا جاتا ہے اور جب تک ایئر پورٹ کا انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ مطمئن نہیں ہو جاتا اس وقت تک جہاز کو اڑنے کی اجازت نہیں دی جاتی" جسٹس خلیل رمدے کا فرمانا تھا" سائیکل اور جہاز کے بارے میں رویے کا یہ فرق ذمہ داری کی وجہ سے ہے' ہم جانتے ہیں اگر سائیکل یا موٹر سائیکل خراب ہوگا تو اس سے صرف ایک شخص کو کوفت ہوگی' اسی طرح اگر گاڑی ایکسیڈنٹ کا شکار ہو جائے تو اس سے چند لوگوں کی جان جائے گی لیکن جہاز میں سینکڑوں لوگ سوار ہوتے ہیں چنانچہ جب جہاز حادثے کا شکار ہوتا ہے تو نہ صرف اس میں سوار لوگ جان سے جاتے ہیں بلکہ وہ زمین پر موجود عمارتوں اور لوگوں کیلئے بھی خطرہ بن جاتا ہے لہٰذا جہاز کی سائیکل' موٹر سائیکل' گاڑی اور بس سے زیادہ پڑتال کی جاتی ہے" جسٹس صاحب کا فرمانا تھا" انسان سماجی لحاظ سے جوں جوں ترقی کرتا ہے اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ بلند مرتبہ لوگوں کو جہاز کی طرح اپنے کیل قبضوں اور نٹ اینڈ بولٹس کا خیال رکھنا چاہیے" اس دور میں بل کلنٹن امریکہ کے صدر تھے' جسٹس رمدے نے بل کلنٹن کی مثال دیتے ہوئے فرمایا تھا" فرض کریں اگر آپ اور میں پاگل ہو جائیں تو ہمارے پاگل پن کا نقصان صرف چند لوگوں کو پہنچے گا لیکن اگر بل کلنٹن پاگل ہو جائے تو وہ آدھی دنیا کو تباہ کر دے گا چنانچہ بل کلنٹن کو ہر فیصلے سے پہلے پچاس مرتبہ سوچنا چاہیے' اسے اپنی محبت یا نفرت کے اظہار سے پہلے' ہاتھ اٹھانے' ہلانے اور گرانے سے پہلے دس دس مرتبہ سوچنا چاہیے کیونکہ اس کی ایک جنبش' ایک حرکت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں لوگوں کی زندگیاں وابستہ ہیں" جسٹس صاحب نے امریکہ کے صدر روز ویلٹ کی مثال بھی دی تھی' ان کا فرمانا تھا" روز ویلٹ نے 1945ء میں جاپان پر ایٹم بم گرانے کا حکم دے دیا تھا' ذرا سوچئے ان کے ایک حکم سے کتنے لاکھوں لوگوں کی زندگیاں چلی گئیں' آپ تصور کیجئے اس شخص کے پاس کتنا خوفناک اختیار تھا اور اس کے اس اختیار

کے ایک غلط استعمال کا کیا نتیجہ نکلا؟"

جسٹس خلیل الرحمن رمدے کے ساتھ وہ سفر' وہ ملاقاتیں اور یہ ساری باتیں ماضی کا قصہ بن گئیں لیکن آج 24 مئی 2007ء کو جب میں نے اخبارات اٹھائے اور اخبارات میں جسٹس خلیل الرحمن رمدے کے بیانات پڑھے تو مجھے 1999ء کی وہ گرمیاں' اوسلو کی وہ شامیں اور جسٹس صاحب کے ساتھ ہونے والی وہ ساری گفتگو یاد آ گئی' جسٹس خلیل الرحمن رمدے اس وقت چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے خلاف صدر پرویز مشرف کے دائر کردہ ریفرنس کی سماعت فرما رہے ہیں' اس سماعت کیلئے قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس نے 13 ججوں کا بنچ بنایا تھا اور جسٹس خلیل الرحمن رمدے اس بنچ کے سربراہ ہیں' 23 مئی کو بنچ کے سامنے ریفرنس کی سماعت تھی' اس سماعت کے دوران جسٹس خلیل الرحمن رمدے نے بڑے دلچسپ ریمارکس دیئے تھے' انہوں نے فرمایا تھا" اگر ججوں کو اس طریقے سے نکالا جاتا رہا اور اس کا کوئی مداوا نہ ہوا تو پھر والدین اپنے بچوں کو جج نہ بننے کی نصیحت کریں گے"' جسٹس صاحب کے ریمارکس 24 مئی کے اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئے اور مجھے اوسلو کی وہ ساری شامیں یاد کرا گئے اور میں نے فوری طور پر اپنے آپ سے سوال کیا' اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ ذمہ دار عہدیدار کون ہے! میرے ذہن میں بے شمار لوگ آئے لیکن پھر میری نظر 13 ججوں کے اس بنچ پر آ کر رک گئی اور مجھے محسوس ہوا اس وقت پاکستان' پاکستان کی عدلیہ اور پاکستان کے مستقبل کی ذمہ داری ان 13 ججوں پر استوار ہوتی ہے' آنے والے کل میں لوگ اپنے بچوں کو جج بنانا چاہیں گے یا نہیں اس کا فیصلہ بھی اس وقت ان 13 ججوں کے ہاتھ میں ہے' کل پاکستان کے لوگ عدلیہ کے بارے میں کیا سوچیں گے' پاکستان میں جمہوریت کی کیا حالت ہو گی' پاکستان کے عوام کے پاس کیا حقوق ہوں گے اور دنیا آنے والے دنوں میں پاکستان کے بارے میں کیا سوچے گی اس کا فیصلہ بھی اب 13 ججوں نے کرنا ہے' مجھے محسوس ہوتا ہے جسٹس خلیل الرحمن رمدے اور ان کی ٹیم اس وقت ذمہ داری کی باریک تار پر چل رہی ہے' ان لوگوں کی ذرا سی بے احتیاطی اس ملک کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دے گی اور ان لوگوں کا ایک فیصلہ اس ملک کے ان تمام لوگوں کو زبان دے دے گا جن کے منہ پر 60 برس سے خوف کے تالے لگے ہیں۔

مجھے یقین ہے 13 ججوں کا یہ پینل درست فیصلہ کرے گا لیکن اس کے باوجود میں جسٹس رمدے کو اوسلو کی وہ شامیں یاد کرانا چاہتا ہوں اور ان سے اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں' 21 مئی

کو چیچہ وطنی کے دو وکیلوں نے اپنے نام سے پرویز ہٹا کر افتخار لگا دیا تھا' آپ کے فیصلے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو یہ لوگ ایک بار پھر اپنا نام تبدیل کر دیں' کہیں ایسا نہ ہو لوگ سپریم کورٹ کی طرف انگلی اٹھا کر کہیں ''یہ وہ کورٹ ہے جو اپنے چیف کو انصاف نہ دے سکی'' کہیں ایسا نہ ہو لوگوں کا انصاف سے اعتماد اٹھ جائے اور وہ عدالت کی بجائے گلیوں' محلوں اور بازاروں میں اپنا فیصلہ کرنے لگیں' میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں آج سے تیس برس پہلے کولمبیا میں باغیوں نے سپریم کورٹ پر قبضہ کر لیا تھا' ان لوگوں نے جج اور 100 وکیل قتل کر دیئے تھے لیکن ججوں نے ہمت نہ ہاری' 1990ء میں کولمبیا کی سپریم کورٹ نے مافیا کے خلاف مقدمہ سننا شروع کیا تھا تو مافیا ہر پیشی پر عدالت میں بم دھماکہ کرتا تھا اور اس دھماکے میں جج مارا جاتا تھا' اس کیس کی سماعت کے دوران 99 جج مارے گئے لیکن اس کے باوجود سماعت جاری رہی اور عدالت نے مافیا لارڈ پابلو اسکوبار کو مجرم قرار دیا' یہ فیصلہ عدل کی تاریخ میں کولمبیا کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سرخرو کر گیا' پاکستان کولمبیا نہیں اور نہ ہی پاکستان میں کولمبیا جیسے حالات ہیں لیکن اس کے باوجود عوام عدالت اور ججوں سے اسی استقامت کی توقع رکھتے ہیں۔ قوم' وکیل اور معاشرہ افتخار محمد چوہدری کیلئے باہر آ کر اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہے اب ججوں کی ذمہ داری باقی ہے لہٰذا انہوں کو استقامت اور انصاف کا مظاہرہ کرنا چاہیے' خواہ ہماری عدالت کولمبیا کی عدالت ہی کیوں نہ بن جائے۔

Kashif Azad@OneUrdu.com

# جس طرح

میں دوبئی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا تو مجھے محسوس ہوا میں جدید دنیا میں آ گیا ہوں' ایئرپورٹ سے گرینڈ حیات ہوٹل تک روشنی ہی روشنی' خوبصورتی ہی خوبصورتی اور امن ہی امن تھا' گاڑیوں کی طویل قطاریں اور عمارتوں پر جلتی بجھتی روشنیاں خوشحالی اور ترقی کی نوید سنا رہی تھیں' ہماری گاڑی دوبئی کی مرکزی شاہراہ جبل علی سے گزر رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کیا آج اس شاہراہ پر کھڑے ہو کر کوئی سوچ سکتا ہے 1980ء تک اس جگہ ریت کے ٹیلے' اونٹوں کے ریوڑ اور خشک جھاڑیاں ہوتی تھیں' یہاں خاک اڑتی تھی اور غربت اور بے بسی کاشت ہوتی تھی لیکن پھر اس ملک' اس شہر کو ایک وژنری شخص ملا اور اس وژنری شخص نے ریت کے ان ٹیلوں کا مقدر بدل دیا' اس نے ویرانے کو دنیا کے جدید ترین شہر میں تبدیل کر دیا اس وژنری شخص کا نام شیخ محمد بن راشد المختوم تھا۔

شیخ محمد 1949ء میں پیدا ہوئے تھے' وہ دوبئی کے سلطان شیخ راشد المختوم کے تیسرے صاحبزادے تھے' ان کی ابتدائی زندگی عربی شیخوں کی روایتی ثقافت کے مطابق گزری' وہ بچپن میں اپنے بھائیوں اور کزنوں کے ساتھ کھیلتے کودتے رہتے تھے' اونٹوں پر بیٹھ کر ریس لگاتے تھے یا پھر صحرا میں ہرن کے پیچھے بھاگتے تھے' 4 سال کی عمر میں انہوں نے گھر پر عربی اور اسلام کی تعلیم شروع کی' 1955ء میں ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی' انہیں دوبئی کے الاحمدیہ سکول میں

داخل کرادیا گیا' انہوں نے اس سکول میں عربی' انگریزی' ریاضی' جغرافیہ اور تاریخ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی' دس سال کی عمر میں وہ الشعاب سکول میں داخل ہو گئے' وہ دو سال تک اس سکول میں پڑھتے رہے' اس کے بعد انہیں دوبئی کے سیکنڈری سکول میں داخل کرادیا گیا' شیخ محمد کے والد شیخ راشد المختوم انہیں فوجی بنانا چاہتے تھے' ان کی خواہش تھی شیخ محمد عسکری تعلیم حاصل کریں' جس کے بعد انہیں لندن یا امریکہ کی کسی ملٹری اکیڈمی میں داخل کرادیا جائے اور وہاں سے واپس آ کر وہ دوبئی کی فوج کی کمان سنبھال لیں' شیخ کی اس خواہش کا پس منظر بہت دلچسپ تھا' شیخ کا خاندان کئی نسلوں سے تجارت سے وابستہ تھا' تجارت وراثت کی شکل میں ان کے خاندان میں منتقل ہوتی جا رہی تھی' ان کے تین بیٹے تجارت سے منسلک تھے لہٰذا ان کی خواہش تھی ان کا ایک بیٹا سپہ سالار بنے لیکن شیخ محمد کا رجحان ذرا مختلف تھا' وہ آرٹ' زبان اور فنون لطیفہ میں دلچسپی لیتے تھے' جب شیخ نے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے برطانیہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تو شیخ محمد نے انگریزی زبان میں داخلہ لینے کا اعلان کر دیا' شیخ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہٹ کے پکے تھے لہٰذا مجبوراً شیخ راشد کو ان کی بات ماننا پڑی۔ یوں شیخ محمد اپنے کزن شیخ محمد بن خلیفہ المختوم کے ساتھ برطانیہ چلے گئے' وہاں انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی کے بل کالج میں انگریزی زبان میں داخلہ لے لیا' جس دن انہوں نے کیمبرج میں قدم رکھا تھا اس دن ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا' یہ واقعہ آگے چل کر دوبئی جیسے جدید اور خوبصورت شہر کی بنیاد بنا۔ یہ شیخ محمد کا کلاس میں پہلا دن تھا' سب طالب علم ایک دوسرے کو اپنا تعارف کرا رہے تھے' جب شیخ محمد نے اپنا تعارف کرایا تو جنوبی امریکہ کے کسی طالب علم نے ان سے پوچھا ''آپ انگریزی سیکھ کر کیا کریں گے'' وہاں کلاس میں چین کا ایک طالب علم بھی تھا اس نے شیخ پر پھبتی کسی ''یہ اونٹوں کو انگریزی سکھائیں گے'' کلاس روم میں ایک قہقہہ گونجا' اس قہقہے اور چینی طالب علم کی پھبتی نے شیخ کو سوچنے پر مجبور کر دیا' شیخ نے سوچا دنیا عربوں کو بدو سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی' اس وقت اس کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کیا وہ دوبئی کو ایک ایسی ریاست بنائیں گے' جس کی مثال پوری دنیا میں نہیں ہوگی' لوگ اس کا حوالہ دیا کریں گے' شیخ محمد کا یہ عزم آگے چل کر آج کے دوبئی کی بنیاد بنا۔

شیخ محمد جتنا عرصہ یورپ رہے وہ وہاں کے نظام کا معائنہ کرتے رہے' وہ چھٹی کے دن یورپ کے دوسرے ممالک اور شہروں میں نکل جاتے اور وہاں جا کر ان کے طرز تعمیر' ان کے حکومتی اور سرکاری نظام' ان کی تجارت' ان کے بینکوں' ان کے ویلفیئر سسٹم اور ان کی طرز گفتگو کا مطالعہ

کرتے' وہ یورپ کی ٹیکسیوں' بسوں اور ریلوں میں بیٹھ کر ان کا نظام دیکھتے' وہ ان کے ائیر پورٹس اور گودیوں کا سسٹم دیکھتے' وہ ان کے سیوریج' بجلی اور پانی کے نظام کا مطالعہ کرتے اور وہ ان کے سکولوں' ہسپتالوں اور ڈاک خانوں کا جائزہ لیتے جب وہ یورپ کا سارا نظام سمجھ گئے تو انہوں نے نتیجہ نکالا جب تک کسی ملک کا جسٹس سسٹم بہتر نہیں ہوتا' وہ ملک ترقی نہیں کرتا' جب تک اس ملک میں سرمایہ کاری نہیں ہوتی وہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا' جب تک اس ملک میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی نہیں آتی' جب تک اس ملک میں مسجد اور تفریح گاہیں دونوں نہیں بنتیں اور جب تک لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق رقم اور بنیادی سہولتیں نہیں ملتیں اس وقت تک ملک ترقی نہیں کر سکتا' وہ واپس دوبئی آئے اور انہوں نے نئے دوبئی کی بنیاد رکھنا شروع کر دی۔ اس وقت تک متحدہ عرب امارات میں تیل نکل چکا تھا اور شیخ زاہد بن سلطان النہیان ایک انقلابی جذبے کے ساتھ امارات کی ترقی اور استحکام کا کام شروع کر چکے تھے' شیخ محمد نے آگے بڑھ کر زیادہ تر کام اپنے ہاتھ میں لے لیا' انہوں نے اسلامی معاشرے کو اعتدال کی راہ پر ڈالا' انہوں نے شرابیوں کے لئے بہترین شراب خانے' جواریوں کے لئے انتہائی جدید جوا خانے اور نمازیوں کے لئے دنیا کی بہترین مسجدیں بنائیں' انہوں نے دنیا جہاں کے سرمایہ کاروں کو دعوت دی اور ان کیلئے دوبئی کی سرزمین کھول دی' انہوں نے دیکھا مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی جدید شہر موجود نہیں چنانچہ مشرقی ممالک کے امراء کو علاج' تعلیم' تفریح' شاپنگ' کاروبار اور عیاشی کے لئے لندن' پیرس اور نیویارک جانا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہر سال مشرق سے اربوں ڈالر مغرب چلے جاتے ہیں' انہوں نے سوچا اگر مشرقی ممالک کے امراء کے لئے چند گھنٹوں کی ڈرائیو اور مختصر سی فلائٹ پر ایک ایسا شہر موجود ہو جو کسی بھی طرح یورپ اور امریکہ سے کم نہ ہو تو ان اربوں ڈالرز کا رخ مشرق کی طرف پھیرا جا سکتا ہے لہٰذا آج حالت یہ ہے دنیا میں سب سے اچھی اور سستی تعلیم دوبئی میں ملتی ہے' دنیا میں سب سے زیادہ شاپنگ' سب سے زیادہ علاج اور سب سے زیادہ تفریح دوبئی میں ملتی ہے' دوبئی دنیا کا سب سے بڑا شاپنگ سنٹر ہے' دوبئی میں دنیا کا سب سے مہنگا ہوٹل موجود ہے' دوبئی میں سب سے زیادہ مساج پارلر ہیں' دوبئی دنیا کا سب سے بڑا ائیر پورٹ اور دنیا کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے' یہ سب ایک شخص کے وژن اور محنت کا نتیجہ ہے اور اس شخص کا نام شیخ محمد بن راشد المختوم ہے۔



میں شیخ محمد بن راشد المختوم کے شہر میں تین دنوں کیلئے آیا ہوں' دوبئی پہنچ کر میں نے

محسوس کیا' اگر انسان کے پاس وژن' محنت اور حوصلہ ہو تو وہ ریت کے ٹیلوں کو سونا بنا سکتا ہے' میری گاڑی میں دوبئی کے بارے میں ایک کتابچہ پڑا تھا' میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی' اس کتابچے میں شیخ محمد بن راشد المختوم کا ایک قول درج تھا' شیخ نے فرمایا تھا ''ترقی کیلئے انصاف اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا جانداروں کیلئے آکسیجن'' میں نے شیشے سے باہر دیکھا' باہر حد نظر تک ترقی ہی ترقی' خوشحالی ہی خوشحالی تھی' میں نے پردہ کھینچ دیا' آنکھیں بند کیں اور دل میں سوچا کاش یہ بات کوئی شخص ہمارے ان حکمرانوں کو سمجھا دے جو انصاف کے بغیر ملک کو ترقی دینا چاہتے ہیں جو کیکر کے جنگل میں کپاس بونا چاہتے ہیں جو جھیلوں کی کائی پر جمناسٹک کھیلنا چاہتے ہیں' کاش کوئی ہمارے حکمرانوں کو یہ سمجھا دے انصاف اور قانون کے بغیر معاشرے اس طرح ہوتے ہیں جس طرح پانی کے بغیر دریا' جس طرح چاندنی کے بغیر چاند۔

☼ ...... ☼ ...... ☼

# اکیسویں صدی کے شیخ چلی

شیخ محمد بن راشد المختوم نے 1976ء میں پیشن گوئی کی تھی "دبئی 2000ء تک دنیا کی جدید اور مضبوط ترین ریاست ہوگی اور پوری دنیا کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوں گے" ان کا یہ بیان اس وقت برطانیہ کے اخبارات میں شائع ہوا تھا اور جس شخص نے بھی یہ بیان پڑھا تھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی' یہ مسکراہٹ بجا تھی' اس وقت دبئی دنیا کی پسماندہ ترین ریاست تھی' پورے شہر کا رقبہ 20 مربع کلومیٹر تھا' شہر میں صرف ایک تھری سٹار ہوٹل اور ایک بڑی سڑک تھی' لوگ اونٹوں اور گدھا گاڑیوں پر سفر کرتے تھے اور شہر میں پینے کا پانی تک دستیاب نہیں تھا لہٰذا اس وقت ایک ایسے شہر کے بارے میں یہ دعویٰ اپنا مذاق اڑانے کے مترادف تھا' برطانیہ کے ایک اخبار کے رپورٹر نے شیخ سے اس خدشے کا اظہار بھی کیا لیکن اس کے جواب میں شیخ محمد نے جو واقعہ سنایا اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا' شیخ نے فرمایا "ہم نے دبئی میں نئی پولیس تشکیل دی ہے' کل میں اپنی گاڑی چلاتا ہوا اپنی ہمشیرہ کے گھر گیا' میں نے غلطی سے نو پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر دی' میں جب واپس آیا تو میری گاڑی کے ٹائر پر پولیس کا "کلپ" چڑھا تھا' میں نے آگے پیچھے دیکھا' دور سائے میں ایک پولیس کانسٹیبل کھڑا تھا' میں نے اشارے سے اسے بلایا' وہ آیا اور اس نے مجھے سیلوٹ کیا' میں نے اس سے پوچھا میری گاڑی پر کلپ تم نے لگایا ہے' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا' میں نے اس سے کہا' تم مجھے نہیں جانتے' اس نے ہاں میں سر ہلا کر جواب دیا' آپ

ہمارے شیخ ہیں' میں نے کہا' تم میری گاڑی نہیں پہچانتے تھے' اس نے ہاں میں گردن ہلائی اور احترام سے بولا' میں پہچانتا ہوں' میں نے پوچھا' پھر تم نے میری گاڑی پر کلپ کیوں لگایا' اس نے سینہ تان کر جواب دیا' آپ کی گاڑی غلط جگہ پر پارک تھی اور دبئی میں شیخ ہو یا کوئی دیٹر قانون سب کے لئے برابر ہے' مجھے اس کی بات بہت اچھی لگی لہٰذا میں آج اس پولیس کانسٹیبل کی بنیاد پر یہ دعویٰ کرتا ہوں ہمارے ملک کا کل بہت روشن ہے اور اگر ہمارے ملک میں اس طرح قانون کی حکمرانی رہی تو اگلے 25 برسوں میں دبئی دنیا کی جدید ترین ریاست ہو گا'' شیخ کا جواب سن کر وہ صحافی خاموش ہو گیا' شیخ محمد کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی اور ٹھیک 25 برس بعد دبئی یورپین سٹائل کا پہلا ایشین شہر بن گیا' آج آپ دبئی جائیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نیو یارک' لندن یا ٹوکیو میں گھوم رہے ہیں اور جیسے آپ جدید دنیا کے کسی جدید ترین شہر میں آ گئے ہیں' آج جب بھی کوئی شخص شیخ محمد بن راشد المختوم کے سامنے دبئی کی تعریف کرتا ہے تو وہ 1976ء کے اس پولیس کانسٹیبل کا نام لیتے ہیں اور اس کے بعد فخر سے کہتے ہیں'' دبئی کو دبئی اس کانسٹیبل نے بنایا تھا۔''



انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ اس نقطے پر متفق ہے جب تک کسی شہر' کسی معاشرے اور کسی ملک میں قانون اور اس کے بعد انصاف قائم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ ملک ترقی نہیں کرتا' آپ دنیا کے کسی جدید اور ترقی یافتہ ملک کو دیکھ لیں آپ کو اس ملک کی ترقی کے پیچھے پولیس کا مضبوط نظام اور فوری اور غیر جانبدارانہ عدالتی سسٹم ملے گا' اسی طرح آپ تمام تباہ شدہ' برباد اور انحطاط پذیر معاشروں کا تجزیہ کر لیں' آپ کو ان تمام معاشروں میں ایک بات مشترک نظر آئے گی اور وہ بات قانون اور انصاف کا کمزور اور بے بس نظام ہو گا' آپ کو معلوم ہو گا ان تمام ملکوں کی عدالتیں بے بس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے کرپٹ ہیں' ان ملکوں کے بااختیار لوگ قانون کو کھیل اور عدالتوں کو کھلونا سمجھتے ہیں اور وہاں کی پولیس اور عدالتیں حکمران کلاس کی انا اور مفادات کی حفاظت کر رہی ہیں' مجھے اچھی طرح یاد ہے رونلڈ ریگن کے دور میں امریکہ میں ایک بڑی سطح کا سروے ہوا تھا' اس سروے میں لوگوں سے پوچھا گیا تھا'' ہم سپر پاور کیوں ہیں'' اس وقت نہ صرف دنیا کی سب سے بڑی فوج' سب سے زیادہ ایٹمی ہتھیار' سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج' سب سے بڑا میڈیا' سب سے زیادہ مالیاتی ذخائر' سب سے بڑی انڈسٹری' سب سے زیادہ انجینئرز' سب سے زیادہ ڈاکٹرز' سب سے زیادہ سائنس دان اور سب سے زیادہ یونیورسٹیاں امریکہ میں تھیں بلکہ اس وقت امریکہ نے سوویت یونین کو تازہ تازہ شکست بھی دی تھی لیکن جب سروے کے

نتائج آئے تو امریکہ کے 81 فیصد لوگوں کی متفقہ رائے تھی "امریکہ کو اس کے قانون اور انصاف نے سپر پاور بنایا" اس سروے کے بعد رونلڈ ریگن نے بڑا مشہور بیان دیا تھا' انہوں نے کہا تھا "اور جب تک امریکہ میں قانون اور انصاف کا احترام باقی رہے گا اس وقت تک امریکہ دنیا کی سپر پاور رہے گا" ریگن کا یہ بیان پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا' میں اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا' میرے لئے ریگن کی بات حیران کن اور ناقابل یقین تھی لیکن جب آنے والے دنوں میں مجھے دنیا میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا اور میں نے قوموں کے عروج و زوال کا تجزیہ کیا تو مجھے معلوم ہوا جب کسی قوم میں قانون محترم ہوتا ہے' جب کسی ملک میں لوگوں کو فوری اور غیر جانبدار انصاف ملتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس ملک کو ترقی کرنے سے نہیں روک سکتی اور جب کسی ملک میں قانون اور انصاف کا مذاق شروع ہو جاتا ہے' جب کسی معاشرے میں قانون سیاستدانوں' حکمرانوں اور مافیا لارڈز کے دروازے پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جب انصاف حکمرانوں کے گھر کی لونڈی بن جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس معاشرے کو برباد ہونے' اسے کھنڈر بننے سے نہیں بچا سکتی' مجھے معلوم ہوا قانون اور انصاف وہ بنیادی پتھر ہوتے ہیں جن پر معاشروں کی دیواریں' چھتیں' گنبد اور مینار تعمیر ہوتے ہیں' یہ بنیاد کے وہ پتھر ہوتے ہیں جن پر عروج اور ترقی کے قبلے تعمیر ہوتے ہیں' یہ وہ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو قوموں کے آنے والے سورج تراشتے ہیں اور یہ وہ کھیت ہوتے ہیں جن میں معاشروں کے مستقبل کاشت ہوتے ہیں۔



آپ بنیاد کے ان پتھروں اور تنزلی اور ترقی کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر پاکستان کے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں' ذرا سوچئے جس ملک میں کانسٹیبل سے لے کر آئی جی تک کی زندگی کا مقصد حکمران طبقے کی حفاظت ہو اور جس کی کسی عدالت میں انصاف نہ ملتا ہو' اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا' ذرا سوچئے جس ملک میں قانون بنانے والے ارکان اسمبلی قانون نافذ کرنے والوں کو سڑکوں پر لٹا کر ٹھڈے مار رہے ہوں اور عدالتیں اس واقعہ پر خاموش بیٹھی ہوں' اس ملک کا کیا مستقبل ہوگا' اس ملک کا کیا کل ہوگا؟ میں جب بھی ایسے واقعات دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم لوگ گارے کی دیوار پر چڑھ کر چاند کو چھونے کی کوشش کر رہے ہیں' ہم لوگ جوہڑ کے کنارے بیٹھ کر ہنسوں کا انتظار کر رہے ہیں' ہم روڑیوں میں لعل تلاش کر رہے ہیں اور ہم لوگ ایک لاقانون اور بے انصاف معاشرے میں رہ کر اللہ کی نصرت اور اللہ کے کرم کی دعائیں مانگ رہے ہیں' مجھے محسوس ہوتا ہے ہم اکیسویں صدی کے شیخ چلی ہیں۔

# ڈیڈ لائن

1775ء میں امریکہ میں سول وار شروع ہوئی' یہ امریکی ریاستوں کی برطانوی سامراج کے خلاف جنگ تھی اس خانہ جنگی کے دوران امریکہ کی فوج نے "اینڈرسن ویل" میں جنگی قیدیوں کی ایک کھلی جیل بنائی' یہ جیل میدان کی شکل میں تھی' امریکہ کے فوجی برطانوی قیدیوں کو وہاں لاتے اور انہیں اس میدان میں چھوڑ دیتے' امریکہ کی فوج نے اس میدان کے گرد ایک سفید لائن کھینچ دی تھی' یہ سفید لائن موت کی لکیر تھی' جب کوئی قیدی اس لکیر کو عبور کرنے کی کوشش کرتا تھا تو امریکی فوج اسے گولی مار دیتی تھی' یہ لکیر ایک غیر مرئی دیوار تھی اور اس کھلی جیل میں بند ہر قیدی جانتا تھا اگر اس کا قدم اس لکیر پر آ گیا تو وہ زندگی کی حد پار کر جائے گا' امریکی اس لکیر کو "ڈیڈ لائن" کہتے تھے۔ 1800ء میں جب دنیا میں کمرشل جرنلزم کا دور شروع ہوا تو "ڈیڈ لائن" کا لفظ اینڈرسن ویل سے نکل کر صحافت میں داخل ہو گیا' صحافت میں "ڈیڈ لائن" کا مطلب کسی خبر' کسی رپورٹ' کسی سٹوری یا کسی کالم کو اخبار' ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے دفتر پہنچانے کا آخری وقت ہوتا ہے' پاکستان کے زیادہ تر اخبارات کی آخری کاپی رات دو بجے پریس جاتی ہے لہٰذا رات ایک ڈیڑھ بجے کے بعد آنے والی خبر اخبار میں شائع نہیں ہوتی چنانچہ اخبارات کی ڈیڈ لائن ایک یا ڈیڑھ بجے رات ہے جبکہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو خبرنامے کا وقت دیکھ کر اپنی ڈیڈ لائن طے کرتے ہیں۔ پچھلے دو سو سال میں صحافت میں یہ لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا' اس کثرت استعمال سے یہ لفظ میڈیا سے نکل کر عام

زندگی میں شامل ہو گیا اور عملی زندگی کے تقریباً تمام شعبے بھی ڈیڈ لائن کے شکنجے میں آ گئے‘ پچھلے دس پندرہ برسوں میں ڈیڈ لائن ہماری سیاست کا بھی باقاعدہ حصہ بن گیا‘ میں 1992ء سے صحافت سے وابستہ ہوں اور اس حوالے سے میرا سیاست کے ساتھ بھی رابطہ رہتا ہے‘ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی وجہ سے میں قریباً روزانہ یہ لفظ سنتا ہوں اور بڑی حد تک اسے بھگتتا بھی ہوں۔ ان 14 برسوں میں مجھے محسوس ہوا سیاست کی ڈیڈ لائن صحافت کی ڈیڈ لائن کے مقابلے میں کہیں خطرناک اور مشکل ہے‘ صحافت کی ڈیڈ لائن کے ڈسے تو شاید بچ جاتے ہیں لیکن سیاست کی ڈیڈ لائن کی لپیٹ میں آنے والے اقتدار کی قربانی دیئے بغیر اس سے باہر نہیں نکلتے۔

جون کے وسط میں میرے ایک دوست نے میرے کان میں سرگوشی کی ”حکومت مشکل کا شکار ہو گئی ہے“ میں نے اسے کہا ”مجھے بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا‘ قومی اور بین الاقوامی امور صدر صاحب کی مکمل گرفت میں ہیں‘ وزیراعظم صاحب معیشت کو ترقی کی پٹڑی پر لے آئے ہیں اور رہی سہی کسر ہمارے ”شیریں دہن“ وزیر اطلاعات محمد علی درانی پوری کر رہے ہیں“ اس نے انکار میں سر ہلایا اور پورے یقین سے بولا ”نہیں جولائی ڈیڈ لائن ہے تم دیکھنا جولائی سے حالات زبردست طریقے سے پلٹا کھائیں گے اور حکومت کیلئے حالات کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا“ میں نے اس کی بات مذاق میں اڑا دی لیکن آنے والے چند دنوں میں حکومت حقیقتاً ڈیڈ لائن کا شکار دکھائی دینے لگی‘ حکومت کی ایم ایم اے کے ساتھ ڈیل کمزور پڑی‘ بے نظیر کے ساتھ خفیہ مذاکرات کی واپسی شروع ہوئی‘ بھارت کے ساتھ تعلقات سرد مہری کا شکار ہوئے‘ سٹاک ایکس چینج اور سٹیل ملز کے ایشوز کی چونچیں ریت سے باہر آنے لگیں اور اپوزیشن کی صفوں میں اتحاد کے آثار دکھائی دینے لگے چنانچہ مجھے اپنے دوست کی بات میں وزن محسوس ہونے لگا‘ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ جولائی کے آخر میں اچانک ایم کیو ایم کا ”کٹا“ کھل گیا اور حکومت کیلئے اسے باندھنا مشکل ہو گیا‘ ایم کیو ایم سندھ حکومت کا مرکزی ستون ہے‘ سندھ میں ”متحدہ حکومت“ ہے جس میں مسلم لیگ ق‘ نیشنل الائنس اور ایم کیو ایم شامل ہیں‘ وفاقی حکومت نے 2002ء میں ایم کیو ایم کو حمایت کے بدلے گورنر شپ‘ 7 صوبائی وزارتیں‘ 4 مشاورتیں اور سپیشل اسسٹنٹس کی چار نشستیں دی تھیں۔ 9 جون 2004ء میں جب ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے حکومت بنائی تو ایم کیو ایم نے وفاقی حکومت کے سامنے چند ”مطالبات“ رکھے‘ ان مطالبات میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کیلئے نوکریاں‘ ایم کیو ایم کے حلقوں کیلئے ترقیاتی فنڈز اور چند چھوٹے بڑے تبادلے شامل تھے‘ وفاقی حکومت نے

یک جنبش قلم یہ سارے مطالبات مان لئے لیکن جب یہ مطالبات پورے کرنے کا وقت آیا تو معلوم ہوا یہ مطالبے اتنے بھی سادہ نہیں ہیں' اس کے بعد وفاقی حکومت اور ایم کیو ایم کے درمیان کھینچا تانی شروع ہوگئی' یہ کھینچا تانی مئی 2006ء میں اپنی آخری حدوں کو چھونے لگی یہاں تک کہ بجٹ سے پہلے ایم کیو ایم نے سندھ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا' اس بائیکاٹ سے سندھ حکومت اور وفاقی حکومت دونوں کو شدید جھٹکا لگا' صدر کی ہدایت پر وزیر اعظم شوکت عزیز اور طارق عزیز نے ایم کیو ایم کے ساتھ مذاکرات کئے' ان مذاکرات میں 31 جولائی کی ''ڈیڈ لائن'' طے ہوئی' دونوں عزیزوں نے ایم کیو ایم سے وعدہ کیا سندھ حکومت 31 جولائی تک ان کے سارے ''مطالبات'' پورے کر دے گی' ایم کیو ایم کے بعض حلقوں کے مطابق ان ''مطالبات'' میں وزیر اعلیٰ سندھ کے ساتھ ساتھ ڈائریکٹر جنرل پوسٹ آفس آغا مسعود' پی ڈبلیو ڈی کے ڈی جی بریگیڈیئر چیمہ اور نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے چیئرمین میجر جنرل فرخ جاوید کی تبدیلی بھی شامل تھی' ان دو ماہ میں آغا مسعود اور بریگیڈیئر چیمہ کے سلسلے میں ایم کیو ایم کی خواہش پوری ہو گئی لیکن چیف منسٹر سندھ اور جنرل فرخ جاوید کا مسئلہ لٹکا رہا' اس دوران چیف منسٹر آفس میں ایم کیو ایم کے وزراء کی انتہائی سو فائلیں جمع ہو گئیں' ایم کیو ایم کے وزراء جب یہ فائلیں نکالنے کا مطالبہ کرتے تھے تو ارباب غلام رحیم وفاقی حکومت پر ذمہ داری عائد کر دیتے' وہ کہتے تھے جب تک مجھے اسلام آباد سے حکم نہیں آئے گا میں آپ لوگوں کی مدد نہیں کر سکتا' ایم کیو ایم کی ان فائلوں میں 50 ہزار نوکریاں بھی شامل تھیں' 31 جولائی کی ڈیڈ لائن آہستہ آہستہ قریب آنے لگی' جولائی کے آخری ہفتے میں صدر کراچی تشریف لے گئے' ایم کیو ایم کا خیال تھا صدر کراچی میں چیف منسٹر کی تبدیلی کا فیصلہ کریں گے لیکن صدر صاحب نے ایم کیو ایم کی توقعات کے برعکس جلسہ عام میں ارباب غلام رحیم پر اعتماد کا اظہار کر دیا جس سے ایم کیو ایم کے جذبات کو شدید دھچکا پہنچا لہٰذا اس کے وزراء نے اگلے دن سندھ اور وفاق میں استعفے دے دیئے۔ اس رات صدر نے ایم کیو ایم کے سربراہ الطاف حسین سے ٹیلی فون پر 55 منٹ گفتگو کی جس میں بڑی حد تک معاملات طے پا گئے' اس گفتگو کے دوران ایم کیو ایم اور حکومتی نمائندوں میں یکم اگست کو میٹنگ طے ہوئی' خیال تھا یکم اگست کو ایم کیو ایم استعفے واپس لے لے گی لیکن عین وقت پر ایم کیو ایم نے چیف منسٹر کے ایک بیان کو ایشو بنایا اور مذاکرات میں شامل ہونے سے انکار کر دیا جس کے بعد حکومت ''ڈیڈ لاک'' کا شکار ہو گئی' رات میری عمران خان سے بات ہو رہی تھی' خان صاحب نے پوچھا ''اس سارے ڈرامے کا کیا نتیجہ نکلے گا'' میں

نے عرض کیا "ایم کیو ایم کے سارے مطالبے مان لئے جائیں گے" عمران خان نے قہقہہ لگا کر میری بات کی تائید کی' میں نے ان سے عرض کیا" وزیر اعلیٰ سندھ سے جو بیان منسوب کیا جا رہا ہے اس میں انہوں نے کہا تھا وہ گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی پسند کریں گے لہٰذا میرا خیال ہے انہیں شیر کی ایک دن کی زندگی دے دی جائے گی" عمران خان نے پوچھا "اور اگر یہ نہ ہوا تو!" میں نے عرض کیا" سندھ کا گورنر تبدیل ہوگا جس کے بعد وہاں گورنر راج نافذ ہوگا اور ایم کیو ایم اپوزیشن کے ساتھ شامل ہو جائے گی" عمران خان نے دوسری بار قہقہہ لگایا۔

سندھ حکومت کا بحران کس کروٹ بیٹھتا ہے اس کے بارے میں سر دست کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا طے ہے ہماری حکومت اس وقت بے شمار "ڈیڈ لائنوں" میں گھر چکی ہے' اے آر ڈی اور ایم کیو ایم کی ڈیڈ لائن ختم ہو چکی ہے' بے نظیر بھٹو کی ڈیڈ لائن ختم ہونے والی ہے' مولانا فضل الرحمان ڈیڈ لائن دے کر ملک سے باہر جا چکے ہیں' قاضی حسین احمد اپنے ہاتھ سے اینڈ رسن وِل کے گرد سفید لکیر کھینچ رہے ہیں اور امریکہ اور بھارت کی ڈیڈ لائنیں سر پر کھڑی ہیں' یہ تمام ڈیڈ لائنیں کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہیں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ آپ کو صرف مشاہد حسین بتا سکتے ہیں!

# چند ماہ کی بات ہے

شاہ ایران محمد رضا پہلوی 1941ء میں تخت نشین ہوا۔ وہ خادم مغرب کہلاتا تھا' وہ امریکی صدر کو اپنا باس کہتا تھا اور واشنگٹن کو ایران کا دارالحکومت' آپ اس کی امریکہ نوازی کی انتہا دیکھئے شاہ ایران نے بیک جنبش قلم ایران میں موجود تمام امریکیوں کو سفارتی حیثیت دے دی' اس وقت ایران دنیا کا واحد ملک تھا جس میں جو امریکی شہری قدم رکھتا تھا اسے ایئر پورٹ پر سفارت کار کا سٹیٹس مل جاتا تھا۔ دنیا میں امریکہ سے باہر کیلیفورنیا یونیورسٹی کی صرف ایک شاخ تھی اور وہ شاخ ایران میں تھی' شاہ ایران کا خیال تھا امریکہ اس کا دوست ہے لہٰذا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن جب 1979ء میں انقلاب آیا تو امریکہ دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے شاہ ایران کو پناہ دینے سے انکار کیا' شاہ ایران پوری دنیا میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن امریکہ نے اسے علاج تک کے لئے نیو یارک نہ اترنے دیا یہاں تک کہ جب اس کا انتقال ہوا تو لواحقین اس کی نعش اٹھا اٹھا کر پھرتے رہے مگر امریکہ کے خوف سے کوئی ملک شاہ کی میت کو چھ بائی دو فٹ جگہ دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آخر مرحوم بادشاہ کو قاہرہ میں قبر نصیب ہوئی۔ ''اناس تاسیو سوموزا'' نکارا گوا میں امریکہ کا دوست تھا' وہ اور اس کا والد برسوں امریکہ کے سپاہی بن کر کیمونزم کے خلاف لڑتے رہے۔ اناس تاسیو کا بھی یہی خیال تھا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن جب اسے نکارا گوا سے بھاگنا پڑا تو امریکہ نے اسے پناہ دینے سے انکار کر دیا' یہ اناس تاسیو سوموزا پیرا گوا کے شہر ''اسنشن'' میں

انتہائی کسمپرسی کی حالت میں مرا' فلپائن کا فرڈی نینڈ مارکوس بھی امریکہ کا دوست تھا' وہ فلپائن میں 20 سال تک امریکی دوستی کا حق ادا کرتا رہا۔ اس نے امریکہ کے ایما پر ہزاروں کیمونسٹ ذبح کر دیئے لیکن وہ 1986ء میں ہونولولو میں امریکہ کی بے وفائیوں کے شکوے کرتے کرتے مرا' انگولا کے باغی لیڈر جوناس سیومبی نے 1992ء میں امریکہ کی ایماء پر کیمونسٹوں سے امن معاہدہ کیا تھا وہ بھی اس خدمت کے بعد یہ سمجھتا تھا اس کی باری کبھی نہیں آئے گی لیکن سی آئی اے نے جوناس کی امداد روک لی جس کے بعد کیمونسٹوں کی تنظیم ایم پی ایل اے نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ امریکہ کی مدد کا انتظار کرتا ہوا ہلاک ہو گیا' پانامہ کے جنرل نوریگا نے 25 سال امریکہ کی خدمت کی لیکن امریکہ نے پانامہ پر فوج کشی فرما دی۔ نوریگا کو گرفتار کیا' اس پر منشیات کا کیس بنایا اور اسے عدالت سے سزا دلا کر جیل میں ڈال دیا۔ امریکہ نے 1979ء میں رہوڈیشیا کے بشپ ایبل منرو ریوا کو موغابے اور نکومو کے خلاف ہلا شیری دی بعد ازاں یہی بشپ امریکی دوستی کے طفیل عبرت کا نشان بن گیا۔ چلی کے ارگسٹو پنوشے نے ملک کو خانہ جنگی اور کیموزم سے بچایا' 17 سال امریکہ کی خدمت کی' وہ امریکہ کا اس قدر وفادار تھا کہ اس نے 1990ء میں امریکہ کے حکم پر حکومت چھوڑ دی اور لندن میں پناہ لے لی' امریکہ کے اشارے پر لندن میں اسے نظر بند کر دیا گیا' وہ امریکہ کو مدد کے لئے دہائی دیتا رہا لیکن پنوشے کی باری آ چکی تھی۔



آپ امریکہ کے دوست ملکوں کی مثال بھی لیجئے' دوسری جنگ عظیم کے بعد 29 ممالک کا خیال تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" لیکن امریکہ نے ان ممالک پر 97 فوجی حملے کئے' آپ تاریخ نکال کر دیکھ لیجئے چین ہو' کوریا ہو یا پھر گوئٹے مالا' انڈونیشیا' کیوبا' کانگو' پیرو' لاؤس' ویت نام' کمبوڈیا' گرینیڈا' لبنان' لیبیا' ایل سلواڈور' نکاراگوا' پانامہ' سوڈان' پورٹو ریکو' یوگوسلاویہ' یوراگوئے' البانیہ' زائر' ہیٹی' بوسنیا' صومالیہ' لائبیریا' بولیویا' افغانستان یا پھر عراق ہر وہ ملک جو امریکہ کا دوست تھا' جس نے خود کو امریکہ سے محفوظ سمجھا اور جو یہ کہتا تھا "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" اس ملک پر امریکی فوج ضرور اتری۔ اس ملک میں امریکی بارود ضرور پھٹا اور اس ملک پر امریکی طیاروں نے ضرور بم برسائے۔ یہ امریکہ کی 1890ء سے اپریل 2003ء تک کی فوجی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں افغانستان اور عراق جیسے درجنوں ملک آتے ہیں۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے ایک بار کہا تھا "آپ امریکہ کی مخالفت کریں تو امریکہ آپ کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لے گا لیکن اگر آپ اس کے دوست بن جائیں تو وہ آپ کو سستے داموں بیچ

دے گا۔" ہم بھی امریکہ کے دوست ہیں لہٰذا بھارت ہمیں گرم تعاقب کی دھمکی دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کو اپنا دوست سمجھ کر مطمئن بیٹھ جاتے ہیں' رچرڈ باؤچر بھارت میں پاکستان کے خلاف بیان دیتا ہے لیکن ہم امریکہ کی دوستی پر اعتماد کر کے چپ چاپ بیٹھے جاتے ہیں' وہ ہم سے ڈاکٹر قدیر' جنوبی وزیرستان اور گوادر مانگتا ہے لیکن ہم اسے ایک دوست کا "لاڈ" سمجھ کر مسکرا دیتے ہیں اور امریکہ کے تھنک ٹینک ہمیں دہشت گرد قرار دیتے ہیں لیکن ہم سوچتے ہیں "ہماری باری کبھی نہیں آئے گی" ہم خود کو عراق' پانامہ اور فلپائن کے مقابلے میں امریکہ کا کہیں زیادہ دوست سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں۔ہم نیوشے' بشپ اسعبل' نوریگا' مارکوس' جوناس سیوبی' تاسیو اور رضا پہلوی کے مقابلے میں امریکہ کے کہیں زیادہ وفادار ہیں لہٰذا ہماری باری کبھی نہیں آئے گی لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں' ہاتھی کتنا ہی مہذب کیوں نہ ہو جائے وہ سونڈ ہلائے بغیر نہیں رہ سکتا اور بچھو خواہ مسجد میں جنم لے وہ ڈسے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں جس امریکہ نے غیر نیوکلیائی ملک عراق کو نہیں بخشا تھا وہ جوہری اسلامی طاقتوں کو کیوں معاف کرے گا! ہم یہ بھول جاتے ہیں' ہم امریکہ کے دوست ہیں لہٰذا ہمیں کبھی نہ کبھی اس دوستی کا تاوان ضرور ادا کرنا پڑے گا' ہم کبھی نہ کبھی ہاتھی کی سونڈ کی لپیٹ میں ضرور آئیں گے لیکن ہم ایک خوش فہم قوم ہیں، ہم اور ہمارے حکمران ابھی تک یہ سمجھ رہے ہیں ان کی باری کبھی نہیں آئے گی، ہم لوگ بلوچستان میں لگی آگ کا نظارہ کر رہے ہیں، ہم اپنی سرحدوں پر ہونے والی تبدیلیاں بھی دیکھ رہے ہیں اور ہم بھارت اور افغانستان کی آنکھوں کی سرخی بھی دیکھ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم یہ سمجھ رہے ہیں، ہماری باری نہیں آئے گی، ہم کتنے خوش فہم ہیں ہم یہ سمجھ رہے ہیں دودھ میں گرنے کے بعد چھپکلی کا زہر ختم ہو جائے گا اور پاکستان تک پہنچ کر بچھو اپنی فطرت بدل لے گا' ہم حقیقتاً بہت بے وقوف ہیں' ہمیں یہ نظر نہیں آ رہا' ہماری باری آ چکی ہے' اب بس چند ماہ کی بات ہے!

O......O......O
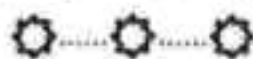
# نائین الیون

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ نیوجرسی سے نکلا، راستے میں ہم لوگ گاڑی کا آئل اور فلٹر تبدیل کرانے کیلئے ایک درمیانے درجے کی ورکشاپ پر رک گئے۔ ورکشاپ پر اس وقت چھ کارکن تھے، ہم نے جونہی گاڑی کھڑی کی، وہ لوگ آگے بڑھے۔ انہوں نے گاڑی ''ڈیک'' پر لگائی۔ ہائیڈرالک ستونوں کے ذریعے گاڑی اوپر اٹھائی اور تقریباً گھنٹہ لگا کر انہوں نے گندا آئل نکالا، پرانا فلٹر الگ کیا، نیا فلٹر اور تازہ آئل بھرا اور پھر اس کے بعد ڈیک پر ہی گاڑی سٹارٹ کر کے انجن کے فنکشنز کا جائزہ لینے لگے، اس جائزے کا دورانیہ بھی تقریباً ایک گھنٹے پر محیط تھا، اس جائزے کے دوران انہوں نے دیکھا آئل تو لیک نہیں کر رہا فلٹر تو نہیں رس رہا، نیا آئل انجن کو پریشان تو نہیں کر رہا اور آئل اور فلٹر تبدیل ہونے سے گاڑی کی رفتار اور کارکردگی پر برے اثرات مرتب تو نہیں ہوئے۔ اس سارے عمل کے دوران ان لوگوں نے نئے آنے والے گاہکوں کو ''وی آر بزی'' کا نعرہ لگا کر بھگا دیا، جب ہم لوگ فارغ ہوئے تو یہ لوگ ورکشاپ کی صفائی پر جت گئے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ورکشاپ یوں ہو گئی جیسے برسوں سے وہاں کوئی گاڑی نہیں آئی۔ میں یہ صورتحال دیکھ کر پریشان ہو گیا کیونکہ ہمارے ملک میں عام فٹ پاتھوں پر بیٹھے ''چھوٹے'' یہ کام کسی آلے اور ورکشاپ کے بغیر چند منٹوں میں کر دیتے ہیں۔ موٹروے پر پہنچ کر میں نے اپنے دوست سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ ہنس کر بولے'' اے

امریکن وے آف ڈوئنگ تھنگز کہتے ہیں''۔

اس واقعے کے بعد میں نے ایک نئے زاویے کے ساتھ امریکی معاشرے کا جائزہ لیا تو مجھے پوری امریکی ''سوسائٹی امریکن وے آف ڈوئنگ تھنگز پر کاربند نظر آئی۔ امریکہ میں جب کوئی شخص کام شروع کرتا ہے تو وہ چار چیزوں کا خیال رکھتا ہے ایک یکسوئی، دو مہارت، تین بعد از خدمت مشاہدہ اور چار ماحول یا جگہ کی صفائی۔ اس سارے سلسلے کو آپ یوں دیکھ سکتے ہیں فرض کریں آپ امریکہ میں باتھ روم ٹھیک کرانے کیلئے پلمبر بلواتے ہیں۔ اول وہ پلمبر اس قدر یکسوئی سے کام کرے گا کہ اس دوران دنیا سے اس کا رابطہ تک منقطع ہو جائے گا۔ وہ کسی دوسری چیز، کسی دوسرے کام کے بارے میں سوچے گا اور نہ ہی اس کی طرف دیکھے گا، دوم وہ کام مکمل کرنے کیلئے اپنی پوری مہارت صرف کر دے گا، سوم کام مکمل ہونے کے بعد وہ ایک کونے میں بیٹھ کر اس کا جائزہ لیتا رہے گا کہ کیا کام واقعی اس معیار، اس لیول کو ''ٹچ'' کر رہا ہے جس کی ضرورت تھی اور آخر میں پلمبر وہ جگہ صاف کرے گا جہاں اس نے کام کیا تھا یوں وہ پلمبر وہاں سے واپس جائے گا اور کوئی شخص اس باتھ روم میں داخل ہونے کے بعد اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ یہاں کام ہوا تھا یا یہاں سے ابھی ابھی کوئی پلمبر گیا ہے۔ اس ''امریکن وے آف ڈوئنگ تھنگز'' کی دو بڑی وجوہات ہیں اول امریکہ میں زیادہ تر کام گارنٹی یافتہ ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی سے کام کراتا ہے تو یہ طے ہوتا ہے اگر سروس کے بعد خرابی دور نہ ہوئی یا چند دنوں بعد وہی مسئلہ دوبارہ پیدا ہو گیا تو وہ مستری یا کارکن واپس آ کر اسی ادا شدہ رقم میں وہ کام دوبارہ کرے گا۔ دوم اگر اس مرمت کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو وہ کارکن یا کمپنی اس کی تلافی کرے گی لہٰذا یہ وہ خوف ہیں جن کے باعث امریکہ میں کوئی شخص رسک لینے کیلئے تیار نہیں ہوتا چنانچہ وے آف ڈوئنگ تھنگز کا یہ فلسفہ ان لوگوں کی سائیکی، ان لوگوں کے مزاج کا حصہ بن چکا ہے۔

اب دیکھئے ایک طرف تو یہ حالت ہے امریکہ کا ایک عام مکینک، ایک عام پلمبر گاڑی کا آئل بدلنے یا ایک معمولی سی ٹونٹی ٹھیک کرنے میں پورا پورا دن لگا دیتا ہے جبکہ دوسری طرف امریکی سیاست ہے اور امریکی حکومت کا وے آف ڈوئنگ تھنگز ہے امریکہ نے دس سال تک افغانستان میں روس کے خلاف جنگ لڑی، ان دس سالوں میں امریکہ نے افغانوں کو بے تحاشا اسلحہ دیا انہیں حملہ کرنے، چھاپہ مارنے، بموں کے بغیر دشمن کے ٹھکانے تباہ کرنے، جان لینے اور جان دینے کی ٹریننگ دی۔ انہیں ہیروئن بنانے اور یورپ اور امریکہ پہنچانے کا طریقہ سکھایا۔

انہیں میزائل دیئے، انہیں توپیں اور ٹینک دیئے اور انہیں بم بنانے اور چلانے کے طریقے سکھائے لیکن جب افغانوں کی تین نسلیں مرنے اور مارنے میں طاق ہو گئیں تو امریکہ یہ سارا گند چھوڑ کر واپس چلا گیا اور اس نے یہ تک نہ سوچا یہ مہلک ترین اسلحہ، یہ ٹرینڈ لوگ اور یہ مرنے مارنے کی فضا کس کس کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے بطن سے کون کون سی تحریکیں جنم لیں گی اور اس کے انڈوں سے کیا کیا خوف، کیا کیا ڈر پیدا ہوں گے۔ افغانستان ایک ایسا آپریشن تھا جس کے اختتام پر امریکہ نے اپنا وے آف ڈوئنگ تھنگز کا فلسفہ فراموش کر دیا تھا۔ اس نے آپریشن کے بعد جگہ کی صفائی کا اصول بھلا دیا تھا اور وہ افغانستان کو افغانوں پر چھوڑ کر چلا گیا تھا، اس بے وفائی، اس کھٹور پن کا پہلا نقصان پاکستان نے اٹھایا، پاکستان شدید ترین دہشت گردی کا شکار ہو گیا، افغانستان سے کلاشنکوفیں آئیں اور پاکستان کی گلی گلی محلے محلے میں ریڑھیوں اور ٹھیلوں پر بکنے لگیں۔ بم، راکٹ لانچر اور گرنیڈ آئے، کراچی پہنچے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کو آگ لگ گئی۔ یورپ اور امریکہ نے ہیروئن چرس اور افیون کے راستے بند کئے تو پاکستان ان مہلک منشیات کی منڈی بن گیا، پاکستان میں فرقہ پرستی شروع ہو گئی اور افغانستان سے درآمد شدہ اسلحہ مسجدوں، امام بارگاہوں اور قبرستانوں میں استعمال ہونے لگا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ بارود کی یہ بو بحیرہ عرب سے نکل کر میڈی ٹیرن سی اور اٹلانٹک اوشین تک جا پہنچی افغانستان کے بارود کی تپش امریکہ کے پاؤں تک آ گئی اور دنیا ایک خوفناک جنگ کے دہانے پر آ کھڑی ہوئی جس کے بارے میں آئن سٹائن نے کہا تھا تیسری جنگ کے بعد دنیا میں جو لوگ بچ جائیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے۔ اس سارے کھیل میں کون قصوروار ہے؟ یہ کس کی خامی، کس کی غلطی تھی؟ اگر ورلڈ ٹریڈ سنٹرز کی تباہی کا کھرا واقعی افغانستان جاتا ہے تو بھی مجرم افغان یا اسامہ بن لادن نہیں بلکہ خود امریکہ ہے' امریکہ 1990ء میں افغانستان کی آگ بجھائے بغیر واپس چلا گیا تھا اور وہ یہ بھول گیا تھا امریکی قانون کے مطابق اگر کسی جگہ مرمت کے بعد کوئی خرابی رہ جائے یا کوئی چیز ٹوٹ جائے تو اس کا تاوان مکینک، مستری کارکن یا کمپنی کو ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ یہ بھول گیا تھا چنگاری چنگاری رہے تو اسے بجھانا آسان ہوتا ہے لیکن اگر وہ بھانبڑ بن جائے تو اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہتا، وہ بھول گیا تھا لاوا چٹانوں میں رہے تو وہ پانی ہوتا ہے لیکن وہ باہر آ جائے تو اس کی پھیلائی تباہی کا سلسلہ سمندروں تک جاتا ہے۔ وہ یہ بھول گیا تھا سلگتی ہوئی آگ اور ٹوٹا ہوا بند قیامت ہوتا ہے۔

کل نائن الیون تھا، امریکہ نے کل تاریخ کے سب سے بڑے سانحے کی پانچویں برسی منائی، میں بھی کل امریکہ کے عوام کے ساتھ اداس تھا لیکن میں ساتھ ساتھ سوچ رہا تھا امریکہ نے جو فصل 1990ء میں افغانستان میں بوئی تھی اسے وہ فصل 2001ء میں کاٹنا پڑی تھی لیکن اس نے جو کانٹے 2003ء میں بوئے ہیں اس فصل کے کٹنے کا وقت کب آئے گا۔ یہ آگ امریکہ کے پاؤں تک کب پہنچے گی۔

# محبت اور امن

اسیسا اٹلی کا خوبصورت ریجن ہے اور اسیسی (Assisi) اس کا ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر یہ شہر اپنے قدیم چرچ کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ چرچ 1228ء میں بنا تھا اور آج تک اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے' پوری دنیا سے ہر سال لاکھوں سیاح اسیسی آتے ہیں' یہ چرچ دیکھتے ہیں اور اس کی شان کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ 80ء کی دہائی تک اسیسی محض عیسائیوں کے لئے ایک مقدس اور سیاحوں کے لئے ایک سیاحتی مرکز تھا لیکن 1986ء میں پوپ جان پال نے اسے ایک نئی حیثیت دے دی' 1986ء میں سرد جنگ اپنے عروج پر تھی' افغانستان میں سوویت یونین کی فوجوں اور افغانوں' پوری دنیا کے مسلمان مجاہدین' امریکہ اور اس کے عیسائی اتحادیوں کے مابین جنگ جاری تھی' بیت المقدس میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی' لداخ کے مسئلے پر چین کے سوشلسٹ اور بھارتی ہندو ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے' تبت کی وجہ سے چینی حکومت اور بودھوں کے درمیان کشمکش پائی جاتی تھی' بوسنیا' سربیا اور کروشیا میں نفرتوں نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کر دیا تھا' بلقانی ریاستوں میں یونان کے عیسائی اور ترک مسلمان لڑ رہے تھے' براعظم امریکہ میں کیوبا اور امریکہ کے درمیان میزائلوں کی دوڑ جاری تھی' شمالی کوریا جنوبی کوریا کے ساتھ دست و گریبان تھا اور برلن کے عیسائی دو حصوں میں تقسیم تھے' اس وقت محسوس ہوتا تھا پوری دنیا بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہے اور

بس ایک دیا سلائی دکھانے کی دیر ہے اور پوری دنیا بھک سے اڑ جائے گی' اس وقت پوپ جان پال سامنے آئے اور انہوں نے ستمبر 1986ء میں اسامی میں مذاہب عالم کی پہلی امن کانفرنس منعقد کرائی۔ یہ ایک دعائیہ کانفرنس تھی جس میں تمام مذاہب کے بڑے رہنما اکٹھے ہوئے' انہوں نے آپس میں ڈائیلاگ کی ضرورت پر زور دیا اور آخر میں سب نے مل کر اللہ تعالیٰ سے امن کی دعا کی۔

یہ کانفرنس 1986ء کے بعد ایک روایت بن گئی اور پچھلے بیس برس سے ہر سال ستمبر میں دنیا بھر کے مذہبی رہنما اور وفود اسامی میں جمع ہوتے ہیں اور امن کیلئے اجتماعی دعا کرتے ہیں۔ اس سال بھی اسامی میں امن کانفرنس ہوئی' کانفرنس کا میزبان ویٹی کن سٹی تھا اور اس کا افتتاح اٹلی کے صدر نے کیا تھا جبکہ اس میں اٹلی کے 5 بڑے وزراء کے علاوہ برکینو فاسو کے صدر' آرتھوڈکس چرچ کے سربراہ' یہودیوں کے رہنما' ویٹی کن سٹی کے کارڈینل' نیپلز کے کارڈینل اور بودھوں کے روحانی پیشوا نے شرکت کی' اسلامی دنیا سے اس کانفرنس میں جامعۃ الازہر کے ریکٹر احمد الطیب' قاہرہ یونیورسٹی سے حسن حنفی' الجزائر سے محمد السلیمان اور ایران سے محمد علی کسرانی نے شریک ہوئے' اٹلی میں موجود پاکستانیوں کا ایک وفد بھی اس کانفرنس میں شریک ہوا' اس وفد کی قیادت پاکستان کے سرمایہ کاری قونصلر اور یورپ کے نامور پاکستانی بزنس مین طارق بھٹی نے کی تھی۔ طارق بھٹی کے ساتھ پاکستانی صحافی اور یورپ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو اخبار ''جذبہ'' کے چیف ایڈیٹر اعجاز احمد پیارا بھی شامل تھے' وفد میں ایک پاکستانی مسیحی سکالر پروفیسر مبین شاہد بھی شامل تھے' پروفیسر مبین شاہد کا تعلق جہلم سے ہے' وہ ویٹی کن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور وہ پاکستان کے ان چند مسیحیوں میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے ٹیلنٹ اور محنت کے زور پر ویٹی کن یونیورسٹی کی فیکلٹی میں شامل ہوئے ہیں' برادرم طارق بھٹی کا تعلق گوجر خان سے ہے وہ آج سے پچیس تیس برس پہلے روزگار کے سلسلے میں فرانس گئے تھے' یورپ جا کر انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی' وہ ٹیلی کمیونیکیشن کے بزنس سے وابستہ ہیں' ان کی کمپنی کا نیٹ ورک اس وقت پورے یورپ میں پھیلا ہوا ہے۔ اٹلی کی حکومت انہیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور وہ اس وقت اطالوی اور پاکستانی حکومتوں کے درمیان پل کا کام دے رہے ہیں' پاکستان میں وہ صدر صاحب کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں' اٹلی میں موجود پاکستانیوں نے اس سال اپنے طور پر امن کانفرنس میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا' انہوں نے وفد تشکیل دیا اور طارق بھٹی کو اس وفد کا سربراہ بنا دیا' یہ اسامی امن کانفرنس میں پاکستانیوں کی پہلی نمائندگی تھی' یہ لوگ جب کانفرنس میں پہنچے تو دوسرے تمام وفود نے

بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا' اٹلی کے صدر اور وزیر داخلہ آگے بڑھ کر پاکستانی وفد سے ملے اور پاکستان اور صدر پرویز مشرف کا بڑے اچھے الفاظ میں ذکر کیا۔

اس کانفرنس میں جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب نے بڑی خوبصورت بات کہی، انہوں نے کہا "دنیا مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہے، اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جو امن اور سلامتی پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے، ہمارے مذہب میں دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو دونوں السلام علیکم کہہ کر ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں لہٰذا جو مذہب امن اور سلامتی پر اتنا یقین رکھتا ہو اس سے دنیا کے امن کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے" پروفیسر مبین شاہد نے کانفرنس میں پاکستان کا مقدمہ پیش کیا انہوں نے بتایا "میں ایک عیسائی پاکستانی ہوں، میں ویٹی کن سٹی میں پڑھاتا ہوں لہٰذا آپ مجھے ایک ذمہ دار عیسائی کہہ سکتے ہیں، میں آج دعوے سے کہتا ہوں پاکستان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، ہم سب پاکستان میں امن اور اطمینان سے رہ رہے ہیں" پروفیسر مبین شاہد اور جامعہ الازہر کے ریکٹر جناب احمد الطیب کی گفتگو کو تمام شرکاء نے سراہا۔ طارق بھٹی نے کہا "جب تک دنیا کی متحارب قوموں میں ڈائیلاگ نہیں ہوتا اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا، ہم نے اس کانفرنس میں شریک ہو کر ڈائیلاگ کا آغاز کر دیا اب آپ لوگ آگے بڑھیں تا کہ دنیا جنگوں اور نفرتوں سے باہر آ سکے"۔ اس کانفرنس کے آخر میں تمام مذاہب کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے عبادت کی، اساسی شہر میں امن مارچ کیا' امن کیلئے شمعیں جلائیں، ایک دوسرے کو پھول پیش کئے اور امن کیلئے اجتماعی دعا کی۔

اساسی کی امن کانفرنس ایک اچھی روایت ہے لیکن اس کے پلیٹ فارم اور دائرہ کار کو مزید وسعت ملنی چاہیے، ویٹی کن سٹی کو اسے صدارتی سطح تک لے جانا چاہیے اور اس میں پوپ اور امام کعبہ کو بھی شریک ہونا چاہیے، پاکستان امن کے معاملے میں فرنٹ لائن سٹیٹ ہے لہٰذا پاکستان کو اس کانفرنس میں سرکاری طور پر شریک ہونا چاہیے تھا، میں پچھلے دنوں اٹلی گیا تو وہاں پاکستان کے چند مقامی لیڈروں نے بتایا وہ کوشش کر رہے ہیں اگلے سال ویٹی کن سٹی سید مشاہد حسین کو سرکاری طور پر دعوت دے، ان کا کہنا تھا ویٹی کن سٹی میں سید مشاہد حسین کے بارے میں بڑی اچھی رائے پائی جاتی ہے، ویٹی کن کی قیادت انہیں سکالر اور معتدل پاکستانی لیڈر سمجھتی ہے' پوپ تک ان کے نام سے واقف ہیں لہٰذا پاکستانیوں کی خواہش ہے اگلے سال سید مشاہد حسین پاکستان

کا وفد لے کر اساسی آئیں، مجھے ان لوگوں نے مشاہد حسین کو یہ پیغام دینے کی ذمہ داری سونپی، میں نے واپس آ کر شاہ صاحب سے رابطے کی کوشش کی لیکن شاہ جی آج کل سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف ہیں لہٰذا ان سے ملاقات نہ ہو سکی تاہم مجھے یقین ہے شاہ جی اگلے سال تک فارغ ہو چکے ہوں گے اور ان کے پاس امن اور اساسی دونوں کیلئے بڑا وقت ہو گا۔ میں واپس اساسی کانفرنس کی طرف آتا ہوں۔ یہ حقیقتاً ایک بڑا پلیٹ فارم ہے لہٰذا پاکستان کو اس پر توجہ دینی چاہئے، طارق بھٹی ویٹی کن سٹی اور اٹلی حکومت کے قریب ہیں چنانچہ ہماری حکومت ان کی مدد سے پوپ کے حلقے تک پہنچ سکتی ہے جس کے نتیجے میں پاکستان کا بین الاقوامی امیج بہتر ہو گا۔

دنیا کے تمام مذاہب میں دو چیزیں مشترک ہیں، ایک محبت اور دوسری امن، ہم سب لوگ اگر ان دو چیزوں کو عالمی اصول بنا لیں تو مجھے یقین ہے دنیا کی تمام توپوں کے دھانوں میں پھول اگ آئیں اور ساری چھاؤنیاں نرسریوں کی شکل اختیار کر جائیں اور دنیا حقیقت میں رہنے کے قابل ہو جائے گی لیکن افسوس اس زمین کے لوگوں کے پاس محبت کے لئے وقت ہے اور نہ ہی امن کیلئے۔

# ملک بھی پھتو ہوتے ہیں

پھتو اندرون پنجاب کے بڑے دلچسپ کردار ہوتے ہیں' یہ لوگ عموماً کمی خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کا واحد مقصد چودھریوں کے جرائم کی سزا بھگتنا ہوتا ہے' پنجاب کے وڈیرے' سردار اور چودھری اپنے کمیوں میں سے مضبوط قد کاٹھ کے نوجوان الگ کر لیتے ہیں اور انہیں پھتو کا عہدہ دے کر اپنا قرب عنایت کر دیتے ہیں جس کے بعد یہ لوگ خصوصی سلوک کے مستحق ہو جاتے ہیں' پنجاب کے چودھری' سردار اور وڈیرے عموماً ظالم ہوتے ہیں' یہ لوگ کمزوروں کے ساتھ زیادتی کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں' آج سے سو پچاس برس پہلے تک ان کی زیادتیاں بے لگام ہوتی تھیں اور یہ لوگ اگر دس بیس بندے قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی ان کے سامنے آہ نہیں کرتا تھا لیکن جب انسانی حقوق کا دور شروع ہوا اور قانون نے پھیل کر چھوٹے فرعونوں کو اپنے دائرے میں لے لیا تو یہ لوگ پھتو کا باقاعدہ ''محکمہ'' بنانے پر مجبور ہو گئے' اب یہ لوگ ظلم کرتے ہیں' عورتوں کو اغواء کرتے ہیں' ان کی آبروریزی کرتے ہیں' دشمنوں پر تشدد کرتے ہیں اور گاؤں کے گاؤں قتل کر دیتے ہیں لیکن جب پولیس آتی ہے تو ان کا کوئی نہ کوئی پھتو آگے بڑھ کر چودھری صاحب کا جرم اپنے سر لے لیتا ہے' جس کے بعد پھتو پولیس' کچہریوں اور جیلوں میں چودھری صاحب کے حصے کی سزا بھگتا ہے' چودھری صاحبان اس کی غیر موجودگی میں اس کے خاندان کا خیال رکھتے ہیں اور جب پھتو ''سزا'' کاٹ کر واپس آتے ہیں تو چودھری اس کے اعزاز میں بہت

بڑی تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جس میں ان کی قربانیوں اور وفاداریوں کا خصوصی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

میں نے خود ایک بار اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو پھتو بنتے دیکھا میں ڈی جی خان کے ایک سردار صاحب کے ساتھ سفر کر رہا تھا' سردار صاحب میرے ساتھ گفتگو بھی فرما رہے تھے اور ڈرائیونگ بھی کر رہے تھے' یہ رات کا وقت تھا' دوران سفر ہماری لینڈ کروزر ایک چھوٹی ایف ایکس کے ساتھ ٹکرا گئی' حادثہ شدید تھا' ہم لوگ بڑی گاڑی میں ہونے کی وجہ سے صاف بچ گئے لیکن ایف ایکس کے مسافر شدید زخمی ہو گئے' سردار صاحب نیچے اترے' انہوں نے ایف ایکس کا جائزہ لیا' اپنے گارڈز میں سے ایک لمبے تڑنگے نوجوان کو قریب بلایا' لینڈ کروزر کی چابی اس کے حوالے کی اور مجھے دوسری گاڑی میں بٹھا کر آگے روانہ ہو گئے' میرے لئے یہ انتہائی خوفناک صورتحال تھی' میں حادثے میں کا شکار ہونے والوں کیلئے سوگوار تھا جبکہ سردار صاحب ڈرائیونگ اور میوزک سے لطف اندوز ہو رہے تھے' سردار صاحب نے میری طرف دیکھا' مجھے تسلی دی اور دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو گئے' میرے اوسان ذرا سے بحال ہوئے تو میں نے ان سے پوچھا ''حادثے کا شکار ہونے والوں کا کیا بنے گا'' انہوں نے فرمایا ''میرا بندہ ٹھیک کر لے گا'' میں نے پوچھا ''اگر پولیس کیس بن گیا تو؟'' انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ''میرا بندہ یہ جرم اپنے سر لے لے گا اور میری جگہ گرفتار ہو جائے گا'' میں نے حیران ہو کر پوچھا ''اس کے بعد کیا ہو گا'' وہ بولے ''اس کے بعد میں اپنے بندے کو چھڑانے کی کوشش کروں گا' سفارش اور رشوت کا سہارا لوں گا' اگر کامیابی نہ ہوئی تو میں اچھے سے اچھے وکیل کا بندوبست کروں گا'' میں نے پوچھا ''اور اگر اس کے بعد بھی وہ رہا نہ ہوا تو؟'' انہوں نے قہقہہ لگایا ''تو پھر کوئی بات نہیں وہ میری جگہ پولیس کی مار کھائے گا اور جیل میں رہے گا' یہ میرا پھتو ہے اور یہ اس کی جاب ہے'' میں نے زندگی میں پہلی بار اس نوعیت کی جاب سنی تھی۔

یہ ہوتے ہیں پھتو' آپ نے اکثر اخبارات میں خبریں پڑھی ہوں گی' فلاں وڈیرے نے اپنے ہاریوں کے ساتھ مل کر فلاں خاتون کی آبروریزی کی' میں جب شروع شروع اس قسم کی خبریں پڑھتا تھا تو سوچتا تھا وڈیرے اس ''نیک'' کام میں اپنے ہاریوں کو کیوں شامل کر لیتے ہیں' میں نے سردار صاحب جیسے لوگوں سے اس بارے میں پوچھا تو پتہ چلا یہ ہاری پھتو ہوتے ہیں اور وڈیرے خود کو قانون سے بچانے کیلئے انہیں استعمال کرتے ہیں' پتہ چلا جب وڈیرے کسی خاتون

کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں تو وہ بعد ازاں خاتون کو اپنے پھتوؤں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ اگر "خدانخواستہ" پولیس کیس بن جائے اور طبی معائنہ ہو تو سردار صاحب بچ جائیں اور سزا کا پھندہ اس پھتو کے گلے میں آ پڑے جس نے آخری مرتبہ خاتون کے ساتھ زیادتی کی تھی' اسی طرح وڈیرے عیاشی سے پہلے اپنی ہدف عورتوں کو پھتوؤں کے نکاح میں دے دیتے ہیں' یہ نکاح کاغذی ہوتے ہیں' یہ خواتین وڈیروں کے حرم سراؤں میں رہتی ہیں لیکن ان کے زوجہ کے خانے میں کسی پھتو کا نام ہوتا ہے اگر اس دوران خاتون ماں بن جائے تو وڈیرے خاتون کو پھتو کے حوالے کرتے ہیں اور اس کا وظیفہ لگا دیتے ہیں' یہ بندوبست بھی قانون کی مداخلت سے بچنے کیلئے کیا جاتا ہے' پھتو اپنے اس کردار سے بخوبی واقف ہوتے ہیں لہٰذا وہ چپ چاپ چودھریوں' سرداروں اور وڈیروں کے جرموں کی ہتھکڑیاں پہن لیتے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں اگر انہوں نے اس نظام میں زندہ رہنا ہے تو انہیں سرداروں کے نفسیاتی امراض کا ایندھن بننا پڑے گا' انہیں اپنے ناکردہ جرائم کی سزا بھگتنا پڑے گی چنانچہ جب بھی کوئی چودھری کسی پھتو کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ چپ چاپ آگے بڑھتا ہے اپنا کان چودھری کے منہ کے قریب لاتا ہے اور اس کے بعد چودھری جو حکم دیتا ہے پھتو اسے ازبر کر کے پولیس کے سامنے پیش ہو جاتا ہے' ہمارے دیہات کے وڈیرے اپنے پھتوؤں کی تعداد پر فخر بھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے دوست وڈیروں کو "ادھار" بھی دیتے رہتے ہیں۔



میں 30 اکتوبر 2006ء تک یہ سمجھتا تھا یہ روایت صرف ہمارے دیہات تک محدود ہے لیکن جب پیر کی صبح باجوڑ ایجنسی کے علاقے ڈمہ ڈولا میں امریکی طیاروں نے ایک دینی مدرسے پر میزائل داغے اور اس حملے میں 83 طالب علم اور اساتذہ شہید ہو گئے اور ہماری حکومت نے اس نامعلوم حملے کا جرم اپنے سر لے لیا تو مجھے محسوس ہوا پھتو صرف دیہات تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ قومیں اور ملک بھی ہو سکتے ہیں اور بدقسمتی سے ہم نہ صرف امریکہ کے پھتو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں بلکہ چودھری بش صاحب کے تمام جرائم اپنے سر لینا ہماری قومی اور ملی ذمہ داری ہے' آج اس حملے کو چار دن گزر چکے ہیں' ان چار دنوں میں ثابت ہو چکا ہے مولانا لیاقت کے اس مدرسے میں صرف غریب طالب علم پڑھتے تھے اور مدرسے میں کوئی شرپسند نہیں تھا' امریکہ کے ذرائع ابلاغ اعتراف کر رہے ہیں اس مدرسے پر امریکی طیاروں نے محض شک کی بنیاد پر حملہ کیا تھا اور اس حملے میں 83 بے گناہ اور معصوم بچے شہید ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود ہم لوگ

رضا کارانہ پھٹو بن چکے ہیں' ہم یہ جرم اپنے سر لے رہے ہیں' کیوں؟ میرا خیال ہے ہم لوگ اقوام عالم میں اپنے لئے پھٹو کا کردار پسند فرما چکے ہیں اور ہم غلامی کی اس سطح تک پہنچ چکے ہیں جہاں غلام اپنی غلامی پر فخر کرنے لگتے ہیں' میں جب بھی اس صورتحال پر غور کرتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے میں امریکہ کا شکریہ ادا کروں کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے یہ امریکہ کی خاص مہربانی ہے اس نے ابھی تک پاکستان کی تمام مسجدوں اور مدرسوں پر حملوں کا فیصلہ نہیں کیا' اس نے ابھی تک ہمیں کلمہ پڑھنے' داڑھی رکھنے اور ٹوپی پہننے کی اجازت دے رکھی ہے ورنہ ہماری حکومت نہ صرف اس امریکی اقدام کی بھی حمایت کر دیتی بلکہ وہ پھٹو بن کر یہ ''کار خیر'' بھی اپنے ذمے لے لیتی' میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں واقعہ کربلا ہمارے دور میں پیش نہیں آیا ورنہ ہم خدانخواستہ حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو بھی اپنا کارنامہ قرار دے دیتے اور ہم اس معاملے میں بھی پھٹو بن جاتے۔

❁......❁......❁

# کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا



موشے کاتساؤ اسرائیل کے صدر ہیں' کاتساؤ کا پس منظر بہت دلچسپ تھا' وہ 1945ء میں ایران کے شہر یزد میں پیدا ہوئے' ان کے والدین کٹر یہودی تھے' 1948ء میں ان کے والدین تہران منتقل ہوئے اور 1951ء میں یہ لوگ اسرائیل چلے گئے' کاتساؤ نے 24 سال کی عمر میں سیاست شروع کی اور وہ لی خود پارٹی کے ٹکٹ پر اسرائیل کے چھوٹے سے قصبے قیریاط کے میئر منتخب ہو گئے' وہ اسرائیل کے کم عمر ترین میئر تھے' وہ 1969ء میں پہلی بار پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے' 1981ء میں وہ ہاؤسنگ کے نائب وزیر بنے اور اس کے بعد وہ مختلف ادوار میں وزیر بنتے چلے گئے' جولائی 2000ء میں انہوں نے مشہور سیاستدان اور سابق وزیراعظم شمعون پیرز کے مقابلے میں صدارتی الیکشن لڑا اور اسرائیل کے صدر منتخب ہو گئے' وہ اسرائیل کی تاریخ کے پہلے صدر ہیں جو 7 سال کیلئے منتخب ہوئے ہیں' موشے کاتساؤ میں پانچ خوبیاں ہیں' وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں' وہ کسی اسلامی ملک میں پیدا ہونے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں' ان کی مادری زبان فارسی ہے' وہ اسرائیل کے سابق وزیراعظم کو شکست دے کر صدر بنے ہیں اور وہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے پہلے اسرائیلی صدر ہیں۔

موشے کاتساؤ کی زندگی اور سیاست اس وقت شدید بحران کا شکار ہے۔ جولائی 2006ء میں ایک یہودی خاتون نے موشے کاتساؤ کے خلاف زیادتی کا پہلا کیس درج کرایا'

پولیس کو ابتدائی تفتیش میں خاتون کی بات سچ محسوس ہوئی لہٰذا 22 اگست 2006ء کو پولیس نے ایوان صدر پر ریڈ کیا' صدر کے تمام کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لئے اور صدر کے خلاف تفتیش شروع کر دی' پولیس ریڈ کی خبریں شائع ہوئیں تو بے شمار خواتین نے صدر کے خلاف جنسی زیادتیوں کے مقدمے درج کرانا شروع کر دیئے' پولیس کو معلوم ہوا موشے کا تساؤ ماضی میں خواتین کو ملازمت دیتے تھے اور اس ملازمت کی آڑ میں ان کے ساتھ زیادتی کرتے تھے' پولیس نے دس خواتین کے مقدمے درج کئے اور اعلیٰ سطح پر ان مقدموں کی تفتیش شروع کر دی' 23 اگست کو صدر کے خلاف پہلی تفتیش شروع ہوئی اور 7 ستمبر کو چوتھے مقدمے پر کام شروع ہو گیا' 13 ستمبر 2006ء کو صدر نے ایوان صدر میں نئی الیکشن کمشنر مس بنیش سے حلف لینا تھا' اسرائیل کے آئین کے مطابق یہ حلف صرف صدر لے سکتا ہے لیکن اس دن صدر کی تفتیش تھی' اسرائیلی قانون کے مطابق کوئی زیر تفتیش ملزم پولیس کی اجازت کے بغیر تفتیش سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا' موشے کا تساؤ نے اس تقریب میں شرکت کیلئے پولیس چیف کو درخواست دی لیکن پولیس چیف نے تفتیش موخر کرنے سے انکار کر دیا' صدر نے پارلیمنٹ سے معذرت کر لی جس کے بعد اسرائیل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ تقریب ایوان صدر کی بجائے پارلیمنٹ میں منعقد ہوئی اور الیکشن کمشنر کا حلف اسرائیل کی پارلیمنٹ نیس ایت نے لیا' اس دن پولیس نے صدر موشے کا تساؤ سے نو گھنٹے تفتیش کی' یہ تفتیش صبح دس بجے شروع ہوئی اور شام سات بجے تک چلتی رہی' پولیس کے مطابق جب تک یہ تفتیش جاری رہے گی اس وقت تک صدر موشے کا تساؤ کی سرکاری مصروفیات معطل رہیں گی اور وہ پولیس کی اجازت کے بغیر کسی جگہ جا سکیں گے اور نہ ہی کسی تقریب میں شرکت کریں گے۔

یہ عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن کے نظام عدل کی تازہ ترین مثال ہے' میں جب اسرائیلی صدر موشے کا تساؤ کا کیس پڑھ رہا تھا تو میں نے سوچا' کیا اسلامی دنیا کے 62 ممالک میں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا پاکستان سے لے کر ایتھوپیا تک کسی اسلامی ملک کی پولیس برسر اقتدار صدر کے خلاف مقدمہ درج کر سکتی ہے؟ کیا کسی اسلامی ملک کی پولیس ایوان صدر میں داخل ہو سکتی ہے؟ وہ صدر کے کاغذات اور کمپیوٹر قبضے میں لے سکتی ہے؟ کیا وہ صدر سے نو نو گھنٹے تفتیش کر سکتی ہے اور کیا کسی اسلامی ملک کا کوئی صدر سرکاری تقریب میں شرکت کیلئے پولیس سے اجازت لے گا اور کیا کسی اسلامی ملک کا پولیس چیف صدر کی درخواست پر نامنظور لکھنے کی جرأت کرے گا؟ میرا جواب انکار تھا' میرا خیال ہے اگر یہ سوال آپ سے بھی پوچھا جائے تو آپ بھی

انکار میں سر ہلا دیں گے' آپ کا یہ انکار بنیادی طور پر ترقی' عروج اور عزت کا نقطہ آغاز ہے' یہ ''نہیں'' آگے چل کر قوموں کا عروج و زوال طے کرتا ہے' میرے بے شمار قارئین کیلئے یہ بات نئی ہو گی کہ اسرائیل نے انصاف اور عدل کا یہ نظام اسلام سے لیا تھا' آج سے چودہ سو سال پہلے یہودیوں اور مسلمانوں کے نظام عدل میں بڑا فرق تھا' یہودی دنیا کی پہلی قوم تھی جس میں بالائی اور زیریں طبقہ پایا جاتا تھا' ان کا بالائی طبقہ قانون کی گرفت سے آزاد سمجھا جاتا تھا جبکہ زیریں طبقوں پر پورا پورا قانون نافذ کر دیا جاتا تھا' آپ نے سیرت کی کتابوں میں بنو مخزوم کی ایک خاتون فاطمہ کا واقعہ پڑھا ہو گا' اس خاتون کو نبی اکرمؐ نے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی تھی اور بعض صحابہؓ کرام نے اس کی سفارش کی تھی جس پر نبی اکرمؐ نے بڑے تاریخی الفاظ فرمائے تھے' آپؐ نے فرمایا تھا' تم سے پہلی قومیں اس لئے برباد ہو گئیں کہ جب ان کا کوئی معزز شخص جرم کرتا تھا تو اسے چھوڑ دیا جاتا تھا لیکن جب کسی عام شخص سے جرم سرزد ہو جاتا تھا تو اس کو سزا دے دی جاتی تھی' آپ نے فرمایا ''خدا کی قسم اگر یہ فاطمہ بنت محمدؐ ہوتی تو بھی میں اسے یہی سزا دیتا'' اس واقعے میں نبی اکرمؐ کا اشارہ یہودیوں کی طرف تھا کیونکہ اس زمانے کے یہودی بالائی طبقے کے مجرموں کو چھوڑ دیا کرتے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے عدل اجتماعی کی بنیاد رکھی' جس میں قاضی کی عدالت میں پہنچ کر خلیفہ اور سائل ایک ہو جاتے تھے' بڑا مشہور واقعہ ہے حضرت عمرؓ کے دسترخوان پر حضرت علیؓ کھانا تناول فرما رہے تھے اور ایک یہودی نے آ کر عرض کیا' حضرت علیؓ میرے ملزم ہیں' حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو اپنے دسترخوان سے اٹھا کر سائل کے ساتھ کھڑا کر دیا اور حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ جس میں انہوں نے اپنے بیٹے کو زنا کے جرم میں اپنے ہاتھوں سے کوڑے مارے تھے' یہ واقعہ اس وقت دنیا کی قانون کی تمام کتابوں میں درج ہے' خلفائے راشدین کے دور میں تمام خلفاء کئی بار قاضیوں کے سامنے پیش ہوئے اور اسلامی عدل کے نظام سے گزرے لہٰذا یہ اسلام تھا جس نے احتساب اور انصاف کا ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں ایک عام بدو کھڑا ہو کر خلیفہ سے دوسری چادر کا حساب مانگ لیتا تھا اور جس میں گورا اور کالا' عربی اور عجمی' چھوٹا اور بڑا سب برابر تھے' آنے والے ادوار میں دنیا کی ہر اس قوم نے اسلام کے اس نظام کو اپنے لئے مشعل راہ بنا لیا جو ترقی کرنا چاہتی تھی' جو اقوام عالم میں آگے بڑھنا چاہتی تھی' آپ دلچسپ بات ملاحظہ کیجئے' دنیا کی جس قوم نے اسلام کے اس نظام عدل سے استفادہ کیا وہ چند برسوں میں سپر پاور بن گئی' اس نے دنیا پر حکمرانی کی یہاں تک کہ یہودی تک اسرائیل میں عدل

کا اسلامی نظام نافذ کرنے پر مجبور ہو گئے لہٰذا آج ان کے سربراہ بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عدل کے اس عمل سے گزرتے ہیں جس سے اسلام کے ابتدائی دنوں میں ہمارے اکابرین کو گزرنا پڑتا تھا' آج ہمارے دشمنوں کے ملک میں بھی وہ نظام نافذ ہے جس پر کبھی ہم فخر کیا کرتے تھے۔

میں نے جب کا تساؤ کا کیس پڑھا تو میرے دل سے آہ نکلی اور میں نے اپنے آپ سے کہا' کاش یہ واقعہ کسی اسلامی ملک میں پیش آیا ہوتا' کاش موشے کا تساؤ کی جگہ کسی اسلامی ملک کا صدر ہوتا تو آج ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ قوم ہوتے' آج ہم بھی عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوتے اور آج ہمیں آر میٹج جیسے لوگوں سے بچنے کیلئے باجوڑ میں اپنے بچے قتل نہ کرنا پڑتے' میں نے سوچا' کاش موشے کا تساؤ مسلمان صدر ہوتا' کاش اسرائیل اسلامی ملک ہوتا۔

# بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے



برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر نے 20 نومبر 2006ء کو فیصل مسجد کا دورہ کرنا تھا' تین بجے کے قریب سیکورٹی اہلکار فیصل مسجد میں داخل ہوئے اور انہوں نے اللہ کے گھر کا تمام انتظام وانصرام "سنبھال لیا" مسجد کا لاؤڈ سپیکر قبضے میں لے لیا گیا' مسجد میں موجود تمام زائرین' سیاحوں اور نمازیوں کو باہر نکال دیا گیا اور مسجد کے چپے چپے کی تلاشی شروع ہوگئی' اس تلاشی کے دوران نماز عصر کا وقت ہوگیا' مسجد کے منتظمین نے سیکورٹی ایجنسیوں کے اہلکاروں کو وقت کی نشاندہی کی' اہلکاروں نے حکم دیا "نماز عصر موخر کردیں" سننے والوں میں سے ایک شخص نے تڑپ کر جواب دیا "نماز موخر نہیں ہوسکتی" اہلکاروں نے اسے گھور کر دیکھا لیکن پھر صورتحال کی نزاکت بھانپ کر خاموش ہوگئے' موذن نے اذان دینے کی اجازت طلب کی' انتظامیہ نے منظوری تو دے دی لیکن لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہ دی' موذن نے لاؤڈ سپیکر کے بغیر اذان دے دی' امام صاحب مقررہ وقت پر اپنے حجرے سے نکلے لیکن انتظامیہ نے انہیں مسجد کے احاطے میں داخل نہ ہونے دیا' وہ تھوڑی بہت تکرار کے بعد واپس لوٹ گئے' اس وقت مسجد کے احاطے میں کوئی نمازی' کوئی سیاح اور کوئی زائر نہیں تھا' مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے والے بھی نہیں تھے لہٰذا وہاں موجود تین چار لوگوں نے "جماعت" بنائی اور چپ چاپ نماز ادا کرکے باہر نکل گئے' یہ فیصل مسجد کی پہلی نماز تھی جس کیلئے باقاعدہ صف بندی ہوئی اور نہ ہی نمازیوں کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے دیا گیا۔

21 نومبر کی صبح اسلام آباد کے ایک صحافی نے اس واقعے کے بارے میں خبر دے دی' اس خبر کی تصدیق برطانیہ کے ایک صحافی نے بھی کی' یہ صحافی فیصل مسجد میں ہونے والی ساری کارروائی مانیٹر کررہا تھا' دارالحکومت کی انتظامیہ اسے وزیراعظم ٹونی بلیئر کا سیکورٹی اہلکار سمجھتی رہی لہٰذا اس صحافی نے اپنی آنکھوں سے حکومت کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ دیکھا اور شام کو مجھے اس کی ساری روداد سنائی' یہ منظر بیان کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا "جب اسلامی ممالک کے حکمران یورپ کے چرچز کا دورہ کرتے ہیں تو ہم وہاں انہیں سیکورٹی فراہم نہیں کرتے' ہم ان کیلئے چرچوں میں موجود زائرین کو باہر نہیں نکالتے لیکن یہ آپ لوگوں کا کمال تھا' آپ نے ہمارے وزیراعظم کے اعزاز میں نہ صرف مسجد خالی کرائی بلکہ نماز تک نہ ہونے دی" اس کا کہنا تھا "نائن الیون کے بعد یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے' ہمارے بعض کٹر شہری مسجدوں کو نشانہ بنانے کے منصوبے بناتے رہتے ہیں' پچھلے پانچ برسوں میں ہمارے بے شمار لوگوں نے مسجدوں میں اذانیں بند کرانے کیلئے حکومت کو درخواستیں دیں لیکن ہماری حکومتوں نے کسی مسجد پر پابندی لگائی' کسی مسجد میں نماز رکوائی اور نہ ہی اذان کے خلاف کوئی حکم جاری کیا' آج بھی یورپ اور امریکہ کی تمام مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں" اس نے کہا "برطانیہ کے جس وزیراعظم کے استقبال کیلئے اذان اور نماز رکوائی گئی تھی اس وزیراعظم کے ملک میں تمام مسجدیں آزاد ہیں' وہاں دن میں پانچ بار لاؤڈ سپیکر پر اذان ہوتی ہے" میں نے اس سے عرض کیا "تمہارے اور ہمارے ملک کے حالات میں بڑا فرق ہے' تمہارے ملک کی سیکورٹی ایجنسیاں اور امن وامان کے ادارے فنکشنل ہیں' تم لوگ سمندروں کی دیواروں کے پیچھے محفوظ ہو جبکہ ہم لوگ فرنٹ لائن سٹیٹ ہیں' ہمارے ملک میں حملے کرنے والے لوگ موجود ہیں لہٰذا ہمیں اس قسم کے بندوبست کرنے پڑتے ہیں" اس نے قہقہہ لگایا اور خاموشی سے اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ کھیلنے لگا۔

میں نے اسے جھوٹی سچی دلیل دے کر خاموش تو کرا دیا لیکن میں اندر سے مطمئن نہ ہوا لہٰذا میں نے اپنے ایک ساتھی سے درخواست کی' وہ مجھے قرآن مجید سے ایسی آیات نکال کر دے جس میں اللہ تعالیٰ نے مسجدوں اور نمازوں پر پابندی لگانے والوں کے بارے میں وعید سنائی ہو' میرے ساتھی ایک عالم دین اور قرآن فہم شخص ہیں' ان کی زندگی کا ایک لمبا عرصہ مدارس میں تعلیم پاتے اور بعد ازاں تعلیم دیتے گزرا' وہ آج کل دین کے بارے میں میری تربیت کررہے ہیں' انہوں نے میرے سامنے سورۃ البقرہ کی ایک آیت رکھ دی' یہ سورۃ البقرہ کی 114 نمبر آیت تھی'

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا ''اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے اور ان کے ویران (ومعطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے' ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت ہوکر ان میں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے تھا (بلکہ جب جاتے ہیبت اور ادب سے جاتے) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی'' یہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ تھا' میں نے جب یہ آیت پڑھی تو میں روح کی گہرائی تک دہل گیا' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہم جیسے لوگوں کے لئے اتاری تھی' اللہ تعالیٰ جانتے تھے پاکستان کے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ آئے گا جو غیر ملکی سربراہان کو خوش کرنے کیلئے مسجدوں کو نمازیوں سے خالی کرائے گا' جو موذن کو اذان اور امام کو امامت سے روک دے گا' جس کی نظر میں دین کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی اور جو شعار اسلام کا کھلم کھلا مذاق اڑائے گا' جس کے دور میں اذان' نماز' داڑھی اور ایمان مشکوک ہو جائیں گے' جس کے عہد میں اہل ایمان کو باغیوں اور دہشت گردوں کا نام دیا جائے گا' جس دور میں ہر لادین' بے دین اور مغرب پرست شخص معتدل اور روشن خیال سمجھا جائے گا اور جس دور میں لادین خواتین وحضرات مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ مسلمان دکھائی دیں گے' میں نے جوں جوں اس آیت پر غور کیا مجھے محسوس ہوا خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن ظالموں کا ذکر کیا تھا وہ لوگ ہمارے اردگرد موجود ہیں اور ہم نہ صرف ان کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے ہیں بلکہ ان کا ہر ظلم اور ہر زیادتی چپ چاپ سہہ رہے ہیں' میں نے محسوس کیا یہ لوگ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے اتنے نافرمان ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ظالم کا خطاب دینے پر مجبور ہیں' میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا اللہ تعالیٰ کی نظر میں ظالم لوگ کون ہوتے ہیں' میرے ساتھی نے جواب دیا اللہ تعالیٰ فرعونوں' نمرودوں' شدادوں اور ابوجہلوں کو ظالم سمجھتا ہے' میں نے یہ آیت دوسری مرتبہ پڑھی' میں جب آیت کے آخر تک پہنچا تو میں ظالم لوگوں کے انجام سے خوف زدہ ہوگیا' اللہ تعالیٰ نے اپنی آیت مبارک کے آخر میں فرمایا'' ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہوگی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہوگی'' میں آیت کے اس حصے کو علماء کرام پر چھوڑتا ہوں' وہ فیصلہ کریں اللہ تعالیٰ کی نظر میں رسوائی اور سزائے عظیم کیا ہوتی ہے' میں تو بس اتنا جانتا ہوں سورۃ البقرہ کی آیت 114 کا پہلا حصہ مکمل ہو چکا ہے' بس آخری حصہ پورا ہونے کی دیر ہے' بس اب رسوائی اور سزائے عظیم باقی ہے۔

# پائپ لائن کی بجائے

موسیٰ حسین شیراز کا رہنے والا تھا، وہ امریکہ سے مشینری درآمد کرتا تھا، اسے کاروبار کی وجہ سے ہر مہینے امریکہ جانا پڑتا تھا، وہ تہران سے دوبئی جاتا تھا اور دوبئی سے نیویارک۔ 2005ء کے آخر میں وہ نیویارک گیا۔ وہ پولٹری فیڈ بنانے والی جدید مشینیں خریدنا چاہتا تھا، وہ سہ پہر تین بجے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اترا، اس نے لمبا اور بھاری کوٹ پہن رکھا تھا، امریکی سکیورٹی ایجنسیوں نے اسے روکا اور تلاشی کیلئے اس کے کپڑے اتارنا شروع کر دیئے۔ یہ ایک کھلی جگہ تھی جہاں سے بیسیوں مسافر گزر رہے تھے، موسیٰ کو ہتک کا شدید احساس ہوا لیکن اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، وہ خاموش کھڑا رہا، ایجنسیاں تلاشی کے اس عمل سے مطمئن نہ ہوئیں چنانچہ اسے تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا، وہاں رات دو بجے تک اس کی تفتیش ہوتی رہی، موسیٰ حسین بلڈ پریشر اور شوگر کا مریض تھا، اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی ناک سے خون رسنے لگا۔ اہلکار گھبرا گئے چنانچہ وہ اسے ہسپتال لے گئے۔ موسیٰ چار دن ہسپتال میں رہا، ان چار دنوں میں اس کے خاندان کو شدید پریشانی لاحق رہی، اس کے کاروبار کا بھی حرج ہوا اور اسے ہسپتال کو بھی 18 ہزار ڈالر ادا کرنے پڑے۔ اسی دوران امریکی ایجنسیوں نے موسیٰ حسین کو ''رسکی'' بھی قرار دے دیا جس کے بعد موسیٰ حسین کی خصوصی تلاشی اور نگرانی شروع کر دی گئی۔ موسیٰ حسین واپس تہران پہنچا تو اس نے مقامی اخبارات میں اپنی ساری روداد شائع کرا دی۔ موسیٰ حسین کا کہنا تھا اگر

امریکی ادارے امریکہ میں ایرانی شہریوں کی تلاشی لے سکتے ہیں، اگر امریکہ نے ایرانیوں کیلئے فنگر پرنٹس لازم قرار دے دیئے ہیں تو ایران ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟ یہ مسئلہ اخبارات سے ہوتا ہوا ایران کی پارلیمنٹ میں گیا۔ 2006ء کے وسط میں اس پر بحث شروع ہوئی اور یہ بحث 19 نومبر کو قانون کی شکل اختیار کر گئی۔ ایران کی پارلیمنٹ نے 26 کے مقابلے میں 135 ووٹوں سے یہ قانون بنا دیا۔ ''2007ء سے ایران کی حدود میں داخل ہونے والے تمام امریکی شہریوں کے فنگر پرنٹس لیے جائیں گے''۔ یہ قانون منظور ہو گیا لیکن ایرانی صدر محمود احمدی نژاد اس سے مطمئن نہیں تھے لہٰذا انہوں نے اس کے خلاف گارڈین کونسل میں اپیل کر دی۔ ایران میں گارڈین کونسل پارلیمنٹ کے کسی بھی قانون کو ویٹو کر سکتی ہے۔ یہ کونسل بارہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے چھ سیاسی و مذہبی لیڈر ہوتے ہیں جبکہ 6 ارکان کا تعلق عدالتوں سے ہوتا ہے۔ ایرانی صدر نے اپنی اپیل میں خیال ظاہر کیا ''ایران کے اختلافات امریکی حکومت سے ہیں امریکی عوام سے نہیں اور اس قانون سے مسافروں اور سیاحوں کو تکلیف ہو گی جس سے ایران اور امریکہ کے سفارتی تعلقات خراب ہو جائیں گے'' ایرانی صدر کا موقف تھا ''فنگر پرنٹس کے عمل سے امریکی مہمانوں کے میزبانوں کو بھی شرمندگی ہو گی چنانچہ ہمیں اس قانون سے پرہیز کرنا چاہیے'' گارڈین کونسل نے اس قانون اور ایرانی صدر کی اپیل کا از سر نو جائزہ لیا اور آخر میں صدر کی درخواست مسترد کر دی۔ گارڈین کونسل کے ترجمان عباس علی کا کہنا تھا ''امریکہ میں ایرانیوں سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو روز شرمندگی ہوتی ہے اگر امریکی اس شرمندگی کا تھوڑا سا حصہ واپس لے لیں گے تو قیامت نہیں آ جائے گی۔ ایرانی پارلیمنٹ قانون پاس کر چکی ہے لہٰذا کوئی امریکی شہری اب اس سے مستثنیٰ نہیں ہو گا''۔



ایران دنیا کا دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف اتنا سنگین قانون بنایا۔ امریکہ نے نائن الیون کے بعد جب فنگر پرنٹس اور تلاشی کا کام شروع کیا تھا تو برازیل دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے اپنے ایئرپورٹس پر صرف امریکیوں کی تلاشی اور فنگر پرنٹس شروع کرا دیئے تھے لہٰذا دسمبر 2003 سے آج تک برازیل کے تمام ایئرپورٹوں پر صرف امریکیوں کی تلاشی اور فنگر پرنٹس لیے جاتے ہیں۔ صدر بش سمیت ساری امریکی انتظامیہ اس امتیازی سلوک پر برازیل سے بارہا احتجاج کر چکی ہے لیکن برازیل حکومت کا کہنا ہے یہ ان کی عدالت کا حکم ہے لہٰذا حکومت اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ برازیل کے بعد ایران دوسرا ملک ہے جس نے امریکیوں کے خلاف

اتنا شدید ایکشن لیا۔ اگر ہم امریکہ اور ایران کے موجودہ سفارتی تعلقات کو سامنے رکھ کر اس قانون کا جائزہ لیں تو یہ قانون سیدھی سادی خودکشی محسوس ہوتا ہے۔ ایران امریکہ کی ہٹ لسٹ میں شامل ہے۔ امریکہ پچھلے پانچ برس سے ایران پر حملے کیلئے بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ امریکی فوج ترکمانستان، آذربائیجان، ترکی، عراق، قطر، افغانستان اور پاکستان کی طرف سے ایران کا گھیرا تنگ کر رہی ہے۔ ایران پر دباؤ ڈالنے کیلئے بلوچستان میں نئے ہوائی اڈے اور چھاؤنیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اتحادی فوجیں ایران کی سرحد تک پہنچنے کیلئے قندھار اور ہرات میں طالبان کے خلاف برسرپیکار ہیں۔ امریکی فوجیں ترکمانستان، آذربائیجان اور ترکی میں اتر رہی ہیں اور قطر کے امریکی ایئربیس پر امریکی سرگرمیوں میں اضافہ ہو چکا ہے، امریکہ کے اپنے تجزیہ نگاروں کو خدشہ ہے صدر بش اپنی صدارتی مدت ختم ہونے سے پہلے ایران اور شام پر حملہ کر دے گا۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے ری پبلکن پارٹی اور بش خاندان پوری دنیا پر عیسائی غلبہ چاہتا ہے، کیونکہ دونوں جانتے ہیں 2008ء کے بعد انہیں یہ موقع نہیں ملے گا چنانچہ وہ اقتدار کے آخری دو برسوں کو ہر صورت میں یادگار بنانا چاہتے ہیں۔ ایران اس صورتحال سے پوری طرح واقف ہے اس نے ایٹم بم بنانے کا سلسلہ بھی تیز کر دیا ہے اور وہ میزائل سازی میں بھی بہت آگے جا رہا ہے۔ ایران امریکی قوت سے بھی پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے اگر امریکہ نے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایران پر حملہ کر دیا تو وہ زیادہ دنوں تک امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا چنانچہ ایران سمجھتا ہے وہ جتنی دیر تک اس حملے کو ٹال لے گا یہی اس کی کامیابی ہوگی۔ ایران کی کوشش ہے وہ کسی نہ کسی طرح امریکہ کو 2008ء کے الیکشن تک ٹالے رکھے۔ جس کے بعد ڈیموکریٹس اقتدار میں آ جائیں گے اور یہ لوگ ری پبلکن کے مقابلے میں جنگ کے مخالف ہیں چنانچہ ایران بچ جائے گا۔ اس صورتحال میں ایسا خطرناک قانون پاس کرنا بیل کو سرخ کپڑا دکھانے کے مترادف ہے لیکن اس کے باوجود ایرانی پارلیمنٹ نے نہ صرف یہ قانون پاس کیا بلکہ اس پر فوری طور پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا۔ یہ حقیقتاً سفارتی جرأت اور قومی بہادری ہے۔

پانچ فروری 2007ء کو ہمارے صدر جنرل پرویز مشرف ایران اور ترکی کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ ایک دن تہران میں رُکے۔ ایران میں انہوں نے صدر محمود احمدی نژاد سے ون ٹو ون اور 75 منٹ کی طویل میٹنگ کی۔ اس میٹنگ میں ایران پاک گیس پائپ لائن پر عملدرآمد کا فیصلہ ہوا۔ صدر مشرف نے مشرق وسطیٰ میں امن قائم کرنے کا منصوبہ بھی پیش کیا اور

ایران نے اس منصوبے کی بھرپور مدد کا یقین بھی دلایا۔ پاکستان نے ایران کو امریکی حملے کے خدشات کے بارے میں بھی بتایا جس پر ایران نے پاکستان کے نیک جذبات پر اطمینان کا اظہار کیا جس کے بعد ہمارے صدر مطمئن ہو کر ترکی روانہ ہو گئے۔ یوں یہ دورہ بھی پچھلے دوروں کی طرح کامیاب قرار پا گیا۔ مجھے یقین ہے ہمارے صدر واپس لوٹیں گے تو گیس پائپ لائن پر کام شروع ہو جائے گا، مجھے یہ بھی یقین ہے گیس پائپ لائن پاکستان، ایران اور بھارت کی معیشت میں انقلاب برپا کر دے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا ملکوں کو صرف معیشت، گیس اور پائپ لائنیں درکار ہوتی ہیں اور کیا ملکوں کیلئے صرف ڈالرز اور خوشحالی کافی ہوتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں انسانوں کی زندگی میں روٹی، کپڑا اور مکان بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کو مشینیں، فیکٹریاں اور سڑکیں ترقی یافتہ بناتی ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ڈالر قوموں کے مقدر کا فیصلہ کیا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے فرد ہو یا قومیں ان کی زندگی کیلئے انا، ضمیر اور عزت نفس آکسیجن کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ڈالر جو دوسرے انسان کے پاؤں چھو کر ملے، وہ روٹی جس کے لئے انسان کو اپنی عزت نفس نیلام کرنا پڑے اور وہ زندگی جس کی گردن میں بے غیرتی کا طوق ہو دنیا میں اس سے بڑا کوئی عذاب نہیں ہوتا، دنیا میں اس سے بڑا خسارہ کوئی نہیں ہوتا دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو سمجھتے ہیں وہ زندگی جو انسان کو انسانیت کے شرف سے نیچے گرا دے اس زندگی سے موت اچھی ہے اور جو روٹی انسان کو انسان کے سامنے جھکا دے اس سے بھوک لاکھ درجے اچھی ہے اور جو ڈالر انسان کو اپنی غیرت کے عوض ملے اس ڈالر سے غربت کروڑ درجے بہتر ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارا شمار دنیا کی ان قوموں میں ہوتا ہے جو عزت نفس پر سمجھوتہ کرتی چلی آ رہی ہیں اور جن کا ملک دوسری قوموں کی چراہ گاہ بن چکا ہے میں نے جب اخبارات میں صدر کے دورے کی خبریں پڑھیں تو میں نے سوچا کاش ہم ایران سے پائپ لائن کی بجائے عزت نفس لے آتے، ہم ان سے یہ سیکھ لیتے کہ عزت کے ساتھ کیسے جیا جاتا ہے، کاش ہم ایرانی صدر سے وہ حوصلہ اور وہ جرأت مانگ لیتے جو قوموں کو قومیں، ملکوں کو ملک اور انسان کو انسان بناتی ہے، کاش ہم پائپ لائن کی بجائے ایران سے ضمیر اور استقلال لے لیتے۔

# جو لوگ اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے

میرے سامنے امریکہ کے نائب صدر ڈک چینی کی ایک تصویر پڑی ہے۔ یہ تصویر 27 فروری 2007ء کو افغانستان کے بگرام ایئربیس پر اتاری گئی اور 28 فروری کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی' اس تصویر میں ڈک چینی جہاز کی طرف جا رہے ہیں' ان کے ایک ہاتھ میں ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جبکہ انہوں نے دوسرے ہاتھ میں اپنا بیگ اور ایک بھاری بھرکم فائل اٹھا رکھی ہے' انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تینوں چیزیں بڑی مشکل سے سنبھال رکھی ہیں' یہ بظاہر ایک سادہ سی تصویر ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں امریکہ کے عروج' امریکہ کی ترقی اور امریکہ کے سپر پاور ہونے کی اصل وجوہات چھپی ہیں' یہ تصویر امریکہ اور تیسری دنیا کے درمیان ایک ایسی لکیر کھینچتی ہے جس کے ایک طرف استحکام' عروج' طاقت اور ترقی ہے جبکہ دوسری طرف' پسماندگی' کمزوری' زوال اور عدم استحکام ہے' یہ تصویر محض ایک تصویر نہیں بلکہ یہ روایت' تاریخ' نظریہ اور زاویہ نظر بھی ہے' دنیا کی تاریخ کبھی مورخ لکھا کرتے تھے اور یہ کتابوں میں محفوظ ہوتی تھی لیکن جب سے کیمرہ ایجاد ہوا ہے یہ تاریخ اب فوٹوگرافر لکھتے اور کیمرہ مین بیان کرتے ہیں لہٰذا اب دنیا کا کوئی شخص تصویروں کے مطالعے کے بغیر کسی قوم کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تاریخ تک پہنچ سکتا ہے۔ ڈک چینی کی یہ تصویر بھی ایک تاریخی دستاویز ہے اور جب تک ہم اس تصویر کا تجزیہ نہیں کرتے ہم امریکہ کی اصل طاقت تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے اور ڈک چینی اس واحد سپر پاور کے نائب صدر' امریکی آئین کے مطابق نائب صدر کو بعض ایسے اختیارات بھی حاصل ہیں جو صدر کے پاس نہیں ہیں' امریکہ کا نائب صدر عملاً دنیا کا نائب صدر ہوتا ہے لیکن یہ شخص نہ صرف اپنا سامان خود اٹھا کر جہاز میں سوار ہوتا ہے بلکہ وہ اپنا بیگ' اپنی فائل اور اپنی کتاب خود اٹھا کر جہاز سے اترتا ہے' حکومت نے اسے سامان اٹھانے کے لئے کوئی اے ڈی سی' سیکرٹری یا ملازم نہیں دیا' وہ اپنا ذاتی سامان اٹھانے کے لئے اپنے سٹاف کے کسی شخص کی مدد بھی نہیں لے سکتا' شاید یہ بات بے شمار لوگوں کے لئے نئی ہو امریکی حکومت صرف صدر کو سرکاری مصروفیات کے دوران بیگ اٹھانے کے لئے معاون فراہم کرتی ہے' یہ سہولت پروٹوکول کی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے دی گئی تھی کیونکہ دنیا بھر میں جب کوئی سربراہ مملکت کسی دوسرے سربراہ سے ملتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھ خالی ہونے چاہئیں چنانچہ امریکی قانون نے اس مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے صدر کو پروٹوکول کے دوران معاون کی سہولت فراہم کر دی لیکن جونہی سرکاری مصروفیت ختم ہوتی ہے صدر بھی اپنے سامان کا خود ذمہ دار ہو جاتا ہے' آپ نے اکثر امریکی صدور کو تعطیلات کے دوران اپنا بیگ اٹھائے یا گالف کھیلتے ہوئے اپنی ٹرالی خود دھکیلتے دیکھا ہو گا' آپ آئندہ غور کیجئے گا' اس وقت صدر کے ساتھ سیکورٹی کے علاوہ کوئی معاون نہیں ہوتا' امریکی صدر کے علاوہ کسی دوسرے عہدیدار کو سرکاری مصروفیات کے دوران بھی یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی لہٰذا نائب صدر ہو یا امریکہ کا کوئی وفاقی وزیر وہ اپنی فائلیں اور اپنا بیگ خود اٹھا کر آتے ہیں اور خود اٹھا کر لے جاتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں آپ پاکستان کے سرکاری کلچر پر نظر ڈالیں تو آپ کو سیکشن افسر سے صدر تک نہ صرف سب کے ہاتھ خالی ملیں گے بلکہ ان کے پیچھے سرکاری ملازموں کی فوج چل رہی ہو گی اور سب ملازموں نے صاحب کی کوئی نہ کوئی چیز اٹھا رکھی ہو گی' آپ صبح کے وقت کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیں' آپ دیکھیں گے 16 سے 22 گریڈ تک کے ہر افسر کا بیگ' اس کی فائلیں' اس کا ٹفن' اس کا لیپ ٹاپ' اس کی چھتری' اس کا پائپ اور بعض اوقات اس کے جوتے تک اس کے ڈرائیور' اس کے چپڑاسی یا اس کے کسی جونیئر افسر نے اٹھا رکھے ہوں گے' آپ پورے پاکستان میں کسی وزیر کو بیگ اٹھائے نہیں دیکھیں گے جبکہ وزیراعظم اور صدر کے معاملے میں تو یہ خواہش مکمل بے وقوفی ہے۔

میں پچھلے 17 برس سے صحافت میں ہوں' میں نے ان 17 برسوں میں ایک ہزار کے قریب وزیر' آٹھ وزیراعظم اور چار صدر دیکھے مگر میں نے آج تک کسی کے ہاتھ میں کوئی فائل' کوئی

کتاب یا کوئی بیگ نہیں دیکھا' ان سب لوگوں کا سامان ان کے سٹاف نے اٹھا رکھا تھا' مجھے ایک صدر صاحب کو وضو کرتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا تھا' صدر صاحب کو چار ملازم مل کر وضو کرا رہے تھے' وضو کے بعد ملازموں نے کرسی پر بٹھا کر ان کے ہاتھ' پاؤں اور منہ خشک کیا تھا' نماز کے بعد چاندی کی ایک طشتری لائی گئی تھی طشتری کے اوپر سے ڈھکن اتارا گیا تو میں نے دیکھا طشتری کے اندر تسبیح پڑی تھی' تسبیح کے بعد برے میں صدر صاحب کی جرابیں آئی تھیں اور ایک باوردی ملازم نے صدر صاحب کے پاؤں گود میں رکھ کر انہیں جرابیں پہنائی تھیں' یہ ایک پرانے صدر کا قصہ تھا' آپ جدید دور کے وزیراعظم کے معمولات ملاحظہ کیجئے' ہمارے وزیراعظم سرکاری یا ذاتی دورے پر جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بارہ ملازم ہوتے ہیں' یہ ملازم ان کے ذاتی کاموں کے لئے ساتھ جاتے ہیں' وزیراعظم کی تقریر اور چشمہ ان کے اے ڈی سی سنبھالتے ہیں جبکہ پرس کی حفاظت سٹاف افسر کرتا ہے' کپڑوں کی استری اور جوتوں کی پالش کے لئے دو ملازم ہوتے ہیں جبکہ' خانساماں وزیراعظم کی خصوصی خوراک کے لئے ساتھ جاتا ہے جبکہ وزیراعظم کا سامان اٹھانے کے لئے دو پورٹر ہوتے ہیں' ہمارے موجودہ صدر اس سے کہیں زیادہ تزک و احتشام کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں' ایک باوردی ملازم نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے' ان کا بیگ اور بریف کیس دو ملازم اٹھاتے ہیں جبکہ موبائل فون تین مختلف افسروں کے پاس ہوتے ہیں' مجھے ان سارے لوگوں میں صرف گورنر پنجاب قدرے بہتر حکمران لگے ہیں ان کے ساتھ صرف ڈرائیور' اے ڈی سی اور سامان اٹھانے کے لئے ایک ملازم ہوتا ہے' صدر' وزیراعظم اور گورنروں کے بعد وزراء اعلیٰ' وزراء اور سیکرٹریوں کی باری آتی ہے' وزراء اعلیٰ پورے لاؤ لشکر کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں' ان کا سامان بھی اسی طرح مختلف لوگوں میں تقسیم ہوتا ہے' کسی نے ان کی پانی کی بوتل اٹھا رکھی ہوتی ہے' کسی کی جیب میں صاحب کا ٹوتھ پیسٹ ہوتا ہے اور کسی نے ان کے لئے صندل کی "ٹوتھ پکس" اٹھا رکھی ہوتی ہیں۔ کوئی ان کے چشمے کی حفاظت کر رہا ہوتا ہے' کسی نے ان کی جرابوں کا جوڑا پکڑ رکھا ہے اور کوئی جیب میں رقم ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے اور جہاں صاحب اشارہ کرتے ہیں وہ جیب سے نوٹ نکال کر سامنے پھیلی جھولی میں ڈال دیتا ہے' اسی طرح وزراء کے ساتھ بھی سٹاف افسروں' ڈپٹی سیکرٹریوں اور ذاتی ملازموں کی فوج چلتی ہے' یہ لوگ بھی ان کا سامان اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے ہیں جبکہ صاحب خالی ہاتھ گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور خالی ہاتھ اترتے ہیں' میں نے ایک بار کراچی ائیرپورٹ پر بڑا دلچسپ منظر دیکھا تھا' ایک وزیر صاحب

جہاز میں سوار ہونے کے لئے آئے تو ان کا بورڈنگ کارڈ ان کے سٹاف افسر نے اٹھا رکھا تھا' یہ افسر وزیر کے آگے آگے چل رہا تھا جبکہ صاحب پتلون کی جیبوں میں ہاتھ دے کر اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے' وزیر صاحب نے تلاشی تک کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

آپ پاکستانی نمائندین کی یہ حرکات ملاحظہ کریں اور اس کے بعد یورپ' مشرق بعید اور امریکہ کے حکمرانوں کا لائف سٹائل دیکھیں تو یقین کیجئے شرم سے سر جھک جاتا ہے' مجھے ایک دوست نے امریکہ کے نائب وزیر رچرڈ آرمیٹج کے ساتھ ایک پاکستانی سیکرٹری کی ملاقات کا احوال سنایا تھا' یہ سیکرٹری صاحب سرکاری ملاقات کے لئے امریکہ گئے تھے' ان کے ساتھ چار لوگوں کا سٹاف تھا' رچرڈ آرمیٹج ملاقات کے بعد سیکرٹری صاحب کو لنچ پر لے گئے' آرمیٹج انہیں پیدل ریستوران تک لے کر گیا تھا' اس نے اپنی ٹرے خود اٹھائی تھی' کھانا لیا تھا اور میز پر بیٹھ کر کھانے لگا' سیکرٹری صاحب اس کے سامنے بیٹھ گئے جبکہ ان کا سٹاف ریستوران کے باہر ٹہلتا رہا' کھانے کے بعد سیکرٹری صاحب نے اپنے ڈپٹی سیکرٹری کو اشارہ کیا' اس نے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ سیکرٹری صاحب کو دے دیا' سیکرٹری صاحب نے آرمیٹج سے عرض کیا' جناب یہ ہماری طرف سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے'' آرمیٹج نے شکریہ ادا کر کے پیکٹ لے لیا' دونوں نے ہاتھ ملایا اور آرمیٹج یہ پیکٹ خود اٹھا کر واپس دفتر چلا گیا جبکہ سیکرٹری صاحب نے اپنی عینک ڈپٹی سیکرٹری کو پکڑا دی اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چار لوگوں کے جلوس میں ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے' میں نے جب سے ڈک چینی کی یہ تصویر دیکھی ہے مجھے محسوس ہوتا ہے یہ تصویر بار بار پوچھ رہی ہے جس ملک کے حکمران اپنا بیگ نہیں اٹھا سکتے' وہ قوم کی ذمہ داری کیسے اٹھائیں گے' میں بار بار یہ سوال سنتا ہوں اور شرم سے سر جھکا لیتا ہوں' میرا خیال ہے پوری قوم کو اجتماعی طور پر اپنا سر جھکا لینا چاہیے' ہمیں مان لینا چاہیے ہمارے دشمن اخلاقی' سیاسی اور ثقافتی لحاظ سے ہم سے بہت آگے ہیں' ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے' حضرت عمر فاروقؓ ہمارے خلیفہ تھے لیکن ان کی سنت پر عمل امریکی اور یورپی حکمرانوں نے کیا' ہمیں مان لینا چاہیے اسلام ہمارا مذہب ہے لیکن اس مذہب کی اصل روح غیر مسلموں نے اپنائی اور ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے مذہب ہمارے ہاتھ میں رہ گیا لیکن اس کی روح ہمارے دشمنوں کے پاس چلی گئی' ہم کلمہ پڑھتے رہ گئے جبکہ ہمارے دشمن اسلام کی برکتوں سے لطف اٹھاتے رہے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

# صغیرہ اسلام کے خلاف

# غداری کا پرچہ درج کریں



میں نے گزشتہ روز اخبارات میں ایک دلچسپ تصویر دیکھی' یہ پنجاب اسمبلی کی عمارت تھی' اس عمارت کے سامنے ایک رکشہ کھڑا تھا اور رکشے سے ایک خاتون اتر رہی تھی' تصویر کے نیچے کیپشن میں لکھا تھا "پنجاب اسمبلی کی خاتون رکن صغیرہ اسلام اجلاس میں شرکت کیلئے رکشے پر اسمبلی آ رہی ہیں" میں نے تین چار مرتبہ یہ تصویر دیکھی اور اتنی ہی مرتبہ کیپشن پڑھا لیکن مجھے اپنے پڑھے اور دیکھے پر یقین نہ آیا لہٰذا میں نے فوراً پنجاب اسمبلی کی ویب سائٹ سے صغیرہ اسلام کا پروفائل نکالا' مجھے ویب سائٹ سے معلوم ہوا صغیرہ اسلام شیخوپورہ سے تعلق رکھتی ہیں' وہ 4 اکتوبر 1945ء کو بھارت میں پیدا ہوئیں' انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا' وہ 1977ء اور 1988ء میں دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں' ان کے خاوند چودھری اسلام صاحب انتقال فرما چکے ہیں' وہ 2002ء کے الیکشن میں خواتین کی مخصوص نشست پر تیسری مرتبہ رکن منتخب ہوئی ہیں اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹرین کی رکن ہیں' ان کے پروفائل کے آخر میں ان کا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر بھی درج تھا' میں نے انہیں ٹیلی فون کیا لیکن وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھیں چنانچہ میں اس تصویر کے بارے میں تصدیق نہ کر سکا لہٰذا ہم سردست اس تصویر کی حقیقت کو

تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں یہ تصویر صغیرہ اسلام ہی کی تھی اور وہ واقعی 11 جون کی ابلتی اور کھولتی دوپہر کو رکشے پر پنجاب اسمبلی گئی تھیں۔

میں نے تیسری کلاس سے اخبار پڑھنے شروع کیے تھے اور آج مجھے اخبارات پڑھتے ہوئے پورے تیس برس ہو چکے ہیں چنانچہ میں بڑے دعوے سے کہتا ہوں میں نے ان تیس برسوں میں ایک بھی ایسی تصویر نہیں دیکھی، ہاں البتہ میرے بچپن میں جنرل ضیاء الحق کی ایک تصویر ضرور چھپی تھی جس میں وہ فور سٹار جرنیل کی وردی میں پورے صدارتی اختیارات کے ساتھ سائیکل چلا رہے تھے میں اس وقت ان کی سائیکل سواری اور عاجزی انکساری سے بہت متاثر ہوا تھا لیکن جب میں باشعور ہوا تو معلوم ہوا جنرل صاحب کی یہ سائیکل سواری ان کے اسلام سے مختلف نہیں تھی چنانچہ جنرل ضیاء الحق کی اس تصویر کے علاوہ مجھے کوئی ایسی تصویر یا مثال دیکھنے کا موقع نہیں ملا مجھے اب تک دنیا کی تین بڑی پارلیمنٹس میں جانے کا اتفاق ہو چکا ہے مجھے اس سال مارچ 2007ء میں لندن میں چوتھی بار ہاؤس آف کامنز کا اجلاس دیکھنے کا موقع ملا۔ برطانیہ کے پاکستانی برٹش رکن اسمبلی چودھری سرور نے میرے لیے پورے پارلیمنٹ ہاؤس کی سیر کا بندوبست کیا تھا مجھے ان کے پولیٹیکل سیکرٹری نے ساری عمارت، سارے ہالز اور سارے کوریڈور دکھائے مجھے امریکی کانگریس میں بھی جانے کا اتفاق ہوا اور میں فرانس کی پارلیمنٹ کا وزٹ بھی کر چکا ہوں ان کے علاوہ میں ٹیلی ویژن چینلز پر بھارتی لوک سبھا، جاپان کی پارلیمنٹ ڈائٹ اور چین کے قومی اسمبلی کے اجلاس بھی دیکھ چکا ہوں مجھے ان تمام پارلیمنٹس میں ایک چیز مشترک نظر آئی تھی، جب بھی ان اسمبلیوں کے اجلاس شروع ہوتے ہیں تو درجنوں بلکہ سینکڑوں ارکان اسمبلی ٹیکسیوں، بسوں اور ٹرینوں کے ذریعے اسمبلی ہاؤس آتے اور جاتے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے برطانوی ارکان اسمبلی کو ٹیکسیوں سے اترتے اور اپنے بیگ خود اٹھا کر ہاؤس آف کامنز میں آتے جاتے دیکھا امریکی کانگریس کی عمارت کے نیچے زیر زمین ٹرین چلتی ہے، میں نے امریکہ کے بے شمار بین الاقوامی شہرت یافتہ سینیٹرز اور کانگریس مین کو اس ٹرین میں سوار ہوتے اور اترتے ہوئے دیکھا اور فرنچ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے بس سٹاپ ہے اور میں نے متعدد فرنچ ارکان اسمبلی کو اس سٹاپ پر بس کا انتظار کرتے دیکھا اسی طرح میں اکثر ٹیلی ویژن چینلز پر بھارتی ارکان اسمبلی کو رکشوں سے اترتے اور سوار ہوتے دیکھتا ہوں، چین کی پارلیمنٹ میں بعض ارکان اسمبلی سائیکلوں پر بھی اجلاس میں آتے ہیں اور جاپان کی پارلیمنٹ میں 140 ایسے ارکان ہیں جن کے

پاس ذاتی ڈرائیور نہیں جبکہ 35 جاپانی ارکان کے پاس ذاتی سواری نہیں اور یہ 35 ارکان ہمیشہ بس ٹرین اور ٹیکسی پر سفر کرتے ہیں' اس کے مقابلے میں آپ پاکستانی اسمبلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ہماری اسمبلیوں کے سو فیصد ارکان نہ صرف ذاتی گاڑیوں کے مالک ہیں بلکہ یہ سب لوگ بڑی بڑی گاڑیوں پر اجلاس میں شرکت کرتے ہیں' پاکستان میں اب پجیرو' لینڈ کروزر، پراڈو اور لیکسز گاڑیاں سیاستدانوں اور ارکان اسمبلی سے منسوب ہو چکی ہیں' اب حالت یہ ہے جب بھی شہر میں کوئی نئی لینڈ کروزر دکھائی دیتی ہے تو پولیس کانسٹیبل اسے فوراً سیلوٹ مار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اس میں لازمی کوئی نہ کوئی رکن اسمبلی یا وزیر صاحب کے لواحقین سوار ہوں گے' ان گاڑیوں کو ملنے والے اس پروٹوکول کی وجہ سے ملک میں دو نمبر دھندے کرنے والے تمام لوگوں نے بھی لینڈ کروزر خرید رکھی ہیں' آپ جعلی ہاؤسنگ سکیموں کے تمام مالکان کو دیکھ لیجئے' آپ جعلی ادویات بنانے والوں' ٹیکس چوری' جوئے اور شراب فروشی کے دھندوں میں ملوث لوگوں کو دیکھ لیجئے' آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یہ تمام لوگ ایک ایک دو دو برانڈ نیو لینڈ کروزر کے مالک ہوں گے' یہ لوگ آپ کو مرسڈیز' بی ایم ڈبلیو یا رولز رائس میں بھی سفر کرتے دکھائی دیں گے تو ان کے آگے آگے ایک لینڈ کروزر ضرور چلتی ہوگی' یہ لینڈ کروزر انہیں سیاستدان کی ''لک'' دیتی ہے اور اس کی وجہ سے راستے کی ساری رکاوٹیں انہیں سیلوٹ کر کے ایک طرف ہٹ جاتی ہیں' آپ لینڈ کروزر کلچر کا اندازہ میرے دوست کی کہانی سے لگا لیجئے میرے دوست 2002ء میں الیکشن لڑنے کیلئے امریکہ سے پاکستان آئے تھے' اس وقت تک پاکستان میں ان کا ووٹ تک نہیں بنا تھا لیکن انہوں نے پاکستان میں ووٹ بنوانے سے پہلے لینڈ کروزر خریدی تھی' میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا تھا ''پاکستان میں ووٹ کے بغیر سیاست ممکن ہے لیکن لینڈ کروزر کے بغیر نہیں''

میں اسلام آباد کا باسی ہوں اور میں روزانہ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرتا ہوں' ہمارا پارلیمنٹ ہاؤس شاہراہ دستور پر واقع ہے اور اس شاہراہ کا شمار دنیا کی دس مہنگی ترین سڑکوں میں ہوتا ہے' اس سڑک پر ایک کینال زمین کی مالیت دس سے بیس کروڑ روپے ہے لیکن پارلیمنٹ ہاؤس کا پارکنگ ایریا بارہ ایکڑ پر محیط ہے اور یہ پارلیمنٹ ہاؤس کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ کے علاوہ ہے' پارلیمنٹ ہاؤس کی پوری عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے اور یہ تہہ خانہ بھی پارکنگ کیلئے استعمال ہوتا ہے' آپ اجلاس کے دوران پارلیمنٹ کا دورہ کر کے دیکھ لیں' آپ کو تہہ خانے سے لے کر

اوپن پارکنگ تک گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آئیں گی' آپ وہاں موجود گاڑیوں کے ماڈل اور میک دیکھ لیں وہاں موجود 90 فیصد گاڑیاں تازہ ترین ماڈل اور انتہائی مہنگے برانڈ کی حامل ہوں گی' ہماری پارلیمنٹ میں ایسے ارکان بھی موجود ہیں جو تیرہ تیرہ گاڑیوں کے کارواں کے ساتھ سفر کرتے ہیں' آپ یہ گاڑیاں دیکھیں اور اس کے بعد ان ارکان اسمبلی کا کروفر دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا ہمارے ارکان اسمبلی امریکہ' برطانیہ' فرانس' چین' جاپان اور بھارت کے ارکان سے کہیں صاحب ثروت ہیں اور پاکستان دنیا کے ان چھ بڑے ممالک کے مقابلے میں کہیں امیر اور خوشحال ملک ہے' آپ یہ گاڑیاں دیکھیں' اپنے ارکان اسمبلی اور وزراء کا ''لیونگ سٹینڈرڈ'' دیکھیں اور اس کے بعد پاکستان میں غربت کی شرح' بے روزگاری اور مہنگائی کا گراف ملاحظہ کریں تو آپ کا سر شرم سے جھک جائے گا۔ پاکستان کے اس سیاسی اور پارلیمانی ماحول میں محترمہ صغیرہ اسلام پنجاب اسمبلی کی عمارت کے سامنے رکشے سے اترتی ہیں اور ان کی یہ تصویر اخبارات میں شائع ہوتی ہے تو یقین نہیں آتا اور میرے جیسا شخص بھی تصدیق کیلئے بے اختیار صغیرہ اسلام کے گھر فون کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔



محترمہ صغیرہ اسلام کی یہ ''حرکت'' ہر لحاظ سے خلاف قانون اور خلاف آئین ہے' خود سوچئے جس ملک کا غریب وزیراعظم اپنے لئے 8 ارب روپے کا نیا جہاز خرید تا ہو اور جس کا چیف منسٹر اپنی مدت کے آخر میں نیا جہاز خرید رہا ہو اور جس کے تمام وزراء کے پاس سیکورٹی کور ہو اور جس کے تمام گورنرز' وزراء اعلیٰ' وزیراعظم اور صدر پندرہ پندرہ کروڑ روپے کی بم پروف گاڑیوں میں سفر کرتے ہوں اور ان کے آگے پیچھے سیکورٹی کی 21 گاڑیاں ہوں وہاں اگر کوئی رکن رکشے پر اسمبلی آئے گی تو کیا یہ حرکت آئین' قانون اور اسمبلی کے تقدس کی توہین نہیں ہوگی' میرا خیال ہے صغیرہ اسلام کا دماغی توازن ٹھیک نہیں چنانچہ حکومت کو فوری طور پر ان کے اس غیر پارلیمانی فعل پر سخت ایکشن لینا چاہیے' حکومت کو ان کی رکنیت فوراً معطل کر دینی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ان کے خلاف غداری کا پرچہ بھی درج کرا دینا چاہیے کیونکہ صغیرہ اسلام اس ملک اور پارلیمنٹ دونوں کی غدار ہیں۔

# صغیرہ اسلام جیسے رول ماڈل

میں نے پچھلے دنوں پاکستان پیپلز پارٹی کی ایک رکن پنجاب اسمبلی صغیرہ اسلام کے بارے میں کالم تحریر کیا تھا' یہ کالم لاہور کے اخبارات میں شائع ہونے والی ایک تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا جس میں صغیرہ اسلام پنجاب اسمبلی کے سامنے رکشے سے اتر رہی تھیں' میرے لئے یہ ایک حیران کن واقعہ تھا اور میں نے اپنے کالم میں اسی حیرت کا اظہار کیا تھا' محترمہ صغیرہ اسلام نے میری حیرت کے جواب میں مجھے اپنی ساری کہانی بھجوائی' یہ کہانی میری پہلی حیرت کے مقابلے میں کہیں زیادہ حیران کن ہے' میری خواہش ہے میں اپنی حیرت کے اظہار سے پہلے آپ کو صغیرہ اسلام کی کہانی سناؤں' صغیرہ اسلام اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ٹکٹ پر خواتین کی خصوصی نشست پر پنجاب اسمبلی کی رکن ہیں' صغیرہ اسلام کا کہنا ہے" میں نے شادی کے وقت صرف میٹرک کیا ہوا تھا' شادی کے بعد میں نے اپنے مرحوم شوہر کے انسپائریشن پر ایف اے کیا' اس کے بعد بی اے اور بی اے کے بعد ایم اے' ابھی میرا ایم اے کا نتیجہ نہیں نکلا تھا کہ میری ساری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئیں' یہ آٹھ مارچ 1976ء کا دن تھا' میرے شوہر اس دن مجھے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے اور میں جوانی میں بیوہ ہو گئی' اس وقت میری گود میں دو برس کی بیٹی تھی' یہ بیٹی میرے جینے کا سہارا بھی تھی اور میرے مرحوم خاوند کی نشانی بھی' میں نے اس بچی کی تعلیم اور تربیت کو اپنا مقصد بنا لیا' میں نے زندگی کے اس مرحلے میں اپنا بوجھ خود اٹھانے کا فیصلہ کیا' میں نے

اپنے ساتھ وعدہ کیا' میں کسی سے کسی قسم کی مدد نہیں لوں گی' اللہ کا کرم ہے میں آج تک اپنے اس وعدے پر قائم ہوں' میں نے اپنی عملی زندگی میں چار چار ٹیوشن پڑھائیں اور ان سے حاصل ہونے والی آمدنی سے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پالا' میں نے 1982ء میں اپنا ایک چھوٹا سکول بنالیا' میں اس سکول میں یتیم بچوں سے فیس نہیں لیتی تھی' اس سکول میں غریب بچوں کی تعلیم بھی مفت تھی' میں خود بھی اس سکول میں پڑھاتی رہی' افسوس پچھلے سال یہ سکول بند ہو گیا''

صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنی سیاسی زندگی کے بارے میں بتایا' ان کا کہنا تھا'' میرے والد اور شوہر دونوں کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا' میرے شوہر ذوالفقار علی بھٹو کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے' میں نے ان کے کہنے پر سیاست شروع کی' میں عملی طور پر 1975ء میں سیاست میں آئی' میں ضلع شیخوپورہ پیپلز پارٹی کی خواتین ونگ کی صدر منتخب ہوئی' اپنے شوہر کے انتقال کے بعد مجھے 1977ء میں پہلی بار خواتین کیلئے مخصوص نشست پر ایم پی اے منتخب کیا گیا' میں اس دور میں پنجاب میں پیپلز پارٹی کی جنرل سیکرٹری اور ضلع لاہور کی صدر بھی رہی' میں بے نظیر بھٹو کے دور میں دوسری مرتبہ ایم پی اے منتخب ہوئی اور 2002ء میں مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو نے تیسری بار پنجاب اسمبلی کی رکن منتخب کرایا' یہ میری قائد بے نظیر بھٹو کا میری جیسی غریب کارکن پر اعتماد تھا' ایم پی اے بننے سے پہلے میں ضلع شیخوپورہ کی واحد خاتون تھی جو زکوٰۃ اور عشر کی چیئر پرسن منتخب ہوئی تھی' میں نے پوری ایمانداری اور محنت سے یہ اہم ذمہ داری نبھائی تھی' میں نے پوری کوشش کی تھی میں حق داروں اور مستحق لوگوں تک زکوٰۃ پہنچاؤں اور اللہ کا کرم ہے میں اس ذمہ داری سے پوری طرح سرخرو ہوئی''



محترمہ صغیرہ اسلام نے اس کے بعد اپنے لائف سٹائل پر روشنی ڈالی' ان کا فرمانا تھا ''میں حقیقی طور پر ایک غریب خاتون ہوں' میرے گھر میں کوئی ملازم نہیں' میں سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں' میں نے پوری زندگی مارکیٹ سے خود سودا خریدا لہٰذا میں پاکستان کی تمام اسمبلیوں کی واحد رکن ہوں جو مہنگائی سے حقیقی معنوں میں واقف ہے' مجھے معلوم ہے جب چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے تو گھریلو خواتین کیلئے تھوڑے پیسوں میں گزارہ کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا میں ان اسمبلیوں کی واحد رکن ہوں جو غریب عوام کی اصل پریشانیوں کو جانتی ہے' جو یہ جانتی ہے اس ملک میں تین چار ہزار روپے ماہانہ کمانے والے لوگ کس طرح گزارہ کرتے ہیں' میرا دعویٰ ہے وہ حکمران کبھی عام آدمی کی مشکلات کو نہیں سمجھ سکتے جو ائیر کنڈیشنڈ میں بیٹھے ہیں اور

جنہوں نے زندگی میں کبھی نوکری پکڑ کر بازار سے آلو پیاز نہیں خریدے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا میں رکشے پر اسمبلی کیوں جاتی ہوں' جاوید بھائی رکشہ تو بہت بڑی سواری ہے' میں تو اکثر اوقات بسوں اور ویگنوں میں سفر کرتی ہوں لہٰذا میں لاہور شہر کی ویگنوں اور بسوں کے احوال سے بھی پوری طرح واقف ہوں' میں یہ جانتی ہوں ویگنوں اور بسوں کے مالکان مسافروں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس دیتے ہیں اور عام شہریوں کیلئے اس گرمی میں ویگنوں اور بسوں میں سفر کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے' میں یہ بھی جانتی ہوں بسوں اور ویگنوں کے اکثر مالکان کرایوں میں اضافہ کر دیتے ہیں اور اس اضافے کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جا رہی ہے' میں روزانہ اس تجربے سے گزرتی ہوں لہٰذا میں پنجاب اسمبلی کی واحد رکن ہوں جو اسمبلی کے فلور پر کھڑی ہو کر وزیر ٹرانسپورٹ سے درخواست کرتی ہے وہ شہر میں ویگنوں اور بسوں کے کرائے کم کرائیں اور وہ شہر میں زیادہ سے زیادہ بسیں اور ویگنیں چلوائیں' میری بیٹی اکثر مجھے کہتی رہتی ہے اماں آپ کیا چیز ہیں' آپ تین بار اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں لیکن آپ آج بھی دھوپ میں پیدل چلتی ہیں یا پھر بسوں ویگنوں اور رکشوں میں دھکے کھاتی ہیں' میں اسے تو یہ کہتی ہوں اور اسے ان خواتین کے بارے میں بتاتی ہوں جو اس گرمی میں سڑک کے کنارے بیٹھ کر پتھر توڑتی ہیں یا چالیس چالیس کلو وزن اٹھا کر پچاس پچاس سیڑھیاں چڑھتی ہیں' میں اس کو بتاتی ہوں میں عوام کی حقیقی نمائندہ ہوں اگر میرے عوام کے پاس پانی' بجلی اور گاڑی نہیں تو میں بھی بڑی حد تک ان نعمتوں سے محروم ہوں' اگر اس ملک کے 90 فیصد لوگ بسوں' ویگنوں اور رکشوں میں سفر کرتے ہیں تو میں بھی ان کے ساتھ سفر کرتی ہوں' میری بیٹی کو میری باتیں پسند نہیں آتیں لہٰذا وہ مجھے کہتی ہے' اماں آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے لیکن جاوید صاحب مجھے اپنی اس "حرکت" پر فخر ہے' میں آپ کو یہاں اپنی ذاتی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی بتاتی چلوں' جون 2006ء میں واپڈا کا ایک اہلکار نوٹس لے کر میرے گھر آ گیا' اس کا کہنا تھا اس پورے محلے میں آپ لوگوں کا بل سب سے کم آ رہا ہے' ہمارا خیال ہے کسی ایم پی اے کا بل اتنا کم نہیں ہو سکتا چنانچہ ہمیں شک ہے آپ بجلی چوری کر رہی ہیں' میں نے اسے کہا تم ہمارے گھر کی تلاشی لے لو اس نے تلاشی لی تو وہ حیران رہ گیا' ہمارے گھر میں صرف ایک اے سی تھا اور اس پر بھی غلاف چڑھا ہوا تھا' وہ اے سی استعمال ہی نہیں ہوتا تھا جبکہ گھر میں بلب بھی نہ ہونے کے برابر تھے' اس نے واپس جا کر اپنے ایس ڈی او کو رپورٹ دی' یہ کسی بھی طرح کسی ایم پی اے کا گھر محسوس نہیں ہوتا'' صغیرہ اسلام کا فرمانا تھا'' میں اپنے ساتھیوں

کو اکثر کہتی ہوں اگر ہم لوگ عوامی نمائندے ہیں تو پھر ہمیں عوام جیسا لگنا چاہیے' یہ کیا بات ہوئی عوام سڑکوں پر دھکے کھا رہے ہیں' وہ مہنگائی میں پس رہے ہیں' بسوں اور ویگنوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح سفر کرتے ہیں جبکہ عوامی نمائندے پچاس پچاس لاکھ کی گاڑیوں میں اسمبلیوں میں آتے ہیں' وہ اپنے کتوں تک کو مربے کھلاتے ہیں اور ان کے گھروں کے بجلی کے بل لاکھ لاکھ روپے ماہانہ آتے ہیں' یہ اس ملک کی کتنی بڑی بدقسمتی ہے کہ اس ملک کے نمائندے کسی بھی طرح عام لوگ دکھائی نہیں دیتے' میرا بس چلے تو اسمبلیوں کے تمام نمائندوں کو بسوں اور ویگنوں میں سفر کراؤں' میں قانون پاس کرا دوں اسمبلی کا کوئی رکن ہوائی جہاز میں سفر کرے گا اور نہ ہی گاڑی استعمال کرے گا' وہ بس' ویگن یا ٹرین پر عوام کی طرح سفر کرے اور جس عوامی نمائندے کے گھر دوسرا ''اے سی'' چلے گا اس کی رکنیت منسوخ ہو جائے گی اور میں قانون بنا دوں تمام عوامی نمائندے بازار سے اپنا سودا سلف خود خریدیں گے' میں قانون بنوا دوں جب تک کوئی عوامی نمائندہ روزانہ دو سو عام لوگوں سے ذاتی طور پر نہیں مل لیتا وہ گھر نہیں جا سکتا' مجھے یقین ہے اگر یہ قانون بن جائیں اور ہمارے نمائندوں اور عام شہری کے لائف سٹائل میں فاصلہ کم ہو جائے تو یہ ملک جنت بن جائے گا''



میں نے صغیرہ اسلام کے خیالات پڑھے تو مجھے پہلی بار کسی عوامی نمائندے میں نمائندگی اور عوام دونوں نظر آئے اور میرے دل سے دعا نکلی' کاش پاکستان کے تمام ارکان اسمبلی صغیرہ اسلام کی طرح ہو جائیں' آپ یقین کیجئے صغیرہ اسلام جیسے لوگ ہی دراصل معاشروں کے رول ماڈل ہوتے ہیں اور معاشروں کو اس قسم کے رول ماڈلز اور ایسے لوگوں کو پروموٹ کرنا چاہیے' کاش ہماری حکومت صغیرہ اسلام کی طرح سوچے' کاش ہم لوگ صرف اور صرف صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو منتخب کریں اور کاش ہم صغیرہ اسلام جیسے لوگوں کو سامنے لائیں اور انہیں رول ماڈل بنا کر اپنے بچوں کو بتائیں بیٹا عوامی نمائندے اس قسم کے ہوتے ہیں اور اگر تم بڑے ہو کر سیاست میں آئے تو تمہیں بھی صغیرہ اسلام جیسا بننا چاہیے' تمہیں بھی شکل' حلیے' کردار اور لائف سٹائل سے عوامی نظر آنا چاہیے۔

☼......☼......☼

# ہم نے چین سے کیا پایا



یہ آج سے تیس برس پرانی بات ہے، پاکستان کے دانشوروں کا ایک وفد چین گیا، یہ لوگ ٹرین کے ذریعے بیجنگ سے شنگھائی جا رہے تھے۔ دوران سفر ایک دانشور نے مترجم کی مدد سے ایک مسافر بچی کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ گفتگو کے دوران بچی نے اچانک پاکستانی دانشور سے پوچھا "آپ کیا کرتے ہیں" دانشور نے مسکرا کر جواب دیا "میں کام کرتا ہوں" بچی معصومیت سے بولی "آپ مجھے اپنے ہاتھ دکھائیں" دانشور نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، بچی نے اس کے نرم اور ملائم ہاتھوں پر ہاتھ پھیرا اور معصومیت سے کہا "اگر آپ کام کرتے ہیں تو پھر آپ کے ہاتھوں پر پھول کیوں نہیں ہیں" دانشور کے لیے یہ بات عجیب تھی، اس نے بچی سے وضاحت چاہی، بچی نے اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں کی جلد سخت اور کھردری تھی اور اس پر جگہ جگہ زخم بنے ہوئے تھے۔ بچی نے ان "زخموں" پر انگلی پھیر کر بتایا "جو شخص کام کرتا ہے اس کے ہاتھوں پر ایسے پھول ہوتے ہیں" دانشور چیں بجبیں ہونے لگا تو مترجم نے مداخلت کی اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "دراصل ہمارے چین میں کام کا مطلب جسمانی محنت ہوتی ہے، ہمارے ہاں نرم ہاتھوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا" دانشور نے حیران ہو کر پوچھا "لکھنا، پڑھنا اور میز کرسی پر بیٹھ کر حساب کتاب کرنا بھی تو کام ہوتا ہے" مترجم نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کی بات درست ہے لیکن چین میں میز کرسی پر بیٹھنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں بھی زخم

ہوتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص اپنی روٹین جاب کے ساتھ جسمانی مشقت کرتا ہے، ہمارے دانشور اور لکھاری لکھنے کے بعد سڑکوں پر روڑی کوٹتے ہیں، کھیتوں میں گوڈی کرتے ہیں اور گلیوں میں اینٹیں لگاتے ہیں اور یہ لوگ ان کاموں کا معاوضہ بھی نہیں لیتے، مثلاً آپ مجھے دیکھیے، میں دفتر خارجہ میں اسسٹنٹ ہوں لیکن میں بھی اس بچی کی طرح کام کرتا ہوں، مترجم نے اتنا کہنے کے بعد اپنے ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے، اس کے ہاتھوں پر بھی مشقت کے "پھول" بنے ہوئے تھے۔

اہل چین دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے محنت کو فلسفے کی شکل دی۔ جنہوں نے خرگوش کی بجائے کچھوے کی رفتار کا انتخاب کیا اور صرف اپنی محنت اور وژن کے بل بوتے پر دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت بن گئے۔ آج چین کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ کسی ملک میں اس وقت تک تجارت، کاروبار اور صنعت کا عمل مکمل نہیں ہوتا جب تک وہاں چینی ماہرین قدم نہیں رکھتے۔ آج دنیا میں کوئی ایسی پراڈکٹ نہیں جس کا مارکیٹ میں چینی ورژن موجود نہ ہو اور آج دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جس میں چینی باشندے نہ پہنچے ہوں اور انہوں نے وہاں کی معیشت سے ان خراج وصول نہ کیا ہو، اس وقت دنیا کی تمام چھوٹی بڑی کمپنیاں چین منتقل ہو چکی ہیں اور چین ایک ایسی معاشی ڈھلوان بن چکا ہے جس نے دنیا کے تمام معاشی دریاؤں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ یہ محض چینیوں کے ہاتھوں کے پھولوں کا کمال ہے، چین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے کام کو عبادت کا درجہ دیا، ماؤزے تنگ اور چواین لائی نے کھرپے، کسی، گینتی اور جھاڑو کو ہر چینی کی ذات کا حصہ بنا دیا، چین میں 70 لاکھ چینی باشندے روز اپنی سائیکلوں پر گینتی، جھاڑو، کسی اور کھرپہ باندھ کر گھر سے نکلتے تھے اور راستے میں آنے والے قریب ترین کھیت میں کام شروع کر دیتے تھے، یہ لوگ گھر سے نکل کر کسی گلی اور کسی سڑک کے کسی حصے کی مرمت شروع کر دیتے تھے، یہ کسی دہلیز، کسی دکان اور کسی کارخانے میں جھاڑو دینا شروع کر دیتے تھے اور یہ لوگ کام کرتے ہوئے کسی سے نہیں پوچھتے تھے یہ کارخانہ' دکان یا یہ کھیت کس کی ملکیت ہے' چین کے لوگ چین کی سرحدوں میں موجود ہر چیز' ہر جگہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور ملکیت کے جذبے سے سرشار ہو کر اسے سنوارنے لگتے تھے' چین کے لوگ چالیس برس تک مسلسل اسی سپرٹ سے کام کرتے رہے' ان چالیس برسوں میں چین میں کسی نے چھٹی نہیں کی' چین میں ہفتہ وار چھٹی کا تصور تک نہیں تھا' یہ لوگ کام کی تنخواہ بھی نہیں لیتے تھے' ان لوگوں کو بس حکومت کی طرف سے مفت کھانا مل جاتا تھا' یہ لوگ صبح سات بجے گھر سے نکلتے تھے ٹھیک بارہ بجے

کھانے کا وقفہ کرتے تھے‘ کسی قریب ترین بیکری پر جاتے تھے اور بیکری کے مالکان انہیں حکومت کے کھاتے سے لنچ دے دیتے تھے اور یہ لوگ تھوڑا سا قیلولہ کر کے ایک بجے دوبارہ کام میں جت جاتے تھے‘ یہ لوگ شام چھ بجے واپس گھر جاتے تھے‘ راستے سے سرکاری بیکری سے رات کا کھانا لیتے تھے اور آٹھ نو بجے کے درمیان سو جاتے تھے‘ آج بھی پورے چین میں بارہ بجے دن لنچ کا وقفہ ہوتا ہے اور چین کے لوگ چھ سے سات بجے کے درمیان ڈنر کر لیتے ہیں میں مارچ 2006ء میں مشاہد حسین سید کے ساتھ چین گیا اور ہمیں بعض جگہوں پر چین کے پرانے ''کامریڈ'' دکھائی دیئے‘ یہ لوگ آج بھی اسی طرح سائیکل پر جھاڑو‘ گینتی‘ کسی اور کھرپہ باندھ کر نکلتے ہیں اور چپ چاپ کام شروع کر دیتے ہیں‘ چین میں کہا جاتا ہے اگر آپ کے پاس دو ہاتھ ہیں تو آپ دوزخ کو جنت بنا سکتے ہیں‘ چین میں یہ بھی کہا جاتا ہے۔ انسان اور جانور میں صرف ہاتھوں کا فرق ہوتا ہے اور جو انسان اپنے ہاتھوں سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں جانور ہے‘ دنیا میں بے شمار قوموں نے ترقی کی‘ ان میں سے بعض قوموں نے علم کا سہارا لیا‘ بعض نے عقل استعمال کی‘ بعض تجارت کے ذریعے ترقی کی چوٹی پر پہنچیں اور بعض نے ہتھیاروں اور فوجوں کی مدد سے ترقی کو فتح کیا لیکن چینی دنیا کے پہلے لوگ تھے جنہوں نے سنگ تراشوں کی طرح اپنے ہاتھ سے ترقی کا بت تراشا‘ جنہوں نے اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے ترقی کا پہاڑ طے کیا‘ شاید یہی وجہ ہے‘ آج سے تیس پینتیس برس پہلے امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے کہا تھا ''اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر انسان کو ہاتھ دیئے ہیں لیکن اس نے ان ہاتھوں کا استعمال صرف چینیوں کو سکھایا'' یہ چینیوں کے ہاتھوں اور ان ہاتھوں کے چھالوں کا کمال تھا۔ آج چین دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت ہے۔ آج اس کے زرمبادلہ کے ذخائر 998 بلین ڈالر ہو چکے ہیں اور یہ دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دینے والا ملک بن چکا ہے‘ چین نے پچھلے دنوں دنیا کی سب سے سستی لگژری گاڑی تک بنائی ہے۔ اس وقت دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جس میں ''میڈ ان چائنا'' نہ ہو‘ دنیا کے 142 بڑے چھوٹے ممالک میں ''چائنا ٹاؤن'' آباد ہو چکے ہیں اور چین دنیا کا واحد ملک ہے جو سوئی سے لے کر جہاز تک بنا رہا ہے‘ جس نے اپنی مٹی اپنی ریت تک کی مارکیٹنگ شروع کر دی ہے اور جس کا دعویٰ ہے اگر دنیا ہم سے کچھ سیکھنا چاہتی ہے تو اسے ہم سے کام کرنا سیکھنا چاہئے۔

دنیا کی اس حیرت انگیز قوم کے صدر ہوجن تاؤ پچھلے دنوں پاکستان کے دورے پر آئے وہ دو دن اسلام آباد رہے اور ہفتے کا دن انہوں نے پاکستان کے ثقافتی شہر لاہور میں گزارا‘ صدر

ہوجن تاؤ نے جس دن لاہور کا دورہ کرنا تھا اس دن لاہور کے تمام سکولوں' کالجوں اور دفتروں میں چھٹی کرادی گئی تھی' اس دن سارا لاہور گھروں میں محصور رہا' ہم نے اس ملک کے صدر کو یہ استقبال پیش کیا جس کے لوگوں نے چالیس سال تک ہفتہ وار چھٹی نہیں منائی تھی' جس کے بابائے قوم ماؤزے تنگ نے موت سے پہلے چین کے لوگوں سے کہا تھا ''تم اگر میرا سوگ منانا چاہو تو تم دو دو گھنٹے مزید کام کرنا' میری روح کو آرام اور سکون مل جائے گا'' جن کے دوسرے بڑے لیڈر چو این لائی کی ہر برسی پر چین کے لوگ ''اوور ٹائم'' کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ وصول نہیں کرتے اور جس کے ہر شہری کے ہاتھ پر آج بھی چھول ہیں' ہم نے اس ملک کے صدر کی آمد پر لاہور میں چھٹی کرادی تھی' کیا ہم نے چین سے یہ سیکھا تھا! میرا خیال ہے ہم لوگ اپنے رویوں میں بھکاری بن چکے ہیں' ہم قوموں' ملکوں اور لیڈروں سے سیکھنے کی بجائے ان سے امداد چاہتے ہیں' ہم دوستیوں کو ایگریمنٹس' امداد اور سفارتکاری کے پیمانوں پر ناپتے ہیں اور ہم یہ دیکھتے ہیں ہم نے کس ملک کی دوستی سے کتنے ڈالر کمائے افسوس ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا' ہم نے کس ملک سے کیا سیکھا' ہم نے کس دوستی سے کیا کیا ہنر حاصل کئے' صدر ہوجن تاؤ آئے' ہم نے ان کے استقبال کے لئے چراغاں کیا' ڈھول بجائے' تصویریں کھنچوائیں' چھٹی کی اور وہ چند ایگریمنٹس پر دستخط کر کے چلے گئے' افسوس ہم نے صدر ہوجن تاؤ کے ہاتھوں کے چھول نہیں دیکھے' ہم نے ان سے یہ نہیں پوچھا ''جناب صدر کیا آپ بھی ہاتھ سے کام کرتے رہے ہیں'' چینی صدر آئے اور چلے گئے لیکن ہم نے ان سے چین کا وہ محاورہ تک نہیں پوچھا جس میں چین کے کسی دانشور نے کہا تھا ''آلو نہ مانگو' آلو کا بیج مانگو''

# دیوار چین

کیمونسٹ پارٹی آف چائنا (سی پی سی) چین کی واحد سیاسی جماعت ہے' یہ پارٹی 1949ء سے چین میں برسر اقتدار ہے۔ صدر سے لے کر عام شہری تک ہر چینی کسی نہ کسی حوالے سے اس پارٹی کا حصہ ہے۔ سی پی سی نے فروری کے مہینے میں پاکستان مسلم لیگ (ق) کو اپنا وفد چین بھجوانے کی دعوت دی' یہ وفد 26 مارچ 2006ء کو چین روانہ ہوا اور تین اپریل کو واپس آیا' مشاہد حسین اس وفد کے سربراہ تھے' اس میں دس افراد شامل تھے' میں اس وفد کا واحد ''غیر پارلیمانی'' اور غیر مسلم لیگی رکن تھا' ہمارے وفد میں دو مسلم لیگی خواتین بھی شامل تھیں' ہم لوگ 26 مارچ کو اسلام آباد سے بیجنگ پہنچے' وہاں سے شنگھائی گئے' شنگھائی سے ارمچی آئے اور ارمچی سے واپس اسلام آباد آ گئے۔ یہ آٹھ روز ایک انتہائی دلچسپ تجربہ تھا۔

چینی لوگ دیوار چین کو ''گریٹ وال'' کہتے ہیں' یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے اور یہ زمین کی واحد تعمیر ہے جو چاند سے دکھائی دیتی ہے' یہ دیوار چین کے پہلے شہنشاہ ہوانگ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کی تعمیر 221 قبل مسیح میں شروع ہوئی اور اس دیوار نے چند برسوں میں 6 ہزار 7 سو کلومیٹر پر پھیلی سلطنت کو اپنی پناہ میں لے لیا' یہ انسانی ہاتھوں کا سب سے بڑا تعمیراتی معجزہ تھی' یہ ایک بلند اور چوڑی دیوار ہے جس پر دس سے پندرہ لوگ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتے ہیں' دیوار کی بیرونی سطحیں مضبوط پتھروں سے بنی ہیں جبکہ ان کے اندر چٹانیں' بھاری

پتھر اور چونا بھرا ہے' آپ اس دیوار کی مضبوطی کا اندازہ اس کی تاریخ سے لگا لیجئے' آج اس دیوار کو بنے اڑھائی ہزار سال ہو چکے ہیں' ان اڑھائی ہزار برسوں میں دنیا پر بے شمار آفتیں نازل ہوئیں' دنیا میں بے شمار سیلاب آئے' لاتعداد زلزلے' بارشیں اور طوفان آئے' بے شمار تہذیبیں بنیں اور لاتعداد معاشرے اپنا اپنا وقت پورا کر کے ختم ہو گئے لیکن یہ دیوار اپنی بنیادوں پر اسی طرح کھڑی رہی' اس نے مٹی سے اپنا رشتہ نہ ٹوٹنے دیا' اس دیوار کے راستے میں بے شمار پہاڑیاں' دریا' صحرا اور میدان آتے ہیں لیکن یہ دیوار ایک مضبوط اژدھے کی طرح ان میدانوں' ان صحراؤں' ان دریاؤں اور ان پہاڑوں کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے اور نقطہ انجام تک اپنا وقار' اپنی عزت اور اپنی توقیر برقرار رکھتی ہے' انسانی تاریخ میں ہر چیز وقت کے سامنے سرنگوں ہو گئی لیکن مصر کے احرام اور چین کی دیوار ایسے انسانی معجزے ہیں جو ہزاروں برس سے وقت کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں اور وقت اپنی پوری کوشش اور اپنی پوری قوت کے باوجود ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا' یہ وقت کے سینے پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں۔

ہم لوگ 28 مارچ کو دیوار کے نظارے کیلئے بیجنگ سے نکلے' تائی یوہان ایوہان ہماری مترجم اور کوآرڈینیٹر تھی' ان کے ساتھی جاؤ کیانگ تھے' یہ دونوں آٹھ روز تک ہمارے ساتھ رہے' دیوار پر شدید سردی تھی' پورے وفد نے اپنے سر اور کان ڈھانپ رکھے تھے' ہماری نظر کی حد تک بل کھاتی ہوئی دیوار تھی اور دیوار کے نیچے بہت دور وقت بیٹھا تھا اور وہ حیرت سے دیوار پر ایستادہ برجیاں اور مینار دیکھ رہا تھا' یہ ایک دفاعی دیوار تھی' زمانہ قبل مسیح میں چین بیرونی حملہ آوروں کا پسندیدہ ملک تھا' یہ فنکاروں' صنعت کاروں اور تاجروں کی سرزمین تھی' یہ لوگ مٹی کو سونے میں ڈھالنے کے فن سے واقف تھے' جب دنیا تن ڈھانپنے کیلئے پتوں کی محتاج تھی اس وقت چین کے کاریگر ریشم بناتے اور پہنتے تھے' ان لوگوں نے گرم مسالوں کو تجارت کی شکل دی تھی' یہ لوگ روغن بنانے' کاغذ تیار کرنے' بارود بنانے اور مٹی کو پتھر کی شکل دینے کے بھی ماہر تھے' زمانہ قدیم میں چین کے ہر گھر میں پانچ چھ بکریاں' ایک دو گائے' مہینے دو مہینے کا راشن اور سونے چاندی کے زیورات ہوتے تھے' یہ لوگ بلا کے ستارہ شناس تھے' یہ آسمان دیکھ کر آنے والے زمانوں کا حساب لگا لیتے تھے' جس وقت دنیا ننگے پاؤں پھرتی تھی اس وقت یہ لوگ چرمی جوتے پہنتے تھے' ان کے پاس دنیا کی انتہائی حسین عورتیں اور انتہائی تیز رفتار گھوڑے ہوتے تھے اور یہ لوگ اپنے کھیتوں میں ایک کاشت سے دو دو فصلیں حاصل کرتے تھے' ان کی انگور کی بیلیں سات سات نسلوں تک پھل دیتی

تھیں" چینی لوگ فطرتاً سرمایہ کار ہیں' یہ لوگ دھیلے سے روپیہ بنانے کا فن جانتے تھے' کہا جاتا تھا اگر ایک چینی گھر سے پتھر لے کر نکلے تو وہ شام کو سونے کی ڈلی لے کر واپس لوٹے گا چنانچہ اس دور میں سال میں کئی کئی بار بیرونی حملہ آور چین پر حملہ کرتے تھے اور چین کو اجاڑ کر چلے جاتے' چینی لوگ فطرتاً صنعت کار' تاجر اور فن کار تھے لہٰذا جنگ لڑنا اور ان حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ان لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا ان لوگوں نے اپنی سلطنت کی حفاظت کیلئے ایک مضبوط دیوار بنانے کا فیصلہ کیا' اس وقت تک دنیا میں کسی قوم نے بیرونی حملہ آوروں سے بچنے کیلئے کوئی دیوار نہیں بنائی تھی دنیا کے کسی ایجنڈ کے پاس ایسی ٹیکنالوجی بھی موجود نہیں تھی لیکن بادشاہ نے حکم دیا اور چینی عوام نے سات ہزار کلومیٹر لمبی دیوار کھینچ دی' اس دیوار نے وقت' خوف اور حملہ آوروں کو چینی حدود سے باہر پھینک دیا۔ اس نے چین کو محفوظ بنا دیا۔

یہ دیوار بنیادی طور پر چین کی نفسیات' چین کے فلسفے اور چینی لوگوں کی عادات کی علامت ہے' یہ دیوار ثابت کرتی ہے چینی قوم بنیادی طور پر پرامن لوگ ہیں' یہ لوگ ڈیفینسو ہیں' افینسو نہیں' ان کی پالیسی کسی دوسرے ملک پر حملہ کرنا نہیں بلکہ اپنا دفاع کرنا ہے' دفاع کا یہ فطری عنصر ابھی تک چینی نفسیات کا حصہ ہے' اس دیوار کی بنیادوں میں چھپا یہ جذبہ آج تک چین کی خارجہ پالیسی ہے' اس دورے کے دوران جب بھی ہمارے کسی ساتھی نے چین کے کسی ذمہ دار شخص سے کہا" ہم سمجھتے ہیں چین مستقبل کی سپر پاور ہے" تو اس نے بڑے آرام سے انکار میں سر ہلایا اور مسکرا کر جواب دیا" ہم سپر پاور نہیں بننا چاہتے" اس انکار کے پیچھے دیوار چین کی تاریخ چھپی ہوتی تھی' چین' امریکہ' یورپ اور مشرق وسطیٰ کے ممالک پر حملہ نہیں کرنا چاہتا' وہ دنیا کا کلچر بدلنے کا بھی خواہاں نہیں ہے وہ بس اپنا دفاع چاہتا ہے' چینی لوگ حملہ نہیں کرتے لیکن اگر ان پر حملہ کر دیا جائے تو یہ دیوار چین بن جاتے ہیں' یہ اس حملے سے بچنا جانتے ہیں' چین کا فلسفہ ہے" آپ کسی معاملے میں پہل نہ کریں" یہ دیوار اس فلسفے کی سب سے بڑی علامت ہے' چینی لوگ بے انتہا محنتی ہیں' یہ لوگ چیلنج قبول کرنے کے بھی ماہر ہیں' یہ لوگ دنیا سے ہٹ کر کام کرتے ہیں' جس چیز کو دنیا ناممکن سمجھتی ہے چینی ڈکشنری میں اس چیز کو ممکن کہا اور سمجھا جاتا ہے دیوار چین ان لوگوں کی اس عادت کا بھی خوبصورت اظہار ہے' چینی لوگ ہر حال میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں' ان کا رنگ اور قامت اتنا منفرد ہے کہ آپ ہزاروں لوگوں میں سے چینی لوگوں کو فوراً پہچان لیں گے' یہ دیوار چینیوں کی اس انفرادیت کو بھی ثابت کرتی ہے' چینی لوگ تاجر' صنعت کار اور فن کار ہیں اور

یہ تینوں چیزیں امن اور استحکام سے منسلک ہیں یہ حقیقت ہے جس جگہ امن نہیں ہوتا وہاں فن ابھر سکتا ہے اور نہ ہی صنعت اور تجارت اور یہ دیوار چین کے امن' استحکام اور دفاع کی بھی علامت ہے لہٰذا کہنے کا مطلب ہے اگر آپ چین اور چینیوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کو دیوار چین کو سمجھنا ہوگا' یہ دیوار وہ دروازہ ہے جس سے ہو کر آپ چین کی فارن پالیسی' چین کے نظام اور چینیوں کے دلوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

28 مارچ وہ دن تھا جب ہم دیوار چین پر کھڑے تھے اور چینیوں کے دل ہمارے لئے کھلے تھے' وہ ہمیں آواز دے رہے تھے۔ چینی کہاوت ہے "دنیا میں محبت سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں" چینی لوگ یہ ہتھیار لے کر ہمارے سامنے صف آراء تھے اور ہم لوگ مقتول ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

# ''کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اُگتے''

چین اپنے محاوروں اور کہاوتوں میں بھی دنیا سے بہت آگے ہے، چینی محاورے اپنے اندر معانی، دانش اور خیالات کی اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ بیسیوں کتابیں مل کر کسی ایک چینی محاورے کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، میں نے بچپن میں جو پہلا چینی محاورہ پڑھا تھا اس نے آنے والے دنوں میں میری زندگی کا سارا اسٹائل بدل دیا۔ میں زندگی میں جب بھی تلخ ہونے لگتا ہوں تو میں یہ محاورہ نکال کر پڑھتا ہوں اور فوراً ریلیکس ہو جاتا ہوں، وہ محاورہ تھا ''جسے مسکرانا نہیں آتا اُسے دوکان نہیں کھولنی چاہیئے'' دوسرا تاریخی محاورہ اس دورے کے دوران ملا، میں نے اپنے ایک میزبان سے چین کی ترقی کی وجہ پوچھی تو اس نے مسکرا کر ایک چینی محاورہ سنایا، وہ محاورہ کچھ یوں تھا ''کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں اُگ سکتے'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا ''ہم نے ترقی سے پہلے ترقی کے بارے میں ریسرچ کی تھی، ہم نے اندازہ لگایا تھا آپ جب تک ہاتھی کا بچہ نہیں پالتے آپ اس وقت تک ہاتھی دانت حاصل نہیں کرتے چنانچہ ہم نے انفراسٹرکچر تیار کرنا شروع کر دیا! ہم نے پورے ملک کو سڑکوں کے ساتھ ملایا، ہم نے ریلوے لائنیں بچھائیں، ایئر پورٹس اور بندرگاہیں بنائیں، ہم نے تعلیم اور صحت عام کی، ہم نے دنیا کی سب سے بڑی ورک فورس تیار کی اور اس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھی کے منہ میں دانت نکل آئے اور پوری دنیا ہم سے محبت کرنے لگی۔'' مجھے اس کی بات اچھی لگی، یہ سچ ہے ترقی سے پہلے ترقی کا

انفراسٹرکچر ضروری ہوتا ہے اور جس ملک کے پاس انفراسٹرکچر نہیں ہوتا، وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا اور چین اس کی سب سے بڑی اور تازہ ترین مثال ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا انفراسٹرکچر چین میں ہے۔ شنگھائی چین کا دوسرا بڑا شہر اور چین کا معاشی اور صنعتی دارالحکومت ہے، ہم لوگ 29 مارچ کو شنگھائی پہنچے تھے، شنگھائی کی آبادی اس وقت ایک کروڑ 74 لاکھ ہے، یہ ایک انتہائی خوبصورت، جاندار اور زندہ شہر ہے۔ آپ جوں ہی اس شہر میں داخل ہوتے ہیں آپ کو زندگی کا احساس ہوتا ہے، 30 جولائی کو شنگھائی کے میئر شین ہونگ گوونگ نے ہمارے وفد کو لنچ دیا تھا، اس لنچ کے دوران مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری امتیاز احمد رانجھا نے ان سے بڑا دلچسپ سوال پوچھا، انہوں نے پوچھا ''شنگھائی میں کتنی غیر ملکی کمپنیاں کام کر رہی ہیں'' میئر کے جواب نے پورے وفد کو حیران کر دیا، انہوں نے بتایا ''اس وقت شنگھائی میں 30 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں'' میئر کا یہ جواب چین کی اقتصادی اور صنعتی ترقی کا منہ بولتا ثبوت تھا، شنگھائی حقیقتاً ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے، آپ اس کے کمرشل والیم کا اندازہ اس میں کام کرنے والی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے لگا سکتے ہیں، اس وقت شنگھائی میں 46 ہزار 9 سو اشتہاری کمپنیاں کام کر رہی ہیں پورے ملک میں 79 ہزار تین سو اشتہاری کمپنیاں ہیں، ان ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے آپ شنگھائی اور چین کے تجارتی سائز کا اندازہ لگا سکتے ہیں، چین اس وقت دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت ہے، چین کا جی ڈی پی 8 ٹریلین اور 158 بلین ڈالر ہے جبکہ اس کے مالیاتی ذخائر 819 بلین ڈالر ہیں، چین کا گروتھ ریٹ 9 اعشاریہ 5 فیصد ہے، یہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ گروتھ ریٹ ہے، چین کی ذاتی بچتوں کا سائز ایک ٹریلین اور 70 بلین ڈالر ہے، اس وقت پوری دنیا چینی مصنوعات استعمال کر رہی ہے، یورپ چینی مصنوعات کا سب سے بڑا خریدار ہے، وہ ہر سال چین سے 218 بلین ڈالر کی اشیاء خریدتا ہے، امریکہ دوسرا بڑا خریدار ہے وہ چین سے سالانہ 212 بلین ڈالر کی اشیاء لیتا ہے جبکہ جاپان اس فہرست میں تیسرے نمبر پر آتا ہے وہ ہر سال چین سے 185 بلین ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے، ان ممالک کے بعد یہ فہرست طویل ہوتی چلی جاتی ہے، عالمی ماہرین کا خیال ہے آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں وہاں آپ کو ''میڈ ان چائنا'' ضرور ملے گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے وہ چین جو کل تک دنیا کا پسماندہ ترین ملک تھا اس نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا، متعلقاً چین نے یہ مقام محنت اور انفراسٹرکچر سے حاصل کیا ہے، اس نے ہاتھی دانت

کے حصول کیلئے ہاتھی پالنے شروع کیے تھے۔ آپ نقل و حرکت کے ذرائع کا اندازہ لگائیے اس وقت چین میں 472 ایئرپورٹ ہیں، ان میں سے 75 فیصد ایئرپورٹس پر بین الاقوامی پروازیں اترتی ہیں، شنگھائی نے اس سال دنیا کی سب سے بڑی کارگو پورٹ کا مقام حاصل کرلیا ہے، اس پورٹ سے پچھلے سال 443 ملین ٹن سامان دنیا کے بازاروں میں گیا، اس وقت دنیا میں سب سے بڑی ورک فورس چین میں ہے، چین میں 48 کروڑ ہنرمند ہیں، یہ تمام ہنرمند اپنے اپنے کاموں کے ماہر ہیں، چین میں انفراسٹرکچر کو وسعت دینے کا کام ابھی تک جاری ہے، چین یچیانگ دریا پر تین بڑے ڈیم بنا رہا ہے، ان ڈیموں پر 22 بلین ڈالر خرچ ہوں گے اور یہ ڈیم چین کو مزید 18 ہزار 2 سو میگاواٹ بجلی دیں گے، یہ دنیا کا سب سے بڑا ہائیڈل پاور پلانٹ ہوگا، چین 59 بلین ڈالر کی مالیت سے تیرہ سو کلومیٹر لمبی نہریں بھی کھود رہا ہے، چین 18 بلین ڈالر سے چار ہزار کلومیٹر لمبی گیس پائپ بھی بچھا رہا ہے، چین 34 بلین ڈالر سے 4480 کلومیٹر لمبے اور 20 کلومیٹر چوڑے جنگلات لگا رہا ہے، چینی اس منصوبے کو ''گریٹ گرین وال پراجیکٹ'' کہتے ہیں، یہ دنیا کا سب سے بڑا جنگلی ذخیرہ ہوگا، چینیوں کا خیال ہے جب یہ منصوبہ مکمل ہوگا تو چاند سے صرف دو چیزیں نظر آئیں گی، ایک گریٹ وال اور دوسری گریٹ گرین وال، ہم نے شنگھائی میں دو ایسے منصوبے دیکھے جنہوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں، ہم جن ماؤ ٹاور گئے، یہ 468 میٹر اونچی 88 منزلہ عمارت ہے جس پر دنیا کا تیسرا بلند ترین ٹی وی ٹاور قائم ہے، یہ ٹاور دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں شمار ہوتا ہے، اس کی لفٹ انتہائی سبک رفتار ہے، ہمارے میزبانوں نے ہمیں حیران کرنے کیلئے لفٹ کے فرش پر ایک سکہ کھڑا کردیا، ہم 88 ویں منزل سے نیچے آئے لیکن یہ سکہ اسی طرح ایستادہ رہا، آپ اس بات سے اس لفٹ کے توازن کا اندازہ لگائیے، دوسرا منصوبہ شنگھائی کا ''یانگ شان ڈیپ سی پورٹ'' تھی، یہ منصوبہ دس برس پہلے شروع ہوا، 1996ء میں شنگھائی کی حکومت نے گہرے پانیوں کی بندرگاہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لیے ان لوگوں نے سمندر کے اندر 32 کلومیٹر لمبا پل اور اس پل پر دو رویہ سڑک بنادی، یہ سڑک پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد منصوبہ ہے۔ آپ جب اس سڑک پر سفر کرتے ہیں تو آپ خود کو گہرے سمندر میں پاتے ہیں، اس سڑک کے آخر میں 30 گودیوں کی ایک نئی بندرگاہ بنائی جارہی ہے جس سے سالانہ 8 ہزار 5 سو کنٹینرز لائے اور لے جائے جائیں گے۔ ہم لوگ جب اس جگہ پہنچے تو ہمیں اپنا گوادر بہت یاد آیا، مسلم لیگ کی مزدور ونگ کے صدر فقیر حسین بخاری نے اس موقع پر بڑا

خوبصورت تبصرہ کیا، انہوں نے کہا "ایک یہ لوگ ہیں جو سمندر کو خشک کر کے بندرگاہیں بنا رہے ہیں اور ایک ہم لوگ ہیں جو قدرت کی دی ہوئی بندرگاہیں تک استعمال نہیں کر رہے۔" مجھے محسوس ہوا اس معاملے میں چین ہم سے بہت آگے ہے شاید یہ چین کی اسی سوچ کا نتیجہ ہے اس وقت دنیا کے تمام سرمایہ کار اپنے اپنے سرمائے کے ساتھ چین کا رُخ کر رہے ہیں، صرف 2005ء میں انٹرنیشنل سرمایہ کاروں نے چین میں 60 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی تھی، چین کی یہ فتوحات حقیقتاً اس کے وژن اور اس کے انفراسٹرکچر کا نتیجہ ہیں۔

بات ہو رہی تھی چینی محاوروں اور کہاوتوں کی تو مجھے چین کی ایک اور کہاوت یاد آ گئی، چینی میں کہا جاتا ہے "انسان کو پھول اس وقت توڑنے چاہئیں جس وقت وہ توڑے جانے کے قابل ہوں" چین نے اپنے عمل سے یہ محاورہ بھی سچ ثابت کر دیا، اس نے معیشت اور اقتصادیات کے پھول کاشت کئے، انہیں جوان کیا اور آج پوری قوم پھول چن رہی ہے، محاوروں سے یاد آیا، پنجاب کے کمیونیکیشن اور ورکس کے صوبائی وزیر رانا ظہیر الدین بھی ہمارے ساتھ تھے، وہ دلچسپ شخصیت کے مالک انسان ہیں، جو بھی شخص ان کی کمپنی میں بیٹھ جاتا ہے وہ ان کا ہو کر رہ جاتا ہے، دوران سفر رانا صاحب نے اپنے والد مرحوم کے دو قول سنائے، یہ قول بھی سونے میں تولنے کے قابل ہیں، رانا صاحب نے بتایا، ان کے والد کہا کرتے تھے، دنیا میں کچھ لوگ دولت مند ہوتے ہیں اور کچھ امیر، ہم ان سے پوچھا کرتے تھے ان دونوں میں کیا فرق ہوتا ہے تو وہ کہتے تھے، دولت مند وہ ہوتا ہے جس کے پاس دولت ہو جبکہ امیر وہ ہوتا ہے جو اس دولت کو مثبت کاموں میں خرچ کرے لہٰذا اللہ تعالیٰ سے دولت مند کی بجائے امیر ہونے کی دعا کرنی چاہیے اور وہ فرمایا کرتے تھے انسان کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس سے دوستوں کو ہمیشہ آس رہے اور دشمنوں کو خوف، میں رانا صاحب کے والد کے اقوال سے بہت متاثر ہوا اس کی وجہ بھی چینی اقوال ہیں، چینی لوگ کہا کرتے ہیں اگر تم ایک سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم مکئی بوؤ، اگر تم دس سال کی منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو تم درخت لگاؤ لیکن اگر تم صدیوں کیلئے منصوبہ بندی کرنا چاہتے ہو تو پھر تم لوگوں کی تربیت کرو، تم انہیں تعلیم دو، رانا صاحب کے والد کے اقوال تیسری کیٹیگری میں فال کرتے ہیں لہٰذا میں نے پاکستان پہنچتے ہی یہ دونوں فقرے اپنی ڈائری میں لکھ لئے۔

# ہم ایک زندہ دل قوم ہیں

سلیم احمد معین نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کے چیئر مین ہیں' مجھے چند دن پہلے ان کا ایک انٹرویو پڑھنے کا اتفاق ہوا' اس انٹرویو میں سلیم معین نے انکشاف کیا نادرا بنگلہ دیش کیلئے ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس بنائے گی' نادرا نے یہ کانٹریکٹ کھلی بولی میں حاصل کیا تھا' اس سلسلے میں بنگلہ دیش نے بین الاقوامی کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کیے' 14 ممالک کی کمپنیوں نے اپلائی کیا' بنگلہ دیش کی حکومت نے بولی کرائی' نادرا نے سب سے کم بولی دی' یوں یہ ٹھیکہ نادرا کو مل گیا' ٹھیکے کے مطابق نادرا بنگلہ دیش کو ایک ڈالر اور 80 سینٹ میں ڈرائیونگ لائسنس بنا کر دے گی' اس پراجیکٹ کا سافٹ ویئر پاکستان میں تیار ہو گا جبکہ افرادی قوت بنگلہ دیش سے حاصل کی جائے گی' میں نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو میرے تین ردعمل تھے اول مجھے نادرا کی پرفارمنس پر خوشی ہوئی' ماشاء اللہ اب ہماری (یا شاید ہمارا) نادرا بین الاقوامی کمپنی بن چکی ہے' اس کے اختیارات اور قابلیت ملکی سرحدیں عبور کر کے دوسرے ممالک میں داخل ہو چکی ہے' دوم نادرا ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس بنانے کی مہارت رکھتی ہے' اس کے پاس بین الاقوامی ڈاکومنٹس بنانے کی مہارت بھی آ گئی ہے اور سوم نادرا نے اپنی یہ قابلیت پاکستانیوں پر آزمانے کی بجائے پہلے بنگالی بھائیوں کو اس کا حق دار سمجھا۔

ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس وہ سرکاری دستاویز ہے جس کی بنیاد پر یورپ' امریکہ

مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ نے ترقی کی تھی‘ آج سے پچاس برس پہلے برطانیہ نے سوچا تھا وہ کون سی جگہ‘ وہ کون سا مقام ہے جس پر ملک کے تمام شہری روزانہ آتے ہیں‘ معلوم ہوا وہ مقام یا وہ جگہ سڑک ہے‘ جو بھی شخص اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے وہ سڑک پر ضرور آتا ہے‘ ایک اندازے کے مطابق یورپ کا ہر شہری روزانہ اوسطاً 89 مرتبہ سڑک پر قدم رکھتا ہے‘ امریکہ میں یہ تعداد 150 کو چھو رہی ہے جبکہ جاپان اور چین میں اس کی تعداد بالترتیب 121 اور 141 ہے‘ برطانیہ نے محسوس کیا جب ہمارے لوگ اس بڑی تعداد میں روزانہ سڑک پر آتے ہیں تو پھر ہمیں سڑک کو اپنے نظام کا مرکز بنانا چاہیے چنانچہ 1950ء میں فیصلہ ہوا برطانیہ کی سڑکیں قانون کا مرکز ہوں گی‘ اس وقت برطانیہ کے زیادہ تر حکمران یہ فقرہ بولتے تھے ”قانون کا نفاذ سڑک سے شروع ہوتا ہے‘ آپ سڑکوں پر قانون نافذ کر دیں‘ پورے ملک میں خود بخود قانون نافذ ہو جائے گا“ برطانیہ نے اس دور میں ٹریفک پولیس کو عام پولیس سے الگ کیا‘ اسے اختیارات‘ سہولتیں اور بھاری تنخواہیں دیں اور اس کے بعد اپنی سڑکیں اس کے حوالے کر دیں‘ برطانیہ کی ٹریفک پولیس نے چند ماہ میں سڑکوں کو قانون کا محور بنا دیا‘ یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس کے بعد فیصلہ ہوا اگر سڑکیں تمام شہریوں کی زندگی میں اہم رول ادا کرتی ہیں تو پھر ڈرائیونگ لائسنس کو بھی اہم ترین دستاویز ہونا چاہیے چنانچہ برطانیہ نے ڈرائیونگ لائسنس کو ہائی سکیورٹی ڈاکومنٹ بنا دیا اور اس کے حصول کو انتہائی پیچیدہ اور مشکل کر دیا‘ اس دور میں کہا جاتا تھا برطانیہ کا وزیراعظم بننا آسان ہے لیکن ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنا مشکل‘ حکومت نے اس کیلئے بڑا کڑا معیار طے کیا‘ لائسنس کے حصول کیلئے بالغ ہونا‘ شریف ہونا‘ قانون کا ادراک رکھنا اور ڈرائیونگ کا ماہر ہونا ضروری تھا‘ آنے والے دنوں میں یہ معیار مزید مشکل ہو گیا چنانچہ آج یہ حالت ہے برطانیہ میں ڈرائیونگ لائسنس سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے‘ آپ کے پاس اگر یہ کارڈ موجود ہے تو برطانیہ کا ہر سرکاری اور غیر سرکاری دروازہ آپ کیلئے کھلا ہے‘ بصورت دیگر آپ برطانیہ میں یتیم کی حیثیت رکھتے ہیں‘ برطانیہ کی دیکھا دیکھی ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس‘ ٹریفک پولیس اور ٹریفک کے قوانین پر عملدرآمد کا سلسلہ یورپ کے دیگر ممالک تک پھیل گیا اور اس کے بعد یہ ڈرائیونگ لائسنس ترقی کا سب سے بڑا معیار بن گیا‘ یہ طے ہو گیا ملکوں کی ترقی کا آغاز ان کی سڑکوں‘ ٹرانسپورٹ اور ڈرائیونگ کے قوانین سے ہو گا‘ آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا جس ملک کی سڑکیں‘ ٹریفک اور ٹریفک قوانین بہتر ہیں صرف وہی ملک ترقی یافتہ کہلا سکتا ہے‘ آپ اس وقت دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا پروفائل نکال کر دیکھ لیں

آپ کو ان تمام ممالک میں ٹریفک اور ٹریفک قوانین مشترک ملیں گے جبکہ آپ دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک کی فہرست بھی نکال کر دیکھ لیں آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی ان تمام ممالک میں ٹریفک کے قوانین بہت کمزور اور ٹریفک کا نظام انتہائی ناقص ہے' آپ امریکہ' لاطینی امریکہ' یورپ' مشرق بعید اور اب مشرق وسطیٰ کے ممالک کے دورے کریں آپ کو ان تمام ممالک میں ٹریفک کے قوانین انتہائی مضبوط اور ڈرائیونگ لائسنس ایک مقدس ڈاکومنٹ نظر آئے ہوگا' آپ کو معلوم ہوگا ڈرائیونگ لائسنس ان تمام ممالک کا سب سے بڑا شناختی کارڈ ہے' آپ ذرا سی ریسرچ کر کے دیکھ لیں اس وقت دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک میں ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس موجود ہیں۔

میں نے جب سلیم معین صاحب کا انٹرویو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا ترقی کے عمل میں بنگلہ دیش ہم سے چند قدم آگے ہے' جس وقت پاکستان کے نصف سے زائد ڈرائیوروں کے پاس عام ڈرائیونگ لائسنس تک موجود نہیں' اس وقت بنگلہ دیش ہائی سکیورٹی ڈرائیونگ لائسنس کے دور میں داخل ہو رہا ہے' بنگلہ دیش کی حکومت اور لوگ یورپ اور امریکہ کی طرح سوچ رہے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہم لوگ آج تک اپنے ڈرائیوروں کو لائسنس لینے کیلئے قائل نہیں کر سکے' دوسرا ہماری نادرا یہ ٹیکنالوجی پہلے پاکستانیوں کو دینے کی بجائے ملک سے باہر بیچ رہی ہے' یہ بات ثابت کرتی ہے ہمارا دفتری نظام اس قدر خراب اور سرخ فیتے کا شکار ہو چکا ہے کہ پاکستان میں اس نظام کی گنجائش بھی موجود نہیں جو بنگلہ دیش ہم سے خرید رہا ہے' میرا خیال ہے صدر صاحب اور وزیراعظم صاحب کو چاہیے وہ سلیم معین کو بلوائیں اور ان سے وہ وجوہات جاننے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے ہم اپنی ٹیکنالوجی پاکستان سے پہلے بنگلہ دیش کو فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں' ترقی ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں ہر چیز آگے کی طرف بڑھتی ہے' اگر چیزیں آگے بڑھ رہی ہوں تو ہم ملکوں اور معاشروں کو ترقی پذیر کہتے ہیں' ہمارے ملک میں بھی چیزیں آگے بڑھ رہی ہیں' یہ سچ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے ہمارے ملک میں آگے بڑھنے کی وہ رفتار نہیں جو اس عمل میں ہونی چاہیے' ترقی تو یہ ہے کہ ہمارے ایک ادارے نے ایک ایسا سسٹم بنالیا ہے جس کی عالمی مارکیٹ میں مانگ ہے لیکن دوسری طرف یہ عالم ہے ہمارا اپنا ملک یہ سسٹم خریدنے اور اس سسٹم کو نافذ کرنے کیلئے تیار نہیں' یہ عجیب بات نہیں لگتی ہم اپنی جھولی کی ریوڑیاں دوسروں کی جھولی میں ڈال رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس فیاضی کا جشن بھی منا رہے ہیں۔

ہم حقیقتاً ایک زندہ دل قوم ہیں۔

# ٹیری اگر یہاں ہوتی



ٹیری شائیو 1963ء میں فلوریڈا میں پیدا ہوئی بائیس سال کی عمر میں اس نے مائیکل شائیو کے ساتھ شادی کر لی 25 فروری 1990ء کو جب وہ 26 برس کی تھی تو ایک صبح اسے شدید الٹیاں شروع ہو گئیں اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا ہسپتال میں ڈاکٹر اس کے مرض کی بروقت تشخیص نہ کر سکے ٹیری کو ہارٹ اٹیک ہوا اس کے جسم میں آکسیجن ختم ہوئی اسے برین ہیمرج ہو گیا اور وہ ایک طویل سکتے میں چلی گئی۔ جس کے بعد ڈاکٹروں نے اس کے منہ میں خوراک کی نالی لگا دی وہ دن ہے اور آج کا دن ہے وہ مسلسل سکتے میں ہے۔ مائیکل شائیو نے غلط علاج کرنے پر ڈاکٹروں کے خلاف کیس کر دیا اگست 1992ء میں عدالت نے اس کیس کا فیصلہ سنا دیا جس کے نتیجے میں دو ڈاکٹروں نے ٹیری کے خاوند کو ساڑھے بارہ لاکھ ڈالر تاوان ادا کیا۔ اسی مہینے ٹیری کی طبی امداد کیلئے ایک ٹرسٹ بنا اور مائیکل نے تاوان کی رقم سے ساڑھے سات لاکھ ڈالر اس ٹرسٹ میں جمع کرا دیے جس کے بعد ٹیری فلوریڈا کے ایک ہسپتال کی مستقل مریضہ بن گئی 1998ء میں مائیکل نے عدالت میں رٹ کی "ٹیری طبی لحاظ سے مر چکی ہے ڈاکٹروں کا کہنا ہے گزشتہ آٹھ برس میں اس کی حالت میں ذرا فرق نہیں پڑا لہٰذا اسے زبردستی زندہ رکھنا اس کے ساتھ زیادتی ہے عدالت ہسپتال کی انتظامیہ کو اس کی خوراک کی نالی ہٹا دینے کا حکم جاری کر دے" عدالت نے ڈاکٹروں کی رائے طلب کی ڈاکٹروں نے مائیکل شائیو کی بات سے اتفاق

کیا چنانچہ عدالت نے 2000ء میں ٹیری کی ٹیوب ہٹا دینے کی اجازت دے دی' یہ حکم سنتے ہی ٹیری کے والدین عدالت میں پیش ہوئے اور انہوں نے عدالت سے درخواست کی "ہماری بچی زندہ ہے جب تک میڈیکل سائنس اسے مردہ قرار نہیں دیتی اس کی خوراک کی نالی نہ ہٹائی جائے" عدالت نے اس درخواست کے فیصلے تک نالی لگانے کی اجازت دے دی' یہ 19 اگست 2003ء کی بات ہے اس کے بعد امریکی معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا' قانون' قانون دان اور عدالتیں ٹیری کو مردہ قرار دینے لگیں اور وہ اس کے حلق سے نالی ہٹانے کا مطالبہ کرنے لگیں جب کہ عام لوگ "ٹیری زندہ ہے" کے نعرے لگانے لگے اور جب تک اس کی سانس چل رہی ہے فیڈنگ ٹیوب برقرار رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے۔

ٹیری کا مقدمہ 2003ء سے آگے بڑھنے لگا' یہ کیس چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت' بڑی عدالت سے فیڈرل کورٹ اور فیڈرل کورٹ سے سپریم کورٹ پہنچ گیا' ان تمام عدالتوں نے ٹیری کو مردہ قرار دے دیا اور ٹیوب ہٹانے کا حکم جاری کر دیا لیکن اکتوبر 2003ء کو فلوریڈا کے گورنر جیب بش نے عدالتوں کا یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا اس کا کہنا تھا "ٹیری زندہ ہے ہم اس کی زندگی کی حفاظت کریں گے ہم اس کی ٹیوب نہیں اترنے دیں گے" ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ 18 مارچ 2005ء کو فیڈرل عدالت نے حتمی فیصلہ دے دیا اس فیصلے کے بعد ہسپتال کی انتظامیہ نے دن کے ایک بج کر 45 منٹ پر ٹیری شائیو کی فیڈنگ ٹیوب اتار دی لیکن اس مرحلے پر وفاقی حکومت نے ٹیری کے کیس میں مداخلت کی اور عدالت سے ٹیری کی ٹیوب بحال کرنے کی درخواست کر دی' عدالت نے فیصلہ دیا "امریکہ کا قانون ٹیری کو زندہ تسلیم نہیں کرتا' اگر حکومت ٹیری کو بچانا چاہتی ہے تو اسے نیا قانون بنانا پڑے گا" حکومت نے ٹیری کا معاملہ فوراً کانگریس میں پیش کر دیا' کانگریس نے نیا بل تیار کیا' اس پر بحث کی اور ٹیری کے حق میں فیصلہ دے دیا' جب اس بل پر بحث چل رہی تھی تو صدر بش ٹیکساس میں اپنے فارم پر چھٹیاں گزار رہے تھے' انہوں نے چھٹیاں منسوخ کیں' اپنے خصوصی طیارے پر بیٹھے اور وائٹ ہاؤس واپس آ گئے' ان کی یہ واپسی حیران کن تھی کیونکہ پچھلے دو سو سال سے امریکہ میں یہ روایت چلی آ رہی ہے جب وہاں امریکی صدر چھٹیاں منانے جاتے ہیں تو انہیں کسی معاملے میں پریشان نہیں کیا جاتا' ان کی ساری سرکاری اور ثقافتی مصروفیات منسوخ کر دی جاتی ہیں' ان کے ٹیلی فون رابطے تک محدود کر دیے جاتے ہیں لیکن صدر بش نے نہ صرف یہ روایت توڑ دی بلکہ وہ فوری طور پر واشنگٹن بھی واپس آ گئے' اس موقع

پروائٹ ہاؤس کے ترجمان سکاٹ میک کلی لان نے صدر کی واپسی کا اعلان کرتے ہوئے کہا" صدر بش سمجھتے ہیں ایک مریضہ کی جان ان کی چھٹیوں سے زیادہ قیمتی ہے" ٹیری کیس کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق آج 24 مارچ تک اس کی فیڈنگ ٹیوب اتری ہوئی ہے اور وہ آہستہ آہستہ موت کی دہلیز کی طرف بڑھ رہی ہے' امریکی قانون اس کی موت کا منتظر ہے جبکہ امریکی عوام اور امریکی حکام ایسا قانون بنانے میں مصروف ہیں جو ٹیری کی اتری ہوئی فیڈنگ ٹیوب دوبارہ لگا سکے جو اس کی زندگی بچا سکے۔

ٹیری کا یہ کیس ثابت کرتا ہے امریکی حکومت اپنے شہریوں کی زندگی کے بارے میں بہت سنجیدہ ہے' آپ ذرا دیکھئے' امریکہ کے ایک عام شہری کا کیس کانگریس میں گیا' کانگریس نے معمول کی کارروائی روک کر یہ کیس سنا' قانون میں تبدیلی کا فیصلہ کیا' قانون سازوں نے نیا بل تشکیل دیا اور صدر اس بل پر دستخط کرنے کیلئے اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے دارالحکومت پہنچ گیا' یہ حقیقت ہے ٹیری زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گی کیونکہ میڈیکل سائنس ٹیری کے معاملے میں بے بس ہے لیکن اس کے باوجود امریکی حکومت نے اپنے شہریوں کے ساتھ اپنی محبت ثابت کر دی' ہم اب امریکہ سے پاکستان آتے ہیں' آپ ٹیری کے کیس کو سامنے رکھیں اور پھر اپنے اسلامی معاشرے پر نظر ڈالیں اور پھر سوچیں" کیا اللہ' رسول' اور قرآن کے دعوے دار اس معاشرے میں بھی انسان کو اتنی ہی وقعت' اتنی ہی اہمیت حاصل ہے' سوچئے اگر ٹیری اس ملک میں ہوتی تو کیا ہماری پارلیمنٹ' ہمارے وزیراعظم اور ہمارے صدر کا ردعمل یہی ہوتا' سوچئے اگر ٹیری اس اسلامی معاشرے میں ہوتی تو کیا ہمارے حکمران اس کی جان بچانے کیلئے قانون تبدیل کر دیتے' کیا یہ بھی اپنی چھٹیاں منسوخ کر دیتے" ہو سکتا ہے آپ کا جواب نفی میں ہو' اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو پھر آپ ایک بات پلے باندھ لیجئے' اسلام کے جس دور میں حضرت عمرؓ فرات کے بھوکے کتوں کو خلیفہ کی ذمہ داری قرار دیتے تھے اس وقت مسلمانوں کا اقتدار زمین کی آخری حدوں پر دستک دے رہا تھا لیکن جب حضرت عمرؓ کی اس سوچ کو مسلمانوں نے فراموش کر دیا اور امریکہ نے اسے قانون بنا دیا تو مسلمان اپنے ہی وجود میں سمٹ کر رہ گئے' وہ اپنی ہی ذات میں شرمندہ ہو گئے' مجھ سے جب لوگ پوچھتے ہیں مسلمان امریکہ کا مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے تو میں کہتا ہوں" صرف اس لئے کہ امریکہ کے دل میں اپنے شہریوں کا احترام باقی ہے' ان میں انسانیت اور انسان دوستی موجود ہے جبکہ مسلمان کا دل رحم اور احترام سے خالی ہو چکا ہے اور اللہ ایسے سفاک لوگوں پر کرم نہیں کرتا"

# گھاٹے کا سودا



لین پی کا تعلق چین کے صوبے جیانگ سو (Jiangsu) سے ہے' وہ مرکزی شہر نان جنگ (Nanjing) سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک گاؤں سین تا نگ کا رہنے والا تھا' آج سے دس برس پہلے نان جنگ میں معاشی سرگرمیاں شروع ہوئیں تو گاؤں کے زیادہ تر نوجوان صوبائی دارالحکومت میں منتقل ہو گئے لین پی بھی ان کی پیروی میں نکل کھڑا ہوا' اس نے شہر کی ایک فیکٹری میں کام شروع کر دیا۔ کام دلچسپ تھا اور لین پی محنتی لہٰذا وہ ترقی کرنے لگا' آنے والے برسوں میں وہ مزدور سے افسر بن گیا' اس کی تنخواہ میں تین گنا اضافہ ہو گیا' لین پی کی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزرنے لگی' تین برس پہلے لین پی نے اپنے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی کر لی' شادی کے بعد لین پی ایک نئے مسئلے کا شکار ہو گیا' اس کی بیوی گاؤں میں رہتی تھی جبکہ وہ اس سے پانچ سو کلومیٹر دور نان جنگ میں مقیم تھا' وہ اپنی بیگم سے سال میں ایک بار ملتا تھا' چین میں تمام ورکروں کو نیو ائیر پر ایک ماہ چھٹی ملتی ہے' انگریزی میں ان چھٹیوں کو سپرنگ ہالی ڈیز یا لانگ ہالی ڈیز کہا جاتا ہے' نیو ائیر سے ایک دو دن پہلے تمام ورکر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں اور 29 جنوری تک چھٹیوں پر رہتے ہیں' لین پی بھی ''لانگ ہالی ڈیز'' پر گاؤں جاتا تھا اور ایک مہینہ اپنی بیگم کے ساتھ گزار کر واپس آ جاتا تھا' اس سال وہ گاؤں گیا تو وہ بیٹے کا باپ بن چکا تھا' وہ بہت خوش تھا لیکن اس کی ماں نے اسے ایک عجیب وہم میں ڈال دیا' اس نے اس سے کہا'' تمہارے بیٹے کی

ناک ہمارے خاندان سے نہیں ملتی' لین چی نے غور کیا تو بچے کی ناک واقعی خاندان سے مختلف تھی' اس نے بچہ اٹھایا اور اسے پیرینٹی سنٹر لے گیا' سنٹر میں بچے کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوا اور ہسپتال نے بچے کو لین چی کی اولاد ڈکلیئر کر دیا' لین چی بچے کو لے کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

چین میں اس وقت لین چی جیسے 14 کروڑ لوگ ہیں' یہ تمام لوگ اپنے گھروں سے دور کام کرتے ہیں اور سال میں صرف ایک بار گھر لوٹتے ہیں' گھروں سے اس دوری کے دوران جب یہ لوگ صاحب اولاد ہوتے ہیں تو یہ لین چی کی طرح شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی عائلی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی ہے' شروع شروع میں یہ شکوک و شبہات طلاق پر جا کر ختم ہوتے تھے لیکن حکومت نے جلد ہی اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا لہٰذا اس نے مختلف علاقوں میں پیرینٹی سنٹر بنا دیئے' اس کے بعد اب مزدور نیو ائیر پر گھر لوٹتے ہیں تو وہ اپنے اپنے نومولود بچے اٹھا کر پیرینٹی سنٹر پہنچ جاتے ہیں' سنٹروں میں ان کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوتا ہے اور اس ٹیسٹ کے بعد ہسپتال ان بچوں کی ولدیت کا تعین کرتے ہیں' اس قسم کے ٹسٹوں کے دوران 20 فیصد لوگوں کے خدشات صحیح ثابت ہو جاتے ہیں چنانچہ وہ ہسپتال ہی سے اپنی بیوی کو طلاق بھجوا دیتے ہیں' ''لانگ ہالی ڈیز'' کے دوران ان سنٹروں میں بے تحاشا رش ہوتا ہے' سینکڑوں ہزاروں لوگ روزانہ یہاں آتے ہیں' ان کی گود میں بچے ہوتے ہیں اور وہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنے اپنے مقدر کے فیصلے کا انتظار کرتے رہتے ہیں' یہ چین کا پہلا سماجی مسئلہ ہے۔



چین کا دوسرا سماجی مسئلہ رشتے ہیں' آج سے پچاس برس پہلے چین کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا تھا' چین کی حکومت نے آبادی کا دباؤ روکنے کا فیصلہ کیا' جس کے نتیجے میں چین میں ''سبز ستارہ'' قسم کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں لیکن جب اس میں خاص کامیابی نہ ہوئی تو حکومت نے اولاد کے سلسلے میں قانون بنا دیا' اس قانون کو سنگل چائلڈ لاء کہا جاتا ہے' اس قانون کی رو سے چین میں ایک جوڑا صرف ایک بچہ پیدا کر سکتا ہے تاہم چین کے بعض مضافاتی اضلاع اور صوبوں میں دو بچوں کی اجازت بھی ہے لیکن یہ اجازت صرف 12 فیصد رقبے تک محدود ہے باقی چین میں سنگل چائلڈ کا قانون نافذ ہے۔ جب اس قانون پر عملدرآمد شروع ہوا تو حاملہ خواتین ابتدائی مہینوں میں الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے بچے کی جنس معلوم کر لیتی تھیں' اگر انہیں معلوم ہوتا وہ بیٹی کی ماں بننے والی ہیں تو وہ اسقاط کرا دیتیں' اس کے نتیجے میں چین میں مرد بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور حکومت کو محسوس ہوا اگر یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو 2000ء تک چین میں صرف مرد ہی مرد ہوں

گے چنانچہ حکومت نے پیدائش سے پہلے بچے کی جنس معلوم کرنے پر بھی پابندی لگا دی اور بلاوجہ اسقاط کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا لیکن اس قانون کے بعد نئے مسائل پیدا ہو گئے' ان مسائل میں چین میں رشتوں کا بحران بھی شامل ہے مثلاً اس وقت چین میں جو بچے پیدا ہو رہے ہیں ان کا کوئی بھائی' کوئی بہن نہیں' ان کا کوئی چاچا' چاچی' تایا تائی' ماموں' ممانی' خالہ' خالو اور پھوپھا پھوپھی نہیں' چین میں انکل کا لفظ تک ختم ہو چکا ہے اور چینی ماہرین کا خیال ہے یہ صورتحال جاری رہی تو دس برسوں بعد ڈکشنری سے بھائی' بہن' چاچا چاچی' تایا تائی' خالہ خالو اور پھوپھا پھوپھی کے الفاظ تک ختم ہو جائیں گے' چنانچہ چینی حکومت کی کوشش ہے چین میں کسی نہ کسی طرح یہ رشتے برقرار رکھے جائیں' حکومت اب چین میں ایسے قوانین بنا رہی ہے جن کے ذریعے بچوں کو بہن بھائی اور کزن کے مصنوعی رشتوں میں پرو دیا جا سکے اس قانون کے بعد بچوں کو مجبور کیا جائے گا وہ سکول میں کسی بچی کو اپنی منہ بولی بہن یا منہ بولا بھائی بنائیں' وہ کسی کو اپنا چچا زاد بھائی' خالہ زاد بہن اور تایا زاد بھائی بہن ڈکلیئر کریں اور باقی زندگی ان کے ساتھ رابطے میں رہیں' چین میں کارڈ چھاپنے والی بے شمار کمپنیاں اس وقت مائی سویٹ انکل' مائی ڈیئر برادر اور مائی ڈیئر سسٹر کے کارڈز چھاپ رہی ہیں' حکومت کی کوشش ہے چین میں ایک ایسا کلچر پروان چڑھایا جائے جس میں بچے یہ کارڈز اپنے مصنوعی رشتے داروں کو دینا شروع کریں اور اس کے بعد پوری زندگی ان کارڈوں کا تبادلہ جاری رکھیں۔

چین اس وقت دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹریل اسٹیٹ' سب سے بڑا شاپنگ مال اور دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت ہے یہ بحران اسی معاشی طاقت' اس شاپنگ مال اور اسی انڈسٹری کا نتیجہ ہے' دنیا میں پانچ سو سال سے ایک فقرہ حکمرانی کر رہا ہے'' کچھ پانے کیلئے کچھ کھونا پڑتا ہے'' چین نے پچھلی تین دہائیوں میں معاشی اور مالیاتی استحکام کے بدلے یہ سارے رشتے کھوئے ہیں' وہ دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت' سب سے بڑا شاپنگ مال اور سب سے بڑی انڈسٹریل سٹیٹ تو بن گیا لیکن اس نے اپنے سارے رشتے کھو دیئے' اس نے والدین کا اولاد پر یقین متزلزل کر دیا' چینی سوسائٹی سے چاچے مامے' تائے اور پھوپھے ختم ہو گئے' چین کے معاشرے سے چاچیاں' ممانیاں' تائیاں اور پھوپھیاں ختم ہو گئیں' وہاں بہن بھائی اور کزن کا رشتہ ختم ہو گیا' آج جب چین میں کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا باپ سب سے پہلے اسے پیرنٹی سنٹر لے جاتا ہے' اس کی ولدیت کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے بعد اسے بیٹا یا بیٹی کہتا ہے' جب یہ بچہ

ذرا سا بڑا ہوتا ہے تو پوری دنیا میں ماں کے سوا اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا' وہ رشتوں کے ایک وسیع خلا کے ساتھ پروان چڑھتا ہے اور جب یہ بچہ جوان ہوتا ہے تو یہ چین کی معاشی اور صنعتی ترقی کا تاوان دینا شروع کر دیتا ہے لہٰذا چین اس وقت ایک ارب 20 کروڑ تنہا لوگوں کا ملک ہے۔

میں نے کل پاکستان کے ایک پالیسی میکر کا بیان پڑھا' انہوں نے فرمایا ہم پاکستان کو چین بنا دیں گے' میں ان کا یہ بیان پڑھ کر پریشان ہو گیا اور میں نے فوراً سوچا پاکستان کو چین بنانے کیلئے حکومت کو پیرینٹی سنٹر بھی بنانے پڑیں گے' اسے اس معاشرے سے رشتوں کی خوشبو' رشتوں کے سارے رنگ بھی اڑانے ہوں گے' اسے اس معاشرے کی ساری خوبصورتی بھی مٹانا ہو گی' میں نے سوچا ''کیا ہم ایک فیکٹری' ایک دکان اور ایک شاپنگ مال کے بدلے اپنے سارے رشتوں کی قربانی دے سکتے ہیں؟'' میں نے پھر سوچا' میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے' ہمارے جیسے ملک میں عام شخص کی عام سی سوچ کی کوئی وقعت نہیں ہوتی' ایسے ملکوں میں وہی ہوتا ہے جو کرنے والے کرنا چاہتے ہیں' جو پالیسی ساز ٹھان لیتے ہیں' میں نے پھر سوچا چین نے رشتوں کی قربانی دے کر ترقی کر لی تھی لیکن کہیں ایسا نہ ہو ہم قربانی بھی دے دیں اور ترقی بھی نہ کر سکیں کیونکہ ہمارا ٹریک ریکارڈ ہے ہم گلاب کی قلمیں لگاتے ہیں جب یہ قلمیں پودے بنتی ہیں اور ان پودوں پر پھول لگنے کا موسم آتا ہے تو ہم کانٹے توڑ کر گھر لے آتے ہیں' ہم لوگ گھاٹے کا سودا کرنے میں ماہر ہیں۔

# بٹ آئی لائیک یو سوچ

بعض اوقات آپ کو یونہی بیٹھے بیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کے بعد اس کہانی کے تمام کردار آپ کے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں' آپ اس کہانی اور اس کہانی کے کرداروں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کردار اور وہ کہانی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی' ولسن اور جارج کی داستان بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے' میں نے یہ کہانی برسوں پہلے کسی ڈائجسٹ میں پڑھی تھی اور یہ بھی بے شمار دوسری کہانیوں کی طرح میرے دماغ کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی' میں جارج اور ولسن دونوں کو بھول گیا لیکن چند روز پہلے اچانک یہ کہانی اپنی پوری جزئیات کے ساتھ یاد آئی اور اس کے تمام کردار میرے ذہن میں اٹک کر رہ گئے' میں نے ان سے جان چھڑانے کی بڑی کوشش کی لیکن ولسن اور جارج میرا پیچھا چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے' یہ دونوں کردار اب ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں' یہ ہر وقت میرے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور میں انہیں اپنے آگے پیچھے چلتا پھرتا دیکھتا ہوں۔

ولسن امریکی ریاست ٹیکساس کا مافیا لارڈ تھا' اس کے دو ہی شوق تھے جانور پالنا اور دشمنیاں بنانا' اس کا کہنا تھا دشمن آپ کی طاقت کا ثبوت ہوتے ہیں' آپ کے جتنے زیادہ دشمن ہوں گے آپ اتنے ہی طاقتور ہوں گے لہٰذا وہ دشمن بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا لیکن اس کا دشمنوں کے ساتھ نمٹنے کا طریقہ بہت دلچسپ تھا' وہ جب بھی کسی شخص کو اپنا دشمن

بناتا تھا تو اس دشمن کے مقابلے میں ایک دوست بھی سٹیبلش کرتا تھا' یہ دوست اس کے دشمن کا دشمن ہوتا تھا' وہ اس ''دوست'' کو اسلحہ دیتا تھا' پیسہ اور حوصلہ دیتا تھا' اسے دشمن سے لڑا دیتا تھا اور خود دور بیٹھ کر اس لڑائی کو انجوائے کرتا تھا' اس جنگ کے دوران عموماً اس کا دشمن مارا جاتا تھا جس کے بعد وہ دشمن کی میت پر آتا تھا' دشمن کی نعش پر پاؤں رکھتا تھا' اپنے شارٹ ٹرم دوست کو تھپکی دیتا تھا اور اس کے بعد اسے بھی گولی مار دیتا تھا' اس کا فلسفہ تھا جب آپ کا کوئی دوست آپ کے دشمن کو شکست دے دیتا ہے تو وہ آپ کا دوست نہیں رہتا چنانچہ آپ کو چاہیے پہلی فرصت میں اپنے اس دوست سے جان چھڑا لیں' ایل۔ ڈین اس کا ایک ایسا ہی دوست تھا' ایل۔ ڈین نے ولسن کے کہنے پر اس کے سب سے بڑے دشمن ماس سے ٹکر لی تھی' ماس ولسن سے بہت بڑا اور مضبوط مافیا تھا' ولسن کا خیال تھا ایل۔ ڈین ماس کو شکست نہیں دے سکے گا لیکن ایل۔ ڈین نے ماس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے' ولسن کو محسوس ہوا ایل۔ ڈین یہ جنگ جیت کر ماس کی جگہ لے چکا ہے چنانچہ اب اسے ایل۔ ڈین سے بھی جان چھڑا لینی چاہیے' ولسن ایل۔ ڈین کی طرف بڑھا لیکن اس وقت تک ایل۔ ڈین ولسن کی نیت بھانپ چکا تھا چنانچہ ایل۔ ڈین وہاں سے بھاگا اور اس نے ٹیکساس سے باہر جا کر اپنا ایک الگ بڑا مافیا بنا لیا' ایل۔ ڈین جرات مند بھی تھا ہوشیار بھی اور دولت مند بھی لہٰذا اس کا مافیا جڑ پکڑنے لگا اور لوگوں کو محسوس ہونے لگا ایل۔ ڈین ولسن کو برباد کر دے گا' اس وقت ولسن کو ایک ایسے شارٹ ٹرم دوست کی ضرورت پڑی جو ایل۔ ڈین کا مقابلہ کر سکے' جارج اس وقت نیا نیا ابھر رہا تھا' اس میں جرأت بھی تھی اور آگے بڑھنے کی خواہش بھی چنانچہ ولسن نے جارج کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا' جارج ایل۔ ڈین کے سامنے ڈٹ گیا جس کے بعد جارج ایل۔ ڈین کے ٹھکانوں کا اندازہ لگاتا اور ولسن جارج کی آڑ میں ان ٹھکانوں پر حملہ کر دیتا' ان حملوں میں ایل۔ ڈین کے بے شمار ساتھی مارے گئے اور اس کے زیادہ تر ٹھکانے اس کے ہاتھ سے نکل گئے حتیٰ کہ وہ جنگلوں میں پناہ گزین ہو گیا' ولسن نے اس کے ہیڈ کوارٹر پر اپنا ایجنٹ بٹھا دیا' جارج اس کامیابی پر پھولے نہیں سماتا تھا' اس کا خیال تھا اب ولسن اسے اپنی ریاست کا جنوبی حصہ دے دے گا' ایک دن ولسن نے جارج کو اپنے فارم ہاؤس پر بلایا' جارج نے اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھا' یہاں سے کہانی کا کلائمیکس شروع ہوتا ہے۔

ولسن نے ڈبل بیرل بندوق اٹھائی' جارج کو ساتھ لیا اور اپنے فارم ہاؤس کی سیر کیلئے نکل کھڑا ہوا' سامنے ولسن کا عزیز ترین کتا کھڑا تھا' کتے نے ولسن کو دیکھا تو وہ اس کے قدموں میں

لوٹنے لگا' ولسن نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا' اسے پیار کیا' چند قدم پیچھے ہٹا' کندھے سے بندوق اتاری' کتے کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی' کتے کے چیتھڑے اڑ گئے' جارج یہ منظر دیکھ کر سہم گیا' ولسن مسکرا کر بولا "یہ میرا عزیز ترین کتا تھا لیکن افسوس اس کے دانت کمزور ہو گئے تھے یہ اب شکار کو پوری طرح دبوچ نہ سکتا تھا' بٹ آئی لائیک یو سوچ" اس کے بعد ولسن نے جارج کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آگے چل پڑا' سامنے اس کا قیمتی ترین گھوڑا کھڑا تھا' ولسن نے اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا' اسے تھپکی دی' چند قدم پیچھے ہٹا اور گھوڑے کو بھی گولی مار دی' جارج کے ماتھے پر پسینہ آ گیا' ولسن نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا "پورے امریکہ میں اس جیسا کوئی گھوڑا نہیں تھا لیکن افسوس اب اس کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا' بٹ آئی لائیک یو سوچ" ولسن نے جارج کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا' سامنے اس کی پسندیدہ گاڑی کھڑی تھی' اس نے گاڑی کی طرف پیار سے دیکھا' ڈکی سے پٹرول کا کین نکالا' گاڑی پر پٹرول چھڑکا' چند قدم پیچھے ہٹا اور گاڑی پر فائر کر دیا' ایک شعلہ سا لپکا اور گاڑی کو آگ لگ گئی' جارج کے چھکے چھوٹ گئے' ولسن اس کی طرف مڑا' قہقہہ لگایا' یہ میری سب سے عزیز گاڑی تھی لیکن اب چلتے ہوئے جھٹکے کھاتی تھی' بٹ آئی لائیک یو سوچ" ولسن آگے چل پڑا' جارج اس کے پیچھے چلنے لگا' سامنے زعفران کا کھیت تھا' ولسن کھیت کے پاس پہنچا' کھیت کو چند لمحے پیار سے دیکھا' پٹرول کا کین اٹھایا' کھیت کے چاروں طرف پٹرول چھڑکا اور پٹرول پر دیا سلائی پھینک دی' پورا کھیت جل کر راکھ ہو گیا' ولسن نے قہقہہ لگایا' "یہ میرے فارم کا سب سے قیمتی کھیت تھا' پچھلے سال میں نے اس سے دو من زعفران حاصل کی تھی لیکن اس سال اس نے صرف ڈیڑھ من فصل دی' میں کارکردگی میں کمی برداشت نہیں کر سکتا' بٹ آئی لائیک یو سوچ" ولسن تھک کر گھاس پر بیٹھ گیا' اس نے بندوق میں ہاتھی مارنے والا بڑا کارتوس بھرا اور جارج کی طرف دیکھ کر بولا "تم نے وعدہ کیا تھا تم اپریل تک ایل۔ڈی ین کو پکڑ لو گے' ذرا حساب لگا کر بتاؤ اپریل میں کتنے دن باقی ہیں" جارج کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا' اس نے جیب سے رومال نکالا' ماتھے پر پھیرا اور لرزتی آواز میں بولا "مائی لارڈ آئی ایم ٹرائینگ' بٹ ہی از سو کلیور" ولسن نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا' اس کے کندھے پر تھپکی دی اور مسکرا کر بولا "ڈونٹ وری' آئی لائیک یو سوچ" اس کے بعد بڑی دیر تک وہاں سناٹا رہا' جارج نے ڈرتے ڈرتے ولسن سے پوچھا "سے آئی گو ناؤ سر" ولسن نے مسکرا کر ہاں میں گردن ہلا دی' جارج اٹھا' سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا' ولسن اسے بڑے پیار سے دیکھتا رہا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا "لیس آئی

لائیک ہم سوچ' آئی لائیک ہم سوچ بٹ...... میں اپنی فطرت سے بہت تنگ ہوں' کام ختم ہونے کے بعد مجھے اپنے دوستوں سے نفرت ہو جاتی ہے' مجھے لوگ اچھے نہیں لگتے'' یہاں پہنچ کر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

یہ ایک عام سی کہانی تھی' دنیا بھر کے ڈائجسٹوں میں روزانہ ایسی بے شمار کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں چند دنوں سے مجھے یہ کہانی بہت یاد آ رہی ہے اور میں ولسن کو اپنے سامنے چلتا پھرتا' باتیں کرتا' قہقہے لگاتا اور بندوق میں کارتوس بھرتا ہوا دیکھتا ہوں' مجھے ولسن کے فارم ہاؤس کے تمام مناظر یاد آتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کیا دنیا میں واقعی ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک دوستی ایک شارٹ ٹرم تعلق ہوتا ہے' جن کی دوستیاں صرف ایک ٹاسک تک محدود ہوتی ہیں' جو صرف پراجیکٹ ٹو پراجیکٹ تعلق رکھتے ہیں' مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا' میں پھر سوچتا ہوں بعض اوقات ہمیں یونہی بیٹھے بیٹھے کوئی کہانی یاد آ جاتی ہے اور اس کہانی کے تمام کردار ہمارے ذہن سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور ہم لوگ پوری کوشش کے باوجود اس کہانی اور اس کہانی کے کرداروں سے جان نہیں چھڑا پاتے' لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہیں امریکہ اور پاکستان کا تعلق بھی ولسن اور جارج جیسا نہ ہو' کہیں صدر بش ولسن اور صدر پرویز مشرف ولسن اور صدر پرویز مشرف جارج نہ ہو' میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میں فوراً انکار میں سر ہلاتا ہوں اور اپنے آپ کو یقین دلاتا ہوں' کہانیاں محض کہانیاں ہوتی ہیں' ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

# معمول کی کارروائی

جان سمتھ کا تعلق برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو سے تھا' وہ امریکہ سے چھوٹی شوگر ملیں

درآمد کرتا تھا اس کا شمار برازیل کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا اور وہ ہر ہفتے امریکہ آتا تھا' اکتوبر 2001ء میں وہ نیویارک ایئرپورٹ پر اترا تو اس نے وہاں عجیب صورت حال دیکھی' اس نے دیکھا امیگریشن کے کاؤنٹرز کے سامنے طویل قطار لگی ہے اور جو بھی مسافر امیگریشن افسر کے پاس پہنچتا ہے' وہ اپنی ٹائی' ٹوپی' جوتے اور پرس نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد سکیورٹی کے دو اہلکار بڑی باریک بینی سے اس کی تلاشی لیتے ہیں' جان سمتھ کیلئے یہ صورت حال حیران کن تھی' وہ پچھلے 20 برس سے امریکہ آ رہا تھا اور اس نے کبھی یہ منظر نہیں دیکھا تھا' جب اس کی باری آئی تو امیگریشن افسر نے اسے بھی جوتے اتارنے کا حکم دیا' اس نے یہ آرڈر ماننے سے انکار کر دیا' امیگریشن افسر نے اس کا پاسپورٹ لیا اور اس پر ڈی پورٹ کی مہر لگا دی' جان سمتھ اگلی فلائٹ سے واپس برازیل چلا گیا' اس نے ریوڈی جنیرو جاتے ہی پریس کانفرنس بلائی اور صحافیوں کو یہ سارا قصہ سنا دیا' پریس نے اگلے دن طوفان برپا کر دیا' حکومت نے امریکی سفیر کو طلب کر لیا لیکن امریکی حکومت نے اسے ''معمول کی کارروائی'' قرار دے دیا' برازیلی حکومت نے یہ معاملہ پارلیمنٹ میں بھیج دیا' پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا آج سے جو بھی امریکی برازیل کی سرزمین پر قدم رکھے گا اس کی تفصیلی تلاشی ہو گی' اگلے دن اس قانون پر عملدرآمد شروع ہو گیا' امریکی حکومت

نے اسے ڈس کریمنیشن قرار دیا اور اس پر شدید احتجاج کیا' برازیل حکومت نے اس کا بڑا خوبصورت جواب دیا' اس نے کہا "یہ ہماری معمول کی کارروائی ہے" لہٰذا 2002ء سے 2006ء تک برازیل دنیا کا واحد ملک تھا جس کے ایئرپورٹس پر صرف ایک ملک کے شہریوں کی تلاشی ہوتی تھی اور وہ ملک تھا امریکہ۔

معمول کی کارروائی کا دوسرا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ بھارت کے سابق وزیر دفاع جارج فرنانڈس 2002ء میں امریکہ کے سرکاری دورے پر گئے تھے' ڈیلاس ایئرپورٹ پر ان کی دھوتی اور کرتے کی تلاشی ہوئی' انہوں نے تلاشی دی اور اپنا دورہ منسوخ کر کے بھارت واپس آ گئے' بھارت نے اس معاملے پر بھی امریکہ سے کسی قسم کا کوئی احتجاج نہ کیا' 2003ء میں فرنانڈس برازیل کے دورے پر گئے' ان کی فلائٹ امریکہ سے ہو کر برازیل جاتی تھی' راستے میں وہ ڈیلاس ایئرپورٹ پر اترے تو ایک بار پھر ان کی تلاشی ہوئی' بھارتی حکومت اس بار بھی خاموش رہی' بھارت نے اس معاملے پر امریکہ سے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا' بھارت میں حکومت بدل گئی' بی جے پی کی جگہ کانگریس نے لے لی من موہن سنگھ وزیراعظم بن گئے' جولائی 2004ء میں امریکہ کے ڈپٹی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج سرکاری دورے پر بھارت آئے' وہ جوں ہی دہلی کے ایئرپورٹ پر اترے بھارتی حکومت نے ان کی تلاشی کا حکم جاری کر دیا' امریکہ کے سفارتی عملے کے لئے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی' امریکی ایمبیسی نے اعتراض کیا تو بھارت نے اس وقت اپنے سابق وزیر دفاع کے ساتھ ہونے والے سلوک پر سرکاری احتجاج کیا' یہ احتجاج اس قدر شدید اور قطعی تھا کہ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ نے نہ صرف دہلی ایئرپورٹ پر بھارتی حکومت سے معافی مانگی بلکہ وہ معافی مانگنے کیلئے بی جے پی کے لیڈر ایل کے ایڈوانی کی رہائش گاہ پر بھی گئے۔



ہم اگر بھارت اور برازیل کی سیاسی اور سفارتی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا ان دونوں ممالک کا امریکہ کے ساتھ کوئی دیرینہ تعلق نہیں تھا' بھارت 1990ء تک نہ صرف امریکہ کا مخالف رہا تھا بلکہ وہ اس کے حریف سوویت یونین کا گہرا دوست بھی تھا اسی طرح برازیل دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے اور اس نے آج تک کسی عالمی مسئلے پر امریکہ کی حمایت نہیں کی جبکہ ان دونوں ممالک کے مقابلے میں پاکستان کا شمار امریکہ کے پرانے دوستوں میں ہوتا ہے' ہم لوگ امریکہ کی دوستی میں وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں سے خودکشی کی حدود شروع ہوتی ہیں' آپ افغانستان کے دونوں جہاد دیکھ لیجئے' 1980ء میں ہم دنیا کی واحد قوم تھے جو امریکی مفادات کے

لئے افغانستان میں سوویت یونین سے دست و گریبان تھے 2002ء میں بھی ہم نے امریکہ کے دہکائے تنور میں چھلانگ لگا دی تھی' ہم اس وقت پوری دنیا میں دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے سب سے بڑے حلیف ہیں لیکن اس کے باوجود 2006ء میں جب ہمارے وزیراعظم وائٹ ہاؤس کی دعوت پر امریکہ گئے تو سرکاری وفد میں شامل وزراء کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جس کا تصور تک محال ہے' ہمارے وزراء کو قطار میں کھڑا کر کے ان کی تلاشی لی گئی' ان کے جوتے اتروائے گئے' ان کی ٹائیاں کھولی گئیں اور ان کی ٹوپیاں جھاڑی گئیں' میں نے جب ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا اور میں نے خود سے پوچھا "کیا امریکہ میں بھارت اور اسرائیل کے وزراء کے ساتھ بھی یہ سلوک ہوتا ہے"؟ میرا جواب نفی میں تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 2005ء میں امریکہ نے "معمول کی اس کارروائی" کا سٹائل تبدیل کر دیا تھا' امریکی حکومت اب سرکاری دورے پر آنے والے وزراء' وزرائے اعظم اور ان کے وفد میں شامل لوگوں کی تلاشی نہیں لیتی ہاں البتہ وہ وزراء اور وہ سینئر حکام جو نجی دوروں پر امریکہ آتے ہیں انہیں معمول کی اس کارروائی سے گزرنا پڑتا ہے لیکن جب پاکستان جیسے عزیز ترین دوست کی باری آتی ہے تو امریکہ اپنے ایئرپورٹس پر 2002ء کے قوانین نافذ کر دیتا ہے وہ پاکستان کے سرکاری وفد کو مشکوک اور سکیورٹی تھرٹ سمجھنا شروع کر دیتا ہے' آپ ایک اور دلچسپ امر بھی ملاحظہ کیجئے جب اخبارات میں اس سلوک پر خبریں شائع ہوئیں اور ایک ٹیلی ویژن چینل نے اس سلوک کی فلم دکھا دی تو امریکی حکومت تو اس پر خاموش رہی لیکن ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز' ہمارے وزیر داخلہ آفتاب احمد شیرپاؤ اور امریکہ میں پاکستان کے سفیر جنرل جہانگیر کرامت نے اسے معمول کی کارروائی قرار دے دیا' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے' اگر یہ معمولی واقعہ ہے تو خاص واقعہ کیا ہوگا؟ خاص کارروائی اور خاص سلوک کیا ہوگا؟

ہم اگر پچھلے پانچ سال کے واقعات جمع کریں تو معلوم ہوتا ہے امریکہ اور یورپ میں ہمارے وزراء اور اعلیٰ سیاستدانوں کی توہین معمول بن چکی ہے' پچھلے سال صدر کے دورے کے دوران جناب خورشید محمود قصوری کی نہ صرف خوفناک تلاشی ہوئی تھی بلکہ ان کا سامان تک ایئرپورٹ پر روک لیا گیا تھا اور لوگوں نے انہیں پاکستان کے سفارتی عملے پر برستے اور یہ کہتے سنا تھا "میں کل کون سے کپڑے پہنوں گا" اسی طرح آئی ایس پی آر کے سابق ڈی جی' صدر کے پریس سیکرٹری اور سرکاری ترجمان میجر جنرل راشد قریشی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا' امریکی

سفارتخانہ اکثر ہمارے سیاستدانوں کے ویزے مسترد کرتا رہتا ہے اپریل 2005ء میں پاکستان کا ایک 8 رکنی سرکاری وفد یورپی یونین کے دورے پر گیا تھا' جب یہ وفد برسلز پہنچا تھا تو بیلجیئم حکام نے وفد میں شامل بزرگ سیاستدان مولانا سمیع الحق کو انٹری دینے سے انکار کر دیا تھا' یہ ایشو بعد ازاں پوری دنیا میں مشہور ہوا اور نیل کے ساحلوں سے لے کر تا بخاک کاشغر ہماری سبکی اور بے عزتی ہوئی' مولانا سمیع الحق نے لندن کے ذریعے واپس آنا تھا' جب وہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر پہنچے تو سیکیورٹی اہلکاروں نے وہاں بھی سوا گھنٹہ ان کی تلاشی لی تھی۔ اپریل 2005ء ہی میں بلوچستان کے وزیر بلدیات حافظ حسین احمد شرودی کو مانچسٹر ایئرپورٹ پر روکا گیا تھا اور چار گھنٹے تک ان کی تلاشی لی گئی تھی لیکن یہ ہمارا کمال ہے ہم نے معمول کی ان تمام کارروائیوں پر آج تک سرکاری سطح پر احتجاج کیا اور نہ ہی کوئی ایسی پالیسی بنائی جس کے ذریعے ایسے واقعات کا تدارک ہو سکے یہ حقائق بتاتے ہیں اگر ہم نے قومی سطح پر کوئی پالیسی نہ بنائی تو معمول کی یہ کارروائیاں آگے چلتی رہیں گی اور ہم لوگ اسی طرح ایئرپورٹوں پر بے عزت ہوتے رہیں گے' حکومت کو چاہیے وہ پاکستان میں موجود امریکہ اور یورپ کے سفیروں کو بلوائے اور انہیں دوٹوک الفاظ میں کہہ دے اگر ہمارے ساتھ آئندہ "معمول کی کارروائی" ہوئی تو ہم نہ صرف اپنے دورے منسوخ کر دیں گے بلکہ آپ سے سفارتی تعلقات بھی منقطع کر دیں گے' اگر یہ ممکن نہیں تو ہم کم از کم پاکستان میں بھی یہ "معمول کی کارروائی" شروع کر دیں' ہم آج سے یہ قانون بنا دیں ہمارے ایئرپورٹوں پر جو بھی امریکی یا یورپی باشندہ اترے گا ہم اس کی جامہ تلاشی لیں گے خواہ وہ رچرڈ آرمیٹج ہو یا کونڈولیزا رائس' خدا کی پناہ ہمارا سرکاری وفد امریکہ جاتا ہے تو ان کے جوتے' ٹوپی اور کوٹ تک اتروا کر تلاشی لی جاتی ہے جبکہ سمندر پار آباد گوروں کا ویٹر بھی پاکستان آتا ہے تو اسے ریسیو کرنے کیلئے سرخ نمبر پلیٹ کی گاڑی رن وے پر پہنچ جاتی ہے' کیوں؟ اس کیوں کا جواب ایک امریکی کہاوت میں چھپا ہے' امریکی محاورہ ہے جس لنگڑے کی چونچ نہیں ہوتی بچے اس کے گلے میں رسی باندھ دیتے ہیں' میرا خیال ہے وہ وقت آ چکا ہے جب ہمیں اپنی چونچ باہر نکال لینی چاہیے' اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو امریکی بچے ہمارے گلے میں رسی باندھیں گے اور ہمیں گلی گلی گھسیٹنا شروع کر دیں گے۔

# اپنے بچے



یہ 2001ء کی بات ہے' ابھی امریکہ میں نائن الیون کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا' عبدالرزاق داؤد پاکستان میں انڈسٹری اینڈ کامرس کے وفاقی وزیر تھے' عبدالرزاق داؤد نے جاپان کے چند بڑے سرمایہ کاروں کو پاکستان کے دورے کی دعوت دی' سرمایہ کار پاکستان آئے تو حکومت نے انھیں کوئٹہ' کراچی' لاہور' فیصل آباد' سیالکوٹ اور اسلام آباد کا دورہ کرایا' وزٹ کے آخری مرحلے پر وفد کی وفاقی سیکرٹریوں' سرکاری اداروں کے چیئرمینوں' ڈائریکٹر جنرلوں اور وزراء کے ساتھ ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ ملاقات کا اہتمام پلاننگ کمیشن میں کیا گیا تھا' اس میٹنگ میں عبدالرزاق داؤد' ان کے ساتھی وزراء اور اعلیٰ سول افسروں نے جاپانی وفد کو پاکستان کے بارے میں بریفنگ دی' پاکستانی حکام کا کہنا تھا پاکستان جغرافیائی لحاظ سے بڑا آئیڈیل ملک ہے' یہ ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے' اس میں کم معاوضے پر ہنرمند دستیاب ہیں' یہاں کے لوگ محنتی ہیں اور اس ملک میں چاروں موسم پائے جاتے ہیں لہٰذا پاکستان سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک آئیڈیل ملک ہے' جاپانی وفد بڑے غور سے یہ باتیں سنتا رہا' جب پاکستانی حکام اپنی تعریفیں کر کے تھک گئے تو جاپانی وفد کا لیڈر کھڑا ہوا' اس نے اپنے ساتھیوں سے اجازت لی اور پاکستانی

حکومت کی مہمان نوازی‘ محبت اور حسن سلوک کی تعریف کے بعد بولا’ میں آپ لوگوں سے صرف دو سوال پوچھنا چاہتا ہوں‘ اگر آپ نے ان سوالوں کا جواب ہاں میں دے دیا تو ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں ہم پاکستان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کریں گے‘ پاکستانی زعماء ہمہ تن گوش ہو گئے‘ جاپانی سرمایہ کار نے پوچھا’’ آپ لوگ ایمانداری سے بتایئے کیا پاکستانی سرمایہ کار اپنا سرمایہ پاکستان میں لگا رہے ہیں؟‘‘ میٹنگ روم میں خاموشی چھا گئی‘ جاپانی سرمایہ کار نے مسکرا کر حاضرین کی طرف دیکھا اور اس کے بعد بولا’’ آپ کی خاموشی بتاتی ہے آپ کا جواب ناں میں ہے‘ ہم لوگ جانتے ہیں پاکستان کے بے شمار سرمایہ کار‘ صنعت کار اور تاجر دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں‘ میں اب دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں‘ جاپانی سرمایہ کار ایک لمحے کیلئے رکا اور اس کے بعد اس نے دوسرا سوال پوچھا’’ کیا اوورسیز پاکستانی اپنا سرمایہ پاکستان میں لگا رہے ہیں‘‘ اس سوال پر بھی ہال میں خاموشی رہی‘ جاپانی سرمایہ کار مسکرایا اور نرم آواز میں بولا ’’حاضرین دنیا میں سرمایہ کاری کے دو لٹمس ٹیسٹ ہوتے ہیں‘ سرمایہ کار جب بھی کسی ملک میں سرمایہ کاری کا سوچتے ہیں تو وہ سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں اس ملک کے سرمایہ کار اپنے ملک پر کس حد تک اعتبار کرتے ہیں‘ اگر انہیں معلوم ہو اس ملک کے سرمایہ کار اپنا سرمایہ ملک سے باہر لے جا رہے ہیں تو وہ اس ملک میں کبھی سرمایہ کاری نہیں کرتے‘ اس کے بعد وہ یہ دیکھتے ہیں۔ کیا اس ملک کے اوورسیز شہری اپنا سرمایہ لے کر اپنے ملک واپس آ رہے ہیں‘ اگر انہیں معلوم ہو اوورسیز شہریوں کی زیادہ تر تعداد واپس آ رہی ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے اس ملک میں سرمایہ لگا دیتے ہیں‘‘ جاپانی سرمایہ کار نے کہا’’ اس میں کوئی شک نہیں پاکستان سرمایہ کاری کے لحاظ سے ایک آئیڈیل ملک ہے‘ ہمیں اس کے موسم‘ زمین اور لوگ بھی اچھے لگتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے جس ملک پر اس ملک کے اپنے سرمایہ کار اعتماد نہیں کر رہے‘ اس ملک پر ہم غیر ملکی سرمایہ کار کیوں اعتبار کریں گے۔‘‘

جاپانی سرمایہ کار کی بات ضرور تلخ تھی لیکن یہ بات سچ تھی‘ دنیا میں پرندے اور سرمایہ کار صرف ان ٹہنیوں پر گھونسلے بناتے ہیں جن پر ان کی جان‘ انڈے اور گھونسلے محفوظ ہوتے ہیں‘ یہ جن ملکوں کے معاشی حالات خراب ہوں‘ جن میں قانون کمزور اور لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال غیر تسلی بخش ہو ان ملکوں سے سب سے پہلے سرمایہ کار بھاگتے ہیں‘ اٹلی میں میرے ایک دوست طارق بھٹی رہتے ہیں‘ وہ ٹیلی کمیونیکیشن کی صنعت سے وابستہ ہیں‘ ان کا شمار یورپ کے چند بڑے پاکستانی

سرمایہ کاروں میں ہوتا ہے' انہوں نے ایک بار مجھے کہا تھا "حکومت کو سمجھائیں کوئی امریکی' یورپی' جاپانی اور چینی سرمایہ کار پاکستان نہیں آئے گا' ان سرمایہ کاروں کو میکسیکو سے لے کر دبئی تک دنیا جو سروسز آفر کر رہی ہے پاکستان کبھی انہیں یہ سروسز فراہم نہیں کر سکتا' یہ لوگ یورپ جیسا لبرل ماحول چاہتے ہیں' انہیں شراب خانے' جوا خانے' ڈسکو کلب اور نیچرز چاہئیں' یہ ٹیکس فری سسٹم اور سرمایہ کاری کا دوستانہ ماحول چاہتے ہیں جبکہ ہمارا معاشرہ' ہماری روایات اور ہماری ثقافت ان لوگوں کی توقعات سے قطعاً مختلف ہے' ہم لوگ ان کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکتے لہٰذا یہ لوگ کبھی پاکستان میں چین' دبئی' ہانگ کانگ' تھائی لینڈ اور میکسیکو جتنی سرمایہ کاری نہیں کریں گے چنانچہ پاکستان کے پاس صرف اوورسیز پاکستانیوں کا آپشن رہ جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایسے بے شمار پاکستانی ہیں جو انتہائی خوشحال ہیں' جو یورپ' امریکہ اور مشرق بعید میں بڑی بڑی کمپنیاں چلا رہے ہیں' یہ لوگ پاکستان بھی آنا چاہتے ہیں' اگر حکومت ان پاکستانیوں کو بہتر ماحول' تحفظ اور اچھا نظام دے تو یہ لوگ پاکستان میں اربوں ڈالر لگا دیں گے' یہ پاکستان کا مقدر بدل دیں گے"

میں نے ان سے پوچھا تھا "حکومت کو اوورسیز پاکستانیوں کا اعتماد بحال کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے" طارق بھٹی نے جواب دیا "یہ لوگ حکومت کی ذرا سی سپورٹ' ذرا سی توجہ اور ذرا سی سپیڈ چاہتے ہیں' ہم لوگ جب دو' تین لاکھ ڈالر لے کر دنیا کے کسی ملک میں جاتے ہیں تو وہاں کی حکومت ہمیں ریڈ کارپٹ استقبال دیتی ہیں لیکن جب ہم لوگ اپنے ملک میں اربوں ڈالر لے کر آتے ہیں تو ایئرپورٹ سے لے کر گھر تک لٹیرے ہمارا پیچھا کرتے ہیں' ہم کسی سرکاری دفتر جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے' عدالتیں ہماری آواز نہیں سنتیں اور حکومت ہمارے ساتھ ہاتھ نہیں ملاتی' آپ حد ملاحظہ کیجئے جب ہماری کمپنیوں کا کوئی گورا ملازم پاکستان جاتا ہے تو اس کے لئے نیچے سے لے کر اوپر تک سارے دروازے کھل جاتے ہیں' اسے سرکاری سطح پر تحفے تک ملتے ہیں لیکن جب ہم لوگ چیک بکس کے بریف کیس لے کر پاکستان آتے ہیں تو ہمیں تھانے کا ایس ایچ او تک ملنے کیلئے تیار نہیں ہوتا' ہم رجسٹریشن اور لائسنس کیلئے اپلائی کرتے ہیں تو دس دس سال تک ہمیں جواب نہیں ملتا' ہم زمین خرید لیتے ہیں تو اس پر حق شفہ ہو جاتا ہے' بینک ہمارے اکاؤنٹس نہیں کھولتے' ہمیں بجلی' گیس' سڑک اور پانی کیلئے کروڑوں روپے رشوت دینا پڑتی ہے اور ہم لوگ گارڈز کے بغیر باہر نہیں نکل سکتے' اسی طرح اگر خدانخواستہ ہم فیکٹری لگا بیٹھیں تو 60 قسم کے محکمے ہمارے پیچھے لگ جاتے ہیں' ہر شخص ہم سے پیسے مانگتا ہے'

ہمیں ناظم سے لے کر چیف منسٹر تک سب کو خوش رکھنا پڑتا ہے اور ہم لوگ اگر پورا ٹیکس دے دیں تو مجرم ہیں' نہ دیں تو بھی مجرم ہیں لہٰذا پھر ہم سوچتے ہیں جب ہمارے ملک کو ہماری ضرورت نہیں تو ہمیں اس دھول' اس خاک اور اس حقارت میں زندگی گزارنے کی کیا ضرورت ہے' ہم کیوں نہ اس معاشرے' اس ملک میں رہیں جہاں ہمارا پیسہ اور ہم دونوں محفوظ ہیں۔

میں نے طارق بھٹی سے اتفاق کیا' میرے ایک دوسرے دوست بیرسٹر انور پرویز نے برطانیہ سے آٹھ سو ملین پاؤنڈ لا کر پاکستان میں سرمایہ کاری کی تھی' وہ جب بھی پاکستان آتے ہیں تو انہیں شدید مایوسی ہوتی ہے' ان کا کہنا ہے انہوں نے جتنے مسائل پچھلے چند برسوں میں دیکھے ہیں اتنے انہوں نے چالیس برس میں مجموعی طور پر نہیں دیکھے' ان کی بات درست ہے یہ عام مشاہدہ ہے پاکستان میں جو بھی اوورسیز پاکستانی سرمایہ لے کر آتا ہے وہ لٹ لٹا کر واپس جاتا ہے اور اس کے بعد واپس آنے کا نام نہیں لیتا' بے شمار پاکستانی اس ملک آ کر جان تک سے ہاتھ دھو بیٹھے لہٰذا آج ہمارے اوورسیز پاکستانی ہمارے نظام پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں' یہ عجیب بات ہے ہم پوری دنیا کو سرمایہ کاری کی دعوت دیتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کے پاس سرمایہ بھی ہے اور جو پاکستان میں سرمایہ کاری بھی کرنا چاہتے ہیں ہم انہیں لفٹ تک نہیں کراتے' ہم انہیں دعوت اور ماحول فراہم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں' ہم نے پچھلے پانچ برسوں میں بے شمار سرکاری اداروں کی نج کاری کی' ہم نے یہ ادارے کوڑیوں کے مول غیر ملکیوں کو بیچ دیئے' ہم اگر یہ یونٹس اوورسیز پاکستانیوں کو دے دیتے تو ذرا سوچئے ان لوگوں کا کس قدر اعتماد بحال ہوتا۔ یہ لوگ اس ملک پر کتنا اعتبار کرتے اور ان کا یہ اعتبار آگے چل کر باہر سے کتنا سرمایہ لاتا۔



صدر پرویز مشرف نے 17 اپریل 2006ء کو کراچی میں "پاک امریکن بزنس کونسل" کی ایک کانفرنس سے خطاب کیا تھا' اس خطاب میں بھی صدر نے امریکہ میں آباد پاکستانیوں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی دعوت دی' صدر نے فرمایا ہم آپ لوگوں کو سرمایہ کاری کے لئے سازگار ماحول اور تحفظ فراہم کریں گے' ہو سکتا ہے صدر اس معاملے میں نیک نیت ہوں لیکن جب ہم اپنے نظام کا تجزیہ کرتے ہیں تو بڑے دکھ سے کہنا پڑتا ہے پاکستان دنیا میں سرمایہ کاری کے حوالے سے ایک انتہائی ناموافق اور غیر محفوظ ملک ہے اور سرمایہ کار صرف لاروں' لپوں پر کسی ملک میں سرمایہ کاری نہیں کیا کرتے' انہیں مضبوط اور عملی یقین دہانیاں چاہیے ہوتی ہیں' یہ لوگ تو اس قدر سمجھدار ہوتے ہیں کہ یہ اس بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھولتے جس کے گارڈز کا قد چھ فٹ سے کم

ہو اور یہ اس گاڑی میں نہیں بیٹھتے جس کے ٹائروں میں ہوا 28 مکعب فٹ سے کم ہو لہٰذا ہمیں ان کا اعتماد بحال کرنے کے لئے اوورسیز پاکستانیوں کا سہارا لینا پڑے گا' ہمیں ان لوگوں کو ملک کی ترقی کیلئے پاکستان آنے کی دعوت دینا پڑے گی جو ہمارے اپنے لوگ ہیں' جو اپنے ملک واپس آنا چاہتے ہیں' پنجابی کی کہاوت ہے جو ماں اپنے بچے سے پیار نہیں کرتی وہ دوسروں کے بچوں سے کیا محبت کرے گی' ہمارے اپنے بچے ہماری محبت کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ ہمیں حق دینے کا سلسلہ اپنے بچوں سے شروع کرنا چاہیے' ہمیں پاکستان کی ترقی کا عمل پاکستانیوں سے شروع کرنا چاہیے۔

O......O......O

# پہلا پڑاؤ

میرے ایک دوست ایمسٹرڈیم میں رہتے ہیں' وہ آج سے 20 برس پہلے ہالینڈ گئے' شہریت لی اور بیوی بچوں کو بھی وہاں بلا لیا' ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وہیں پیدا ہوئے' وہیں پڑھے اور وہیں جوان ہوئے' میرے یہ دوست سال میں ایک مہینے کیلئے پاکستان آتے ہیں' ان کے بچے بھی عموماً ان کے ساتھ ہوتے ہیں' وہ پچھلے مہینے تشریف لائے تو میری ان سے طویل گپ شپ ہوئی' ان کا کہنا تھا مجھے پاکستان چھوڑے بیس سال ہو چکے ہیں' اس عرصے میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میں نے پاکستان کو یاد نہ کیا ہو' میں نے ان سے عرض کیا ''آپ پھر پاکستان کیوں نہیں آ جاتے'' انہوں نے میرے سوال کا بڑا عجیب جواب دیا' انہوں نے فرمایا ''میں نے کئی بار سوچا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ جاتا ہوں' میری دو جوان بچیاں ہیں' میں پاکستان میں ان کی حفاظت کیسے کروں گا'' میرے لئے ان کی یہ منطق انوکھی تھی کیونکہ میں نے تو یہ دیکھا تھا ہمارے اکثر تارکین وطن اپنے بچوں بالخصوص بچیوں کیلئے کروڑوں ڈالر کا کاروبار چھوڑ کر امریکہ اور یورپ سے پاکستان آ جاتے ہیں لیکن وہ ایک مختلف کہانی' مختلف دلیل پیش کر رہے تھے۔

میں نے وضاحت کی درخواست کی' میرے دوست بولے ''ہالینڈ میں میری بچیاں آزادانہ پھرتی ہیں' وہ رات کو دو دو بجے ٹرینوں اور بسوں پر سفر کرتی ہیں' سنسان گلیوں اور ویران سڑکوں پر چہل قدمی کرتی ہوئی گھر واپس آتی ہیں مگر ہمیں کوئی خوف نہیں ہوتا' ہم جانتے ہیں' اس

ملک میں کسی میں اتنی جرأت نہیں' وہ ان کی طرف تیز ہی آنکھ سے دیکھے' اس غیر اسلامی ملک میں ہماری بچیوں کی عزت آبرو اور ناسب کچھ محفوظ ہے جبکہ اس اسلامی ملک میں دن کی روشنی میں بھی اگر کسی بچی نے ہمسائے کے گھر جانا ہو تو اسے گلی میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے بھائی' والد یا خاوند کی ضرورت پڑتی ہے' ہم چار بھائی ہیں' ہم چاروں لاہور کی ایک ہی گلی میں رہتے ہیں' میں جب پاکستان آتا ہوں اور میری بچیوں نے اپنے چچا کے گھر جانا ہو تو میں انہیں چھوڑنے کیلئے ساتھ جاتا ہوں' میری بچیاں مجھ سے کہتی ہیں' پاپا ہم ایمسٹرڈیم میں روزانہ رات کو دو دو بجے آتی ہیں' آپ وہاں پریشان نہیں ہوتے لیکن اپنے ملک میں آپ ہمیں اکیلے دو سو گز دور نہیں جانے دیتے' میں انہیں کیا بتاؤں' ان کے اپنے وطن پاکستان میں ان کی عزت کتنی غیر محفوظ ہے'' ان کی بات سن کر مجھے ٹھنڈے پسینے آ گئے' میں نے خفت مٹانے کیلئے کہا'' پاکستان کی صورتحال اتنی بھی خراب نہیں یہاں.........'' انہوں نے میری بات کاٹ دی اور بڑے یقین سے بولے'' ہالینڈ میں آبرو ریزی کی آخری واردات 18 سال پہلے ہوئی تھی اس کے بعد اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی لیکن تم اپنے آج کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لو تمہیں اس میں آبرو ریزی' چھیڑ چھاڑ اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے بیسیوں واقعات ملیں گے' تم کل کی خبر پڑھ لو' کل لیاقت جمنیزیم میں موسیقی کا پروگرام ہو رہا تھا وہاں نوجوان لڑکوں نے لڑکیوں کا کیا حشر کیا' تم مجھے اس معاشرے میں واپس آنے کی دعوت دے رہے ہو جس میں برقعے والیاں محفوظ ہیں اور نہ ہی جینز والیاں اور جس میں بچیاں اکیلی سکول نہیں جا سکتیں' تم میرے ایک دوست کی مثال لو اس نے اپنی بیٹی کو کالج سے اٹھا لیا' میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا' میرے بیٹے نے جاب کر لی ہے اور میں بیمار رہنے لگا ہوں لہٰذا ہمارے لئے بچی کو کالج چھوڑنا ممکن نہیں رہا' میں نے کہا' تم اسے وین یا ٹیکسی لگوا دیتے' اس نے بتایا' بچی پہلے بھی وین پر ہی کالج جاتی تھی لیکن اسے چھوڑنے اور لینے کیلئے میرا بیٹا ساتھ جاتا تھا' اب ظاہر ہے یہ ممکن نہیں' ہم بچی کو اکیلے بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتے' وقت بہت خراب ہے چنانچہ تم جواب دو' جس ملک میں یہ صورتحال ہو تم مجھے وہاں آنے کی دعوت دے رہے ہو'' میرا دوست خاموش ہو گیا' میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پاکستان میں ایک طرف یہ صورتحال ہے جبکہ دوسری طرف ہم روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا راگ الاپ رہے ہیں' حکومت میراتھن کے بہانے بچیوں کو سڑکوں پر لانے کی کوشش کر رہی ہے اور مذہبی رہنما ڈنڈے کے زور میں انہیں واپس گھروں میں دھکیل رہے ہیں' پہلا فریق

دوسرے فریق کو اعتدال پسندی اور روشن خیالی کا مخالف قرار دے رہا ہے اور دوسرا فریق پہلے فریق کو فحاشی' عریانی اور بداخلاقی کا مجرم گردان رہا ہے جبکہ اصل مسئلے کی طرف پہلا فریق توجہ دے رہا ہے اور نہ ہی دوسرا' سوچنے کی بات ہے جس معاشرے میں عورت کی آبرو غیر محفوظ ہو' کیا وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے' میرا خیال ہے اسلامی تو رہا ایک طرف' وہ معاشرہ' معاشرہ نہیں کہلا سکتا' جس ملک میں مارکیٹ' بازار' سکول اور کالج میں' جس ملک میں بسوں' ویگنوں اور رکشوں میں بہو بیٹیوں کے آنچل کھینچے جاتے ہوں' جس ملک میں چھٹی کے وقت زنانہ کالجوں کے سامنے اوباش نوجوانوں کا جمگھٹا لگ جاتا ہو اور جس معاشرے میں ہر نگاہ دعوت دیتی اور ہر نظر گھورتی پائی جاتی ہو وہ معاشرہ اسلامی ہو سکتا ہے اور نہ ہی اعتدال پسند' جس معاشرے میں آج بھی کاروکاری' ونی اور عورتوں کی خرید و فروخت جاری ہو' جس میں مختار مائی کو انصاف کیلئے وزیراعظم کے دروازے پر دستک دینی پڑے اور جس معاشرے کی 95 فیصد گالیوں میں ماؤں بہنوں کا ذکر آتا ہو ہم اس معاشرے کو مہذب معاشرہ نہیں کہہ سکتے' تم یقین کرو روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی جنگوں میں تہذیب اور شائستگی پہلا پڑاؤ ہوتی ہے لیکن ہم لوگ اس پڑاؤ پر رکے بغیر یہ جنگ جیتنا چاہتے ہیں' ہم لوگ اپنی گلیوں' اپنے بازاروں میں تہذیب اور قانون نافذ کئے بغیر اپنی بچیوں کو گھروں سے باہر لانا چاہتے ہیں' ہم ایک بار پھر کیکر کے درختوں پر ململ سکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میرے اسی دوست نے مجھ سے پوچھا تھا ''تم میراتھن ریس کے حامی ہو یا مخالف'' میں نے جواب دیا'' میں حامی ہوں' میرا خیال ہے' یہ چیزیں حبس دم کے شکار اس معاشرے کا سینہ کھول دیں گی' لوگوں میں وسعت اور اعتدال آئے گا'' میرے دوست نے ہنس کر پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے' پاکستان کی روشن خیال اور اعتدال پسند قوتیں اپنی اس کوشش میں مخلص ہیں'' میں نے جواب دیا ''میرا خیال ہے یہ لوگ مخلص ہیں'' میرے دوست نے قہقہہ لگایا ''اگر یہ لوگ مخلص ہیں تو پھر ان لوگوں کی اپنی بچیاں میراتھن ریس میں کیوں نہیں آتیں' تم بتاؤ وہ پولیس جو ڈنڈے کے ذریعے ریس میں حائل رکاوٹیں دور کر رہی ہے' وہ انتظامیہ' وہ سیاستدان جو روشن خیالی کی حمایت میں بیان دے رہے ہیں' ان کی اپنی بچیاں گھروں میں کیوں بیٹھی ہیں''

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

# کاغذ کا گلاس

امریکہ میں کاغذ کا پہلا گلاس 1918ء میں بنا تھا' گلاس بنانے والی کمپنی کا کہنا تھا لوگوں کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا ہے لہذا ہمیں اب نئے حالات کو سامنے رکھ کر برتن بنانے چاہئیں' کمپنی کا کہنا تھا چند برسوں میں دھات اور شیشے کے گلاس ناپید ہو جائیں گے اور ان کی جگہ کاغذ کے یہ گلاس لے لیں گے' لوگوں نے شروع شروع میں اس تصور کو پسند نہ کیا لیکن 1925ء تک کاغذ کے یہ گلاس 1925ء تک ڈسپوزیبل کلچر میں تبدیل ہو گئے' گلاس کے بعد کاغذ کی پلیٹیں آئیں' ان پلیٹوں کیلئے پلاسٹک کے چمچ' چھریاں اور کانٹے بنے اور پھر اس ڈسپوزیبل کراکری کیلئے ''ٹیک اے وے'' ریستوران بن گئے' کھانے کی جگہ برگر' سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک کلچر آیا' بریک فاسٹ باکس' لنچ باکس اور ڈنر باکس بنے' آئس کریم کے کپ اور پانی کی ڈسپوزیبل بوتلیں' فروٹ کاک ٹیل' فش اینڈ چپس' سلاد پیک اور کافی کے ڈسپوزیبل مگ بنے' چپس کے لفافے' نمکو' بسکٹ اور کیک پیس کے پیکٹ بنے' مٹھائیوں اور سویٹ ڈشز کے پیالے بنے اور مشروبات کی ڈسپوزیبل بوتلیں بنیں' یہاں تک کہ امریکہ کا پورا باورچی خانہ فٹ پاتھ اور سڑک پر آ گیا' لوگ دفتر جاتے ہوئے راستے میں رکتے' کسی سٹور سے ناشتے کے چند پیکٹ خریدتے اور بس' ٹیکسی یا ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ناشتہ شروع کر لیتے' لنچ کے وقت لوگ دفتروں سے نکلتے' قریب ترین سٹور سے چند پیکٹ اٹھاتے اور کھڑے کھڑے لنچ کر لیتے' اسی طرح ڈنر کے وقت ''ڈنر باکس'' لیتے

اور بس سٹاپ پر بس کا انتظار کرتے کرتے اس ضرورت سے بھی فارغ ہو جاتے۔

کھانا انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا' ایک عام شخص روزانہ تین سے چار گھنٹے کھانے پر صرف کرتا ہے' اگر آپ اس میں سبزی کی خریداری' صفائی' کٹائی اور پکائی بھی شامل کر لیں تو یہ دورانیہ مزید بڑھ جاتا ہے' جب امریکہ نے کھانے کے عمل کو ڈسپوزیبل شکل دی تو امریکی معاشرے کی زندگی آسان ہوگئی' لوگوں کیلئے کھانے کا حصول اور کھانا' کھانا مشکل نہ رہا' بس آپ کی جیب میں ڈالر ہونے چاہئیں اور آپ کسی بھی جگہ رکیں اور بریک فاسٹ' لنچ اور ڈنر کے مسئلے سے فارغ ہو جائیں' کھانے کے بعد یہ ڈسپوزیبل کلچر آگے بڑھا' اب شیو اور میک اپ اس کا دوسرا ٹارگٹ تھا' مردوں کیلئے شیونگ کا ایسا سامان تیار ہوا جسے وہ تھیلے میں رکھتے' بس اور ٹرین میں بیٹھتے' اپنے منہ پر گیلا ہاتھ پھیرتے' بیٹری سیلوں کی ایک چھوٹی سی مشین منہ پر رکھتے اور ان کا چہرہ تر و تازہ ہو جاتا' اسی طرح عورتیں بستر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ جاتیں' اپنا ہینڈ بیگ کھولتیں' سرخی پاؤڈر کی شیشیاں نکالتیں اور چند سیکنڈ میں تیار ہو جاتیں' یہ کلچر آگے بڑھا اور بال پوائنٹ نے قلم کی جگہ لے لی' سلیٹ کی جگہ کاپی اور کاپی کی جگہ چپکنے والے کاغذ آ گئے' گھروں کی ملکیت کا تصور بدل گیا' فرنشڈ گھر ملنے اور بکنے لگے' آپ صرف اپنا بیگ اٹھائیں اور نئے گھر میں داخل ہو جائیں' آپ کی ضرورت کی تمام اشیاء وہاں موجود ہوں گی' آپ جب تک اس میں رہنا چاہیں رہیں جب دل بھر جائے تو چابی مالک مکان کے حوالے کریں اور نئے گھر میں منتقل ہو جائیں' کرایوں کا تصور مہینے سے ہفتے پر آ گیا' لوگ اب پہلی تاریخ کی بجائے ہفتے کے ہفتے کرایہ دینے اور لینے لگے' نوکریاں بھی ویک تو ویک ہو گئیں' تمام کمپنیاں اپنے ملازمین کو جمعہ کے دن تنخواہیں دینے لگیں' ملازمت گھنٹوں میں تصور ہونے لگی' لوگ ہفتوں' مہینوں اور برسوں کی بجائے پینتیس اور چالیس گھنٹوں کے ملازم ہو گئے' وہ جتنی دیر کام پر آنا چاہیں آئیں اور ان گھنٹوں کی تنخواہ لے لیں' اس دوران اگر انہیں اچھی نوکری مل جائے تو وہ چپ چاپ نئی جگہ شفٹ ہو جائیں' یہ کلچر آگے بڑھا اور میاں بیوی کا رشتہ بھی ڈسپوزیبل ہو گیا' آپ کو چلتے پھرتے کوئی پسند آ گیا تو وہ آپ کا خاوند بن گیا' اس کے ساتھ رہیں مگر کھانا اپنا کھائیں' نوکری اپنی کریں' اگر دل کرے تو ایک آدھ بچہ بھی پیدا کر لیں اور کسی دن یونہی چلتے پھرتے دوسرے فلیٹ میں منتقل ہو جائیں' اس کلچر میں بیوی بیوی نہ رہی' وہ پارٹنر اور گرل فرینڈ بن گئی' جتنے دن دوستی کی حرارت رہی تعلق قائم رہا' حرارت ختم ہوئی تو کاغذ کے کپ کی طرح ڈسٹ بین میں پھینک دی گئی اور اس کی جگہ نیا گلاس نیا کپ آ گیا۔

امریکہ اس وقت سر سے پاؤں تک ڈسپوزیبل کلچر میں رنگا ہوا ہے' اس کے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بال تک ہر چیز ڈسپوزیبل' ہر چیز ''یوز اینڈ تھرو اوے'' کے اصول پر کاربند ہے' وفاداری' استحکام اور طویل عرصے کا ساتھ یہ وہ لفظ ہیں' یہ وہ جذبے ہیں جن سے امریکی پچھلے چالیس سال سے ناآشنا ہیں' امریکہ میں وابستگی اور وفاداری ذہنی عارضہ اور بیماری بن چکا ہے' وہاں اگر کوئی شخص دو چار سال کسی کے ساتھ گزار لے تو لوگ اسے دماغی ہسپتال لے جاتے ہیں' ایک سٹڈی کے مطابق امریکی شہریوں کی زندگی کی 82 فیصد ضروریات ڈسپوزیبل ہو چکی ہیں' آپ کمپیوٹر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا کمپیوٹر خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں آپ کسی نیٹ کیفے میں داخل ہوں' ایک دو ڈالر دیں اور کمپیوٹر استعمال کر لیں' ٹیلی فون کیلئے ٹیلی کارڈ لیں' کسی بوتھ میں کھڑے ہو کر نمبر ڈائل کریں' بات کریں اور باہر آ جائیں' پبلک ٹوائلٹ میں سکہ ڈالیں فطری ضروریات پوری کریں اور باہر آ جائیں' آپ کی جیب میں پیسے نہیں ہیں تو کریڈٹ کارڈ نکالیں اور جو چیز پسند آ جائے وہ خرید یں اور آگے نکل جائیں' گرمیوں کے کپڑے سردیوں کے شروع میں کچرا گھر میں پھینک دیں اور سردیوں کے کپڑے گرمیوں کے شروع میں کباڑیئے کو دے دیں اور ویک اینڈ پر ساتھی بدلیں' دو دن اکٹھے رہیں اور ایک دوسرے کا نام تک جانے بغیر واپس آ جائیں' یہ ہے امریکی کلچر' یہ کلچر اس وقت صرف امریکہ تک محدود نہیں بلکہ یہ یورپ' مشرق بعید اور اب کسی حد تک ایشیا تک بھی پہنچ چکا ہے' پوری دنیا اس وقت ڈسپوزیبل کلچر کا حصہ بن چکی ہے لیکن یہ حقیقت ہے اس کلچر کے بانی امریکی ہیں لہٰذا اس وقت امریکہ اس کلچر کا سب سے بڑا مرکز ہے' یہ کلچر صرف امریکی زندگی تک محدود نہیں بلکہ یہ اب ان کی سوچ' ان کے ذہن اور ان کی پالیسی کا حصہ بن چکا ہے' اس کلچر کا رنگ اب ان کی سیاست' ان کی سفارت اور ان کے انٹرنیشنل ریلیشنز میں بھی آ گیا ہے' یہ لوگ اب پوری دنیا کو ڈسپوزیبل پوائنٹ آف ویو سے دیکھتے ہیں' ان کی نظروں میں دوستیاں' سفارتی تعلقات' سٹریٹجک پارٹنر شپ اور کاغذ کے گلاس میں کوئی فرق نہیں' یہ کہتے ہیں ''یوز تھرو اینڈ فارگیٹ'' (استعمال کرو' پھینکو اور بھول جاؤ) ان لوگوں کی پوری سفارتی پالیسی ڈسپوزیبل کلچر پر استوار ہے' یہ لوگ مارکوس کو اپنا دوست کہتے ہیں پھر اسی مارکوس کو ہوائی میں مرنے کیلئے چھوڑ دیتے ہیں' یہ شاہ ایران کو اپنا محبوب بناتے ہیں لیکن کام نکلنے کے بعد اسے واشنگٹن تک آنے کی اجازت نہیں دیتے' صدام حسین ان کا بھائی ہوتا ہے لیکن پھر اسی صدام حسین پر حملہ کرتے ہیں اور اسے گرفتار کر کے اسی کو پھانسی دے دیتے ہیں' 1980ء سے 1990ء تک

پاکستان ان کا دوست تھا' 1990ء سے 2000ء تک یہی پاکستان ان کا دشمن ہو گیا اور 2001ء سے 2007 تک پاکستان ایک بار پھر ان کا دوست بن گیا' ہم سب امریکہ کے اس طرز عمل پر اسے گالی دیتے ہیں' ہم اس کے پرچم جلاتے ہیں' اس کے خلاف سڑکوں اور گلیوں میں ہائے ہائے کے نعرے لگاتے ہیں لیکن ہم کبھی اس کی اس ''بے وفائی'' کی وجہ تلاش نہیں کرتے' ہم ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں اس میں امریکہ کا کوئی قصور نہیں' ان کے کلچر اور ہمارے کلچر میں زمین آسمان کا فرق ہے' ہم شہ رگ تک ملکیت کے احساس اور وفاداری کے جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ ہیں جبکہ امریکی لوگ اپنی ضرورت کو اولیت دیتے ہیں' یہ یوز تھرو اینڈ فارگیٹ کے قائل ہیں لہٰذا جب ہم اپنے مقام سے امریکہ کو دیکھتے ہیں تو وہ ہمیں برا لگتا ہے لیکن اگر ہم امریکہ کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھیں تو مجھے یقین ہے ہمیں اپنا آپ برا لگے گا' آپ خود سوچئے کیا کوئی شخص کاغذ کے گلاس سے محبت کر سکتا ہے' کوئی شخص کاغذ کے گلاس کو کتنی دیر اٹھائے اٹھائے پھرے گا' امریکی ہاتھوں اور کاغذ کے گلاس میں اتنی دیر اٹیچ منٹ رہ سکتی ہے جتنی دیر کوئی ڈسٹ بین نہیں آتی یہ جون کا مہینہ اور 2007ء ہے اور اس وقت پوری دنیا جانتی ہے گلی کے دوسرے موڑ پر ایک ڈسٹ بین موجود ہے' کاغذ کا گلاس نشے میں چور امریکی کے ہاتھ میں ہے اور وہ تیزی سے ڈسٹ بین کی طرف بڑھ رہا ہے' اس حقیقت سے پوری دنیا واقف ہے اگر کوئی ناواقف ہے تو وہ کاغذ کا گلاس ہے' پوری دنیا ہمارے انجام سے واقف ہے لیکن ہم کبوتر کی طرح آنکھ بند کر کے جھوم رہے ہیں۔

# حرص کی مٹی

دیو جانسن کلبی یونان کا ایک عجیب کردار تھا' تاریخ اسے نسل انسانی کا سب سے بڑا متوکل اور سب سے بڑا قناعت پسند دانشور کہتی ہے وہ آنکھوں سے اندھا لیکن دل و دماغ سے روشن شخص تھا اس کے پاس ایک کتا تھا' یہ کتا اس کا ساتھی بھی تھا اور راہبر و رہنما بھی اس کتے کی نسبت سے لوگ اسے "کلبی" کہتے تھے' دیو جانسن کلبی ارسطو اور سکندر اعظم کے دور میں تھا اور اس کے بارے میں عجیب اور دلچسپ واقعات مشہور تھے' مثلاً کہا جاتا ہے وہ ایک دن دوپہر کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر ایتھنز کی گلیوں میں گھوم رہا تھا' کسی نے اس سے پوچھا "دیو جانسن تم چراغ لے کر کیا تلاش کر رہے ہو" اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں آدمیوں کے ہجوم میں انسان تلاش کر رہا ہوں" اس زمانے میں ارسطو نے انسان کے بارے میں اپنا مشہور فلسفہ دیا تھا' ارسطو کا کہنا تھا "انسان ایک ایسا جانور ہے جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور اس کی قامت سیدھی ہوتی ہے" یہ فلسفیوں' عالموں اور علم پرستوں کا دور تھا چنانچہ ارسطو کا یہ فلسفہ گلی گلی' محلے محلے دہرایا جانے لگا' جہاں دو لوگ جمع ہو جاتے وہ آپس میں "ارسطو کے انسان" کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے تھے' ایک دن ارسطو اپنے شاگردوں میں گھرا بیٹھا تھا' دیو جانسن کلبی وہاں آیا' اس نے شاگردوں کو دائرہ وسیع کرنے کا حکم دیا' ان کے درمیان بیٹھا' بغل سے ایک مرغ نکالا' مرغ کو زمین پر کھڑا کیا' ایک ہاتھ سے مرغ کی ٹانگیں زمین کے ساتھ لگائیں' دوسرے ہاتھ سے مرغ کی چونچ پکڑی اور چونچ کو کھینچ کر آسمان

کی طرف اٹھا دیا' مرغ سیدھا کھڑا ہو گیا' اس کے بعد دیو جانس کلبی نے ارسطو کے شاگردوں کی طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کر بولا "یہ ہے تمہارے استاد کا انسان" ارسطو کے منہ سے بھی قہقہہ نکل گیا' دیو جانس کلبی کی درویشی اور سادگی پورے یونان میں مشہور تھی' وہ عموماً شہر سے باہر رہتا تھا' اگر اسے کھانے کیلئے کچھ مل جاتا تھا تو وہ کھا لیتا تھا بصورت دیگر فاقے کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا' وہ کسی حد تک توحید پرست بھی تھا' اس کا کہنا تھا اس کائنات کی تمام چیزیں دیوتاؤں نے بنائی ہیں لیکن دیوتاؤں کو کس نے بنایا ہے! وہ کہتا تھا جس طاقت نے دیوتا بنائے ہیں وہی طاقت دراصل اس کائنات کا مالک ہے اور میں اس مالک کو ماننے والا ہوں' اس کا کہنا تھا دنیا کا سامان و اسباب انسان کو اصل خوشی سے محروم کر دیتا ہے' اگر انسان زندگی میں حقیقی خوشی پانا چاہتا ہے تو اسے دنیا کے ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے' اس کا کہنا تھا ہمارا گھر بار' ہمارے بیوی بچے' شہر' لوگ' عزیز رشتے دار' روایات' قوانین اور ضابطے ہماری آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں' انسان اس وقت تک پوری طرح آزاد نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا داری سے رہائی نہیں پا لیتا اور اس کا کہنا تھا انسان کی ضروریات انتہائی مختصر ہیں لیکن انسان ضروریات کے دائرے کو اتنا پھیلا دیتا ہے کہ پوری زندگی کے سفر کے باوجود یہ دائرہ ختم نہیں ہوتا' اس کا کہنا تھا بہادر شخص وہ ہے جو اپنے اندر کے خوف کو شکست دے دے۔

دیو جانس کلبی زندگی کے آخری حصے میں شہر سے نکل کر جنگل میں آباد ہو گیا تھا' کسی نے اس سے پوچھا "تمہیں جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا" اس نے مسکرا کر جواب دیا "انسان کا دشمن انسان ہے جانور نہیں" ایک اور جگہ لکھا ہے "انسان کو جانوروں سے نہیں انسان سے خطرہ ہے" وہ کہا کرتا تھا "انسان سے بچو' انسان کی درندگی ہزار درندوں پر بھاری ہے" بڑا مشہور واقعہ ہے سکندر اعظم اس کی تلاش میں شہر سے باہر نکلا' دیو جانس کلبی ایک بیابان میں بیٹھا دھوپ تاپ رہا تھا' سکندر حاضر ہوا اور نہایت عاجزی انکساری سے عرض کیا "یا استاد میرا نام سکندر ہے اور میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں" دیو جانس نے مسکرا کر جواب دیا "خواہشوں کا غلام بادشاہ ایک آزاد شخص کی کیا خدمت کر سکتا ہے" سکندر اعظم نے اصرار جاری رکھا جب وہ تنگ آ گیا تو اس نے قہقہہ لگایا اور سکندر سے کہا "بادشاہ سلامت آپ میری دھوپ روک کر کھڑے ہیں' مہربانی فرما کر میرے آگے سے ہٹ جائیں' مجھے سورج کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہونے دیں" دیو جانس کلبی آخری عمر میں توکل اور قناعت کی انتہائی سیڑھی پر چڑھ گیا' اس کے پاس مٹی کا ایک پیالہ ہوتا تھا' وہ اس سے پانی بھی پیتا تھا اور اس پیالے سے پلیٹ کا کام بھی لیتا تھا' ایک دن وہ پانی پینے کیلئے ندی پر گیا

اس کا ایک شاگرد بھی ساتھ تھا' شاگرد نے ایک جانور دیکھا' جانور ٹہلتا ہوا جنگل سے نکلا' ندی کے کنارے پہنچا' پانی پر جھکا' پانی پیا اور ٹہلتا ہوا جنگل میں واپس چلا گیا' شاگرد نے استاد کو جانور کی حرکات وسکنات بتائیں تو دیو جانس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا "تم پر تف ہو' ایک جانور بھی توکل میں تم سے کتنا آگے ہے' تم ابھی تک پیالے کی محتاجی سے آزاد نہیں ہو سکے" اس نے اسی وقت پیالہ پتھر پر مارا اور کرچیاں اٹھا کر ندی میں پھینک دیں اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پیالے کی محتاجی سے بھی آزاد ہو گیا۔

دیو جانس کلبی سارا دن جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور شام کو واپس اپنے ٹھکانے پر آ جاتا تھا' یہ ٹھکانہ کچی مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹب تھا' وہ ٹب میں لیٹتا' ٹانگیں باہر لٹکاتا اور سوچتا سوچتا سو جاتا' یہ ٹب اس کی کل کائنات تھا' ایک دن سردیوں کی سنہری دوپہر تھی' دیو جانس کلبی ٹب میں لیٹا تھا' ایتھنز کا ایک ہرکارہ اس کے پاس آیا اور اسے آ کر خوشخبری سنائی "مبارک ہو' سکندر اعظم پوری دنیا فتح کر کے واپس ایتھنز آ رہا ہے" دیو جانس کلبی نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد وہ تاریخی فقرہ کہا جو آنے والے زمانوں میں دیو جانس کی پہچان بن گیا' جس نے پانچ ہزار برس بعد بھی دیو جانس کلبی کو زندہ رکھا' اس نے کہا "اگر انسان قناعت پسند ہو تو وہ مٹی کے اس ٹب میں بھی خوش رہ سکتا ہے لیکن اگر وہ حریص ہو جائے تو پوری کائنات بھی اس کیلئے چھوٹی ہے" دیو جانس کلبی کا یہ فقرہ مجھے کل سے یاد آ رہا ہے' کل میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا تھا جب انسان کیلئے ایک گاڑی' پانچ سے آٹھ مرلے کا ایک مکان' پچاس ہزار روپے ماہانہ اور ایک ٹیلی فون کافی ہوتا ہے تو وہ اس کے باوجود کرپشن کیوں کرتا ہے' اس نے پوچھا' ہمارے حکمران پچاس پچاس گاڑیاں' چار چار جہاز' سو سو ایکڑ کے محلات اور چالیس چالیس کروڑ کے سیکرٹ فنڈز کیوں چاہتے ہیں' ان کے دل کیوں نہیں بھرتے' میں نے اسے دیو جانس کلبی کا یہ فقرہ سنایا اور اس کے بعد عرض کیا' "انسان اگر مطمئن ہونا سیکھ لے تو وہ کچی مٹی کے ٹب میں بھی خوش گوار زندگی گزار سکتا ہے لیکن اگر اس کی آنکھوں میں حرص آ جائے تو ساری دنیا کی گاڑیاں' ساری دنیا کے جہاز' ساری دنیا کے محلات' ساری دنیا کا سونا چاندی' ڈالر اور ساری دنیا کا اقتدار مل کر بھی اس کی بھوک نہیں مٹا سکتا' وہ اپنی پوری زندگی مزید سے مزید اور زیادہ سے زیادہ کی تلاش میں گزار دیتا ہے" میں نے اس سے عرض کیا "بدقسمتی سے ہمارے حکمرانوں' ہماری رولنگ کلاس کا تعلق لوگوں کے اس گروہ سے ہے جن کی آنکھیں اور جن کے معدے حرص کی مٹی سے بنے ہیں لہٰذا یہ لوگ کبھی سیر نہیں ہوں گے' یہ لوگ اپنے کفن تک پر جیبیں لگوائیں گے اور یہ دوزخ میں بھی ٹھنڈا پانی مانگیں گے"

# آدھا گلاس

شیخ صاحب میرے ایک بزرگ دوست ہیں' کپڑے کی صنعت کے ساتھ وابستہ ہیں' سیلف میڈ شخص ہیں' کبھی کھدر کا تھان کندھے پر رکھ کر گلی گلی فروخت کیا کرتے تھے' اللہ نے کرم کیا اور ان کا کاروبار چل نکلا' وہ آج کل ارب پتی ہیں' ان کی کئی ٹیکسٹائل ملیں اور شوروم ہیں' آج سے دس برس پہلے انہیں بلڈ پریشر ہوا' پھر شوگر ہوئی' پھر دل کا درد شروع ہوا' پھر نیند کم ہوئی اور پھر وہ شدید قسم کے چڑچڑے پن کا شکار ہو گئے' ان کے مزاج کی ترشی نے اثر دکھایا اور وہ تنہا ہوتے چلے گئے' جب وہ دفتر جاتے تو تمام لوگ مختلف حیلے بہانوں سے آگے پیچھے ہو جاتے' گھر میں بھی سب لوگ ان سے دور دور رہتے' ان کے چوکیدار گارڈز اور ڈرائیورز تک تیزی سے بدلنے لگے' جو بھی ڈرائیور ان کے ساتھ ایک دن نوکری کر لیتا تھا وہ شام کو انہیں سلام کر کے رخصت ہو جاتا تھا' اس تنہائی اور چڑچڑے پن نے اثر دکھایا اور وہ بری طرح اعصابی مریض بن گئے' ان کے کندھوں' گردن اور کمر میں مسلسل درد رہنے لگا' درد اس قدر شدت اختیار کر لیتا تھا کہ وہ اپنی ٹانگوں پر رسیاں لپیٹنے پر مجبور ہو جاتے تھے' انہوں نے دنیا جہان کے ڈاکٹروں سے مشورے کئے' دنیا کی قیمتی ترین دوائیں کھائیں' حکیموں اور سنیاسیوں تک سے علاج کرایا لیکن انہیں افاقہ نہ ہوا' وہ اکثر کہا کرتے تھے بس میرا آخری وقت آ گیا ہے' مجھے مرنے کا افسوس نہیں' اگر افسوس ہے تو یہ کہ میرے جنازے میں کوئی شخص شامل نہیں ہو گا' میں انہیں تسلی دیتا تھا لیکن وہ میری تسلی سے

مزید چڑ جاتے تھے‘ میں خود ان کی حالت سے مایوس ہو گیا تھا مگر پھر ایک روز عجیب معجزہ ہوا‘ شیخ صاحب ٹھیک ہونا شروع ہو گئے‘ ان کا چڑچڑا پن ختم ہو گیا‘ ان کا غصہ دور ہو گیا‘ وہ یک دم بزلہ سنج اور بزم آراء ہو گئے‘ وہ سارا سارا دن لطیفے سناتے اور قہقہے لگاتے رہتے اس کے نتیجے میں ساری دنیا ایک بار پھر ان کی گرویدہ ہو گئی‘ گھر میں وہ ”موسٹ وانٹیڈ“ شخص ہو گئے‘ دفتر میں لوگ ان کا انتظار کرتے رہتے اور ملازم ان کی خدمت کرنے‘ ان کے ساتھ اپنی ڈیوٹی لگوانے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگتے‘ بیماریوں میں سب سے پہلے ان کی نیند کا مسئلہ حل ہوا‘ وہ ساری رات بغیر کروٹ بدلے آرام سے سونے لگے‘ پھر دل کا مسئلہ حل ہوا‘ پھر بلڈ پریشر نارمل ہوا اور آخر میں شوگر ٹھیک ہو گئی‘ وہ جوانوں کی طرح بھاگنے دوڑنے لگے‘ ایک طویل عرصے بعد میں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گیا‘ وہ پہچانے نہیں جاتے تھے‘ انہوں نے بڑی خوبصورت امپورٹیڈ جینز پہن رکھی تھی ان کی شرٹ بھی آج کے فیشن کے مطابق تھی‘ آنکھوں پر جوانوں والی عینک تھی اور پاؤں میں گوچی کے جوتے تھے‘ ان کا چہرہ سرخی مائل تھا اور ہاتھ کی گرفت میں گرمی تھی‘ وہ بات بے بات قہقہے لگا رہے تھے۔

میں نے ان سے اس کایا کلپ کی وجہ پوچھی تو میں مزید حیران رہ گیا‘ ان کی بات بہت دلچسپ تھی‘ انہوں نے بتایا ایک روز میں صبح اٹھا تو میرے پورے جسم میں درد ہو رہا تھا‘ میرا بلڈ پریشر زیادہ تھا‘ شوگر بھی نارمل نہیں تھی‘ میں ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کیلئے بیٹھا تو ایک ایک کر کے سارے ملازم وہاں سے بھاگ گئے‘ یہاں تک کہ میری بیوی تک بہانہ بنا کر باہر چلی گئی‘ میں بالکل اکیلا رہ گیا‘ میں نے نوکروں کو آواز دی‘ میری آواز پر کسی نے جواب نہ دیا‘ اس وقت مجھے محسوس ہوا میں پوری دنیا میں اکیلا ہوں‘ میں نے وہیں اس میز پر بیٹھے بیٹھے اپنے آپ سے سوال کیا‘ میری اس تنہائی‘ اس اکیلے پن کی وجہ کیا ہے؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مجھے محسوس ہوا اپنے تمام تر مسائل کا ذمہ دار میں خود ہوں‘ میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا‘ کبھی دنیا جہان کی رونقیں میری تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں‘ میں جہاں بیٹھتا تھا وہاں لوگوں کے میلے لگ جاتے تھے‘ میں نے اپنے آپ سے پوچھا ”پھر وہ شخص اکیلا کیسے ہو گیا‘ وہ کون سی چیز ہے جس نے اس شخص کو تنہا کر دیا“ میں نے سوچنا شروع کیا تو سوچتا ہی چلا گیا‘ میں نے اپنے ذہن میں اپنی تمام پرانی عادتیں دہرائیں‘ وہ تمام کام یاد کئے جو میں ماضی میں کیا کرتا تھا‘ میں یاد کرتا گیا‘ دہراتا گیا یہاں تک کہ میرے دماغ میں ایک چمک سی ابھری اور مجھے یاد آ گیا میں آج سے دس پندرہ برس قبل ایک مثبت سوچ کا حامل شخص تھا‘ میں ایک پرامید اور روشن خیال شخص تھا‘ حالات کچھ بھی ہوتے‘ خطرات اور پریشانیاں خواہ کتنی ہی گمبھیر اور سنگین ہوتیں‘ میں

کبھی امید کا دامن نہ چھوڑتا میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بہتری کی توقع کرتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے اپنی یہ عادت ترک کر دی میں اپنا یہ اصول بھلا بیٹھا لہٰذا میں آہستہ آہستہ بیمار ہوتا چلا گیا' میں تنہا اور اداس ہوتا گیا' میں نے اسی میز پر بیٹھے بیٹھے اپنی خامی پکڑ لی میں نے اپنی کوتاہی کا اندازہ لگا لیا اور جب میں وہاں سے اٹھا تو میں ایک تبدیل شدہ انسان تھا۔ میں نے پازیٹو تھنکنگ یعنی مثبت سوچ کو اپنا شعار بنا لیا' اب میں دنیا کے افسوسناک ترین واقعے سے بھی اچھی چیز دریافت کر لیتا ہوں' مثلاً پچھلے دنوں سونامی آیا' اس سانحے میں دو سے تین لاکھ لوگ مارے گئے' اس سانحے پر ساری دنیا ماتم کر رہی تھی' جس کو دیکھو وہ غمناک اور پریشان تھا لیکن میرا رویہ اس کے بارے میں بالکل مختلف تھا' میں نے دیکھا اس حادثے کے بعد عالمی برادری حرکت میں آ گئی ہے' 45 ممالک نے سونامی سے متاثر ہونے والے ممالک میں امدادی ٹیمیں بھجوا دی ہیں' 112 ممالک میں اداکاروں' کھلاڑیوں' صحافیوں اور دوسرے طبقات نے سونامی کے متاثرہ لوگوں کیلئے امدادی شو کئے' دنیا کے چھ ارب لوگوں نے اپنے متاثرہ بھائیوں اور بہنوں کیلئے چندے جمع کئے' دنیا بھر کے لوگوں کے دلوں میں ان لوگوں کیلئے رحم اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے' میں نے دیکھا لوگ ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر کے انڈونیشیا' سری لنکا اور فلپائن گئے اور انہوں نے ملبہ صاف کرنے کیلئے وہاں کے لوگوں کی مدد کی' پوری دنیا نے ان لوگوں کو کمبل' خیمے' کپڑے اور خوراک بھجوائی' میں لوگوں کی یہ کوششیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہا' لوگوں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کے جو جذبات موجزن تھے میں انہیں محسوس کر کے خوش ہوتا رہا' میں نے دیکھا نعشوں کے عین درمیان ایک بچی گیند کے ساتھ کھیل رہی تھی' لوگ نعشوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے لیکن میں اس بچی کی معصومیت پر خوش ہو رہا تھا' میں موت کے درمیان موجود زندگی کے اس احساس سے لطف اندوز ہو رہا تھا' میرے لئے خوشی کی دوسری بات یہ تھی کہ دنیا بھر کے سائنس دانوں نے اس سانحے کے ردعمل میں ایسے آلات ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا جو سونامی سے پہلے لوگوں کو اس کی اطلاع دے دیں' میرے لئے خوشی کی تیسری بات یہ تھی کہ ہماری سرحدوں سے چند ہزار میل دور اتنا بڑا سانحہ پیش آیا لیکن اللہ نے ہم پر کرم کیا' ہم لوگ ایسی تباہی سے بچ گئے' یہ بڑی بات تھی' میں اللہ کے اس کرم پر خوش تھا' میں نے اس کا شکر ادا کیا' میں یوں ہی تمام بری خبروں' تمام چھوٹے بڑے حادثوں اور سانحوں سے بہتری اور اچھائی دریافت کر لیتا ہوں' اگر کسی جگہ کوئی عمارت گر جائے یا پل ٹوٹ جائے تو میں یہ سوچ کر خوش ہوتا ہوں اس جگہ پہلے سے کئی گنا زیادہ خوبصورت اور شاندار عمارت بنے گی' کوئی بند دفتر ہو جائے تو میں یہ

سوچتا ہوں یہ کتنا خوش نصیب ہے یہ اب ان ہستیوں کو دیکھ سکتا ہے جن کو ہماری مادی نظریں نہیں دیکھ سکتیں مجھے اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو میں سوچتا ہوں وہ رقم جو مجھے ملنی تھی وہ کسی دوسرے کی جیب میں چلی گئی ہو سکتا ہے وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہو جس سال مندہ ہو یا ہمارا منافع کم ہو جائے تو میں سوچتا ہوں اس سال لوگوں کو سستا کپڑا ملے گا' ہمارے حصے کے منافع سے سینکڑوں ہزاروں لوگ فائدہ اٹھائیں گے میرے سامنے کوئی ایسا حادثہ' کوئی ایسا سانحہ پیش ہو جائے جس میں سے مجھے کوئی مثبت اشارہ نہ ملے تو میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتا ہوں اس میں میرے اللہ کی رضا شامل تھی اور میرا رب کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتا میری اس عادت' میری اس پازیٹو تھنکنگ نے مجھے دوبارہ دنیا میں لا کھڑا کیا میں دوبارہ زندہ ہو گیا میں آج سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے میں آج سے دو تین مہینے پہلے چوبیس گھنٹے کا شاکی تھا مجھے دنیا کی ہر چیز' ہر شخص' ہر سوچ سے شکایت تھی اختلاف تھا' یہ اختلاف' یہ شکایت مجھے ہر وقت بیمار رکھتی تھی میں نے شکایت کرنا چھوڑ دیا میں اختلاف کو سمیٹ کر نقطہ نظر اور رائے تک لے آیا مجھے جب کوئی اعتراض ہوتا ہے تو میں بڑے آرام سے کہتا ہوں "میرا یہ خیال ہے اور یہ خیال غلط بھی ہو سکتا ہے میرے اس فقرے سے میرا اختلاف میرا اعتراض محض میری رائے بن جاتا ہے وہ میرا نقطہ نظر ہو جاتا ہے لہٰذا اس سے نہ تو لوگ ناراض ہوتے ہیں اور نہ ہی میں چڑچڑے پن کا شکار ہوتا ہوں"

شیخ صاحب خاموش ہو گئے میں نے پوچھا "اور بیماریاں" وہ مسکرا کر بولے "میرا خیال ہے ہماری 80 فیصد بیماریاں ہماری اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں' یہ ہمارے منفی رویوں کا ردعمل ہوتی ہیں' اگر ہم مثبت طرز فکر اپنا لیں تو ہم سدا صحت مند رہیں' ہم پوری زندگی خوش اور تندرست رہیں" میں نے شیخ صاحب سے ہاتھ ملایا اور خوش خوش واپس آ گیا میں نے محسوس کیا شیخ صاحب نے بھرا ہوا گلاس دیکھنا شروع کر دیا ہے جبکہ ہم لوگ آدھے گلاس کو روتے رہتے ہیں۔

# خوشی

یہ 1640ء تھا' اس وقت نیو یارک پانچ حصوں میں تقسیم تھا' شمالی حصے پر ہالینڈ کا قبضہ تھا' ہالینڈ کے جاگیردار افریقہ سے غلام لاتے تھے اور انہیں اپنے کھیتوں میں بیگار پر لگا دیتے تھے اس وقت شمالی نیو یارک کے ارد گرد جنگل تھے' یہ غلام بعض اوقات پہرے داروں کی غفلت کا فائدہ اٹھاتے تھے اور کھیتوں سے بھاگ کر جنگلوں میں چھپ جاتے تھے' یہ ایک مسئلہ تھا' ہالینڈ کے جاگیرداروں کا دوسرا مسئلہ اس سے بھی گھمبیر تھا' اس دور میں انگلینڈ سے فوج آئی اور اس نے ہالینڈ کے قابضین سے لڑنا شروع کر دیا' برطانوی فوج اسلحے اور تعداد میں ڈچ لوگوں سے بڑی تھی چنانچہ ڈچ جاگیردار خوف کا شکار ہو گئے' ان لوگوں نے اپنے بچاؤ کیلئے شمالی نیو یارک میں ایک دیوار بنائی اور اس دیوار کے پیچھے پناہ گزین ہو گئے' یہ دیوار 1652ء میں مکمل ہوئی' اور یہ 1699ء تک برقرار رہی' 1698ء میں انگلینڈ کی فوج نے شمالی نیو یارک پر قبضہ کر لیا اور ڈچ سرداروں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا جس کے بعد یہ دیوار گرا دی گئی' ڈچوں کے دور میں اس دیوار کے ساتھ ایک نسبتاً کھلی گلی ہوتی تھی' لوگ اس گلی کو ''وال سٹریٹ'' کہتے تھے' یہ دیوار 1699ء میں ختم ہو گئی لیکن وال سٹریٹ آج تک قائم ہے۔ وال سٹریٹ آج دنیا کی سب سے بڑی سٹاک ایکسچینج مارکیٹ ہے' انیسویں صدی کے شروع میں جب نیو یارک میں بلند عمارتوں کی تعمیر شروع ہوئی تو دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں نے آسمان کو ہاتھ لگانے کیلئے اسی جگہ کا انتخاب کیا تھا'

یہ جگہ اس وقت دنیا کا معاشی دارالحکومت بھی کہلاتی ہے' اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کی تمام بڑی کمپنیوں اور تمام بڑے سرمایہ کاروں کے دفاتر موجود ہیں' کہا جاتا ہے دنیا میں سرمائے کا سورج روزانہ وال سٹریٹ سے طلوع ہوتا ہے اور جس دن یہ سورج طلوع نہیں ہوگا اس دن دنیا دیوالیہ ہو جائے گی' اس وقت وال سٹریٹ میں 3124 امریکی' 93 کینیڈین' 195 یورپی' 81 ایشیائی' 59 کریبین' 89 لاطینی امریکہ اور 10 مڈل ایسٹ اور افریقہ کی کمپنیاں رجسٹر ہیں اور اس وقت وال سٹریٹ میں دنیا کے 21 ٹریلین ڈالر دفن ہیں' آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو اس وقت دنیا کی کل دولت 33 ٹریلین ڈالر ہے اور ان 33 ٹریلین ڈالرز میں سے 21 ٹریلین ڈالر اس وقت وال سٹریٹ میں ہیں جبکہ باقی 12 ٹریلین ڈالرز سے دنیا اپنا کاروبار حیات چلا رہی ہے۔

اگر ہم وال سٹریٹ کی کمپنیوں اور ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ لوگوں کا جائزہ لیں تو یہ دنیا کے امیر اور خوشحال ترین لوگ ہیں' ان میں سے ہر شخص اور ہر کمپنی کا کاروبار سو سے زائد ممالک تک پھیلا ہوا ہے اور یہ لوگ ہر گزرنے والے سیکنڈ میں امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں' مجھے ایک بار وال سٹریٹ کے ایک کھلاڑی کا انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا' انٹرویو کرنے والے نے اس سے سوال کیا ''اس وقت آپ کے اکاؤنٹس میں کتنی رقم ہے'' اس نے مسکرا کر جواب دیا ''آپ کے سوال کرنے سے پہلے میرے پاس بارہ بلین اور نو سو ملین ڈالر تھے لیکن میرے جواب دینے کے بعد اس رقم میں تین ملین کا اضافہ ہو جائے گا'' یہ لوگ زندگی کو اس طرح دیکھتے اور سوچتے ہیں ''ٹائم از منی'' (وقت دولت ہے) کے محاورے نے بھی اسی ''گلی'' میں جنم لیا تھا' وال سٹریٹ میں حقیقتاً ہر سیکنڈ سونے کے بھاؤ تولا اور پلاٹینیم کی قیمت میں بیچا جاتا ہے لہٰذا بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے وال سٹریٹ کے لوگوں تک زندگی کی گرم ہوا کبھی نہیں پہنچتی' یہ لوگ ان تمام تکلیفوں اور مسائل سے آزاد ہوتے ہیں جن سے اس دنیا کے ساڑھے چھ ارب لوگوں کا روزانہ پالا پڑتا ہے' یہ لوگ حقیقتاً خوش اور خوشحال ہیں اور انہوں نے زندگی میں کبھی ان تلخ حقائق کی کڑواہٹ محسوس نہیں کی جو روزانہ ہمارے حلق کو زہر بناتے ہیں لیکن چند روز پہلے مجھے وال سٹریٹ میں ہونے والے ایک سروے رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا' اس رپورٹ نے مجھے حیران کر دیا' امریکہ کی ایک کمپنی نے وال سٹریٹ کے باسیوں سے پوچھا ''تم لوگوں نے کبھی خوشی کو محسوس کیا'' ان تاجروں' کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز اور بروکروں کا جواب بہت دلچسپ تھا' ان میں سے 91 فیصد لوگوں کا کہنا تھا انہوں نے زندگی میں کبھی خوشی کو محسوس نہیں کیا' انہیں سرے سے یہ معلوم نہیں' خوشی کیا ہوتی ہے۔۔۔

اس کا اظہار کس طرح کیا جاتا ہے' کمپنی نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا وال سٹریٹ کے زیادہ تر لوگ مسکرانا' قہقہہ لگانا اور ہنسا بھول چکے ہیں اور اس ''بازار'' میں اگر کبھی کسی کے منہ سے قہقہہ نکل جائے تو سب لوگ مڑ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہیں' میرے لئے یہ تحقیق حیران کن تھی' میں بے شمار دوسرے لوگوں کی طرح دولت اور خوشحالی کو خوشی کا جوہر سمجھتا تھا' میرا خیال تھا جب تک کسی شخص کی جیب میں ایک دو کروڑ روپے نہ ہوں اس وقت تک اسے خوشی نصیب نہیں ہوتی' وہ اس وقت تک خوشی کو پوری طرح محسوس نہیں کر پاتا لیکن وال سٹریٹ کے اس سروے نے اس سارے فلسفے کو جڑوں سے ہلا دیا اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا خوشی دولت اور خوشحالی سے ماورا کوئی چیز ہوتی ہے اور اس کا تعلق جذبوں کے کسی دوسرے ماخذ سے ہوتا ہے' مجھے معلوم ہوا ایک چھوٹا بچہ روزانہ چار سو بار ہنستا ہے جبکہ ایک نارمل بالغ شخص کے چہرے پر صرف پندرہ مرتبہ مسکراہٹ آتی ہے اور جوں جوں یہ بالغ شخص خوشحالی کی تلاش میں آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے چہرے سے ہنسی اور خوشی غائب ہوتی چلی جاتی ہے' مجھے معلوم ہوا دولت دنیا میں بے شمار خوبیاں لے کر آتی ہے' یہ انسان کو بے شمار تحفے اور انعامات بھی دیتی لیکن یہ اپنے ساتھ کبھی خوشی اور مسرت نہیں لے کر آتی۔



اس شام میرے پاس اللہ کے ایک ولی تشریف لائے' میں نے ان سے سوال کیا ''حضور خوشی کیا ہوتی ہے'' انہوں نے قہقہہ لگایا اور بڑے یقین سے بولے'' دنیا میں لوگ دولت دے کر کوئی نہ کوئی جنس خریدتے ہیں' آپ روپے دے کر آٹا' دالیں' چینی' جوتے اور کپڑے لیتے ہیں ہم اس خرید و فروخت کو کاروبار کہتے ہیں' انسان جب جنس کے بدلے روپیہ اور روپے کے بدلے جنس لیتا ہے تو اسے خوشی حاصل نہیں ہوتی' خوشی صرف اس خرید و فروخت میں حاصل ہوتی ہے جس میں آپ روپے ادا کرتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں آپ کوئی جنس نہیں خریدتے' آپ کو اس کے عوض کوئی چیز نہیں ملتی'' میں نے پوچھا'' مثلاً'' وہ مسکرائے'' مثلاً آپ کسی ضرورت مند طالب علم کی فیس ادا کر دیتے ہیں' کسی مریض کا علاج کرا دیتے ہیں یا آپ کسی یتیم کو جوتا خرید دیتے ہیں'' ان کا فرمانا تھا'' خوشی صرف خوش نصیب لوگوں کو ملتی ہے اور خوش نصیب وہ ہوتے ہیں جو اپنے نصیب پر خوش ہوتے ہیں' جو اللہ کی رضا کو اپنا مقدر بنا لیتے ہیں'' مجھے ان کی بات اچھی لگی لیکن ساتھ ہی میں نے سوچا'' مگر بچوں کو تو نصیب کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی خوشی کا' وہ پھر روزانہ چار چار سو بار کیوں مسکراتے ہیں'' مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے معصوم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور ہم زندگی میں جس قدر آگے بڑھتے جاتے ہیں' ہم معصومیت سے اتنے ہی دور ہوتے جاتے ہیں' ہم

جوں جوں چالاک، ہوشیار اور سمجھ دار ہوتے جاتے ہیں، ہم توں توں خوشی سے دور ہوتے جاتے ہیں، ہم توں توں مسرت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔'' مجھے محسوس ہوا خوشی کیلئے توکل اور معصومیت دونوں ضروری ہوتی ہیں اور قدرت سرمائے دار کو سرمایہ دے کر یہ دونوں انعام چھین لیتی ہے' وہ اسے چالاک اور پریکٹیکل بنا دیتی ہے اور پریکٹیکل اور چالاک لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے' وہ کبھی وجود کی جڑوں تک خوش نہیں ہو سکتے۔''

# 21 گرام

ڈاکٹر ایل جان نے دس سال قبل تجربات شروع کئے تھے' وہ انسانی روح کا وزن معلوم کرنا چاہتا تھا' اس نے نیویارک کے چند ڈاکٹروں کو ساتھ ملایا اور مختلف طریقے وضع کرنا شروع کر دیئے' یہ لوگ بالآخر ایک طریقے پر متفق ہو گئے۔ ڈاکٹر نزع کے شکار لوگوں کو شیشے کے باکس میں رکھ دیتے تھے' مریض کی ناک میں آکسیجن کی چھوٹی سی نلکی لگا دی جاتی تھی اور باکس کو انتہائی حساس ترازو پر رکھ دیا جاتا تھا' ڈاکٹر باکس پر نظریں جما کر کھڑے ہو جاتے تھے' مریض آخری ہچکی لیتا تھا' اس کی جان نکلتی تھی اور ترازو کے ہندسوں میں تھوڑی سی کمی آ جاتی تھی' ڈاکٹر یہ کمی نوٹ کر لیتے تھے' ان لوگوں نے پانچ سال میں بارہ سو تجربے کئے' 2004ء کے آخر میں ڈاکٹر ایل جان کی ٹیم نے اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے" ڈاکٹر جان نے اپنی تھیوری کے جواز میں 12 سو مردوں کی ہسٹری بیان کی' اس کا کہنا تھا ان کے باکس میں رکھا شخص جوں ہی فوت ہوتا تھا اس کا وزن 67 گرام کم ہو جاتا تھا لہٰذا وہ بارہ سو تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں انسانی روح کا وزن 67 گرام ہوتا ہے۔ اسی قسم کے تجربات لاس اینجلس کے ایک ڈاکٹر ابراہام نے بھی کیے تھے' اس نے انتہائی حساس ترازو بنایا' وہ مریض کو اس ترازو پر لٹاتا' مریض کے پھیپھڑوں کی آکسیجن کا وزن کرتا اور اس کے مرنے کا انتظار کرتا' ڈاکٹر ابراہام نے سینکڑوں تجربات کے بعد اعلان کیا "انسانی روح کا وزن 21 گرام ہے" ابراہام کا کہنا تھا انسانی روح اس

21 گرام آکسیجن کا نام ہے جو پھیپھڑوں کے کونوں' کھدروں' درزوں اور لکیروں میں چھپی رہتی ہے' موت ہچکی کی صورت میں انسانی جسم پر وار کرتی ہے اور پھیپھڑوں کی تہوں میں چھپی اس 21 گرام آکسیجن کو باہر دھکیل دیتی ہے اس کے بعد انسانی جسم کے سارے سیل مر جاتے ہیں اور انسان فوت ہو جاتا ہے"

ڈاکٹر ایل جان کا تخمینہ درست ہے یا ڈاکٹر ابراہام کی تحقیق' یہ فیصلہ ابھی باقی ہے تاہم یہ طے ہو چکا ہے انسانی روح کا وزن گراموں میں ہوتا ہے اور ہمارے جسم سے 21 یا 67 گرام زندگی خارج ہوتی ہے اور ہم فوت ہو جاتے ہیں' میں نے پچھلے دنوں ہالی وڈ کی ایک فلم دیکھی تھی' یہ فلم ڈاکٹر ابراہام کی تھیوری پر بنی تھی اور اس میں بھی انسانی روح کو 21 گرام قرار دیا گیا تھا لہٰذا اگر ہم فرض کر لیں ہمارے جسم میں بھاگنے دوڑنے والی زندگی کا وزن محض 21 گرام ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے ان 21 گراموں میں ہماری خواہشوں کا وزن کتنا ہے' اس میں ہماری نفرتیں' ہمارے ارادے' ہمارے منصوبے' ہماری ہیرا پھیریاں' ہمارے سمجھوتے' ہماری چالاکیاں' ہمارے لالچ' ہماری سازشیں اور ہماری ابد تک زندہ رہنے کی تمنا کتنی وزنی ہے' ان 21 گراموں میں ہماری یونیفارم' ہمارے ایل ایف او' ہماری ڈیل' ہمارے اقتدار' ہمارے الیکشن' ہماری لبرل ازم' ہماری آزاد خیالی اور ہماری بہادری کا کتنا وزن ہے' ان 21 گراموں میں ہمارے حوصلے' ہماری قوت برداشت' ہماری جرأت' ہماری خوشامد' ہماری پھرتیوں' ہماری عقل اور ہماری فہم کا کتنا حصہ ہے' ان 21 گراموں میں ہماری سمارٹ نس' ہماری الرٹ نس' ہماری فارن پالیسی اور ہماری امریکہ نوازی کا بوجھ کتنا ہے اور ہم چودھری صاحب کی طرح لاہور کے سارے پلاٹ ہتھیانا چاہتے ہیں' ہم اپنی اگلی نسل کو بادشاہ بنانا چاہتے ہیں' ہم اپنی ساری دولت پین شفٹ کرنا چاہتے ہیں اور ہم اگلے بیس پچیس برس تک کرسی پر جلوہ افروز رہنا چاہتے ہیں' ہم نے خوشامد کو آرٹ کی شکل دے دی ہے' ہم روزانہ بیسیوں لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں' ہم ایک منٹ میں دس دس مرتبہ اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں اور ہم صرف اپنا اقتدار بچانے کیلئے چھ چھ سو بے گناہوں کو ظالموں کے حوالے کر دیتے ہیں' ہم داڑھی اور نماز کو خوف کی شکل دے رہے ہیں اور ہم ظالم سے نفرت کرنے والے ہر شخص کو مجرم سمجھتے ہیں' سوال پیدا ہوتا ہے ہماری ان ساری سوچوں' ہمارے ان سارے خیالات اور ہماری ان ساری خواہشوں کا وزن کتنا ہے اور ان 21 گراموں میں ہماری گردن کی اکڑ' ہمارے لہجے کے تکبر اور ہماری نظر کے غرور کا بوجھ کتنا ہے اور ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کا کتنی دیر

تک مقابلہ کر سکتے ہیں' ہم ان 21 گراموں کی مدد سے قدرت کے فیصلوں سے کتنی دیر تک بچ سکتے ہیں' یہ 21 گرام ہمیں کتنی دیر تک وقت کی آنچ سے بچا سکتے ہیں' یہ 21 گرام کب تک ہمارے غرور کی حفاظت کر سکتے ہیں اور یہ 21 گرام ہمارے منصوبوں اور ہماری خواہشوں کی کتنی دیر نگہبانی کر سکتے ہیں۔

میں نے کسی جگہ پڑھا تھا تبت کے لوگ 21 گراموں کی اس زندگی کو موم سمجھتے ہیں لہٰذا یہ لوگ صبح کے وقت موم کے دس بیس مجسمے بناتے ہیں اور یہ مجسمے اپنی دہلیز پر رکھ دیتے ہیں' ان میں سے ہر مجسمہ ان کی کسی نہ کسی خواہش کی نمائندگی کرتا ہے' دن کو سورج کی تپش میں اضافہ ہوتا ہے تو یہ مجسمے پگھلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ شام تک ان کی دہلیز پر موم کے چند آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں بچتا' یہ لوگ ان آنسوؤں کو دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے پوچھتے ہیں'' کیا یہ تھیں میری ساری خواہشیں'' اور اس کے بعد ان کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور وہ کائنات کی اس طاقت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں جو ان کے 21 گرام کی اصل مالک ہے' جس کے حکم سے ان کی سانسیں چلتی ہیں اور ان کے قدم اٹھتے ہیں' میں نے کسی جگہ پڑھا تھا ہمارے بدن میں ایک منٹ میں 87 کروڑ حرکتیں ہوتی ہیں اور ہمارے ذہن میں ایک منٹ میں اربوں خیال آتے ہیں اور ہم ایک منٹ میں ایک لاکھ دس ہزار منصوبے بناتے ہیں لیکن اگلے منٹ یہ سارے خیال' یہ سارے منصوبے اور یہ ساری کروٹیں ہمارے ذہن کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہیں' ہم اپنے خیال بھول جاتے ہیں۔ ہمارے یہ سارے خیال' ہمارے یہ سارے منصوبے اور ہماری یہ ساری حرکتیں بھی انہیں 21 گراموں کی مرہون منت ہیں اور یہ 21 گرام آگے چل کر موم کے پتلے ثابت ہوتے ہیں لیکن آپ انسان کا کمال دیکھئے ڈیڑھ سو گرام گندم' 8 اونس شراب اور کسی ایک سیکرٹری کی خوشامد اس کے 21 گراموں کو خدا بنا دیتی ہے۔ یہ خدا کے لہجے میں بولنا شروع کر دیتا ہے' یہ اپنی ذات کو ملک کی بقا قرار دے دیتا ہے اور یہ خود کو ناگزیر سمجھنے لگتا ہے' ہم سب کیا ہیں؟ محض 21 گرام محض ایک سانس' محض ایک ہچکی' محض ایک چھینک' محض ایک جھٹکا' محض ایک بریک' محض دماغ کا ایک شارٹ سرکٹ اور محض دل کے اندر اٹھتی ہوئی ایک لہر اور بس' ہم نے کبھی سوچا 21 گرام کتنے ہوتے ہیں' 21 گرام لوہے کے 14 دانے ہوتے ہیں' ایک ٹماٹر' پیاز کی ایک پرت' ریت کی چھ چٹکیاں اور پانچ ٹشو پیپر ہوتے ہیں' یہ ہیں ہم اور یہ ہے ہماری اوقات لیکن ہم بھی کیا لوگ ہیں' ہم 21 گرام کے انسان خود کو کھربوں ٹن وزنی کائنات کے خدا سمجھتے ہیں' ہم 21 گرام کے انسان

خود کو 21 گرام کے کروڑوں انسانوں کا حکمران سمجھتے ہیں' ہم وقت کو اپنا غلام اور زمانے کو اپنا ملازم سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں بس ذرا سی تپش کی دیر ہے اور ہمارے سارے اختیار' ہمارے سارے اقتدار کی موم پگھل جائے گی' ہم شام تک موم کا آنسو بن جائیں گے' ہمارے 21 گرام منوں مٹی میں مل جائیں گے' ہم تاریخ کی سلوں تلے دفن ہو جائیں گے اور 21 گرام کا کوئی دوسرا خدا ہماری جگہ لے لے گا۔

O......O......O

# کفن چور

اس کی ناک پر سنہری رنگ کی خوبصورت عینک دھری تھی اور گود میں لیپ ٹاپ تھا' فلائیٹ ہموار ہوتے ہی اس نے میز کھولی لیپ ٹاپ اس پر رکھا اور کام شروع کر دیا' میں جہاز میں دستیاب میگزین اور اخبارات پڑھنے لگا' کئی گھنٹے گزر گئے لیکن وہ کام کرتا رہا' کھانے کے دوران اس نے ذرا دیر کیلئے وقفہ کیا' میں نے موقع غنیمت جانا اور اس کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی' وہ سنگاپور کا رہنے والا تھا' وہ پچھلے سال یونیورسٹی سے فارغ ہوا اور اس نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی' وہ چھٹیاں گزارنے امریکہ جا رہا تھا' اس کے تعارف میں چھٹیوں والی بات حیران کن تھی' ہمارے ملک میں پٹواری اور ایس ایچ او کے سوا کوئی سرکاری ملازم پہلے سال چھٹیاں گزارنے امریکہ نہیں جا سکتا' میں نے اسے کریدنا شروع کر دیا' اس نے بتایا یہ دورہ خالصتاً ذاتی تھا اور اس کے تمام اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کر رہا تھا' اس کا کہنا تھا وہ خاندانی لحاظ سے بھی کوئی خوشحال شخص نہیں اور پچھلے پانچ برسوں میں اس کے والدین نے اسے ایک پائی نہیں دی' میں نے آخر میں اس سے وزٹ کے اخراجات کے بارے میں پوچھ لیا' یہاں سے کہانی نے ٹرن لیا' اس نے بتایا سنگاپور کی بیوروکریسی ایفی شینسی اور ڈلیوری میں دنیا میں پہلے نمبر پر ہے' سنگاپور کے اس اعزاز کی دو بڑی وجوہات ہیں' پہلے نمبر پر ٹیلنٹ آتا ہے' سنگاپور کی حکومت یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بہترین طالب علموں کو نوکری کی پیشکش کرتی ہے اور دوسرے نمبر پر سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کا پیکج ہے'

سنگاپور میں سرکاری ملازمین کی تنخواہیں نجی شعبے کو سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہیں' اگر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اسسٹنٹ کو پانچ ہزار ڈالر تنخواہ دیتی ہیں تو حکومت بھی اس گریڈ کے ملازمین کی تنخواہ اور مراعات پانچ ہزار ڈالر کر دیتی ہے' سنگاپور میں سرکاری اور نجی شعبے کے ڈاکٹر' سیکورٹی افسر' اکاؤنٹس آفیسر' منیجر' کلرک اور چیف ایگزیکٹوز کے پیکج یکساں ہوتے ہیں لہٰذا سنگاپور دنیا کا واحد ملک ہے جس میں لوگ نجی شعبوں سے ٹوٹ کر سرکاری محکموں میں آتے ہیں' اس نے بتایا سنگاپور کے سرکاری افسر اس قدر خوشحال ہیں کہ وہ اپنی جیب سے امریکہ میں چھٹیاں گزار سکتے ہیں' ان کی اس خوشحالی کے نتیجے میں سنگاپور نے "بیسٹ بیوروکریٹک سسٹم" کا اعزاز حاصل کیا ہے' اس نے بتایا سنگاپور میں بڑے سے بڑا فیصلہ اور مشکل سے مشکل ترین فائل بھی تکمیل کیلئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لیتی' کسی سائل کو اپنے کام کیلئے انتظار نہیں کرنا پڑتا اور کوئی شخص کسی سرکاری محکمے کی شکایت نہیں کرتا' وہ جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر اترا' اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا لیکن مجھے ایک نیا راستہ ایک نئی سوچ دے گیا۔



بیوروکریسی کیا ہوتی ہے؟ بیوروکریسی عوامی حقوق کو عوام تک پہنچانے کا نظام ہوتا ہے' لوگوں کو انصاف چاہیے' لوگوں تک یہ انصاف بیوروکریسی پہنچائے گی' لوگوں کو دوا' تعلیم' خوراک اور صاف ستھرا ماحول چاہیے اور عوام کی یہ ساری ضرورتیں بیوروکریسی پوری کرے گی' بیوروکریسی بنیادی طور پر وہ دروازہ ہوتا ہے' جس سے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو گزرنا پڑتا ہے لہٰذا جب تک بیوروکریسی کا نظام ٹھیک نہیں ہوتا اس وقت تک ملک ٹھیک پرفارم نہیں کرتا' یہ حقیقت ہے بیوروکریٹک نظام سے اچھے نتائج لینے کیلئے بیوروکریٹس کا مطمئن' خوشحال اور ریلیکس رہنا ضروری ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے' جن کا سرکاری ملازم غیر مطمئن بھی ہے اور بدحال بھی لہٰذا ہمارے ملک میں دنیا کا انتہائی سست' اذیت ناک اور شرم انگیز سرکاری نظام پایا جاتا ہے' اس نظام میں آپ کو آکسیجن لینے کیلئے چپڑاسی سے وزیراعظم تک کا سفر کرنا پڑتا ہے اور اس کے باوجود آپ کو ایک گھونٹ آکسیجن نہیں ملتی' پاکستان کے انتہائی قابل اور پڑھے لکھے نوجوان سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحان دیتے ہیں لیکن جب یہ نوجوان بیوروکریسی کا حصہ بنتے ہیں تو یہ اس نظام کا ایک آدھ پرزہ مزید توڑ دیتے ہیں' جس کے بعد اس کی رفتار میں مزید کمی واقع ہو جاتی ہے' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے اور وہ وجہ ان لوگوں کا پیکج ہے' ایک سرکاری ملازم اور پرائیویٹ ملازم کی تنخواہ میں اتنا واضح فرق ہے کہ سرکاری ملازم

کیلئے رشوت کے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا آپ کو یقین نہ آئے تو آپ پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان میں پہلی دس پوزیشنیں حاصل کرنے والے نوجوانوں کا پیکج دیکھ لیں' آپ کو معلوم ہوگا ان کے مقابلے میں کم صلاحیت کے نوجوان پرائیویٹ سیکٹر میں دو دو لاکھ روپے تنخواہ لے رہے ہیں جبکہ سی ایس ایس میں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو دس ہزار روپے سیلری مل رہی ہے' ذرا خود سوچئے اس تنخواہ میں یہ لوگ کام کا جذبہ کہاں سے لائیں گے' چیف سیکرٹری صوبے کا سب سے بڑا افسر ہوتا ہے' وہ پورے صوبے کا بیوروکریٹک نظام چلاتا ہے' فیڈرل شریعت کورٹ کے رجسٹرار میرے دوست ہیں' وہ گزشتہ روز مجھے پنجاب کے چیف سیکرٹری سلیمان صدیق کے بارے میں بتا رہے تھے' ان کا کہنا تھا سلیمان صدیق صبح آٹھ بجے دفتر آتے ہیں اور رات دس گیارہ بجے تک دفتر میں کام کرتے ہیں جبکہ ان کا پیکج صرف 45 ہزار روپے ہے' یہ تنخواہ شیل کمپنی' یونی لیور' پاکستان ٹوبیکو کمپنی یا بحریہ ٹاؤن کے کسی جونیئر افسر کے پیکج سے بھی کم ہے' پاکستان میں ٹرک چلانے والے لوگ بھی مہینے میں اس سے زیادہ پیسے کما لیتے ہیں' آپ 45 ہزار روپے ماہانہ میں اپنے ایک بچے کو کسی اچھے تعلیمی ادارے میں تعلیم نہیں دے سکتے لہٰذا خود بتایئے کیا اس پیکج سے چیف سیکرٹری کی کارکردگی متاثر نہیں ہوگی' آپ چیف سیکرٹری کے پیکج کو سامنے رکھ کر ڈی سی او اور اسسٹنٹ کمشنر کی تنخواہوں کا اندازہ بھی کر لیجئے' حکومت ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ کو جتنی تنخواہ دیتی ہے اتنی رقم ایک درمیانے درجے کا ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹس سے ایک دن میں کما لیتا ہے اور ایک درمیانے درجے کی کمپنی کا سیکورٹی افسر شہر کے ایس ایس پی سے زیادہ تنخواہ لیتا ہے چنانچہ یہ تفاوت وہ بنیادی خامی ہے جس کی وجہ سے ہمارے سرکاری نظام کی کارکردگی شرمناک شکل اختیار کر چکی ہے۔



حکومت نے اس ظلم پر ایک اور ظلم ''ایم پی گریڈ ون'' سکیم کی شکل میں کیا' حکومت مختلف اتھارٹیوں' کمشنوں اور کارپوریشنوں کی سربراہی کیلئے مارکیٹ سے منیجر ہائر کر رہی ہے اور ان لوگوں کو تین ساڑھے تین لاکھ روپے تنخواہ دی جاتی ہے' یہ لوگ آگے چل کر ایک ایسے سیکرٹری یا چیف سیکرٹری کی ''قیادت'' میں کام کرتے ہیں جس کا پیکج چالیس پینتالیس ہزار روپے ہوتا ہے' آپ خود فیصلہ کیجئے سیکرٹری ساڑھے تین لاکھ کے چیئرمین کے ساتھ کام کرتے ہوئے کیا محسوس کرتا ہوگا' میں کل اخبار میں خبر پڑھ رہا تھا حکومت نے ان لاکھ پتی چیئرمینوں کی تنخواہ میں مزید 60 ہزار روپے اضافہ کر دیا' ان لوگوں کو اس کے علاوہ 50 فیصد اضافی ہاؤس رینٹ اور یوٹیلٹی بلز کی مد میں مزید 20 ہزار روپے بھی ملیں گے' یہ سیدھی سادھی زیادتی ہے' میرا خیال ہے حکومت اگر

تمام سرکاری شعبوں کے انتظامی افسروں کو ایم پی گریڈ ون دے دے اور ان کے پیکج کو ان کی کارکردگی سے منسلک کر دے تو بڑی حد تک پاکستان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں' مجھے معلوم ہے حکومت اس معاملے میں فنڈز کا رونا روئے گی لیکن اس کا حل بھی موجود ہے' حکومت اگر ایک سال تک صدر اور وزیراعظم کے شاہانہ دوروں پر پابندی لگا دے' کابینہ کا سائز کم کر دے' صدر اور وزیراعظم سمیت ملک کی دس بڑی شخصیات کی سرکاری گاڑیوں کی تعداد آدھی کر دے یا پھر پانچ بڑے شہروں کے پلاٹوں کی آمدنی کا صرف ایک فیصد ان لوگوں کی تنخواہوں کیلئے مختص کر دے تو یہ مسئلہ دو دن میں حل ہو سکتا ہے' ہمیں اس مسئلے پر ہٹلر جیسی سپرٹ کا مظاہرہ کرنا ہوگا' ہٹلر نے سرکاری ملازموں کو ان کی مرضی کا پیکج دیا تھا لیکن ان سے کام اپنی مرضی کے مطابق لیا تھا' ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ یہ سچ ہے جب آپ بھوکے کو مٹھائی سے مکھیاں اڑانے کی ذمہ داری سونپیں گے تو آپ کی مٹھائی کا قول کبھی پورا نہیں ہوگا' فرانسیسی کہاوت ہے ننگے ہمیشہ کفن چور ہوتے ہیں' ہماری بیوروکریسی پیٹ سے بھوکی اور تن سے ننگی ہے لہٰذا اس ملک میں ہمارے کفن محفوظ ہیں اور نہ ہی مٹھائی۔



⚙......⚙......⚙

# وی آر سوری



میں نے جہاز سے اترتے ہوئے اخبار اٹھالیا' یہ گلف نیوز کا دو مارچ 2007ء کا شمارہ تھا' اخبار کے اندرونی صفحات پر انتہائی دلچسپ تصویر چھپی تھی' تصویر کے اوپر "مارچ ٹو لندن" کی سرخی لگی تھی اور تصویر میں مختلف عمروں کی خواتین اور حضرات فٹ پاتھ پر مارچ کر رہے تھے' ان سب کے ہاتھ زنجیروں سے بندھے تھے اور ان کے گلے میں غلیل نما لکڑیاں تھیں' تصویر کے نیچے کیپشن میں لکھا تھا "ہل شہر کے سینکڑوں شہری غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہونے پر لندن تک مارچ کر رہے ہیں' یہ لوگ شدید بارش کے باوجود چار سو کلومیٹر تک مارچ کریں گے اور 25 مارچ کو لندن پہنچیں گے' اس مارچ کے دو مقصد ہیں' ان تمام لوگوں کی نسلوں سے معافی مانگنا جنہیں دو سو سال پہلے برطانوی باشندوں نے غلام بنا کر امریکہ میں بیچ دیا تھا اور دوسرا ہل شہر کے عظیم سپوت ولیم ویلبر فورس کو سلام عقیدت پیش کرنا جس کی بیس سالہ کوشش کی بدولت ہاؤس آف کامنز نے غلامی پر پابندی لگا دی" یہ اخبار پچھلے ایک ماہ دو دن سے میرے پاس پڑا ہے' میں روزانہ یہ تصویر دیکھتا ہوں اور اس کے بعد خود سے دو سوال پوچھتا ہوں' ولیم ویلبر فورس کون تھا اور کیا اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیے ہیں؟

ولیم ویلبر فورس برطانیہ کے خوبصورت شہر ہل کے ایک امیر خاندان کا فرد تھا' اس کا والد رابرٹ ویلبر فورس شہر کا سب سے بڑا تاجر تھا' ولیم 24 اگست 1759ء کو پیدا ہوا اور اس نے

1788ء میں ایم اے کی ڈگری لی لیکن وہ ایم اے سے آٹھ سال پہلے ہاؤس آف کامنز کا رکن بن چکا تھا' وہ دار العوام کا کم سن ترین رکن تھا' اس وقت اس کی عمر صرف 21 برس تھی' میں ولیم ویلبر فورس کی کہانی کو ذرا دیر کیلئے روکوں گا اور آپ کو اس سے تین سو سال پیچھے لے جانے کی کوشش کروں گا' کرسٹوفر کولمبس نے 1492ء میں امریکہ دریافت کیا تھا اور 1500ء میں یورپی تاجروں نے اس نئی دنیا پر یلغار کر دی تھی' شمالی اور جنوبی امریکہ اس وقت حقیقتاً سونے کی کان تھی' پورا براعظم جنگلی بھینسوں سے اٹا پڑا تھا' زمین کے ایک سرے سے دوسرے کونے تک جنگل ہی جنگل تھے اور جنگلات کے بعد سونے' چاندی اور ہیروں کی ہزاروں کانیں تھیں' امریکہ کی زمین گنے سے لے کر مکئی اور سورج مکھی سے لے کر تمباکو تک ہر قسم کی فصل کیلئے انتہائی سود مند تھی چنانچہ یورپی تاجر امریکہ اور لاطینی امریکہ پہنچے انہوں نے بندوق کے زور پر مقامی آبادی کو غلام بنایا اور انہیں کانوں سے سونا نکالنے اور زمین پر گنا' مکئی اور تمباکو کاشت کرنے پر لگا دیا' یورپی تاجر ظالم اور بے رحم تھے لہٰذا یہ مقامی لوگوں سے غیر انسانی سطح پر کام لیتے تھے' اس زیادتی کے نتیجے میں مقامی آبادی تیزی سے کم ہونے لگی' آپ اس کی مثال صرف کیوبا سے لیجئے' 1500ء میں کیوبا کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ تھی' 1511ء میں ہسپانوی فوجیوں نے کیوبا میں کالونی قائم کی' کیوبا کے لوگوں کو غلام بنایا اور انہیں سونا نکالنے پر لگا دیا' کیوبا کے لوگ شدید غذائی قلت' بیماریوں اور مظالم کا شکار ہونے لگے یہاں تک کہ 1517ء میں محض چھ برس بعد کیوبا کی آبادی صرف دو ہزار رہ گئی' یہی حالت برازیل' میکسیکو' ارجنٹائن' بولیویا' کولمبیا' وینزویلا اور چلی کی تھی جبکہ شمالی امریکہ میں ٹیکساس' کیلیفورنیا اور نیویارک کی حالت اس سے بھی پتلی تھی' ورجینیا کے ڈچ حکمران تمباکو کی فصل بو لیتے تھے تو انہیں تمباکو سکھانے اور سمیٹنے والے لوگ نہیں ملتے تھے' پرتگالی طالع آزما فلوریڈا کے جنگلوں میں روز دو سو بھینسے مار لیتے تھے لیکن انہیں بھینسوں کی کھال اتارنے والے نہیں ملتے تھے اسی طرح مین ہیٹن میں کماد کی فصل کھڑی کھڑی سوکھ جاتی تھی لیکن ولندیزی اور برطانوی زمینداروں کو فصل کاٹنے والے نہیں ملتے تھے چنانچہ امریکہ کے تمام یورپی آقا افرادی قوت کے شدید بحران کا شکار ہو گئے' ہسپانوی' ولندیزی اور پرتگیزی تاجروں نے جلد ہی اس کا حل نکال لیا' یہ لوگ بحری جہاز لے کر افریقہ پہنچے' سیاہ فاموں کا پورا پورا قبیلہ اغواء کرتے اور انہیں امریکہ لا کر کھیتوں' جنگلوں اور کانوں پر لگا دیتے' یہ سلسلہ چل پڑا تو سیاہ فام لوگوں کا اغواء اور انہیں امریکہ پہنچانے کا کام باقاعدہ تجارت کی شکل اختیار کر گیا' بارسلونا' ایمسٹرڈیم' نیپلز اور اینڈورین میں

تجارتی کمپنیاں بنیں اور یہ کمپنیاں غلامی کی باقاعدہ تجارت کرنے لگیں' یہ کمپنیاں دو طریقوں سے غلام حاصل کرتی تھیں' یہ گھانا' کانگو' انگولا' گیانا اور مغربی افریقہ سے لوگوں کو زبردستی اغواء کر لیتے تھے یا پھر شراب' تلواروں' بندوقوں اور سونے کے سکوں کے عوض لوگوں کو خرید لیتے' یہ لوگ بعد ازاں منڈیوں میں لائے جاتے' ان کی بولی دی جاتی اور یہ مختلف خریداروں کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے امریکہ پہنچ جاتے' ایک اندازے کے مطابق 1500ء سے 1850ء تک افریقہ سے ایک کروڑ 20 لاکھ غلام امریکہ لائے گئے' ابتداء میں یہ تجارت صرف سپین' ہالینڈ اور پرتگال تک محدود تھی لیکن پھر برطانیہ بھی اس کاروبار میں کود پڑا' برطانیہ نے 1730ء میں غلاموں کی تجارت شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا سے آگے نکل گیا' 1780ء میں دنیا میں غلاموں کی چار بڑی منڈیاں اور غلاموں کو امریکہ پہنچانے کی چار ہی بڑی بندرگاہیں تھیں' یہ چاروں منڈیاں اور بندرگاہیں برطانیہ میں تھیں' یہ منڈیاں لیورپول' لندن' برسٹول اور لین کیسٹر میں قائم تھیں' برطانوی تاجر اس کاروبار میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے 1790ء تک 34 لاکھ غلام افریقہ سے اغواء کر کے امریکہ میں بیچے۔



اب ہم واپس ولیم ولبر فورس کی طرف آتے ہیں' ولیم اس تجارت کو انسانیت کی تذلیل سمجھتا تھا' اس نے 12 مئی 1789ء کو ہاؤس آف کامنز میں پہلی بار انسانی تجارت کے خلاف آواز اٹھائی' اس وقت وہ اس ایشو پر بولنے والا پہلا شخص تھا' وہ پورا سال بولتا رہا یہاں تک کہ ہاؤس نے 1790ء میں یہ مسئلہ پارلیمانی سلیکٹ کمیٹی کے حوالے کر دیا' ولیم نے اپریل 1791ء میں پارلیمنٹ میں پہلی بار غلاموں کی تجارت کے خلاف بل پیش کیا لیکن بدقسمتی سے وہ 88 کے مقابلے میں 163 ووٹوں سے ہار گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری' وہ ہر سال اسمبلی میں بل پیش کرتا رہا یہاں تک کہ 20 برس بعد مارچ 1807ء آ گیا اور ولیم ولبر فورس 16 ووٹوں سے جیت گیا' یوں برطانیہ میں 25 مارچ 1807ء کو غلاموں کی تجارت پر پابندی لگ گئی' ولیم ولبر فورس 29 جولائی 1833ء تک زندہ رہا' وہ 1807ء کے بعد جب بھی لوگوں سے ملتا تھا وہ کہتا تھا ''میں نے ایک چھوٹی سی مچھلی میز پر لا کر رکھ دی' میں دیکھتا رہا' دیکھتا رہا اور ایک دن یہ مچھلی وہیل بن گئی'' ولیم ولبر فورس کی بات درست تھی' اس کی بیس سال کی محنت رنگ لائی اور اس نے افریقہ کے ان تمام بچوں کو خوف سے آزاد کر دیا جو ماؤں کی کوکھ میں سہمے بیٹھے تھے' اس نے انسانوں کو

انسان ہونے کا فخر واپس کر دیا لہٰذا وہ دن ہے اور آج کا دن ہل کے لوگ ہر سال مارچ کے مہینے میں ولیم ویلبر فورس کی یاد میں بے شمار تقریبات کرتے ہیں۔

مارچ 2007ء میں برطانیہ میں غلامی پر پابندی کے دو سو سال پورے ہو گئے تھے لہٰذا ہل کے لوگوں نے اس دن کو منانے کیلئے خصوصی اہتمام کا فیصلہ کیا' انہوں نے ہل سے لندن تک 400 کلومیٹر لمبا مارچ کرنے کا اعلان کیا' یہ معافی کا مارچ تھا' اس مارچ کے ذریعے ہل کے لوگوں نے ان تمام سیاہ فاموں کی روحوں اور نسلوں سے معافی مانگ لی جنہیں برطانوی تاجروں نے امریکہ میں بیچ دیا تھا' میں نے جب سے یہ تصویر دیکھی ہے میں اس وقت سے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں ''کیا اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام اچھے کام یورپی لوگوں کے نصیب میں لکھ دیئے ہیں'' مجھے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا' میں روز سوچتا ہوں کیا ہمارے ملک میں بھی کسی گروہ' کسی طبقہ فکر کو قوم سے معافی مانگنے کی جرأت ہو گی' کیا غلام محمد سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک وہ تمام حکمران قوم سے اجتماعی معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے اس ملک کے اقتدار پر شب خون مارا تھا' کیا ہمارے وہ تمام سیاستدان قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں' جنہوں نے اس ملک میں آمروں کے پاؤں اور ہاتھ مضبوط بنائے تھے' کیا کبھی یہ لوگ بھی کسی ایک شہر میں اکٹھے ہو کر اپنی سیاسی بد دیانتیوں' اپنی سیاسی مصلحتوں اور اپنی ضمیر فروشیوں کا اعتراف کر سکتے ہیں اور اس کے بعد قوم سے اتنا کہہ سکتے ہیں ''وی آر سوری'' کیا پی سی او کے تحت حلف لینے والے تمام سابق اور موجودہ جج قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں' کیا اس ملک کے تمام دانشور' ادیب' شاعر اور صحافی اپنی مصلحتوں' اپنے سمجھوتوں اور اپنی ضمیر فروشیوں پر قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں اور کیا وہ تمام سابق فوجی افسر قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جنہوں نے صدر ایوب سے لے کر یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک جرنیلوں کو اقتدار تک پہنچایا تھا اور جو اس ملک کے آئین' قانون' دستور اور جمہوریت کو نقصان پہنچانے میں برابر کے شریک رہے تھے اور کیا اس ملک کے وہ تمام تاجر' استاد' وکیل اور ڈاکٹر بھی قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں جو ہر ظلم چپ چاپ سہتے رہے' جو ہر زیادتی برداشت کر گئے اور جو ہمیں ایک ایسا ملک دے کر ریٹائر ہو گئے جس میں انصاف ہے' روزگار ہے اور نہ ہی میرٹ' کیا اس ملک کے کسی طبقے میں اتنی جرأت' اتنی ہمت موجود ہے' یقین کیجئے میں اس دن اس ملک اور اس میں رہنے والوں کو مسلمان سمجھوں گا جب جنرل سوار خان سے

لے کر جنرل حمید گل اور جسٹس شیخ ریاض سے لے کر مولانا فضل الرحمٰن اور اعجاز الحق سے لے کر چودھری شجاعت تک اس ملک کے تمام زندہ اکابرین ملک پر مارشل لاء لگانے' پی سی او کے تحت حلف اٹھانے' ق لیگ بنانے اور یونیفارم کے حق میں ووٹ دینے پر قوم سے معافی مانگیں گے' جب یہ سب لوگ گلے میں وی آر سوری کی تختیاں لٹکا کر سڑکوں پر مارچ کریں گے' کاش میری زندگی میں وہ دن آ جائے۔

# سیلی بریشن

میں 2001ء میں آخری مرتبہ امریکہ گیا تھا۔ یہ دورہ امریکی حکومت کی طرف سے تھا اور اس کے تمام تر اخراجات واشنگٹن کی ایک فاؤنڈیشن نے ادا کیے تھے۔ یہ فاؤنڈیشن امریکہ کے ایک سرمایہ دار خاندان نے قائم کی تھی اور یہ تیسری دنیا کے نوجوان صحافیوں کو امریکہ کی دس ریاستوں کی سیر کراتی تھی۔ مجھے 2001ء میں اس فاؤنڈیشن کا مہمان بننے کا موقع ملا، فاؤنڈیشن کا دفتر سرمایہ دار خاندان کے محل میں قائم تھا' یہ محل واشنگٹن کے عین قلب میں واقع تھا اور یقیناً کروڑوں ڈالر مالیت کا ہوگا۔ ہمیں دورے کے پہلے دن اس محل میں لے جایا گیا اور فاؤنڈیشن کے بارے میں بریفنگ دی گئی۔ یہ بریفنگ ایک نیم سیاہ فام امریکی ڈاکٹر فلپ دے رہا تھا۔ بریفنگ کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں باہر کھلی ہوا میں آ گیا۔ یہ محل کا خوبصورت گارڈن تھا، باغ میں بلند و بالا درخت تھے اور دور دور تک چمکیلی کیاریوں میں پھول لہرا رہے تھے۔ میں بینچ پر بیٹھ گیا، ڈاکٹر فلپ بھی باہر آ گیا، امریکہ میں عمارتوں کے اندر سگریٹ پینے پر پابندی ہے لہٰذا ڈاکٹر فلپ سگریٹ پینے کے لیے باہر آیا تھا۔ میں بینچ سے اٹھا اور ڈاکٹر فلپ کے ساتھ گپ شپ شروع کر دی۔ وہ کیلیفورنیا کا رہنے والا تھا۔ اس کے والدین سات نسل پہلے افریقہ سے آئے تھے، اس کا والد سیاہ فام جبکہ ماں میکسیکن تھی لہٰذا اس کا رنگ سیاہ سے نیم سیاہ ہو گیا تھا، وہ یونیورسٹی میں ریسرچ پڑھاتا تھا اور 80ء کی دہائی میں ایک سال کراچی رہا تھا۔ پاکستان کا ذکر آیا تو اس نے کراچی کی

باتیں چھیڑ دیں۔ اسے کراچی کا ہلہ گلہ اور لوگ بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے بتایا کراچی میں اسے ایک حکیم صاحب ملے تھے۔ وہ بہت حلیم الطبع اور شائستہ انسان تھے، فلپ اکثر ان کے کلینک چلا جاتا تھا۔ وہ حکیم صاحب بعد ازاں کراچی کے گورنر بھی بنے تھے فلپ بار بار ان کا نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر اسے ان کا نام یاد نہیں آ رہا تھا، میں نے اسے بتایا' ان کا نام حکیم سعید تھا اور وہ بدقسمتی سے 1997ء میں شہید ہو گئے ہیں'' اس کے منہ سے آہ نکلی اور وہ چند لمحوں کے لیے اداس ہو گیا۔ میں نے اسے بتایا' میں نے حکیم سعید کی شہادت پر کالم لکھا تھا جس پر مجھے 1997ء کے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ ملا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی، اس نے فوراً سگریٹ بجھایا۔ سگریٹ کا ٹوٹا گارڈن کی باؤنڈری وال پر رکھا اور مسکرا کر تالیاں بجانے لگا۔ میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ تالیاں بجانے کے بعد اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے بڑی گرم جوشی سے مبارکباد پیش کی۔ میں نے جھجک کر اس کا شکریہ ادا کیا' اس نے سگریٹ کا ٹوٹا دوبارہ جلایا، تین چار لمبے کش لیے، ٹوٹا ''ڈسٹ بین' میں پھینکا اور اندر چلا گیا لیکن میں ڈاکٹر فلپ کے ردعمل کے بارے میں سوچتا رہا، مجھے محسوس ہوا میں نے جب اپنے ایوارڈ کے بارے میں اسے بتایا تھا تو اس نے اندازہ لگایا یہ میری زندگی کی ایک بڑی اچیومنٹ ہے اور اسے میری اچیومنٹ کو ''سیلی بریٹ'' کرنا چاہیے چنانچہ اس نے سگریٹ بجھایا اور تنہائی میں کھڑے ہو کر میرے لیے تالیاں بجانا شروع کر دیں اس کی یہ ادا' وہ لمحہ اور وہ گارڈن ہمیشہ ہمیشہ کیلئے میری یادداشت کا حصہ بن گیا۔

ڈاکٹر فلپ کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دس منٹ مجھے زندگی بھر کے لیے ایک نیا سبق دے گئے۔ وہ سبق ''سیلی بریشن'' تھا۔ ڈاکٹر فلپ نے مجھے سکھایا، ہمارے دوست، ہمارے عزیز رشتے دار، بہن، بھائی، ہمسائے اور ساتھی اپنی کامیابیوں پر ہم سے مبارکباد کی توقع رکھتے ہیں۔ کسی نے اچھی تصویر بنائی ہے، کسی کی آواز اچھی ہے اور اس اچھی آواز کی وجہ سے اسے کوئی ایوارڈ ملا ہے۔ کسی نے اچھا مضمون لکھا ہے۔ کسی نے اچھی تقریر کی ہے، کسی نے امتحان میں اچھے نمبر لیے ہیں، کسی کی تنخواہ میں دو سو روپے اضافہ ہو گیا، کسی نے گالف کھیلنا شروع کر دی، کسی نے گھر بنایا، کسی نے شادی کی، کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا، کسی کے بچے نے سکول میں انعام لیا' کسی کی بیوی نے اچھا اچار بنایا، کوئی اچھی ٹائی لگا کر آیا اور کسی کا عزیز رشتے دار جرنیل بن گیا' یہ سب لوگ اپنی کامیابیوں کی ''سیلی بریشن'' چاہتے ہیں۔ ان کے دل کے کسی گوشے میں مبارکباد کی خواہش انگڑائی لیتی ہے اور جو شخص ان کی یہ خواہش پوری کر دیتا ہے وہ ڈاکٹر فلپ کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے

لیے ان کے دل میں جگہ پالیتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ''سیلی بریشن'' ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو انسان کے حوصلے میں دس گنا اضافہ کردیتی ہے' جو لوگوں کا ٹیلنٹ بڑھاتی ہے اور جو لوگوں کی کامیابیوں میں اضافہ کرتی ہے مجھے محسوس ہوا مغربی معاشروں اور ہمارے ملکوں میں ایک فرق سیلی بریشن بھی ہے۔ وہ لوگ دوسروں کی خوشیوں اور کامیابیوں کو سیلی بریٹ کرتے ہیں، وہ لوگ ایک دوسرے کو کارڈ اور پھول بھجواتے ہیں، ایک دوسرے کے لیے تالیاں بجاتے ہیں اور وہ لوگوں کو متوجہ کر کے اعلان کرتے ہیں '' خواتین وحضرات میرے اس دوست سے ملئے، اس کے کھیت میں ایک کلو کا ٹماٹر پیدا ہوا تھا یا کل اس کی بلی نے چھ بچے دیئے تھے'' اور لوگ کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہیں، مجھے یاد آیا میں ایک بار ہالینڈ کی ایک فیملی کا مہمان بنا تھا، ان دنوں میزبان کے بچے نے زندگی کی پہلی ڈرائنگ بنائی تھی، میرا میزبان گھر آنے والے ہر ملاقاتی کو بچے کا کارنامہ بتاتا تھا اور بچے اور ڈرائنگ دونوں کو ملاقاتی کے حضور پیش کر دیتا تھا۔ ملاقاتی جی بھر کر بچے کے ٹیلنٹ اور ڈرائنگ کی تعریف کرتا تھا، میزبان نے مجھے بھی ڈرائنگ دکھائی، وہ ایک انتہائی فضول اور بھدی ڈرائنگ تھی' میں نے محسوس کیا لوگ صرف بچے کی حوصلہ افزائی کیلئے اس ڈرائنگ کی تعریف کررہے ہیں۔ مجھے اس وقت یہ بات عجیب لگی لیکن بعد ازاں معلوم ہوا یورپ میں لوگ دوسروں کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض اور ذمہ داری سمجھتے ہیں، وہاں لوگ دوسروں کی خوشیوں کو سیلی برٹ کرتے ہیں۔ یورپ میں لوگ ایک دوسرے کو ملنے کے فوراً بعد '' نائس ٹائی یا نائس سوٹ'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور پھول اور کارڈ سے دوسروں کا استقبال کرتے ہیں اور یہ عادت یورپ کی کامیابی کی بڑی وجہ ہے۔



میں نے ڈاکٹر فلپ کے بعد مغربی سوسائٹی اور پاکستانی معاشرے کا تقابل کیا تو معلوم ہوا ہم لوگ سیلی بریشن کے معاملے میں بہت کنجوس ہیں۔ ہم دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، مبارکباد پیش کرتے ہوئے یا دوسروں کے حق میں تالیاں بجاتے ہوئے شرما جاتے ہیں، ہم دوسروں سے دس ہزار گلے کرلیں گے لیکن ان کی خوشی میں شریک ہونے سے گریز کریں گے۔ ہم لوگوں کو خوش ہونا اور خوشی منانا نہیں آتا، آپ پاکستان کی شادیوں کو دیکھ لیجئے' پاکستان کی ہر شادی کا آغاز ناراضی سے ہوتا ہے، عین شادی کے دن سارا خاندان ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتا ہے۔ بارات آنے پر پتہ چلتا ہے دولہے کی بھابھی راستے سے واپس چلی گئی تھی یا بہن نے ناشتہ نہ ملنے پر رو رو کر حشر کر دیا تھا، پاکستان کی تمام پھوپھیاں، چاچے اور ماموں شادی پر ضرور

ناراض ہوتے ہیں، اسی طرح بچے کا نام رکھنے پر اکثر گھروں میں فساد ہو جاتا ہے۔ نئی گاڑی لینے، ملک سے باہر جانے یا سسرال کو تحفہ دینے پر بھی آدھا خاندان ناراض ہو جاتا ہے، میں نے اکثر پروموشن پانے والے لوگوں کے بارے میں کولیگ کو کہتے سنا "یہ خوشامدی تھا، صاحب کا سالہ تھا یا سازشی تھا لہٰذا اسے پروموشن مل گئی" میں نے ہمیشہ امتحانوں میں زیادہ نمبر لینے والے طالب علموں پر نقل کا الزام لگتے دیکھا' میں نے لوگوں کو نوکری پانے والے امیدواروں کو ہمیشہ سفارشی کہتے پایا اور میں نے ہمیشہ ناکام سیاستدانوں کے منہ سے دھاندلی کا الزام سنا' میں نے آج تک پاکستان کے کسی والد کو اپنے بیٹے یا بیٹی کی آواز، ڈرائنگ یا کھیل کی تعریف کرتے نہیں دیکھا اور میں نے آج تک کسی شخص کے منہ سے کسی سیلف میڈ کی اچھائی نہیں سنی۔ میں نے آج تک ہر شخص کی کامیابی پر دوسروں کو کڑھتے اور جلتے ہوئے دیکھا۔ میرے ایک دوست کل دوسرے دوست پر رشوت خوری کا الزام لگا رہے تھے، میں نے وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر بولے "اس نے ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنا لیا" میں نے کہا "ملازمت کے پانچویں سال میں گھر بنانے کا مطلب رشوت تو نہیں ہوتا، کیا تم نے کبھی اسے رشوت لیتے دیکھا، کسی نے تمہیں بتایا اور کیا آج تک اس کے خلاف رشوت ستانی کا کوئی کیس درج ہوا" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں دوسرے دوست کو بھی جانتا تھا' مجھے معلوم تھا اس نے بے شمار لوگوں سے قرض لے کر مکان بنایا تھا لیکن میرا دوست میری بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، یہ ایک جیلس رویہ تھا' ہمارا پورا معاشرہ اس جیلس رویے کا شکار ہے، ہم دوسروں کی کامیابیوں میں خامیاں تلاش کرتے ہیں شاید یہی وجہ ہے ہمارے ہاں ٹیلنٹ پروان نہیں چڑھ رہا، ہم لوگ دوسرے کی خوشی پر خوش نہیں ہوتے' شاید یہی وجہ ہے ہم سب میں خوشی ختم ہوتی جا رہی ہے' ہم لوگ بھول گئے ہیں' خوشی ہمیشہ دوسرے لوگوں کو خوش دیکھ کر ملتی ہے اور جب تک آپ دوسروں کی کامیابی کو تسلیم نہیں کرتے آپ خود کبھی کامیاب نہیں ہوتے، ہم لوگ بھول گئے ہیں خوشی کی بیل ہمیشہ ہمسائے کے صحن میں لگتی ہے اور وہاں سے ہوتی ہوئی ہمارے صحن میں سایہ کرتی ہے اور ہم بھول گئے ہیں اگر ہمسایہ خوش نہیں ہوگا تو ہم تک کبھی خوشی نہیں پہنچے گی اور اگر ہم دوسروں کی خوشی کو سیلی بریٹ نہیں کریں گے تو دوسرے کبھی ہماری کامیابیوں کو "سیلی بریشن" کی کھاد نہیں دیں گے۔

# ترتیب

خواجہ صاحب نے فرمایا ”بنیادی طور پر ہماری ترتیب غلط ہے‘ ہماری ترجیحات درست نہیں‘ مثلاً آپ دنیاداری کو لے لیجئے پاکستان میں میٹرک میں اچھے نمبر لینے والے بچے کیا کرتے ہیں؟“ وہ خاموش ہوئے اور میری طرف دیکھنے لگے‘ میں نے جواب دیا ”وہ ایف ایس سی میں داخلہ لیتے ہیں‘ وہ میڈیکل میں چلے جاتے ہیں یا انجینئرنگ کا شعبہ اختیار کر لیتے ہیں“ وہ مسکرائے ”بالکل ٹھیک‘ یہ بچے سائنس کا شعبہ منتخب کرتے ہیں‘ یہ ڈاکٹر بن جاتے ہیں یا انجینئر‘ جبکہ کم نمبر لینے والے بچے ایف اے کرتے ہیں اور اس کے بعد بی اے کر لیتے ہیں‘ بی اے میں زیادہ نمبر لینے والے بچے ایم اے یا ایم ایس سی کرتے ہیں‘ کسی کالج میں لیکچرار بھرتی ہوتے ہیں یا پھر ایم فل اور پی ایچ ڈی کر لیتے ہیں جبکہ کم نمبر والے سی ایس ایس کرتے ہیں اور بیوروکریٹس بن جاتے ہیں‘ تعلیم کے اس کھیل میں پیچھے رہ جانے والے بچے سیدھے سیاست کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں‘ یہ لوگ کونسلر بنتے ہیں‘ ناظم منتخب ہوتے ہیں‘ ایم پی اے‘ ایم این اے اور سینیٹر بنتے ہیں‘ مشیر اور وزیر بن جاتے ہیں اور پھر پورا ملک چلاتے ہیں“ وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور اس کے بعد بولے ”تم اس سارے عمل کا جائزہ لو‘ کلاس میں سب سے لائق بچہ ڈاکٹر بنا‘ اس سے کم لائق بچہ بیوروکریسی میں آیا اور سب سے لائق بچے کا باس بن گیا اور کلاس کا سب سے نالائق بچہ سیاست میں گیا اور پورے صوبے یا پورے ملک کے ڈاکٹروں اور بیوروکریٹس کا افسر بن گیا اور اس کے ہاتھ میں

پورے ڈیپارٹمنٹ کی عنان آ گئی" میں ہنس پڑا' ان کی بات واقعی دلچسپ تھی۔

وہ مسکرائے اور اسی نرم آواز میں بولے "یہ پورے معاشرے کا المیہ ہے' تم غور کرو ہمارے معاشرے کا ناکام شاگرد بڑا ہو کر کیا بنتا ہے وہ استاد بن جاتا ہے' ناکام استاد وائس چانسلر ہو جاتا ہے' ناکام ڈاکٹر دواؤں کی فیکٹری لگا لیتا ہے یا ہسپتال کا مالک بن جاتا ہے' نالائق انجینئر چند برسوں میں چیف انجینئر بن جاتا ہے' ناکام وکیل جج بھرتی ہو جاتا ہے' بے ایمان اور چور شخص زکوٰۃ کمیٹی کا چیئرمین بن جاتا ہے' ناکام کرکٹر پاکستان کرکٹ بورڈ کا چیئرمین ہو جاتا ہے' ناکام خاوند اور مایوس باپ سفیر بنا دیا جاتا ہے' نوکری کے انٹرویو میں فیل ہونے والا نوجوان کمپنیوں کا مالک بن جاتا ہے' سکول میں بچوں کے لنچ باکس چوری کرنے والا شخص بینک منیجر ہو جاتا ہے اور سکول اور کالج کے ہر امتحان میں فیل ہونے والا بچہ وزیر تعلیم بن جاتا ہے" وہ دم لینے کے لئے رکے اور لمبا سانس بھر کر بولے "تم دیکھ لو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری ترتیب الٹ ہے' ہم میں سے ہر شخص کا باس ہم سے نالائق ہے' معاشرے میں ہر باصلاحیت شخص کے اوپر ایک نالائق اور کم صلاحیت کا شخص بیٹھا ہے' تم سیاست کو دیکھ لو سیاست ملک کا سب سے اہم شعبہ ہوتا ہے لیکن تم یونین کونسل سے پارلیمنٹ تک تمام سیاستدانوں کو دیکھو تمہیں ان میں دنیا جہان کی خرابیاں اور خامیاں ملیں گی' استاد معاشروں کے معمار ہوتے ہیں' تم اپنے استادوں کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو' بیورو کریٹس سسٹم کی مائیں ہوتے ہیں' تم ان کا معیار اور صلاحیت دیکھ لو' کاروباری لوگ معاشروں کا خون ہوتے ہیں تم ان لوگوں کی ذہنیت اور خیالات دیکھ لو' پروفیشنل لوگ معاشروں کا جسم ہوتے ہیں تم ان کو دیکھ لو اور دانشور' صحافی اور ادیب قوموں کی روح ہوتے ہیں یہ لوگ عوام کی کردار سازی کرتے ہیں تم ان لوگوں کا معیار بھی دیکھ لو' تمہیں شرم آئے گی" وہ رکے اور دوبارہ بولے "تم مجھے بتاؤ کیا ہم نے پچھلے ساٹھ برسوں میں عالمی سطح کا کوئی دانشور' ادیب اور صحافی پیدا کیا؟ کیا ہم نے عالمی سطح کی کوئی ایک کمپنی بنائی؟ کیا ہم نے عالمی سطح کا کوئی ایک چیف ایگزیکٹو' کوئی ایک انجینئر' کوئی ایک ڈاکٹر' کوئی ایک وکیل اور کوئی ایک سیاستدان پیدا کیا؟ کیا ہم اپنے کسی ایک سیاستدان کا تقابل یورپ' امریکہ اور جاپان کے سیاستدانوں سے کر سکتے ہیں" انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا' میں نے انکار میں سر ہلا دیا' وہ مسکرائے "یہی وجہ ہے تم اکیسویں صدی میں یونیفارم کا دفاع کر رہے ہیں' ہمارے وزیر اعلیٰ پنجاب جناب چودھری پرویز الٰہی جلسہ عام میں اعلان کرتے ہیں وہ جنرل پرویز مشرف کو یونیفارم کے ساتھ دس مرتبہ صدر منتخب کریں گے اور

ہماری اسمبلیاں وردی کے حق میں قراردادیں پاس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے بیوروکریٹک سسٹم کو دنیا کا نالائق ترین نظام قرار دیا جاتا ہے، ہمارے ڈاکٹروں کو قصائی کا خطاب ملتا ہے، دنیا ہماری عدالتوں کو ''کینگرو کورٹس'' کہتی ہے اور ہماری انڈسٹری کو جعلی صنعت کہا جاتا ہے'' وہ رک گئے، میں ان کی بات غور سے سن رہا تھا۔

وہ بولے ''ہم اب آتے ہیں دین کی طرف' دین کی حالت اس سے بھی خراب ہے، تم اپنے علماء کرام کی حالت دیکھ لو، یہ کون لوگ ہیں؟ کیا ہم لوگ خاندان کے معذور، کند ذہن اور بیمار بچے کو مولوی نہیں بناتے؟ کیا یہ بچے بعدازاں پورے ملک کی امامت نہیں کرتے، کیا یہ لوگ بعد ازاں ہم لوگوں کا اسلام سیدھا اور معاشرے کی دینی تربیت نہیں کرتے؟'' وہ رکے اور دوبارہ بولے ''حقیقت تو یہ ہے ہمارے دینی طبقے کے نوے فیصد لوگ انگریزی نہیں جانتے، یہ لوگ ہوائی جہاز پر نہیں بیٹھتے، انہیں کمپیوٹر چلانا نہیں آتا اور یہ پاکستان کا جغرافیہ نہیں بتا سکتے، تم خود دیکھو ہم دین کو کس قسم کا ''سٹف'' دے رہے ہیں، کیا آج تک پاکستان میں میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والا کوئی نوجوان مولوی بنا؟ کیا پی سی ایس اور سی ایس ایس میں اول پوزیشن حاصل کرنے والا کوئی افسر ہمارا امام بنا؟ کیا ہمارے ملک میں ہارورڈ، کیمبرج، آکسفورڈ اور ہائیڈل برگ کا کوئی ڈگری ہولڈر شخص عالم دین بنا، کیا آج تک ہمارے کسی عالم دین نے مذاہب میں پی ایچ ڈی کی اور اس کی ڈگری کو دنیا کی دس بڑی یونیورسٹیوں نے تسلیم کیا؟ کیا ہم نے آج تک پاکستان میں عالمی سطح کی کوئی دینی یونیورسٹی قائم کی؟ کیا آج تک پاکستان کے کسی بڑے سیاسی گھرانے کا کوئی فارن کوالی فائیڈ بچہ مدرسے میں بھرتی ہوا اور کیا آج تک ہمارے علماء کرام نے ملک میں کوئی میڈیکل کالج، کوئی انجینئرنگ یونیورسٹی، کوئی مینجمنٹ انسٹیٹیوٹ اور کوئی ریسرچ لیبارٹری بنائی'' وہ خاموش ہو گئے، میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

وہ مسکرائے ''دین مسلمان کی زندگی کی سب سے بڑی ترجیح ہوتی ہے لیکن ہم اس ترجیح کو سب سے کم اہمیت دیتے ہیں۔ ہم معاشرے کا سب سے محروم اور معذور ترین شخص اس شعبے کے حوالے کرتے ہیں لہٰذا آج ہمارے دین کی بھی وہی حالت ہے جو سیاست، کاروبار، تجارت اور تعلیم کی ہے'' میں خاموش رہا، وہ بولے ''ہم امریکہ، اسرائیل اور یورپ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں لیکن جب تک ہم اپنے معاشرے میں ان جیسی ترتیب قائم نہیں کریں گے اس وقت تک ہم ان

کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، امریکہ میں اس وقت 26 ہزار پی ایچ ڈی پادری ہیں، امریکہ میں چرچ 55 ہزار ہسپتال اور میڈیکل کالج چلا رہا ہے۔ امریکہ میں ہر سال ہارورڈ، سٹین فورڈ، کولمبیا اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے دو ہزار پادری ڈگری لیتے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کی کابینہ کے 70 فیصد ارکان پروفیسر ہیں اور یورپ کے 82 فیصد سیاستدان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اسرائیلی تاجر دنیا میں سب سے زیادہ ٹیکس دیتے ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ "پڑھاکو" سیاستدان برطانیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اسرائیل نے 1965ء میں فارمولا بنایا تھا ان کے سب سے زیادہ ذہین شخص کو مذہب میں جانا چاہیے۔ اس سے کم صلاحیت کے شخص کو تعلیم میں آنا چاہیے۔ اس سے کم کو سیاست میں، اس سے کم کو کاروبار میں، اس سے کم بیوروکریسی میں اور اس سے کم صلاحیت کے لوگوں کو فنی اور تکنیکی شعبوں کا رخ کرنا چاہیے۔ اسرائیل میں آج کوئی طلاق یافتہ، کوئی کنوارہ اور کوئی ناکام باپ جج نہیں بن سکتا۔ دو برس پہلے اسرائیل کے ایک جج کا بیٹا چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ وہ جج صاحب اسی دن مستعفی ہو گئے تھے، کیوں؟ کیونکہ یہودی سمجھتے ہیں جو شخص اپنی بیوی کو راضی نہیں رکھ سکتا اور جو اپنے بیٹے کو مجرم بننے سے نہیں روک سکتا وہ معاشرے کو انصاف فراہم نہیں کر سکتا لہٰذا وہ لوگ دنیا میں بھی ترقی کر رہے ہیں اور ان کا مذہب بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے، جب تک ہم لوگ بھی ایسی ترتیب قائم نہیں کرتے، ہم اپنی ترجیحات ٹھیک نہیں کرتے، ہم لوگ آگے نہیں بڑھیں گے، ہم لوگ اس طرح مار کھاتے رہیں گے"۔

# جاب اور کام

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے پلکوں پر نشو رکھ لیا، ہم سب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کی یہی صورتحال ہوتی، آپ ایک لمحے کے لیے خود سوچئے اگر آپ نے اچھی پوزیشن کے ساتھ ایم بی اے کیا ہو، اگر آپ ایک صحت مند اور خوبصورت جوان ہوں لیکن آپ نوکری کے لیے جہاں بھی درخواست دیتے ہوں، آپ کو وہاں سے صاف جواب مل جاتا ہو تو آپ پر کیا گزرے گی، آپ کا ردعمل کیا ہو گا لہٰذا یہ نوجوان بری طرح داخلی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

میں نے اس سے کہا "میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تحیر اور بے بسی تھی، میں نے عرض کیا۔ "کیپ ٹاؤن کی میڈیکل یونیورسٹی کو طبی دنیا میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کا پہلا بائی پاس آپریشن اسی یونیورسٹی میں ہوا تھا اس یونیورسٹی نے تین سال پہلے ایک ایسے سیاہ فام شخص کو "ماسٹر آف میڈیسن" کی اعزازی ڈگری دی جس نے زندگی میں کبھی سکول کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ جو انگریزی کا ایک لفظ پڑھ سکتا تھا اور نہ ہی لکھ سکتا تھا لیکن 2003ء کی ایک صبح دنیا کے مشہور سرجن پروفیسر ڈیوڈ ڈینٹ نے یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں اعلان کیا، ہم آج ایک ایسے شخص کو میڈیسن کی اعزازی ڈگری دے رہے ہیں جس نے دنیا میں سب سے زیادہ سرجن پیدا کیے، جو ایک غیر معمولی استاد اور ایک حیران کن سرجن ہے اور جس نے میڈیکل سائنس اور انسانی دماغ کو حیران کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پروفیسر

نے ہیملٹن کا نام لیا اور پورے ایڈیٹوریم نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ یہ اس یونیورسٹی کی تاریخ کا سب سے بڑا استقبال تھا"۔ نوجوان چپ چاپ سنتا رہا۔ میں نے عرض کیا "ہیملٹن کیپ ٹاؤن کے ایک دور دراز گاؤں سینٹانی میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین چرواہے تھے، وہ بکری کی کھال پہنتا تھا اور پہاڑوں پر سارا سارا دن ننگے پاؤں پھرتا تھا، بچپن میں اس کا والد بیمار ہو گیا لہٰذا وہ بھیڑ بکریاں چھوڑ کر کیپ ٹاؤن آ گیا۔ ان دنوں کیپ ٹاؤن یونیورسٹی میں تعمیرات جاری تھیں۔ وہ یونیورسٹی میں مزدور بھرتی ہو گیا۔ اسے دن بھر کی محنت مشقت کے بعد جتنے پیسے ملتے تھے، وہ یہ پیسے گھر بھجوا دیتا تھا اور خود چنے چبا کر کھلے گراؤنڈ میں سو جاتا تھا۔ وہ برسوں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ تعمیرات کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ یونیورسٹی میں مالی بھرتی ہو گیا۔ اسے ٹینس کورٹ کی گھاس کاٹنے کا کام ملا، وہ روز ٹینس کورٹ پہنچتا اور گھاس کاٹنا شروع کر دیتا، وہ تین برس تک یہ کام کرتا رہا پھر اس کی زندگی میں ایک عجیب موڑ آیا اور وہ میڈیکل سائنس کے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں آج تک کوئی دوسرا شخص نہیں" یہ ایک نرم اور گرم صبح تھی"۔

نوجوان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے عرض کیا "پروفیسر رابرٹ جوئز زرافے پر تحقیق کر رہے تھے، وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے جب زرافہ پانی پینے کے لیے گردن جھکاتا ہے تو اسے غشی کا دورہ کیوں نہیں پڑتا، انہوں نے آپریشن ٹیبل پر ایک زرافہ لٹایا، اسے بے ہوش کیا لیکن جوں ہی آپریشن شروع ہوا زرافے نے گردن ہلا دی چنانچہ انہیں ایک ایسے مضبوط شخص کی ضرورت پڑ گئی جو آپریشن کے دوران زرافے کی گردن جکڑ کر رکھے۔ پروفیسر تھیٹر سے باہر آئے، سامنے ہیملٹن گھاس کاٹ رہا تھا، پروفیسر نے دیکھا وہ ایک مضبوط قد کاٹھ کا صحت مند جوان ہے۔ انہوں نے اسے اشارے سے بلایا اور اسے زرافے کی گردن پکڑنے کا حکم دے دیا۔ ہیملٹن نے گردن پکڑ لی، یہ آپریشن آٹھ گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ڈاکٹر چائے اور کافی کے وقفے کرتے رہے لیکن ہیملٹن زرافے کی گردن تھام کر کھڑا رہا۔ آپریشن ختم ہوا تو وہ چپ چاپ باہر نکلا اور جا کر گھاس کاٹنا شروع کر دی۔ دوسرے دن پروفیسر نے اسے دوبارہ بلا لیا، وہ آیا اور زرافے کی گردن پکڑ کر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد یہ اس کی روٹین ہو گئی وہ یونیورسٹی آتا آٹھ دس گھنٹے آپریشن تھیٹر میں جانوروں کو پکڑتا اور اس کے بعد ٹینس کورٹ کی گھاس کاٹنے لگتا، وہ کئی مہینے دوہرا کام کرتا رہا اور اس نے اس ڈیوٹی کا کسی قسم کا اضافی معاوضہ طلب کیا اور نہ ہی شکایت کی۔ پروفیسر رابرٹ جوئز اس کی استقامت اور اخلاص سے متاثر ہو گیا اور اس نے اسے مالی سے "لیب اسسٹنٹ" بنا

دیا۔ ہیملٹن کی پروموشن ہو گئی۔ وہ اب یونیورسٹی آتا، آپریشن تھیٹر پہنچتا اور سرجنوں کی مدد کرتا۔ یہ سلسلہ بھی برسوں جاری رہا۔ 1958ء میں اس کی زندگی میں دوسرا اہم موڑ آیا۔ اس سال ڈاکٹر برنارڈ یونیورسٹی آئے اور انہوں نے دل کی منتقلی کے آپریشن شروع کر دیئے۔ ہیملٹن ان کا اسسٹنٹ بن گیا، وہ ڈاکٹر برنارڈ کے کام کو غور سے دیکھتا رہتا، ان آپریشنوں کے دوران وہ اسسٹنٹ سے ایڈیشنل سرجن بن گیا۔ اب ڈاکٹر آپریشن کرتے اور آپریشن کے بعد اسے ٹانکے لگانے کا فریضہ سونپ دیتے، وہ انتہائی شاندار ٹانکے لگاتا تھا، اس کی انگلیوں میں صفائی اور تیزی تھی، اس نے ایک ایک دن میں پچاس پچاس لوگوں کے ٹانکے لگائے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں کام کرتے ہوئے سرجنوں سے زیادہ انسانی جسم کو سمجھنے لگا چنانچہ بڑے ڈاکٹروں نے اسے جونیئر ڈاکٹروں کو سکھانے کی ذمہ داری سونپ دی۔ وہ اب جونیئر ڈاکٹروں کو آپریشن کی تکنیکس سکھانے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ وہ میڈیکل سائنس کی اصطلاحات سے ناواقف تھا لیکن وہ دنیا کے بڑے سے بڑے سرجن سے بہتر سرجن تھا۔ 1970ء میں اس کی زندگی میں تیسرا موڑ آیا، اس سال جگر پر تحقیق شروع ہوئی تو اس نے آپریشن کے دوران جگر کی ایک ایسی شریان کی نشاندہی کر دی جس کی وجہ سے جگر کی منتقلی آسان ہو گئی۔ اس کی اس نشاندہی نے میڈیکل سائنس کے بڑے دماغوں کو حیران کر دیا، آج جب دنیا کے کسی کونے میں کسی شخص کے جگر کا آپریشن ہوتا ہے اور مریض آنکھ کھول کر روشنی دیکھتا ہے تو اس کامیاب آپریشن کا ثواب براہ راست ہیملٹن کو چلا جاتا ہے، اس کا محسن ہیملٹن ہوتا ہے" میں خاموش ہو گیا۔



نوجوان سنتا رہا، میں نے عرض کیا "ہیملٹن نے یہ مقام اخلاص اور استقامت سے حاصل کیا۔ وہ 50 برس کیپ ٹاؤن یونیورسٹی سے وابستہ رہا، ان 50 برسوں میں اس نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ وہ رات تین بجے گھر سے نکلتا تھا، 14 میل پیدل چلتا ہوا یونیورسٹی پہنچتا اور ٹھیک چھ بجے تھیٹر میں داخل ہو جاتا۔ لوگ اس کی آمد و رفت سے اپنی گھڑیاں ٹھیک کرتے تھے، ان پچاس برسوں میں اس نے کبھی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا، اس نے کبھی اوقات کار کی طوالت اور سہولتوں میں کمی کا شکوہ نہیں کیا لہٰذا پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا جب اس کی تنخواہ اور مراعات یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے زیادہ تھیں اور اسے وہ اعزاز ملا جو آج تک میڈیکل سائنس کے کسی شخص کو نہیں ملا۔ وہ میڈیکل ہسٹری کا پہلا ان پڑھ استاد تھا۔ وہ پہلا ان پڑھ سرجن تھا جس نے زندگی میں تیس ہزار سرجنوں کو ٹریننگ دی، وہ 2005ء میں فوت ہوا تو اسے یونیورسٹی

میں دفن کیا گیا اور اس کے بعد یونیورسٹی سے پاس آؤٹ ہونے والے سرجنوں کے لیے لازم قرار دے دیا گیا وہ ڈگری لینے کے بعد اس کی قبر پر جائیں، تصویر بنوائیں اور اس کے بعد عملی زندگی میں داخل ہو جائیں" میں رکا اور اس کے بعد نوجوانوں سے پوچھا "تم جانتے ہو اس نے یہ مقام کیسے حاصل کیا" نوجوان خاموش رہا، میں نے عرض کیا "صرف ایک ہاں سے' جس دن اسے زرافے کی گردن پکڑنے کے لیے آپریشن تھیٹر میں بلایا گیا تھا اگر وہ اس دن انکار کر دیتا، اگر وہ اس دن یہ کہہ دیتا میں مالی ہوں میرا کام زرافوں کی گردنیں پکڑنا نہیں تو وہ مرتے دم تک مالی رہتا یہ اس کی ایک ہاں اور آٹھ گھنٹے کی اضافی مشقت تھی جس نے اس کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیئے اور وہ سرجنوں کا سرجن بن گیا۔"

نوجوان خاموش رہا، میں نے اس سے عرض کیا "ہم میں سے زیادہ تر لوگ زندگی بھر جاب تلاش کرتے رہتے ہیں جبکہ ہمیں کام تلاش کرنا چاہیے" نوجوان نے غور سے میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا "دنیا کی ہر جاب کا کوئی نہ کوئی کرائی ٹیریا ہوتا ہے اور یہ جاب صرف اس شخص کو ملتی ہے جو اس کرائی ٹیریا پر پورا اترتا ہے جبکہ کام کا کوئی کرائی ٹیریا نہیں ہوتا۔ میں اگر آج چاہوں تو میں چند منٹوں میں دنیا کا کوئی بھی کام شروع کر سکتا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس کام سے باز نہیں رکھ سکے گی۔ ہیملٹن اس راز کو پا گیا تھا لہٰذا اس نے جاب کی بجائے کام کو فوقیت دی یوں اس نے میڈیکل سائنس کی تاریخ بدل دی۔ ذرا سوچو اگر وہ سرجن کی جاب کیلئے اپلائی کرتا تو کیا وہ سرجن بن سکتا تھا؟ کبھی نہیں، لیکن اس نے کھرپہ نیچے رکھا، زرافے کی گردن تھامی اور سرجنوں کا سرجن بن گیا" میں رکا اور ہنس کر بولا "تم اس لیے بے روزگار ہو، نا کام ہو کہ تم جاب تلاش کر رہے ہو، کام نہیں، جس دن تم نے ہیملٹن کی طرح کام شروع کر دیا تم نوبل پرائز حاصل کر لو گے تم بڑے اور کامیاب انسان بن جاؤ گے۔"

# ون مین شو

حاجی صاحب چینی کے بیوپاری تھے، انہوں نے زندگی کا آغاز پانڈی (لوڈر) کی حیثیت سے کیا، تیس برس پہلے انہوں نے چینی کی دس بوریاں ادھار لیں، ایک تھڑے پر رکھیں اور پانڈی سے دوکاندار بن گئے، ان کا کاروبار چل نکلا اور وہ 80ء کی دہائی میں پاکستان میں چینی کے سب سے بڑے بیوپاری سمجھے جانے لگے، حاجی صاحب کی دوکان سے جس قیمت پر پہلی بوری نکلتی تھی وہ اس دن پورے ملک میں چینی کا ریٹ ہوتا تھا، ان کا منیجر بوریوں میں نوٹ بھر کر بینک لے جاتا تھا، حاجی صاحب 1990ء میں انتقال کر گئے، ان کے چار بیٹے تھے، وہ اپنے بیٹوں کیلئے بے تحاشا جائیداد اور دولت چھوڑ کر گئے لیکن آج 16 برس بعد ان کے چاروں بیٹے فٹ پاتھ پر کھڑے ہیں، ان کی جیب میں راولپنڈی سے اسلام آباد تک کا کرایہ نہیں ہوتا اور وہ قطار میں لگ کر یوٹیلٹی سٹور سے سستی چینی خریدتے ہیں۔

حاجی صاحب اور ان کی اولاد پاکستان کے "جینٹک پرابلم" کی ایک ادنیٰ سی مثال ہیں۔ ہم لوگوں میں ایک جینیاتی خامی ہے ہماری ایک نسل کا ہنر، ترکہ، ورثہ اور تجربہ دوسری نسل میں منتقل نہیں ہوتا ہے، ہماری ایک نسل بے تحاشا دولت کماتی ہے جب یہ دولت دوسری یا تیسری نسل تک جاتی ہے تو وہ اسے ضائع کر دیتی ہے، وہ فقیر ہو جاتی ہے، ایک نسل دنیا کی بہترین صنعت کار، بزنس مین، مصور، موسیقار، گلوکار اور دانشور ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بانجھ، ان پڑھ، عیاش اور

نکھٹو ہوتی ہے، ہماری ایک نسل بادشاہوں کی طرح زندگی گزارتی ہے جبکہ دوسری نسل چٹائیوں پر سوتی ہے، ہماری ایک نسل سونے کے نوالے کھاتی ہے جبکہ دوسری نسل ایک ایک لقمے کو ترس جاتی ہے۔ ہماری ایک نسل فنکار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل بے ہنر اور بے فن ہوتی ہے، ہماری ایک نسل زمیندار ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل فیکٹریوں میں مزدوری کرتی ہے' ہماری ایک نسل جہازوں میں سفر کرتی ہے جبکہ دوسری نسل ویگنوں میں دھکے کھاتی ہے اور ہماری ایک نسل علامہ محمد اقبال ہوتی ہے جبکہ دوسری نسل جاوید اقبال ہوتی ہے؟ کیوں؟ یہ ''کیوں'' اس ملک کا اصل مسئلہ ہے اور اس کیوں میں اس خطے کے تمام مسائل کی جڑیں پیوست ہیں' ہم لوگ بنیادی طور پر انفرادیت پسند اور انفرادیت پرست ہیں، ہم لوگ اپنا ہنر، اپنی کامیابی، اپنی اچیومنٹ اور اپنا تجربہ دوسری نسل میں منتقل نہیں کر پاتے، ہم لوگ ادارہ بنانے کی قابلیت یا اہلیت پیدا نہیں کر پاتے' ہم لوگ اپنی کامیابی کو کمپنی کی شکل نہیں دے پاتے، ہم لوگ ''ون مین شو'' ہیں، ہمارے تمام ادارے، تمام دفتر، تمام فیکٹریاں اور تمام کاروبار کسی ایک شخص کی ذات کے اردگرد گھومتے ہیں، جس دن وہ شخص چھٹی کر جاتا ہے، ملک سے باہر چلا جاتا ہے، بیمار ہو جاتا ہے یا خدانخواستہ انتقال کر جاتا ہے اس دن وہ پورا ادارہ، وہ پوری ایمپائر بیٹھ جاتی ہے اور وہ سارا کاروبار تباہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے لوگ اپنی کامیابی، اپنا ہنر، اپنی قابلیت، اپنی دولت اور اپنا تجربہ دوسرے لوگوں کو منتقل کرتے ہیں، وہ اپنی اگلی نسل کو دولت کے ساتھ ساتھ تجربہ، اعتماد اور ہنر بھی دیتے ہیں، وہ ایسے ادارے بناتے ہیں جو ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتے ہیں، آپ آج بل گیٹس کو مائیکروسافٹ سے نکال دیں یقین کیجئے اس سے مائیکروسافٹ کے کاروبار پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، یہ ادارہ سو پچاس سال تک اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہے گا جبکہ اس کے مقابلے میں آپ میاں منشا کو نکال دیں، آپ دیوان ضیاء یا عقیل ڈیڈی کو الگ کر دیں، آپ دیکھیں گے پوری ایمپائر کی جڑیں تک ہل جائیں گی' گورے اور پاکستانی میں یہی فرق ہے' یہ بنیادی طور پر اپروچ کا فرق ہے۔ یہ زاویہ نظر اور طریقہ کار کا فرق ہے' مغرب کے لوگ مل کر ادارہ بناتے ہیں، وہاں شخص کی بجائے اداروں کی حیثیت اور اہمیت ہوتی ہے' وہاں لوگ نظام یا سسٹم پر توجہ دیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں لوگ ہزار ہزار ملازمین کے اداروں کو اپنی ہاں اور ناں پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں' وہ پورے پورے محکمے کو اپنا غلام بنا دیتے ہیں' وہ پورے پورے ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ مزارعوں جیسا سلوک کرتے ہیں لہذا ہمارے زیادہ تر ادارے ''ون مین شو'' ہوتے ہیں اور جس دن

''ون مین'' ختم ہو جاتا ہے اسی دن سارے ''شو'' کی بتیاں بجھ جاتی ہیں' آپ اپروچ کا فرق ملاحظہ کیجئے پوری دنیا میں مالکان اپنے اداروں کیلئے ماہر اور'' کمی ٹمنٹ'' لوگوں کو منتخب کرتے ہیں جبکہ ہم لوگ اپنے گرد ہمیشہ خوشامدیوں، چاپلوسوں اور منافقوں کی فوج جمع کرتے ہیں، ہمارے معاشرے میں خوشامد سب سے بڑی اہلیت اور قابلیت سمجھی جاتی ہے، ہم ہمیشہ کمزور، نالائق اور غلامانہ ذہنیت کے شخص کو ملازم رکھتے ہیں اور ہم ایسے ملازم منتخب کرتے ہیں جو ہمارے ادارے میں پچیس تیس برس تک کم تنخواہ پر کام کرتے رہیں، ہمارا دوسرا کھیل اس سے بھی خطرناک ہوتا ہے' ہم اپنی زندگی میں اپنے بچوں کو اپنے کام، اپنے ہنر اور اپنے تجربے سے دور رکھتے ہیں، ہم انہیں بڑی گاڑیاں اور بھاری کریڈٹ کارڈ دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں'' جا بچہ عیش کر'' اور بچہ عیش کرنا شروع کر دیتا ہے لہٰذا اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے جس دن ہماری آنکھ بند ہوتی ہے اسی دن ہمارا شو ختم ہو جاتا ہے، اسی دن ہماری ساری ایمپائر دھڑام ہو جاتی ہے۔

ہمارا یہ مسئلہ صرف کاروبار اور کارپوریٹ سیکٹر تک محدود نہیں، ہماری حکومتیں اور نظام بھی ون مین شو ہوتے ہیں، ہمارے حکمران ایک نظام تشکیل دیتے ہیں' وہ جب تک اقتدار میں رہتے ہیں ان کا نظام دنیا کا بہترین سسٹم ہوتا ہے لیکن جوں ہی وہ ایوان اقتدار سے باہر قدم رکھتے ہیں ان کا نظام، ان کی اصلاحات اور بعض اوقات ان کا آئین بھی رخصت ہو جاتا ہے، آپ صدر ایوب خان کو لیجئے' ایوب خان نے پاکستان میں جمہوریت، خوشحالی، صنعت کاری اور پرائیوٹائزیشن کا دس سالہ جشن منایا تھا لیکن جب وہ رخصت ہوئے تو ان کا بی ڈی سسٹم، ان کی خوشحالی اور ان کے پانچ پانچ سالہ منصوبے بھی گھر چلے گئے، ان کا آئین بھی ختم ہو گیا اور ان کا ون یونٹ بھی ٹوٹ گیا، بھٹو اپنے ساتھ نیشنلائزیشن اور اسلامی سوشلزم لائے تھے' ان کی یہ دونوں پالیسیاں ضیاء الحق کے دور میں پھانسی چڑھ گئیں اور جنرل ضیاء الحق کی اسلامی اصلاحات 1988ء میں ہوا میں بکھر گئیں، اس کے بعد بے نظیر بھٹو کی پالیسیوں کو جناب نواز شریف نے روند دیا اور نواز شریف کے فارمولے 12 اکتوبر 1999ء کو فارغ ہو گئے لہٰذا آپ ہماری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے ہماری کسی حکومت کی کوئی خوبی دوسری حکومت تک ٹرانسفر نہیں ہوئی، ہماری حکومتوں کا بنایا کوئی منصوبہ دوسری حکومت تک نہیں پہنچا' یہاں حالت یہ ہے بے نظیر بھٹو کے دور میں بجلی کے تھرمل یونٹ خوشحالی اور کامیابی ہوتے ہیں لیکن نواز شریف کے دور میں وہ غداری اور کرپشن بن جاتے ہیں' ایک دور میں موٹروے کارنامہ ہوتا ہے اور دوسرے دور میں وہی موٹروے سفید ہاتھی کا درجہ پا

جاتی ہے' کیوں؟ یہ کیوں ہماری جینیاتی خرابی' ہمارا ون مین شو ہے' ہماری ساری کامیابیاں صرف ہماری ذات تک محدود رہتی ہیں' ہم انہیں آگے ٹرانسفر کرنے میں ناکام رہتے ہیں' آپ موجودہ حکومت کو لیجئے' آج جب حکومت اپنے نظام کے بارے میں دعوے کرتی ہے، جب یہ خوشحالی اور اعتدال پسندی کے نعرے لگاتی ہے تو مجھے ہنسی آ جاتی ہے کیونکہ میں اس ملک، اس خطے کی تاریخ سے واقف ہوں، میں جانتا ہوں جس دن ان حکمرانوں کے پاؤں دہلیز سے نیچے اتریں گے اسی دن ان کی اعتدال پسندی اور ان کی خوشحالی کا غبارہ پھٹ جائے گا، اسی دن ان کا ون مین شو بھی ختم ہو جائے گا۔ ہم لوگوں کے جینز میں خرابی ہے، ہم میں سے ہر نسل اپنے لئے نیا گھر بناتی ہے' ہمارے ملک میں باپ کی سوچ بیٹے کو منتقل نہیں ہوتی اور بیٹا اپنا تجربہ' اپنا ہنر' اپنی صلاحیت اور اپنی کامیابی اپنے بیٹے کو منتقل کئے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے چنانچہ ہماری ہر نسل اپنے لئے نئی بنیادیں کھودتی ہے اور ہماری ہر نسل اپنے لئے نیا سسٹم بناتی ہے!

ہم جب تک اپنی اس خرابی کو نہیں سمجھیں گے اور ہم جب تک اسے دور کرنے کی منصوبہ بندی نہیں کریں گے ہم آگے نہیں بڑھیں گے ہم اس وقت تک ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے چلتے رہیں گے' ہم اس وقت تک دائروں میں سفر کرتے رہیں گے۔

# وفادار

جوزف رافیل سے میری ملاقات ایک لائف ٹائم تجربہ تھا۔ جوزف ایمسٹرڈیم میں فاسٹ فوڈ کی سب سے بڑی کمپنی کا مالک تھا' شہر میں اس کے پچاس سے زیادہ ریستوران تھے وہ دن میں آدھ گھنٹہ کیلئے اپنے کسی ریستوران پر جاتا' اپنے کارکنوں سے ملتا' ان کے ساتھ گپ شپ لگاتا اور اگلے ریستوران کی طرف نکل جاتا' شام کو وہ "ڈیم سکوائر" کے ایک ریستوران میں بیٹھتا' کافی پیتا' اپنے دوستوں کے ساتھ گپ لگاتا اور گھر چلا جاتا' یہ اس کا معمول تھا' میرا ایک دوست اس کے ریستوران میں کام کرتا تھا' میرا یہ دوست 1990ء میں ہالینڈ گیا تھا' اس نے جوزف کے پاس نوکری شروع کی تھی اور اس کے بعد اس نے 16 سال جوزف کے ساتھ گزار دیئے' میں ان کی مستقل مزاجی پر حیران تھا یورپ میں ایک ہی ادارے اور ایک ہی نوکری سے چپکے رہنے کو نفسیاتی مرض سمجھا جاتا ہے' یورپ کے بارے میں کہا جاتا ہے وہاں نوکری' عورت اور موسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا لیکن میرے اس دوست نے یورپ کے اس فلسفے کو بدل دیا' اس نے 16 سال ایک ہی ریستوران کے کاؤنٹر پر گزار دیئے' میں نے ایک دن اس سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ مسکرا کر بولا "صرف جوزف کی وجہ سے" مجھے بڑی حیرت ہوئی' میرے دوست نے اپنی بات جاری رکھی "صرف میں نہیں بلکہ آج تک جس شخص نے بھی جوزف کو جوائن کیا وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا" میرے لئے یہ بات بھی حیران کن تھی' میں نے اپنے دوست سے وجہ پوچھی' وہ مسکرا کر بولا "جوزف ہر

شام ہمارے ریستوران میں آتا ہے' کافی پیتا ہے اور دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے' میں آج اس کے ساتھ تمہاری ملاقات طے کر دیتا ہوں' تم اس سے خود پوچھ لینا'' میں نے فوراً حامی بھر لی۔

جوزف کے ساتھ میری ملاقات طے ہو گئی' شام چھ بجے جوزف وہاں آ گیا' وہ ایک کٹر یہودی تھا' اس کی ناف تک لمبی داڑھی تھی' سر پر سیاہ ہیٹ اور گھٹنوں تک لمبا کوٹ تھا' اس کے ہاتھ میں قیمتی پتھروں کی چھوٹی سی تسبیح تھی اور وہ وقفے وقفے سے عبرانی زبان میں کچھ بڑبڑاتا تھا' میرے دوست نے مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا' میں نے جوزف کا غور سے جائزہ لیا' مجھے اس کی شخصیت میں ایک ان دیکھی کشش محسوس ہوئی' وہ دھلا دھلایا سا نرم مزاج شخص تھا' اس نے میرے ساتھ گپ شپ شروع کر دی' وہ مختلف موضوعات پر سوال کرتا اور میرے جوابوں میں سے نئے سوال نکالتا' سوال و جواب کے اس سلسلے کے دوران میں نے اس کے ملازمین کا حوالہ دیا اور اس سے پوچھا ''آپ کے ملازم آپ کو چھوڑتے کیوں نہیں ہیں؟'' وہ مسکرایا ''میں ملازمین کا انتخاب بڑی احتیاط سے کرتا ہوں' میرا اپنا کرائیٹریا ہے اور جو شخص اس کرائیٹریا پر پورا نہیں اترتا میں اسے ملازم نہیں رکھتا'' میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولا ''جب کوئی شخص میرے پاس نوکری کے لئے آتا ہے تو میں اس سے پوچھتا ہوں کیا تم عبادت کرتے ہو اگر وہ ہاں میں جواب دے تو وہ میرا پہلا امتحان پاس کر جاتا ہے'' میں نے اسے ٹوک کر پوچھا ''عبادت سے تمہاری کیا مراد ہے'' اس نے مسکرا کر جواب دیا ''اگر وہ مسلمان ہے تو کیا وہ نماز پڑھتا ہے' وہ عیسائی ہے تو کیا وہ چرچ جاتا ہے' یہودی ہے تو سینا گوگا' ہندو ہے تو مندر اور بودھ ہے تو کیا وہ ٹمپل جاتا ہے' وہ کسی مذہب کا ماننے والا ہو میں صرف یہ دیکھتا ہوں کیا اس کا مذہب کے ساتھ تعلق قائم ہے'' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا' وہ بولا ''میں اس کے بعد اس سے پوچھتا ہوں وہ اپنے خاندان' بیوی اور بچوں کو کتنا وقت دیتا ہے' اگر اس کا جواب روزانہ چار گھنٹے اور ہفتے میں دو دن ہو تو میں اسے ملازم رکھ لیتا ہوں' میں طلاق یافتہ اور مطلقہ لوگوں کو ملازمت نہیں دیتا' اگر کوئی کنوارہ شخص میرے ادارے میں ملازم ہو جائے تو وہ سال کے اندر اندر شادی کا پابند ہوتا ہے'' میرے لئے یہ شرط بھی عجیب تھی لیکن میں خاموش رہا' وہ بولا ''میں یہ دیکھتا ہوں کیا وہ سال میں ایک مہینے چھٹیاں لیتا ہے اور کیا وہ یہ چھٹیاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کسی اچھے مقام پر گزارتا ہے' میں یہ دیکھتا ہوں وہ اوور ٹائم تو نہیں لگاتا اور وہ ہفتے اور اتوار کی چھٹی اپنے خاندان' اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا ہے' اگر مجھے معلوم ہو وہ سارا سال کام کرتا ہے' وہ اوور ٹائم لگاتا ہے یا وہ ہفتے اور اتوار کے دن بھی کام کرتا ہے تو میں اسے ملازم نہیں رکھتا'' میں خاموش رہا' وہ بولا ''میں اس سے پوچھتا ہوں کیا وہ ہفتے میں کم از کم پانچ دن

ایکسر سائز کرتا ہے' کیا وہ واک' جاگنگ' سائیکلنگ اور ویٹ ٹریننگ کرتا ہے' اگر اس کا جواب ناں میں ہو تو میں فوراً معذرت کر لیتا ہوں'' میں اس کی بات غور سے سنتا رہا' وہ بولا'' اور میں اس سے آخری سوال پوچھتا ہوں' کیا وہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہے' کیا وہ اخبارات' رسائل یا کتابیں پڑھتا ہے اور کیا اس کے دوستوں میں کوئی پڑھا لکھا شخص موجود ہے' اگر وہ ہاں کہہ دے تو میں اسے نوکری دے دیتا ہوں'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے جوزف سے کہا'' یہ ساری چیزیں تو ذاتی ہیں' ان کا کام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ ملازمت کے مروجہ اصولوں کے بھی خلاف ہیں'' اس نے قہقہہ لگایا اور میرا ہاتھ دبا کر بولا'' مجھے معلوم تھا تم مجھ سے یہی کہو گے'' وہ تھوڑی دیر رکا' اس نے ہیٹ اتار کر سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر بولا'' ان تمام چیزوں کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ وفاداری سے ہے' میں سمجھتا ہوں جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ دنیا کے کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا' جو شخص اپنے رب کی اطاعت نہیں کرتا وہ دنیا کے کسی شخص کی اطاعت نہیں کرتا' جو شخص اپنے آرام کا خیال نہیں رکھتا وہ کسی شخص کو آرام نہیں پہنچا سکتا' جو شخص اپنے خاندان کو وقت نہیں دے سکتا وہ دنیا کے کسی شخص کو وقت نہیں دیتا' جو شخص اپنی صحت اور سلامتی کا خیال نہیں رکھتا وہ شخص کسی شخص کی سلامتی اور صحت کا خیال نہیں رکھ سکتا اور جو شخص پڑھتا نہیں وہ شخص زندگی میں سیکھتا نہیں اور جو شخص زندگی میں سیکھتا نہیں وہ کسی ادارے کسی کمپنی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا' میرا فلسفہ ہے جو شخص اپنے ساتھ وفادار نہیں وہ کسی ادارے' کسی کمپنی اور کسی شخص کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا لہٰذا میں ہمیشہ اپنے لئے وفادار لوگوں کا انتخاب کرتا ہوں'' اس کی بات میرے لئے بالکل نئی تھی' میں نے سوچا'' واقعی وفاداری کا آغاز انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے جو شخص اپنے ساتھ بے وفا ہو وہ دوسروں کے ساتھ کیسے وفاداری کر سکتا ہے' جو شخص اپنے اللہ کے ساتھ دھوکہ کر رہا ہو' جو اپنی ذات کے ساتھ دغا کر رہا ہو' جس نے اپنے خاندان' اپنے وجود اور اپنے ذہن کو محروم کر رکھا ہو وہ دوسروں کے ذہن' وجود اور خاندان کو کیسے نواز سکتا ہے' وہ ان کا بھلا کیسے سوچ سکتا ہے'' میں نے اس یہودی کا ہاتھ تھاما' اسے سیلوٹ کیا اور باہر آ گیا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا'' میں بھی ان لوگوں میں شمار ہوتا ہوں جو روز اپنے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں' جو اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور انہوں نے اس دھوکے کو پروفیشن' جاب اور مصروفیت کا نام دے رکھا ہے'' میں نے اسی وقت اپنا تھیلا کندھے پر رکھا اور فٹ پاتھ پر جوگنگ شروع کر دی' میں نے وفاداری کے میدان میں پہلا قدم رکھ دیا۔

☼.....☼.....☼

# بس ایک قدم

''تم جانتے ہو دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ کون سا ہے'' ان کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں' میں نے پانچ سات ایئر پورٹوں کا نام لیا لیکن ہر نام پر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا' میں نے تھک کر عرض کیا ''سر آپ ہی بتا دیجئے'' وہ میٹھے لہجے میں بولے ''شکاگو کا او۔ہیر (O,HARE) دنیا کا مصروف ترین ایئر پورٹ ہے' اس ایئر پورٹ سے روزانہ 60 انٹرنیشنل فلائیٹس اڑتی ہیں' یہ دنیا میں یونائیٹڈ ایئر لائنز کا سب سے بڑا اور امریکن ایئر لائنز کا دوسرا بڑا مرکز ہے' اس نے 2003ء میں شمالی امریکہ کے بہترین ایئر پورٹ کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا' اس کے 4 ٹرمینل اور چھ پرائمری ایئر کیریئر رن ویز ہیں''۔

میں نے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھا' وہ مسکرا کر بولے ''لیکن کہانی یہ نہیں' کہانی اس ایئر پورٹ کا نام ہے'' میں خاموشی سے سنتا رہا' وہ بولے ''او۔ہیر ایک چھوٹا سا سرکاری ملازم تھا' او۔ہیر کا پورا نام بچ او۔ہیر (BUTCH-O HARE) تھا' وہ امریکی فوج میں فائیٹر پائلٹ تھا' دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کی ڈیوٹی ایئر کرافٹ کیریئر LEXINGTON پر لگ گئی' یہ ایئر کرافٹ کیریئر پیسفک اوشین میں کھڑا تھا' او۔ہیر اور اس کے دوسرے فائیٹر پائلٹس بحری جہاز سے طیارے اڑاتے تھے' جاپانیوں پر حملے کرتے تھے اور واپس آ جاتے تھے' 1941ء دسمبر کی ایک شام او۔ہیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اڑا' یہ لوگ ابھی چند میل دور گئے تھے کہ او۔ہیر نے

اپنے سنگل انجن ''گرومین ایف 4 ایف'' طیارے کے فیول کی سوئی دیکھی' اس کے طیارے میں پیٹرول بہت کم تھا' او۔ ہیر نے اپنے چیف کو اپنی پوزیشن بتادی' چیف نے اسے فوری طور پر واپس جانے کا حکم دے دیا' او۔ ہیر ایئر کرافٹ کیریئر کی طرف واپس مڑ گیا' جب وہ کیریئر کے قریب پہنچا تو اس نے ایک عجیب منظر دیکھا' اس نے دیکھا 9 جاپانی طیارے کیریئر پر حملہ آور ہیں اور کیریئر کی حفاظت کیلئے وہاں کوئی طیارہ موجود نہیں' اس صورتحال میں او۔ ہیر کے پاس دو راستے تھے' وہ اکیلا ان تمام جاپانی طیاروں کا مقابلہ کرتا یا پھر وہ اپنی جان بچا کر فرار ہو جاتا' او۔ ہیر ایک دلیر شخص تھا لہٰذا اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا' وہ جاپانی طیاروں پر پل پڑا' وہ فضا میں طیاروں پر جھپٹتا' ان پر گولے پھینکتا اور دوسری طرف نکل جاتا' وہاں سے واپس پلٹتا اور دشمن طیاروں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتا' اس نے آدھے گھنٹے میں دشمن کے 5 طیارے مار گرائے' اس دوران اس کا بارود ختم ہو گیا' اس نے نئی تکنیک سے لڑنا شروع کر دیا' وہ دشمن طیارے پر جھپٹتا اور اسے اپنے طیارے کے پر سے چھیلتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا' اس تکنیک کے نتیجے میں دشمن کے مزید تین طیارے تباہ ہو گئے جبکہ دشمن کا آخری طیارہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور وہ سمندر میں گر گیا' او۔ ہیر کیریئر پر اتر آیا' اسی اثناء میں اس کے ساتھی پائلٹ واپس آ گئے' او۔ ہیر نے انہیں ساری روداد سنائی لیکن لوگوں نے یقین کرنے سے انکار کر دیا' اس زمانے میں امریکی فضائیہ کے تمام طیاروں میں کیمرے نصب ہوتے تھے' یہ کیمرے آپریشنز کے دوران تصویریں اتارتے رہتے تھے' او۔ ہیر اپنے طیارے سے کیمرہ اتار کر لے آیا' جب تصویریں بن کر آئیں تو پورے امریکہ میں شور ہو گیا' امریکہ کا بچہ بچہ او۔ ہیر زندہ باد کے نعرے لگانے لگا' حکومت نے فروری 1942ء میں او ہیر کو دوسری جنگ عظیم کا پہلا نیوی ایس (ACE) ایوارڈ دیا جبکہ 1943ء میں اسے امریکن آرمی کے انتہائی شاندار ایوارڈ فلائنگ کراس سے بھی نوازا گیا' او۔ ہیر 26 نومبر 1943ء میں ایک جنگی مہم پر نکلا' اس کا طیارہ دشمن کا نشانہ بنا' وہ سمندر میں گرا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے لاپتہ ہو گیا' اس کی موت کے بعد امریکی حکومت نے اپنا سب سے بڑا ائیرپورٹ اس کے نام منسوب کر دیا'' وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے جذباتی لہجے میں کہا ''سر ویل ڈن یہ تو واقعی لاجواب کہانی ہے'' وہ مسکرائے ''نہیں میں تمہیں اس سے بھی اچھی کہانی سنانا چاہتا ہوں'' ''میں ہمہ تن گوش ہو گیا' وہ بولے'' شکاگو میں ایزی ایڈی نام کا ایک وکیل رہتا تھا' اللہ تعالیٰ نے اسے بے تحاشا ذہانت سے نواز رکھا تھا'

اسے امریکہ کا سارا قانون ازبر تھا' وہ شکاگو کا سب سے اچھا مقرر بھی تھا' کیریئر کے آغاز میں اس کی ملاقات الکپون نام کے ایک بدمعاش سے ہوگئی' الکپون شکاگو کا مافیالارڈ تھا' پورا شہر اس سے ڈرتا تھا' الکپون نے ایزی ایڈی کو اپنا وکیل نامزد کر دیا' پولیس جب بھی الکپون کو پکڑتی ایزی ایڈی اسے بڑی مہارت سے چھڑا لیتا' اس زمانے میں لوگ کہتے تھے اگر الکپون کو ایزی ایڈی کا تعاون حاصل نہ ہو تو اس کا سارا مافیا ایک مہینے میں بکھر جائے' ایزی ایڈی نے الکپون سے بے تحاشا مالی فوائد حاصل کیے' جس کے نتیجے میں اس کا شمار شکاگو کے امراء میں ہوتا تھا' اس کے پاس شہر کا سب سے بڑا فارم ہاؤس تھا' وہ بیسیوں گاڑیوں اور لمبے چوڑے بینک بیلنس کا مالک تھا' ایزی ایڈی کا ایک ہی بیٹا تھا' اس نے اسے دنیا کی ہر نعمت دے رکھی تھی' ایک دن یہ بیٹا گھر آیا اور اپنے باپ کا دامن پکڑ کر بولا' ڈیڈی میں جب بھی باہر جاتا ہوں تو بچے مجھے الکپون' الکپون کہہ کر چھیڑتے ہیں' بیٹے کی یہ بات باپ کے دل پر لگی' وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے سوچا' میں نے اپنے بیٹے کو دنیا کی تمام سہولتیں دے دی ہیں لیکن میں اسے ایک اچھی شناخت' ایک اچھا نام نہیں دے سکا' ایزی ایڈی نے اسی وقت الکپون کا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا' وہ گھر سے نکلا تو وہ جانتا تھا وہ اب کبھی گھر واپس نہیں آ سکے گا کیونکہ الکپون کے کاغذوں میں غداری کی سزا موت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ایزی ایڈی سیدھا تھانے گیا اور اس نے الکپون کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا اعلان کر دیا' پولیس نے اسی وقت الکپون کو گرفتار کر لیا' ایزی ایڈی گھر کی طرف رخصت ہوا تو اسے راستے میں کسی نے گولی سے اڑا دیا'' وہ رکے اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے ''یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے'' میں نے حیران ہو کر عرض کیا'' سر یہ تو ایک نہایت ہی فضول اور بچگانہ سی کہانی ہے' جاسوسی ناول اور ڈائجسٹ ایسی کہانیوں سے بھرے پڑے ہیں'' انہوں نے قہقہہ لگایا ''میں ابھی ایک فقرہ بولوں گا اور یہ دنیا کی بہترین اور انتہائی قیمتی کہانی ہو جائے گی'' انہوں نے سرکس کے جادوگروں کی طرح میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے'' ہماری پہلی کہانی کا ہیرو او۔ ہیر اس ایزی ایڈی کا بیٹا تھا'' مجھے جھٹکا لگا اور میں شدت حیرت سے کھڑا ہو گیا۔

وہ مسکرائے ''میرے بچے بعض فیصلے' بعض نیکیاں کھجور کے درختوں کی طرح ہوتی ہیں' ایک نسل انہیں کاشت کرتی ہے' ان کی آبیاری کرتی ہے' انہیں جوان کرتی ہے اور اس کے بعد قبر میں اتر جاتی ہے اور دوسری نسل اس نیکی' اس فیصلے کا پھل کھاتی ہے' اگر ایزی ایڈی اس لمحے یہ فیصلہ نہ کرتا تو اس کا بیٹا بڑا ہو کر کسی مافیا کا حصہ بن جاتا' وہ کسی پولیس مقابلے میں مارا جاتا اور تاریخ

اس کا نام تک فراموش کر دیتی لیکن ایزی ایڈی نے اپنے بیٹے کو اچھا نام دینے کا فیصلہ کیا' وہ خود مر گیا لیکن اپنے بیٹے کو نیکی اور سچ کے راستے پر کھڑا کر گیا یہاں تک کہ اس کا بیٹا او۔ ہیر اس راستے پر چلتا چلتا امریکہ کا قومی ہیرو بن گیا' وہ اپنے باپ کو ایک ایسی شناخت دے گیا جو قیامت تک برقرار رہے گی' آج بھی جب کوئی طیارہ او۔ ہیر ائیر پورٹ پر اترتا ہے "ائیر ہوسٹس خواتین و حضرات ہم چند لمحوں میں او۔ ہیر ائیر پورٹ پر اترنے والے ہیں" کا اعلان کرتی ہے تو سب لوگ سر سے ٹوپی اتار کر ایزی ایڈی کی عظمت کو سلام کرتے ہیں' وہ سر خم کر کے اسے زندہ باد کا نذرانہ پیش کرتے ہیں' ایزی ایڈی اور اس کے بیٹے او۔ ہیر کی کہانی بتاتی ہے اچھے فیصلے درخت کی قلم کی طرح ہوتے ہیں' اگر آپ چاہتے ہیں آپ کی اولاد گرمی' تپش اور بارش سے محفوظ رہے تو آپ کو ایزی ایڈی کی طرح اپنے صحن میں کسی اچھے فیصلے کی قلم بونا پڑتی ہے' آپ کو اپنی نسل' اپنی اولاد کو اچھا نام دینے کیلئے اپنی جان' اپنی ذات کی قربانی دینا پڑتی ہے' میں چاہتا ہوں اس ملک کا ہر صاحب اولاد اپنی میز پر ایزی ایڈی کا نام لکھ کر لگا دے اور ہر فیصلہ کرنے سے پہلے ایک منٹ کیلئے سوچے کیا میرا یہ فیصلہ میرے بیٹے کو او۔ ہیر بنا دے گا اگر اس کا جواب ہاں ہو تو اسی وقت فیصلے کی طرف اٹھ کھڑا ہو' فیصلہ کا یہ ایک قدم اسے تاریخ کا سنگ میل بنا دے گا"۔

# ایڈجسٹمنٹ



نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے' وہ بار بار انگلی کی نوک سے آنسو صاف کرتا تھا اور شرمندگی سے دائیں بائیں دیکھتا تھا' میں اسے پچھلے پندرہ منٹ سے دیکھ رہا تھا' اس کی زندگی طوفانوں میں گھری تھی' وہ تین سال کا تھا تو اس کی والدہ انتقال کر گئی' والد نے دوسری شادی کر لی' سوتیلی ماں سوتیلی زیادہ تھی اور ماں کم لہٰذا جوانی تک گھر اس کیلئے گھر نہیں تھا' اس کا سارا بچپن' سارا لڑکپن اور جوانی کا ایک لمبا حصہ محرومیوں میں گزرا' وہ معمولی معمولی خواہشوں کیلئے ترستا رہا' سکول میں اسے اچھے استاد اور ہمدرد دوست نہ ملے' اس نے ایف ایس سی کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گیا' ایف اے میں اس کے نمبر اچھے نہ آئے' اس نے سپورٹس مین بننے کی کوشش کی لیکن نہ بن سکا' اس نے اداکاری' صداکاری اور مصوری کی کوشش کی لیکن فیل ہو گیا' اس نے موسیقی سیکھنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی آگے نہ بڑھ سکا' بی اے میں وہ معمولی نمبروں سے پاس ہوا' اس نے ایم اے کیا تو اس میں بھی اس کی کوئی پوزیشن نہ تھی' وہ نوکریاں تلاش کرتا رہا' ہر جگہ درخواست دی' ہر ٹیسٹ میں بیٹھا' ہر جگہ انٹرویو دیا لیکن ناکام رہا' اس نے اپنا کاروبار شروع کیا وہ بھی نہ چل سکا' وہ اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کے والدین اپنی بیٹی کسی ناکام شخص کے حوالے کرنے کیلئے تیار نہیں تھے لہٰذا 245 ممالک پر پھیلی اس دنیا میں اس کا کوئی دوست نہ تھا' وہ کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن آدھی سے زیادہ کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا' وہ آدھی فلم دیکھ کر اٹھ جاتا تھا اور کوئی گانا پورا

نہیں بن سکتا تھا' وہ تبلیغی جماعت میں شامل ہوا لیکن راستے سے بھاگ آیا' وہ کبھی سگریٹ پینا شروع کر دیتا تھا اور کبھی سگریٹ نوشی ترک کر دیتا تھا' وہ کبھی مولوی بن جاتا تھا اور کبھی ڈانسروں کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا اور وہ کبھی کسی درگاہ پر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی رندوں اور جواریوں کی محفل کا حصہ بن جاتا تھا' اسے سمجھ نہیں آتی تھی وہ کیا ہے' وہ کیوں ہے اور اس نے زندگی میں کیا کرنا ہے؟ اس کا کہنا تھا' وہ دنیا کا ناکام ترین شخص ہے!

میں بڑے غور سے اس کی کہانی سنتا رہا' وہ بول بول کر تھک گیا تو میں نے اسے پانی کا گلاس پیش کیا اور اس سے پوچھا "تم جانتے ہو دنیا میں کتنے موسم ہیں" وہ ذرا سوچ کر بولا "سردی' گرمی' بہار اور خزاں چار موسم ہیں" میں نے پوچھا "سردیوں میں کیا ہوتا ہے!" اس نے خفگی سے میری طرف دیکھا اور ناراض لہجے میں بولا "سردیوں میں سردی ہوتی ہے!" میں نے مسکرا کر گردن ہلائی اور اس سے سوال کیا "ہم سردیوں میں سردی سے بچنے کیلئے کیا کرتے ہیں" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا' میں نے عرض کیا "ہم کوئلوں کی انگیٹھی جلا لیتے ہیں' ہم ہیٹر کا بندوبست کرتے ہیں' ہم گرم کپڑے پہنتے ہیں' سویٹر' جرسیاں' کوٹ اور جیکٹس پہنتے ہیں' ہم گردن کے گرد مفلر لپیٹ لیتے ہیں اور سر پر اونی ٹوپی پہن لیتے ہیں' ہم پاؤں میں گرم جرابیں اور بند جوتے پہنتے ہیں اور کم سے کم باہر نکلتے ہیں' ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟" میں اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ ذرا دیر رک کر بولا "ہم سردی سے بچنے کیلئے کرتے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "نہیں ہم جانتے ہیں سردیاں چند دنوں کی بات ہے اگر ہم نے یہ دو تین ماہ گزار لئے تو موسم کھل جائے گا اور ہم گرم کپڑوں کے بغیر باہر نکل سکیں گے" وہ خاموش رہا' میں نے عرض کیا "گرمیوں میں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال ہوتی ہے' ہم ٹھنڈے کپڑے پہنتے ہیں' کمروں میں پنکھے' روم کولر اور ایئر کنڈیشنر لگا لیتے ہیں' درختوں کے نیچے بیٹھتے ہیں اور سایوں میں چلتے ہیں' ہم دن میں دو دو تین تین بار غسل کرتے ہیں' شربت پیتے ہیں اور گرم دوپہروں میں باہر نہیں نکلتے' کیوں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا' میں نے دوبارہ عرض کیا "موسم خزاں میں پودوں کے پتے گر جاتے ہیں' ساری گھاس جل جاتی ہے اور درخت ٹنڈ ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد بہار آتی ہے' گھاس کی کونپلیں نکلتی ہیں' شاخیں ہری ہوتی ہیں' ان پر پتے نکلتے ہیں اور پتوں کے ساتھ پھول کھلتے ہیں" میں خاموش ہو گیا' اس نے کروٹ بدلی اور گرم آواز میں بولا "لیکن سر ان موسموں کا میری کہانی کے ساتھ کیا تعلق' جناب عالی آپ بالکل لایعنی اور فضول

بات کر رہے ہیں' میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں اور آپ کچھ جواب دے رہے ہیں' مجھے آپ کی بالکل سمجھ نہیں آ رہی"

میں نے قہقہہ لگایا اور نوجوان سے عرض کیا" میں دو باتیں ثابت کرنا چاہتا ہوں ہم لوگ موسم کی سختیاں اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے یہ سردیاں' یہ گرمیاں اور یہ خزاں چند دنوں کی بات ہے اور اس کے بعد وقت بدل جائے گا' اگر ہم اس حقیقت سے واقف نہ ہوں تو تم یقین کرو ہم لوگ سردیوں میں جم جائیں یا پھر گرمیوں میں پگھل جائیں' تمہارا پہلا مسئلہ یہ ہے تم وقت کی حقیقت سے واقف نہیں ہو' تم یہ نہیں جانتے تبدیل ہونا وقت کی فطرت ہے' جب تک زندگی اور کائنات قائم ہے وقت تبدیل ہوتا رہے گا' سردیاں گرمیوں میں ضرور تبدیل ہوں گی اور گرمیاں سردیوں میں ضرور ڈھلیں گی' شام کی صبح ضرور ہو گی اور صبح شام کے پردوں میں ضرور گم ہو گی' ناکامی کامیابی میں ضرور بدلے گی' کمال ضرور زوال پذیر ہو گا اور طاقت کمزور' کمزور طاقت اور اختیار بے اختیاری میں ضرور تبدیل ہو گا' خوشبو بدبو اور بدبو خوشبو میں ضرور تبدیل ہو گی اور دوسرا تم یہ نہیں جانتے دنیا کی کوئی طاقت موسموں کو نہیں بدل سکتی' دنیا کے سارے حکمران سارے اختیارات اور ساری قوتیں مل کر سردیوں کو نہیں روک سکتیں' دنیا کا کوئی شخص گرمیوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا اور دنیا کی کوئی طاقت خزاں اور بہار کو نہیں روک سکتی' دنیا کا کوئی شخص ناکامی' مشکل' تنگی اور بیماری سے نہیں بچ سکتا اور دنیا کا کوئی شخص سدا کامیاب' ہمیشہ خوشحال' تا مرگ صحت مند اور پوری زندگی سکھی نہیں رہ سکتا' وقت اور کیفیت کبھی یکساں نہیں رہتی" وہ خاموشی سے سنتا رہا' میں نے عرض کیا" ہم لوگ موسموں' وقت اور کیفیتوں کو تبدیل نہیں کر سکتے' ہم ان کے ساتھ صرف ایڈجسٹ کر سکتے ہیں' آندھی آئے تو ہمیں نیچے بیٹھ جانا چاہیے' سردیاں ہوں تو آگ جلا کر سردی گزرنے کا انتظار کریں' گرمیاں آئیں تو ٹھنڈی جگہ بیٹھ جائیں اور ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیں' خزاں آئے تو ٹنڈ منڈ درختوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں اور بہار آئے تو چند دن کی بہار سے لطف اٹھائیں' ہمارے پاس وقت اور موسموں کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا' اسی طرح ہم نے برے وقتوں' ناکامیوں' خرابیوں' بیماریوں اور پریشانیوں کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کرنا ہوتا ہے' اگر ہماری ماں تین سال میں ہمیں چھوڑ گئی تو ہم اسے واپس نہیں لا سکتے چنانچہ ہم نے ماں کی کمی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے' ہمیں اچھے سکول' اچھے استاد اور اچھے کلاس فیلو نہیں ملے' ہم کسی کلاس میں اچھے نمبر نہیں لے سکے' ہمیں نوکری نہیں ملی' ہم بزنس میں ناکام ہو گئے اور ہماری شادی مرضی

کے مطابق نہیں ہوئی تو ہم نے ان کیموں کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کرنا ہے‘ ہم نے کبھی اپنی خواہشوں پر کمبل دے دینا ہے اور کبھی اپنی حسرتوں کو سائے میں لٹا دینا ہے‘ ہم نے کبھی اپنی آرزوؤں کو دو دو بار غسل دینا اور کبھی انہیں ہیٹر کے سامنے بٹھا دینا ہے‘ ہم نے کبھی آندھیوں میں زمین پر لیٹ کر وقت بدلنے کا انتظار کرنا ہے اور کبھی درختوں پر چڑھ کر صبح کی راہ تکنی ہے‘ ہم نے زندگی کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ہے“ میں رکا اور ذرا دیر بعد بولا ”ہم میں سے جو لوگ موسموں کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کرتے وہ جم جاتے ہیں یا پگھل جاتے ہیں“ میں خاموش ہو گیا‘ وہ سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے بولا ”لیکن سر میں نے کب تک ایڈجسٹ کرنا ہے“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور ہنس کر جواب دیا ”جب تک تمہارے مقدر کی آندھی ختم نہیں جاتی‘ یاد رکھو دنیا کی کوئی سختی ساڑھے سات برس سے لمبی نہیں ہوتی اور دنیا کا کوئی شخص جس کیفیت میں پیدا ہوتا ہے اس کیفیت میں فوت نہیں ہوتا اور دنیا کا کوئی ناکام شخص پوری زندگی ناکام نہیں رہتا کیونکہ تبدیلی وقت کا مقدر بھی ہے اور فطرت بھی“



☼......☼......☼

# بڑے گھروں والے

میں نے ان سے پوچھا" خواجہ صاحب پورا عالم اسلام زوال کا کیوں شکار ہے، ہم دنیا کے ہر کونے، ہر خطے میں مار کھا رہے ہیں" خواجہ صاحب مسکرائے اور ذرا سے توقف سے بولے" فرعونیت کی وجہ سے" میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، یہ وہ وقت ہوتا ہے جب وہ سوال پسند نہیں کرتے، انہوں نے فرمایا" فرعون کے بے شمار معانی ہیں، ان معنوں میں ایک مطلب بڑے گھر والا بھی ہوتا ہے، فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا، اس کی اس جسارت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند فرمایا' جب اللہ تعالیٰ کسی کو ناپسند فرماتے ہیں تو وہ اس شخص کی ہر ادا، ہر عادت کو خرابی بنا دیتے ہیں اور آنے والے زمانوں میں جو بھی شخص اللہ کے اس مشرک کی پیروی کرتا ہے، جو بھی اس کی عادات اپناتا ہے اللہ اسے بھی اس زوال، اس انجام کا شکار بنا دیتا ہے" میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا، انہوں نے فرمایا" فراعین مصر کو بلند و بالا اور وسیع و عریض عمارتیں بنانے کا شوق تھا، ان کا خیال تھا محلات، دربار، قلعے اور دروازے طاقت اور اختیار کی علامت ہوتے ہیں اور اگر انہوں نے خود کو خدا ثابت کرنا ہے تو انہیں پہاڑوں سے بلند عمارتیں بنانی چاہئیں چنانچہ وہ اس خبط میں مبتلا ہو گئے" وہ ذرا دیر کیلئے رکے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اس کے بعد بولے" یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی قبریں تیار کیں، آپ اہرام مصر دیکھیں، یہ کیا ہیں یہ وسیع و عریض قبریں ہیں، سائنس آج تک حیران ہے یہ لوگ اتنے بڑے بڑے پتھر کہاں سے

لائے، انہوں نے یہ پتھر ایک دوسرے کے ساتھ کیسے جوڑے اوران لوگوں نے کرینوں کے بغیر یہ پتھر ایک دوسرے کے اوپر کیسے رکھے، یہ مقبرے دراصل ان کی سوچ اور فکر کے آئینہ دار ہیں، یہ مقبرے ثابت کرتے ہیں فرعون حقیقتاً بڑے گھروں والے لوگ تھے اور وہ اپنے بڑے بڑے گھروں، قلعوں اور قبروں سے خود کو خدا ثابت کرنا چاہتے تھے''۔ خواجہ صاحب مکمل طور پر خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا'' لیکن فرعون کے گھروں کا ہمارے زوال کے ساتھ کیا تعلق'' وہ مسکرائے'' بڑا گہرا تعلق ہے، فرعون اللہ کا دشمن تھا اور اللہ اپنے دشمن کی عادتوں کو پسند نہیں کرتا چنانچہ دنیا کے تمام بڑے گھروں والے لوگ جلد یا بدیر فرعون جیسے انجام کا شکار ہوتے ہیں، یہ لوگ، ان کی خدائی اور ان کے بڑے بڑے گھر بالآخر زوال پذیر ہو جاتے ہیں'' میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے'' تم دنیا میں ترقی اور پستی پانے والے لوگوں، معاشروں، قوموں اور ملکوں کا جائزہ لو تو تمہیں چھوٹے گھروں، چھوٹے دفتروں اور چھوٹی گاڑیوں والے لوگ، ملک اور معاشرے ترقی پاتے نظر آئیں گے جبکہ ہر وہ ملک جس کے بادشاہ، حکمران، وزیر، مشیر، بیوروکریٹس اور تاجر بڑے گھروں، بڑے دفتروں میں رہتے ہیں وہ ملک اور وہ معاشرہ زوال پذیر ہو گا'' میں خاموشی سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا'' پورا عالم اسلام بڑے گھروں کے خبط میں مبتلا ہے، اس وقت دنیا کا سب سے بڑا محل برونائی کے سلطان کے پاس ہے، عرب میں سینکڑوں ہزاروں محلات ہیں اور ان محلات میں سونے اور چاندی کی دیواریں ہیں اور اسلامی دنیا اس وقت قیمتی اور مہنگی گاڑیوں کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے'' وہ خاموش ہوئے، ذرا دیر سوچا اور پھر بولے'' تم پاکستان کو دیکھو، تم ایوان صدر، وزیراعظم ہاؤس، گورنر ہاؤسز، کور کمانڈر ہاؤسز، آئی جی، ڈی آئی جی ہاؤسز، ڈی سی اور ہاؤس اور سرکاری گیسٹ ہاؤسز کو دیکھو، یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب بڑے گھر ہیں، پاکستان کے ایک ضلع میں 18 ویں گریڈ کے ایک سرکاری عہدیدار کا گھر 106 کنال پر مشتمل ہے، راولپنڈی کا ایک سابق ایوان صدر اس قدر وسیع تھا کہ اس میں یونیورسٹی بنائی گئی، اسلام آباد کے وزیراعظم ہاؤس کا رقبہ قائداعظم یونیورسٹی کے مجموعی رقبے سے چار گنا ہے، لاہور کا گورنر ہاؤس پنجاب یونیورسٹی سے بڑا ہے اور ایوان صدر کا سالانہ خرچ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے'' میں خاموشی سے سنتا رہا'' تم لوگ اپنے حکمرانوں کے دفتر دیکھو، ان کی شان و شوکت دیکھو، ان کے اخراجات اور عملہ دیکھو، کیا یہ سب فرعونیت نہیں، کیا اس سارے تام جھام کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ہم سے راضی رہے گا جبکہ اس کے برعکس تم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کا لائف سٹائل

دیکھو، بل گیٹس دنیا کا امیر ترین شخص ہے دنیا میں صرف 18 ممالک ایسے ہیں جو دولت میں بل گیٹس سے امیر ہیں باقی 192 ممالک اس سے کہیں غریب ہیں لیکن یہ شخص اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتا ہے، وہ اپنے برتن خود دھوتا ہے، وہ سال میں ایک دو مرتبہ ٹائی لگاتا ہے اور اس کا دفتر مائیکروسافٹ کے کلرکوں سے بڑا نہیں، وارن بفٹ دنیا کا دوسرا امیر ترین شخص ہے اس کے پاس 50 برس پرانا اور چھوٹا گھر ہے، اس کے پاس 1980ء کی گاڑی ہے اور وہ روز کوکا کولا کے ڈبے سٹورز پر سپلائی کرتا ہے، برطانیہ کے وزیراعظم کے پاس دو بیڈروم کا گھر ہے، جرمنی کی چانسلر کو سرکاری طور پر ایک بیڈروم اور ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم ملا ہے، اسرائیل کا وزیراعظم دنیا کے سب سے چھوٹے گھر میں رہ رہا ہے، اس کی بجلی تک کٹ جاتی ہے، بل کلنٹن کو لیونسکی کیس کے دوران کورٹ فیس ادا کرنے کے لئے دوستوں سے ادھار لینا پڑا تھا، وائیٹ ہاؤس کے صرف دو کمرے صدر کے استعمال میں ہیں، اوول آفس میں صرف چار کرسیوں کی گنجائش ہے اور جاپان کے وزیراعظم کو شام چار بجے کے بعد سرکاری گاڑی کی سہولت حاصل نہیں چنانچہ تم دیکھ لو چھوٹے گھروں والے یہ لوگ ہم جیسے بڑے گھروں والے لوگوں پر حکمرانی کر رہے ہیں، یہ آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم دن رات پیچھے جا رہے ہیں' وہ خاموش ہو گئے۔

میں نے عرض کیا ''گویا آپ کا فرمانا ہے ہم ترقی نہیں کر سکتے؟'' انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے'' ہاں جب تک ہم فرعون کے دربار سے نکل کر موسیٰ کے خاک ساروں میں شامل نہیں ہوتے، جب تک ہم بڑے گھروں سے نقل مکانی کر کے چھوٹے گھروں میں نہیں آتے اور جب تک ہم قلعوں، ایوانوں اور محلوں سے نکل کر مکانوں، گھروں اور فلیٹوں میں شامل نہیں ہوتے' ہم اس وقت تک ترقی نہیں کریں گے، ہم اس وقت تک بڑی قوم نہیں بنیں گے'' وہ رکے، انہوں نے کچھ سوچا اور مسکرا کر بولے تم خود بتاؤ'' اللہ نے جو قانون اپنے نبیوں کیلئے نہیں بدلا تھا وہ یہ قاعدہ ہمارے لئے کیوں تبدیل کرے گا''۔

✿.....✿.....✿

# جسے اللہ عزت دے

میں وزیر صاحب کو باہر چھوڑ کر واپس آیا تو میرا دوست اسی طرح منہ پھلا کر بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر ناگواری، نفرت اور غصے کے تاثرات تھے، میں نے زندگی میں کبھی کسی چہرے پر اتنی لکیریں نہیں دیکھی تھیں جتنی اس وقت میرے دوست کے منہ پر تھیں، میں خاموش بیٹھ گیا، وہ بڑی دیر تک اپنے جذبات سے الجھتا رہا، ہمارے درمیان وقت سرکتا رہا، آدھ گھنٹے بعد اس نے سر اٹھایا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "یہ تمہارا وزیر میرا پرانا کلاس فیلو ہے، ہم دونوں لنگوٹیے تھے۔ آج اس سے بیس برس بعد ملاقات ہوئی تو میں اپنے جوش کو دبا نہیں سکا" یہ اس بے تکلفی کا عادی نہیں تھا چنانچہ بات بگڑ گئی، میں اس پر شرمندہ ہوں" میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا، اس کی شرمندگی بجا تھی لیکن یہ واقعہ اس سے کہیں دلچسپ تھا۔

ایک گھنٹہ پہلے ہم دونوں دفتر میں بیٹھے تھے اچانک دروازہ کھلا اور وزیر صاحب اندر داخل ہو گئے۔ میں ان کے استقبال کیلئے آگے بڑھا، میرا دوست بھی اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے دور ہی سے "اوئے" کا نعرہ لگا دیا۔ اس کے اس نعرے سے وزیر صاحب کا رنگ فق ہو گیا اور مجھے پسینہ آ گیا، وزیر صاحب چپ چاپ بیٹھ گئے، وہ پندرہ منٹ میرے دفتر میں بیٹھے رہے اس دوران میرا دوست انہیں ان کا بچپن یاد کراتا رہا۔ انہوں نے کس بیری سے کتنے بیر توڑے تھے۔

انہوں نے کس لڑکی سے کتنے جوتے کھائے تھے اور انہوں نے کس کس کھمبے کی تاریں اتار کر کہاں کہاں بیچی تھیں۔ وزیر صاحب ہر انکشاف پر جز بز ہو جاتے تھے، پہلو بدلتے تھے اور مجھ سے آنکھیں چراتے تھے، انہوں نے بڑی مشکل سے چائے ختم کی، اپنی ایک مصروفیت کا بہانہ بنایا اور رخصت ہو گئے، وہ جب دفتر سے نکلنے لگے تو میرا دوست ان سے بغل گیر ہونے کیلئے آگے بڑھا لیکن وزیر صاحب اسے "اگنور" کر کے باہر چلے گئے۔ میں انہیں پورچ میں چھوڑ کر واپس آیا تو میرا دوست شدید جلن اور پشیمانی کا شکار تھا میں نے اس سے عرض کیا "تم اس سارے معاملے کے ہولی سولی مجرم ہو، تم نے بڑی کوشش کر کے اپنی بے عزتی کرائی تھی"۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نے کہا "تمہارا اسٹائل دنیاوی لحاظ سے بھی ٹھیک نہیں تھا اور دینی لحاظ سے بھی" اس کے چہرے پر تحیر پھیل گیا، میں نے عرض کیا "ہم لوگ سرمائے کی دنیا میں آباد ہیں، ہم لوگ بینکوں میں اکاؤنٹس کھولتے ہیں اور ان اکاؤنٹس میں اپنی پونجی جمع کراتے ہیں۔ یہ بچت ہمارا سرمایہ ہوتی ہے اور یہ سرمایہ مشکل وقت میں ہمارے کام آتا ہے، ہم زمین جائیداد بھی بناتے ہیں، یہ زمین جائیداد ہمیں زندگی میں ہمت، حوصلہ اور اعتماد دیتی ہے، ہم زیورات بھی خریدتے ہیں، ہم پرائز بانڈ، لاٹریاں اور ڈالر بھی جمع کرتے ہیں، یہ سب سرمائے کی مختلف شکلیں ہیں اور یہ سرمایہ مشکل وقتوں میں ہمارے کام آتا ہے، کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے عرض کیا "دنیا میں سب سے بڑا سرمایہ انسان ہوتا ہے، جہاں ہماری دولت، زمین جائیداد اور سونا چاندی جواب دے جاتی ہے وہاں ہمارے بہن بھائی اور دوست احباب کام آتے ہیں لہٰذا ہمارا سب سے بڑا اکاؤنٹ انسان ہوتے ہیں، جو لوگ ان "ہیومین اکاؤنٹس" پر توجہ نہیں دیتے، جو ان کے ڈیبٹ اور کریڈیٹ کا خیال نہیں کرتے وہ بارشوں کے وقت اکیلے رہ جاتے ہیں اور ان کا مشکل وقت مزید مشکل ہو جاتا ہے" میرا دوست خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے عرض کیا "ہم لوگ پوری زندگی دوستیاں بناتے رہتے ہیں، ہم مشکل وقتوں میں اپنے دوستوں کا ساتھ دیتے ہیں، ہم اکٹھے پیر توڑتے ہیں، ہم ان کیلئے مار کھاتے ہیں اور ہم دوستی کے استحکام کیلئے روپیہ پیسہ بھی خرچ کرتے ہیں لیکن جب ہمارا دوست زندگی میں آگے نکل جاتا ہے، وہ جب سی ایس ایس کر کے بڑا افسر بن جاتا ہے، وہ وزیر ہو جاتا ہے

یا وہ صنعت کار اور کارخانے دار بن جاتا ہے تو ہم اسے ''اوئے'' کہہ کر ناراض کر دیتے ہیں اور ہم اس سے فاصلے پر چلے جاتے ہیں، کیا ہمارا رویہ عقلی لحاظ سے درست ہے؟'' میرے دوست نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے کہا ''ہم کتنے بے وقوف لوگ ہیں، ہمارا دوست جب ہماری طرح بے بس، بے اختیار اور غریب تھا تو ہم اس کی عزت کرتے رہے تھے لیکن جب وہ ہماری مدد کرنے کے قابل ہوا تو ہم نے اس کی بے عزتی شروع کر دی، ہم نے اسے ناراض کر دیا'' میں خاموش ہو گیا۔

وہ بولا ''ہمیں کیا کرنا چاہیے'' میں نے عرض کیا ''ہمیں دوست کی کامیابی کو فوراً تسلیم کر لینا چاہیے، ہمیں اپنے دوستوں کے عروج کے زمانے میں انہیں ماضی کے مقابلے میں زیادہ عزت دینی چاہیے' ہمیں ان کی ترقی کو مان لینا چاہیے'' وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا'' یہ دنیاوی پہلو تھا، اب آتے ہیں اس واقعے کے دینی پہلو کی طرف، میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا، میں نے پوچھا'' نمرود فرعون اور ابوجہل کا انجام کیوں برا ہوا تھا؟'' اس نے تھوڑی دیر سوچا اور مسکرا کر بولا'' یہ لوگ مشرک تھے لہٰذا یہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے'' میں نے ہاں میں گردن ہلائی اور اس کے بعد عرض کیا'' میرے عزیز یہ فقط ایک پہلو ہے، اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے'' اس نے پوری آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا، میں نے عرض کیا'' اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کرام کو عزت بخشی تھی لیکن ان لوگوں نے انبیاء کرام کی توہین شروع کر دی چنانچہ یہ لوگ اللہ کے عذاب کا شکار ہو گئے، تم دیکھ لو ان انبیاء کرام کے ادوار میں بے شمار ایسے لوگ تھے جو پوری زندگی شرک پر قائم رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی قسم کی سزا نہ دی' کیوں؟ کیونکہ یہ لوگ شرک کے ساتھ انبیاء کرام کی توہین نہیں کرتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں نمرود فرعون اور ابوجہل کے انجام سے بچائے رکھا' میرا دعویٰ ہے جب قدرت لوگوں کو عزت دیتی ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے اس کے بندے اس کے فیصلے کا احترام کریں وہ بھی اس شخص کی عزت کریں لیکن جب کوئی شخص ان لوگوں کی توہین کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے برداشت نہیں کرتا اور وہ اسے اپنے فیصلے، اپنے کرم اور اپنے رحم کی توہین سمجھتا ہے'' میں رکا، میرا دوست خاموشی سے دیکھتا رہا، میں نے عرض کیا'' اللہ تعالیٰ کو انسان کی کوئی ایک ادا پسند آ جاتی ہے جس کے بدلے میں

وہ اسے نیک نامی سے نوازتا ہے لہٰذا میرا خیال ہے اللہ تعالیٰ جسے عزت دے ہمیں اس کی توہین کرنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے ہمیں اس کی برتری تسلیم کر لینی چاہیے بصورت دیگر ہم فرعون کے انجام کا شکار ہو جاتے ہیں" میرے دوست نے میری بات سنی' مجھ سے وزیر صاحب کا ٹیلی فون نمبر لیا اور دفتر سے رخصت ہو گیا۔

# آج سے



وہ آگے جھکا اور سرگوشی میں بولا ”سر اس ملک میں کوئی اچھی بات بھی ہوگی؟ چمن سے گوادر اور کراچی سے لنڈی کوتل تک سرکاری نظام بچھا ہے اس نظام کا کوئی نہ کوئی پرزہ، کوئی نہ کوئی کارندہ اچھا، ایماندار اور مخلص بھی ہوگا؟ اس ملک میں 16 کروڑ لوگ رہتے ہیں ان 16 کروڑ میں چند اچھے لوگ بھی ہوں گے؟ مسلم لیگ (ق) ملک کی رولنگ پارٹی ہے اس جماعت میں بھی کوئی نہ کوئی درد دل رکھنے والا باضمیر شخص ہوگا اور صدر پرویز مشرف اور شوکت عزیز میں بے شمار خرابیاں اور خامیاں ہوں گی لیکن ان دونوں نے پچھلے سات برسوں میں کچھ اچھے کام بھی کیے ہوں گے؟ آپ وہ کام، وہ اچھائیاں اور وہ خوبیاں بیان کیوں نہیں کرتے؟ آپ تصویر کے دوسرے رخ پر کیوں نظر رکھتے ہیں؟“

میں غور سے اس کی بات سنتا رہا، وہ خاموش ہوا تو میں نے عرض کیا ”اس ملک اور اس ملک کے باسیوں میں بے شمار خوبیاں اور بے شمار اچھائیاں ہیں؛ دنیا میں اس وقت 140 ممالک میں خیرات، صدقہ اور چیریٹی ہوتی ہے، ان 140 ممالک کی فہرست میں پاکستان پانچویں نمبر پر ہے، ہم پوری دنیا میں فی کس آمدنی کے لحاظ سے سب سے زیادہ خیرات دینے والے لوگ ہیں، پاکستان میں ہر سال 100 سے 140 ارب روپے ضرورت مندوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں، پاکستان دنیا میں مفت کھانا کھلانے والے آٹھ ممالک میں شامل ہے، پاکستان میں اس وقت

اڑھائی ہزار کے قریب ایسے مزار ہیں جن پر دن رات لنگر چلتا ہے اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان مزاروں سے کھانا کھاتے ہیں، آپ لاہور کے داتا دربار، اسلام آباد کے بری امام، سیہون شریف کے تجی لال شہباز قلندر اور کراچی کے شاہ غازی کے دربار پر جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں چوبیس گھنٹے لنگر چلتا ملے گا، پاکستان کا ہر شہری ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے، لوگ اپنے کپڑے، جوتے، برتن، دوائیں اور فرنیچر ضرورت مندوں کو دے دیتے ہیں، پاکستان میں لاکھوں یتیم خانے، بیوہ گھر، مسجدیں، درگاہیں، دربار، قبرستان اور سکول اہل ثروت کے پیسوں سے چل رہے ہیں، اس وقت پاکستان میں چھوٹے بڑے دس لاکھ کے قریب مدرسے ہیں یہ تمام مدارس عوام کی معاونت سے چل رہے ہیں اور ان میں تعلیم پانے والے بچوں کو نہ صرف کتابیں دی جاتی ہیں بلکہ انہیں رہائش، کھانا اور لباس تک فراہم کیا جاتا ہے، ہمارے مدارس دنیا کا سب سے بڑا چیریٹی بورڈنگ سسٹم ہیں، اس وقت پاکستان کے تمام قصبوں اور شہروں میں ایسے سکول، ہسپتال اور ڈسپنسریاں موجود ہیں جن میں تعلیم اور علاج کی سہولت مفت دی جاتی ہے، دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایمبولینس سروس پاکستان میں ہے، ہمارے عبدالستار ایدھی گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہیں، اس وقت دنیا میں کینسر کا سب سے بڑا چیریٹی ہسپتال پاکستان میں ہے، یہ ہسپتال کرکٹ سٹار عمران خان نے بنایا تھا اور پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کا ہر چوتھا شہری فلاح عامہ کا کوئی نہ کوئی کام کر رہا ہے اور جس میں رمضان میں ہر گھر میں افطاری کی دعوت ہوتی ہے اور جس میں سب سے زیادہ خون دیا جاتا ہے اور جس میں بحران، آفت اور حادثے میں لوگ دوسروں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہیں اور پاکستان دنیا کا دوسرا ملک تھا جس نے پچیس سے چالیس لاکھ غیر ملکیوں کو پناہ دی تھی اور پاکستان کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جس میں لوگ بھوکے نہیں سوتے"

میں رکا اور اس کے بعد عرض کیا "رہ گیا ہمارا سرکاری نظام تو آج کے زمانے میں بھی پولیس، محکمہ مال اور کسٹم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی ایمانداری کی قسم کھائی جا سکتی ہے، ہمارے ملک میں ایسے جج بھی موجود ہیں جن کے تمام فیصلے ضمیر کے کعبے سے نکلتے ہیں اور ایسے سیاستدان بھی زندہ ہیں جو برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی کہنے کی جرأت رکھتے ہیں" میں خاموش ہو گیا' اس نے کرسی پر کروٹ لی اور مسکرا کر بولا "پھر آپ ان لوگوں کے بارے میں کیوں نہیں لکھتے" میں نے عرض کیا' اس کی دو وجوہات ہیں اول یہ تمام انفرادی اچھائیاں ہیں اور یہ آج

تک اجتماعی شکل اختیار نہیں کر سکیں' دوسرا' ہمارے ملک میں برائی اچھائی پر غالب آ رہی ہے، ہمارا ہر نیا دن ہمارے کسی نہ کسی اچھے، باضمیر اور ایماندار شخص کی نعش سے طلوع ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام معاشروں میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، ہم نے دیکھنا یہ ہوتا ہے معاشرے میں اچھے لوگ زیادہ ہیں یا برے، اگر کسی معاشرے میں عبدالستار ایدھی جیسے لوگ زیادہ ہوں تو وہ معاشرہ اچھا ہوتا ہے اور اگر اس میں بلیک میلروں، بدمعاشوں، بدقماشوں، سمجھوتے بازوں، ابن الوقتوں، فراڈیوں، ڈکیتوں، چوروں اور نوسر بازوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ معاشرہ برا ہوتا ہے، بدقسمتی سے ہمارے معاشرے، ہمارے ملک میں پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد کم اور دوسری قسم کے لوگ تعداد اور اثر رسوخ میں زیادہ ہیں۔ اگر مسئلہ صرف یہ ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی لیکن اصل مسئلہ پہلی قسم کے لوگوں کی تعداد میں آنے والی کمی ہے۔ ہمارے ملک سے جب بھی کوئی اچھا شخص رخصت ہوتا ہے تو پورے ملک میں اس کی جگہ لینے والا کوئی نظر نہیں آتا اور ہمارے سارے کھیتوں میں برائی کی پنیری لگی ہے اس میں کوئی شک نہیں خیرات، چیریٹی اور ہمدردی بہت بڑی دولت ہوتی ہے لیکن معاشرے صرف ان سے نہیں چلا کرتے، معاشروں کو تعلیم، روزگار، انصاف، جمہوریت، سڑکیں اور صاف پانی بھی چاہیے، خوف، لالچ اور ظلم سے پاک ماحول بھی درکار ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے ہماری مسجدوں کے امام تک سیکورٹی گارڈ کے بغیر نماز شروع نہیں کراتے اور ہمارا پانی اور بجلی کا وزیر تک منرل واٹر پیتا اور گھر میں جنریٹر چلاتا ہے، ہمارے وزیر تعلیم کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں اور ہمارا وزیر صحت پرائیویٹ ہسپتالوں میں علاج کراتا ہے۔ ذرا سوچو کیا ان حالات پر ہمارا دل نہ دکھے، ذرا سوچو اگر ہم بھی ان حالات پر خاموش ہو جائیں، اگر ہم بھی عوام کو معاشرے کی معدوم ہوتی اچھائیوں کا لالی پاپ دینا شروع کر دیں اور اگر ہم بھی لوگوں کو خوش فہمیوں کی افیون کھلانا شروع کر دیں تو ظلم کے خلاف آواز کون اٹھائے گا؟ کون بات کرے گا؟ اور لوگوں کو کون جگائے گا؟" میں خاموش ہو گیا۔

اس نے ذرا دیر سوچا اور مسکرا کر بولا "سر ہم لوگ بہت دکھی ہیں اوپر سے آپ لوگ ہمارے زخموں پر نمک چھڑک دیتے ہیں جس سے ہماری تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے آپ مہربانی فرما کر کبھی کبھی ان زخموں پر مرہم بھی رکھ دیا کریں، سر مریض کو حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے، ہم جانتے ہیں آپ ہمیں شفا نہیں دے سکتے لیکن آپ ہمیں کم از کم تھپکی تو دے سکتے ہیں، آپ ہماری ہمت تو بندھا سکتے ہیں، آپ بھی کبھی ایسا بھی کر دیا کریں، آپ کی مہربانی ہو گی" میں نے قہقہہ لگایا

اور آگے جھک کر عرض کیا" مریض کو حوصلے اور تھپکی سے پہلے دوا کی ضرورت ہوتی ہے، دنیا کی دس ہزار تھپکیاں مل کر کسی ایک شخص کا درد نہیں مٹا سکتیں، اگر تم چاہتے ہو میں ڈاکٹر کو بلانے کے بجائے مریض کے سرہانے بیٹھ کر بانسری بجانا شروع کردوں تو میں حاضر ہوں، میں آج سے تصویر کا وہ رخ پیش کرنا شروع کردیتا ہوں جس نے ابھی جنم نہیں لیا، میں آج سے اس خوشحالی، اس امن، اس سکون، اس انصاف اور اس جمہوریت کے گن گانا شروع کردیتا ہوں جس کا ابھی پہلا بیج پیدا نہیں ہوا، جس کے تصور تک نے ابھی ہماری رولنگ کلاس کے دماغ پر دستک نہیں دی، میں آج سے خالی گلاس کو بھرا کہنا شروع کردیتا ہوں اور میں پتھر میں ڈرل مشین سے سرخ گلاب کی قلم لگا دیتا ہوں، میں آج سے پاکستان کی ہر حکومت، ہر ادارے اور آنے والے ہر حکمران کو پائندہ باد کہنا شروع کردیتا ہوں، میں آج سے جوہڑ کے کنارے بیٹھ کر امید کے سورجوں کا انتظار شروع کردیتا ہوں، میں آج سے سرکنڈوں سے زعفران جھڑنے کی امید شروع کردیتا ہوں اور میں آج سے توے کی دوسری پرت کو روشن کہنا شروع کردیتا ہوں لو میں خود کو تبدیل کرلیتا ہوں اب تم لوگ تسلی اور تھپکی سے اپنے سارے مسائل حل کرلو تم لوگ ہتھیلیوں پر چیڑ اگالو اور تم ہاتھیوں کو فیڈر پلا لو"

ہم سارا دن ممبئی کے کھنڈرات میں پھرتے رہے اور شام کو سورنتو چلے گئے' سورنتو میں اس وقت سورج ڈوب رہا تھا' ہمارے ہوٹل کی کھڑکی سے سمندر کے چھلکے کھاتے کناروں تک سونے کا ایک سنہری راستہ بچھا تھا' تم نے کہا تھا "مجھے یقین نہیں آتا دنیا میں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں سبز پہاڑوں کے قدموں میں سمندر ہوں" میں خاموش رہا' تم نے پوچھا "کیا ہم دوبارہ اس جگہ آئیں گے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' تب تم نے ناخن سے کھڑکی کے فریم پر تاریخ لکھ دی' تمہیں یاد ہوگا ہماری اگلی صبح کیپری میں طلوع ہوئی تھی' کیپری سمندر کے درمیان ایک خوبصورت پہاڑ تھا اور اس پہاڑ پر کیپری کا شہر آباد تھا' بالکل پرستان جیسا شہر' کیپری پہاڑ کے نیچے یاقوت کا غار تھا اور اس غار میں نیلے پانیوں کی "آزورو لیک" تھی' ہمارے اطالوی ملاح نے لیک میں داخل ہوتے ہی کوئی دھن چھیڑ دی تھی' تب تم نے پانی میں انگلیاں ڈبوئی تھیں اور غار کی دیوار پر میرا نام لکھ دیا تھا' تم نے وینس کی گرم ریت پر بھی میرا نام لکھا تھا' تم نے موتی کارلو کے رائل گارڈن کے درختوں' کین کے سلگتے ساحل' وینس کے گنڈولوں' فلورنس کے عجائب گھروں' پیسا کے مینار' میلان کے ڈومو چرچ' آئفل [illegible] تم نے [illegible] نہر میں لہروں سے تصویریں بھی بنائی تھیں' تم نے روم کے فواروں میں اپنے اور میرے نام کے سکے بھی پھینکے تھے اور تم نے ہاں تم نے پیرس کے پیگال چرچ میں ہمارے نام کی موم بتی بھی جلائی تھی لیکن ان موم بتیوں' ان تصویروں' ان سکوں اور ریت پر کھینچے ان حرفوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ جب وقت بدلا تو کوئی حرف' کوئی تصویر اور کوئی موم بتی ہمیں ٹوٹنے' ہمیں بکھرنے سے نہ بچا سکی' کوئی وعدہ' سورج کے گھر تک جانے کی کوئی خواہش اور آخری سانس تک چلتے رہنے' آگے بڑھتے رہنے کا کوئی عہد ہمیں الگ ہونے سے نہ روک سکا اور ہم اور ہماری خواہشیں بھی بالآخر لہروں کے ساتھ بہہ گئیں' ہم بھی ماضی کے بے شمار لوگوں کی طرح ماضی کی دیوار میں چن دیئے گئے۔

میں آج ایک بار پھر سورنتو کی اسی کھڑکی میں کھڑا ہوں اور میرے سامنے سورج کا سنہری راستہ بچھا ہے لیکن کھڑکی کے فریم پر کسی اور کا نام لکھا ہے' میں اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں اور اپنے خالق سے پوچھ رہا ہوں یا باری تعالیٰ یہ کیسی دنیا ہے جس میں کھڑکیوں' غاروں' دیواروں اور فواروں کی عمریں بھی اور انسانوں اور ان کے جذبوں کی سانسیں چھوٹی ہوتی ہیں' جس میں انسان چلے جاتے ہیں لیکن کھڑکیاں رہ جاتی ہیں' مجھے آسمان سے کوئی جواب نہیں مل رہا' پلیز تم بھی اپنی کھڑکی کھولو اور آسمان سے یہ سوال ضرور پوچھو شاید تمہیں جواب مل جائے۔